سیر المصنفین

جلد دوم

جس میں

نثاران اردو کے حالات زندگی اور اردو زبان کی عہد بعہد کی ترقی و تبدیلی

کا ذکر کیا گیا ہے

از

جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی وکیل

مترجم شاعرانہ خیالات و مغربی تاریخ یورپ و خیالات ارونگ

جس کو

مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی

نے

جامعہ ملیہ پریس میں چھپوا کر شائع کیا

باراول سنہ ۱۹۲۸ء ایک ہزار قیمت ۴ر

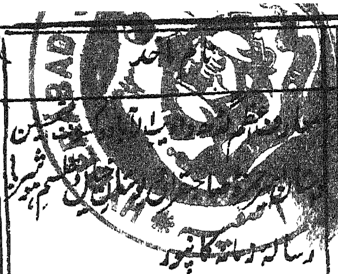
فہرست مطالب

فہرست حوالہ جات ہردو جلد

یہاں ہم صرف اُن کتابوں کا نام درج کرتے ہیں جن سے ہم نے مصنفین کے حالات زندگی اخذ کیے ہیں اور اُن کتابوں کا ذکر غیر ضروری سمجھتے ہیں جن سے اقتباسات بطور نمونہ تحریر کیے گئے ہیں ہم نے ذیل میں یہ طریقہ اختیار کیا ہو کہ ہر مصنف کے نام کے سامنے اُس ماخذ کا نام لکھ دیا ہو جہاں سے اُسکے حالات لیے گئے ہیں۔ پہلی جلد کے ساتھ یہ فہرست سہواً درج ہونے سے رہ گئی تھی اب اس کمی کو بھی پورا کر دیا گیا ہے۔

نام دور	نمبر سلسلہ	نام مصنف	نام ماخذ
پہلا دور	۱	میر محمد عطا حسین خاں تحسین	آب حیات و نظام الملک طوسی
"	۲	ڈاکٹر جان گلکرائسٹ	از مقدمہ گلشن ہند و رسالہ اُردو اورنگ آباد
"	۳	سید حیدر بخش حیدری	آرائش محفل و رسالہ اُردو اورنگ آباد
"	۴	میرزا علی لطف	مقدمہ گلشن ہند و رسالہ اُردو اورنگ آباد
"	۵	میر بہادر علی حسینی	رسالہ اُردو و نظام الملک طوسی
"	۶	میر امن دہلوی	خمخانہ جاوید و باغ و بہار
"	۷	حفیظ الدین احمد	مقدمہ گلشن ہند و رسالہ اُردو اورنگ آباد
"	۸	میر شیر علی افسوس	خمخانۂ جاوید و عصر جدید میرٹھ
"	۹	سید انشاء اللہ خاں انشا	آب حیات
"	۱۰	مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی	واقعات دار الحکومت دہلی
"	۱۱	مولوی شاہ عبد القادر دہلوی	"
"	۱۲	مولوی اسمٰعیل (شہید راہ خدا)	"
"	۱۳	منشی نہال چند لاہوری	مذہب عشق

نام دور	نمبر سلسلہ	نام مصنف	نام ماخذ
پہلا دور	۱۴	میر کاظم علی جوان	رسالہ اُردو و مقدمہ گلشن ہند
〃	۱۵	سری للو لال کوی	〃
〃	۱۶	مولوی اکرام علی	اخوان الصفا و مقدمہ گلشن ہند
〃	۱۷	مظہر علی ولا	آب حیات و بیتال پچیسی
〃	۱۸	مولوی امانت اللہ	رسالہ اُردو اورنگ آباد دکن
〃	۱۹	منشی بینی نرائن	〃
〃	۲۰	میرزا جان طپش	〃
〃	۲۱	محمد خلیل اللہ خاں اشک	〃
دوسرا دور	۲۲	فقیر محمد خاں گویا	بستان حکمت
〃	۲۳	مرزا رجب علی بیگ	قند اُردو و حدائق العشاق گلدستہ اردو [illegible]
〃	۲۴	مرزا اسد اللہ خاں غالب	یادگار غالب
〃	۲۵	ماسٹر رام چندر	تذکرۃ الکاملین
〃	۲۶	مولانا غلام امام شہید	قند اُردو
〃	۲۷	خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر	〃
〃	۲۸	منشی عبد الکریم	الف لیلہ با تصویر مترجمہ خود
〃	۲۹	منشی امیر احمد مینائی	یادداشت مولوی حفیظ الملک خمخانہ جاوید
تیسرا دور	۳۰	سرسید احمد خاں	حیات جاوید
〃	۳۱	نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی	اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام
〃	۳۲	شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد	خمخانہ جاوید و رسالہ ادیب الہ آباد
〃	۳۳	شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں	ادیب الہ آباد و تمدن ہند و قند اردو و یادداشت شیخ محمد اسمٰعیل
〃	۳۴	شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی	رسالہ الناظر لکھنؤ
〃	۳۵	شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی	حیات النذیر
〃	۳۶	شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی	ترجمہ حالی و عصر جدید میرٹھ و کسوف الشمسین



نام دور	نمبر سلسلہ	نام مصنف	[illegible]
تیسرا دور	۳۷	شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی	[illegible]
"	۳۸	مطبع منشی نولکشور	[illegible]
"	۳۹	پنڈت رتن ناتھ در سرشار لکھنوی	رسالہ زمانہ کانپور
"	۴۰	مولوی عبد الحلیم شرر	رسالہ ادیب الہ آباد
		وہ مصنفین جنکا ذکر حاشیۂ کتاب پر موجود ہے	
"	۴۱	نواب محسن الملک مرحوم	یادداشت مولوی ظفر الملک علی گڑھ منتھلی
"	۴۲	مولوی عزیز مرزا مرحوم	یادداشت فرستادہ مولوی ظفر الملک
"	۴۳	مولوی سید کرامت حسین مرحوم	"
"	۴۴	مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ	رسالہ ادیب الہ آباد
"	۴۵	مولوی ظفر علی خاں	اخبار نویسوں کے حالات
"	۴۶	خواجہ غلام الثقلین مرحوم	تعزیت نامہ
"	۴۷	رائے بہادر لالہ بیجناتھ	یادداشت عطاکردہ لالہ منوہر لال صاحب وکیل خلف الصدق رائے بہادر لالہ بیجناتھ سرگباشی
"	۴۸	مولوی بشیر الدین احمد مرحوم	یادداشت عطاکردہ خود
"	۴۹	ماسٹر پیارے لال آشوب	خمخانہ جاوید
"	۵۰	منشی سجاد حسین مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ	یادداشت فرستادہ مولوی ظفر الملک
"	۵۱	شمس العلماء مولوی سید امداد امام اثر	یادداشت فرستادہ خود
"	۵۲	سید سلیمان ندوی	" "
"	۵۳	مولوی سید وحید الدین سلیم	" "
"	۵۴	مولوی عبد الرزاق	" "
"	۵۵	نواب حاجی محمد اسمعیل خاں مرحوم	زبانی یادداشت مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

دیباچہ



جس وقت ہم نے اس کتاب کی پہلی جلد کتابت کے لیے دی تھی اُس وقت ہمارا یہ خیال نہ تھا کہ ہم اس کتاب کو دو جلدوں میں شائع کرینگے چنانچہ دیباچہ جو پہلی جلد کے ساتھ شائع ہو چکا ہے درحقیقت پوری کتاب کے لیے لکھا گیا تھا لیکن دورانِ کتابت میں آسانی اور سہولت اسی کی مقتضی ہوئی کہ سیر المصنفین کو دو جلدوں میں تقسیم کیا جائے۔ پس ہم نے جلد اول میں پہلے دو دوروں کا حال بیان کر دیا ہے اور اس جلد میں ہم صرف دورِ سوم کا تذکرہ درج کرینگے۔ دورِ حاضر یا دورِ چہارم جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہو گیا ہے اب تک مرتب نہیں ہوا اور نہ ابھی ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اسے ترتیب دیں بڑی دقت جو ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ دورِ سوم کے جن برگزیدہ اصحاب کا ذکر کیا گیا ہے انھوں نے ہماری زبان میں تصنیف و تالیف کا پایہ بہت بلند کر دیا ہے اور ہم اپنے دور کے اہلِ تصنیف کو اُس معیارِ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے ہرگز ابھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ اُن کا ذکر بھی دورِ سوم کے مصنفین کے دوش بدوش کیا جائے حالانکہ ہماری دلی خواہش یہی ہے کہ دورِ چہارم کے مصنفین کو ہم دورِ سوم کے مصنفین سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر دیکھیں تاکہ ہماری زبان کا عنفوانِ شباب فی الحقیقت شباب کی امنگوں و آرزوؤں سے لبریز نظر آنے لگے دورِ حاضر کے اہلِ تصنیف ہمارے نزدیک مصنفین کی صف میں کھڑے ہونے کے لیے ضرور تیار نظر آتے ہیں لیکن ابھی وہ اعلیٰ درجے کے مصنفین میں شمار نہیں کیے جا سکتے

فنِ تصنیف میں اُن کی تصویر نا تمام ہے اور نا تمام تصویر کو مکمل کہکر پیش کرنا غلط بیانی ہے اور نافہمی کی دلیل ہے۔ بیشک تصویروں کا تقاضا ہے کہ ہمیں مرکزِ عام پر لاکر ہماری طرف لوگوں کو دعوت دو لیکن وہ ذرا او رصبر سے کام لیں لوگ خود بخود اُن کی طرف متوجہ ہوجائینگے اور یہ خاکسار شرحِ حیات اُن کی خوبیاں بیان کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا اور اُس وقت سیر المصنفین کی تیسری جلد تیار ہوسکیگی۔

پہلی جلد کی اشاعت کے بعد سب سے بڑا اعتراض ہم پر نثرِ اُردو کی ابتدا کے متعلق کیا گیا ہے۔ فدائیانِ اُردو اس بارہ میں یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ وہ اُردو کی پیدائش اور مسلمانوں کا ہندوستان میں داخلہ دونوں مترادف الفاظ سمجھتے ہیں۔ اُن سے کم درجہ پر وہ صاحب ہیں جو تحقیق و تدقیق کے دلدادہ ہیں اور وہ نثرِ اُردو اور نظمِ اُردو کی ابتدا اُن نثروں کی بنا پر جو دکن میں دستیاب ہوگئی ہیں ساتھ ساتھ بتلاتے ہیں حالانکہ دنیا کی کوئی تحریری زبان ایسی نہیں ہے جسکی نثر نظم سے پہلی لکھی گئی ہو یا نظم کے ساتھ ساتھ ہی معرضِ وجود میں آئی ہو۔

بہر حال اس جدید تحقیقات[1] کا خلاصہ جہانتک اُردو نثر سے متعلق ہے یہ ہے:-

حضرت زین الدین خلد آبادی نے جو ۷۷۱ھ ہجری میں فوت ہوئے اپنے ایک مرید خاص نصیر الدین بدھیری کی اس یاد دہانی پر کہ حضرت اپنا خلیفہ کسی کو مقرر کردیں بر وقت انتقال فرمایا تھا کہ منجہ مت بلاوہ یعنی مجھے مت بلاؤ۔

شیخ عین الدین گنج العلم نے اپنے اُردو رسالے آٹھویں صدی ہجری میں تصنیف کیے

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے دو کتابیں معراج العاشقین اور ترجمہ نشاط العشق نویں صدی ہجری میں تحریر کی تھیں۔

میراں جی شمس العشاق کے رسالے "جل ترنگ" اور "گل باس" وغیرہ دسویں صدی ہجری کی تصنیف ہیں۔

(۱) دیکھو دکن میں اُردو مؤلفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی دمشی فاضل، و تاریخ زبان اُردو مؤلفہ حکیم سید شمس اللہ قادری

مولانا عبداللہ نے سنہ ۱۰۳۲ ہجری میں احکام الصلوٰۃ تصنیف فرمائی نمونہ حسب ذیل ہے۔

روح قبض ہوا اسی وقت اسکیاں انکھیاں موچنا ہور۔ پاؤں دراز کرنا ہور ہات دراز کرنا دونو پہلو کی طرف ولیکن سینے پہ نا رکھنا ہور اسی کی تھوڈی ہور سر کوں ملا کر بندنا اسے بزنخداں بولتے ہیں یو سب سُنّت ہے ہور مرنی تے اول اس کی سر کوں قطب کے طرف سلانا ہور موے بعد از اسی غسل دینا اس طریق سوں"

اسی زمانہ کی ایک اور کتاب مفتاح الخیرات ہے اس کا نمونہ بھی ذیل میں درج کرتا ہوں۔

"ایمان کی حکماں کا معرفت ہونا ہور احکام ہور ارکان پچھاننا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کوں اسکی پچھان تی چھٹکارا ہے ہور۔ آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار نا ہوئیگا اگر تجھے پوچھیں گے ایمان کیا ہے بول تو ایمان اقرار کرتا ہو زبان کے تئیں ہور استوار کرنا ہے دل میں خدا تعالیٰ یک ہے یقرار یک خدا خارج دوسرا نہیں ہے"

ملا وجہی نے غالباً حضرت وجیہ الدین گجراتی کی تالیف سے کتاب سبرس ترجمہ کی ہے۔ یہ تصوف کی بہترین کتاب ہے جو سنہ ۱۰۴۵ ہجری میں مرتب ہوئی کتاب کی عبارت مقفیٰ ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

تمام مصحف کا معنا الحمد للہ میں ہے مستقیم ہور تمام الحمد للہ کا معنا بسم اللہ میں ہے قدیم ہور تمام بسم اللہ کا بسم اللہ کی نقطی میں رکھیا ہے کریم سمجھ دیکھ خاطر اتال حدیث میں یوں آئی ہے کہ العلم نقطہ وکثرہا جہال یعنی علم ایک نقطہ ہے جاہلاں نے اسے بدھائے"

شمائل الاتقیا کا ترجمہ میراں یعقوب نے سنہ ۱۰۸۰ ہجری میں ترتیب دیا یہاں اسکی کچھ عبارت بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے۔

"اپنی حیات کی وقت سنجے اشارت کیے تھی جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں

ہندی زبان میں لیاوی تا ہر کسی کوں سمجھا جاوی اس وقت منجے بیا نہیں تا کہ
یک ہزار ستر پر اٹھوں سال کوں رحلت کئے پر ان اُن کے بھانجے عارف حق سیج
عارفو زکی نور دیدی مصطفے کی کلیجی ہو اور مرتضٰی کے میں شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ
تعالٰی کی خلافت کے زمانے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا ہی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی
مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا جب خدا کی توفیق سوں کتاب تمام ہوا ہو حضرت شاہ
کی حضور ہو محقق کامل موحد واصل شریعت کے موافق بابا ابراہیم خلیل کے اس کی ایکیر مطلع فرما کر خوش کیے"

اس کے بعد میر فضلی کی کتاب دہ مجلس کا نمبر آتا ہی جسکا ذکر ہم جلد اول میں کر چکے ہیں
یہ کتاب سنہ ۱۱۴۵ ہجری کی تصنیف ہی۔ نمونہ ذیل میں درج ہی۔

"اس کتاب کا سبب تالیف یہ تھا کہ قبلہ حقیقی اور کعبہ تحقیقی میرے نواب شرف بیلنگان
ہر سال تازیہ ابو عبداللہ الحسینی کا بہ خلوص نیت اندرون محل بجا لاتا تھا اور بندہ
روضۃ الشہدا کا خلاصہ سناتا تھا لیکن معنی اس کے عورتوں کی سمجھ میں نہ آتے تھے
اور فقرات پر سوز و گداز بسبب لغت فارسی اُن کو نہ رلاتے تھے۔ الغرض مذکور کرتیں
کہ ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے"

سنہ ۱۱۸۵ ہجری میں مولوی محمد باقر آگاہ نے سیر، عقاید اور فقہ کی متعدد کتابیں
لکھنی شروع کیں۔ اُن کی نثر کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"بعض علماء متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ
جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام امیان فارسی
سے بھی آشنا نہیں ہیں اس لیے یہ عاصی مطلب قسم اول کا بہت اختصار کے ساتھ
لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہی اور ہر رسالہ کے وزن علیحدہ ہونے سے خواہش
و آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہو سکے"

شرف الملک مولانا محمد غوث نے جنکا انتقال سنہ ۱۲۳۸ ہجری میں ہوا

کیدانی فقہ حنفی کا ترجمہ فرمایا۔ عبارت کا نمونہ ذیل میں ہے۔

"بوج کہ تحقیق بندہ آزمائی جاتا ہے درمیان اس کی کہ بندگی کرے خدا کی اور ثواب
پاوے اور درمیان اس کی کہ گناہ کرے خدا کی اور عذاب کیا جاوے۔"

مولانا قاضی بدرالدولہ خلف شرف الملک نے بھی نثر میں مختلف کتابیں سیر،
فقہ، عقائد اور تفسیر پر تحریر فرمائیں۔ آپکی کتاب فوائد بدریہ کے دیباچہ میں سے کچھ عبارت
یہاں نقل کیجاتی ہے۔

"لیکن دیکھا کہ بازار علم کا بہت کاسد ہوگیا ہے اور علم کے جاننے والے دنیا سے گزر گئے اب
کوئی کتاب زبان عربی یا فارسی میں تصنیف کیے تو کچھ فائدہ اس پر مترتب نہیں جن کو ان باتوں
کی معرفت حاصل ہے ان کے لیے بہت سے کتب موجود ہیں اور کسی کو خواہش مندبھی نہیں پایا
تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا تا عوام مومنوں کو اس سے فائدہ حاصل
ہووے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے احوال سے واقف ہو کر ان کی پیروی خوبی کیا تھہ کریں"

قاضی صاحب موصوف نے ۱۲۸۰ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔

مندرجۂ بالا نمونوں سے ناظرین کرام خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ۱۲۴۵ھ ہجری سے
قبل جبکہ میر فضلی نے اپنی کتاب دہ مجلس تصنیف کی جملہ تصنیفات کی نثریں یہ مشکل
اردو کہی جاسکتی ہیں۔ کم از کم مجھے تو ان مختصر نثروں کا نقل کرنا بھی اجیرن ہو گیا۔
طبیعت نہایت مکدر اور منغص ہوئی۔ جس طرح ابتدائی انگریزی زبان کو اینگلو سیکسن
کہا جاتا ہے اسی طرح ان بزرگوں کی اردو کو اگر دکنی اردو کہیں تو بیجا نہیں ہے جس جفاکشی
او محنت و تلاش سے ان بزرگوں کی کتابوں اور نثر کے نمونوں کو دکن میں اردو کے
مولف نے بہم پہونچایا ہے وہ ضرور قابل تعریف ہے لیکن ان کا یہ کارنامہ کوہ کندن و کاہ
برآوردن کا مصداق ہے۔ اگر ہم نے اپنی کتاب کی جلد اول میں دہ مجلس کو نثر اردو کی
"غالباً پہلی کتاب" لکھدیا تھا تو ہم کو آزاد مرحوم کا مقلد کہکر ہم پر کیوں عدم تحقیق کا الزام

لگایا گیا؛ کیا اب کوئی شخص ان نمونوں کی موجودگی میں اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ دہ مجلس ہی ایسی کتاب ہے جسکو اُردو کہا جا سکتا ہے اور فی الواقع یہی اُردو کی سب سے پہلی کتاب کہے جانے کی مستحق ہے؛ باوجود اس کے ہم فضلی مرحوم کو بھی مصنف کا لقب نہیں دے سکتے اور نہ مرزا رفیع السودا کو اپنی کلیات کا دیباچہ نثر میں لکھنے پر اُن کو شاعر بے بدل کی طرح ناثر بے مثال کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان دونوں صاحبان کی نثریں جنکا نمونہ ہم نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں دیا ہے میر محمد عطا حسین خاں تحسین وغیرہ کے مقابلہ میں عدیم الفہم ہیں حقیقت یہ ہے کہ تحسین سے پیشتر اُردو نثر سانچے میں ڈھل رہی تھی لیکن کوئی مکمل سانچہ تیار نہیں ہوا تھا۔ ہم پر عدم تحقیق کا الزام بیجا ہے ہمارے ذوق ادب نے رطب ویابس کو اُردو نثر میں شامل نہیں کیا اور نہ ہم آیندہ ایسی نثروں اور ایسے مصنفین کو اپنی کتاب میں جگہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے معترض دوست اگر کسی زبان کی تاریخ بغور ملاحظہ فرمائیں تو اُن کو معلوم ہو جائے کہ ادوار اس وقت سے قائم کیے جاتے ہیں جبکہ زبان ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی زبان مستقل صورت اختیار کرلے پس جب تک نثر لکھنے کا طریقہ مروج اور عام نہو گا اس وقت تک نہ مصنف پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ دور قائم کیے جا سکتے ہیں بعض صاحب جن کو ہم نے نظر انداز کر دیا ہے ہمارے اس نظریہ کے بیّن ثبوت ہیں۔

ہمارے زمانہ کی تمام تر شایستگی اور تہذیب دانایان فرنگ کی مرہون منت ہے لہذا جس طرح انھوں نے اپنی اپنی زبان کی تاریخ کی تدوین میں قدم اٹھایا ہے اور جس طرح انھوں نے اپنی اپنی زبان کے ادوار قائم کیے ہیں وہ ہمارے لیے دلیل راہ ہیں اور ہم کو بھی اُن کے نقش قدم پر چلنا چاہیے کیونکہ ایک متمدن قوم اپنے زمانہ عروج میں کبھی غلط رستہ اختیار نہیں کرتی۔ پس انگریزی علم ادب کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے۔ اُس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ نظم میں اُن کے یہاں سب سے قدیم اور مشہور انگریزی شاعر جیفری چاسر ہے

جو سنہ ۱۳۴۰ء سے سنہ ۱۴۰۰ء تک زندہ رہا۔ اُسکو انگریزی شاعری کا باپ کہتے ہیں وہی سب سے
پہلا شخص ہے جس نے انگریزوں کی قومی زبان کو نظم میں اظہار مطالب کا ذریعہ قرار دیا
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُسنے انگریزی کو لٹریری زبان بنایا۔ باوجود اس کے انگریزی شاعری
کا دور اوّل چاسر کے نام نامی سے خالی ہے جس زمانہ کو انگریزی شاعری کا دور اوّل
خیال کیا جاتا ہے وہ اس سے بھی ڈیڑھ صدی پیشتر ہو گزرا ہے۔ دور اوّل ملکہ الزبتھ کے
زمانہ سے تقریباً سنہ ۱۵۵۸ء میں شروع ہوا ہے اور سنہ ۱۶۱۶ء میں ختم ہوتا ہے۔(۱)

اب انگریزی نثر لیجیئے۔ اگرچہ چاسر سے پیشتر متعدد شعرا اور مصنفین جو نامور اور
معروف بھی ہیں گزر چکے تھے لیکن موجودہ انگریزی زبان کا سب سے پہلا انشا پرداز چاسر
ہی کو بتلایا جاتا ہے چاسر سے پیشتر انگریزی زبان پانچ چھ صدی سے رواج پا رہی تھی
لیکن اس عرصہ میں وہ برابر قالب بدلتی رہی اور مستقل صورت صرف چاسر کے زور قلم
نے پیدا کی چنانچہ اُسی زمانہ سے نثر کے ادوار قائم ہوئے اور مصنفین کی تعداد میں روز بروز
اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سچ ہے کہ زندہ زبانیں برابر بدلتی رہتی ہیں اور بدلتی رہینگی اور جو زبان
محدود دائرے میں بند ہو جاتی ہے وہ بہت جلد مردہ ہو جاتی ہے چنانچہ سنسکرت کی
مثال ہمارے سامنے موجود ہے تاہم دور قائم کرنے کے لیے زبان کی مستقل صورت کو
جو پہلے پہل اُسنے اختیار کی ہے پیش نظر رکھنا چاہیے پس ہم نے بھی اپنی زبان کی نثر کو
میر محمد عطا حسین خاں تحسین کے وقت سے ایک مستقل شکل میں پایا ہے اور اسی بنا پر اسی
زمانہ سے نثر کے ادوار قائم کیے ہیں۔

تاریخ زبان اُردو اور تذکرہ مصنفین اُردو میں بھی فرق ہے۔ بعض صاحب
دونوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور فوراً اعتراضات جڑ دیتے ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب کی
پہلی جلد میں "اُردو کی پیدائش" کے نام سے ایک باب تحریر کیا ہے اور اس میں دکھایا ہے
کہ کیونکر اختلاط الفاظ کی بنیاد پڑی اور کس طرح رفتہ رفتہ الفاظ کے اختلاط سے ایک

---

(۱) ماخوذ از شاعرانہ خیالات مترجمہ تمنا

دوسری زبان یعنی اُردو کی ابتدا ہوئی۔ یہ سچ ہو کہ شاہجہاں سے پہلے بھی وہ زبان جسکو ہم اُردو کہتے ہیں بولی جاتی تھی اور ظاہر ہو کہ آناً فاناً کوئی زبان عرصۂ وجود میں نہیں آسکتی تاہم شاہجہاں کے لشکر سے اس زبان کا منسوب ہونا اور اُردو کا نام حاصل کرنا ظاہر کر رہا ہو کہ اس وقت سے اس زبان کو زبان سمجھا جانے لگا اگرچہ فی الواقع یہ محض روزمرہ کی ضروریات کو ادا کرنے کے لیے زبان تھی ورنہ زبان سے جو آجکل مفہوم ہو اس سے کوسوں دور تھی اور ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں آج بھی صفر کے برابر ہو۔ البتہ اس کی روز افزوں ترقی سے امید ہو کہ جلد متمدن اقوام کی زبانوں کا مقابلہ کرسکے۔

بہرحال زبان اُردو کی تاریخ لکھتے وقت اُسکی پہلی شکل یعنی اختلاط الفاظ کا بیان کرنا اور بتدریج اُسکی ترقی اور نشوونما کا ذکر کرنا ضروری ہو جیسا کہ ہم نے اُردو کی پیدائش کے باب میں مختصراً کیا ہے لیکن تذکرہ مصنفین لکھتے وقت ہم اس زمانہ کے مصنفین سے ابتدا کرنے کے لیے مجبور ہیں جبکہ زبان نے پہلے پہل مستقل صورت اختیار کی۔ ہم ہرگز شیخ عین الدین گنج العلم سے اور اُنکے مابعد تحسین تک جو مصنفین گزرے ہیں اُن سے اُردو نثر کے ادوار قائم نہیں کرسکتے کیونکہ اُنکی دکنی اُردو دراصل اُردو ہی نہیں ہو ہمارے نزدیک تحسین سے پیشتر ایسی اُردو کا سراغ نہیں ملتا جسے بآسانی اُردو کہہ سکیں اور کھینچ تان کر کسی کتاب کو اُردو کی کتاب کہدینا اور بات ہو۔

یہ دوسری جلد جیسا کہ پیشتر عرض کیا جاچکا ہو عرصہ سے مسودہ کی صورت میں تھی اور اس کے کچھ اجزاء رسالہ اُردو اورنگ آباد دکن، رسالہ الناظر لکھنؤ اور جامعہ دہلی میں بھی چھپ چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء سے اسوقت تک مسودہ میں موجودہ حالت کے لحاظ سے کہیں کہیں تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں تاکہ کتاب اپنے

وقت اشاعت کی معلومات سے پیچھے نہ رہے۔

ہم ناظرین کی آگاہی کے لیے یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمنے جن کتابوں سے مدد لیکر یہ کتاب مرتب کی ہو، اکثر وہی عبارت اور وہی الفاظ قائم رکھے ہیں۔ البتہ اُن عبارتوں کو مختصر کر دیا ہو اور کہیں کہیں جہاں ضرورت ہوئی تبدیل کر دیا ہو یا اضافہ کر دیا ہو۔ بے شک مصنفین کی طرز تحریر یہ جہاں دوسروں کی راے نقل کی گئی ہو وہاں اپنی راے کے اظہار سے بھی گریز نہیں کیا گیا

اگرچہ ہم نے ایسے صحاب کے حالات جن کا ذکر اس کتاب کے متن میں آ گیا ہو حتی المقدور درج کرنے کی کوشش کی ہو لیکن بعض ایسے اشخاص بھی رہ گئے ہیں جن کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا یا تو اس وجہ سے کہ اُن کے ورثاء نے خاکسار کی تحریرات پر کچھ توجہ نہ فرما کر اُن کے حالات قلمبند کرنے میں تساہل و تکاہل کو دخل دیا یا خود اُن صاحبان نے اپنے آپ کو دو رسوم کے مصنفین کا حاشیہ نشین بھی ناپسند فرمایا

آخر میں ہم مسٹر سچدانند سنہا بیرسٹرایٹ لا پٹنہ بانی ہندوستان ریویو کلکتہ و سابق ممبر مالیات صوبۂ بہار و اوڑیسہ کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتے ہیں جنھوں نے دلی خلوص کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت میں سعی بلیغ سے کام لیا۔ اگرچہ

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

غازی آباد
۲۹ نومبر ۱۹۲۶ء

محمد یحییٰ تنہا

سیر المصنفین

اُردو کا عنفوانِ شباب

تیسرا دور

سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک



دوسرا دور ہنگامۂ مشرق یعنی غدر تک منتہی ہو جاتا ہے اور اس کے بعد تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دور دوسرے دور سے اس قدر چسپاں ہے کہ ایک کو دوسرے سے جُدا کرنا آسان نہیں ہے۔ بے شک ہر دور کی خصوصیات نمایاں ہیں لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں سنہ سے فلاں سنہ تک دورِ اوّل رہا اور اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا یا یہ کہ تیسرا دور ٹھیک غدر کے بعد شروع ہو گیا۔ دراصل مصنفین کی طرزِ تصنیفات کے لحاظ سے ہم نے یہ تین دور قائم کیے ہیں خواہ اُنھوں نے اپنی کتابیں کسی زمانہ میں کیوں نہ تصنیف کی ہوں۔ مثلاً سرسید تیسرے دور میں شمار کیے گئے ہیں حالانکہ اُن کی بعض تصنیفات مثل **آثار الصنادید** وغیرہ غدر سے پیشتر کی ہیں۔ اسی طرح اگرچہ منشی امیر احمد مینائی نے غدر کے بعد شہرت حاصل کی

اور اُن کی جس کتاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ غدر کے بہت بعد کی تصنیف ہے لیکن اُن کو دوسرے دور کے زمرۂ مصنفین میں جگہ دی گئی ہے کیونکہ **انتخاب یادگار** کی زبان بالکل **فسانۂ عجائب** جیسی ہے۔ پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے قائم کردہ دور فی الواقع ایک سنہ سے شروع ہو کر دوسرے سنہ پر ختم ہو جاتے ہیں اور اُن میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ہاں مطالب کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے اور آسانی کی غرض سے یہ دور قائم کر دیے گئے ہیں۔ ممکن ہے دو چار سال کا اِدھر اُدھر پھیر ہو لیکن یہ بے دغدغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان کی تصنیفات ضرور تین زمانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ اور تین سے زیادہ یا تین سے کم دور قائم نہیں کیے جا سکتے۔

چوتھا دور دورِ حاضر ہے اور اِس عہد کے مصنفین کے حالات کسی آیندہ زمانہ میں شرح و بسط کے ساتھ لکھنا بہتر ہوگا۔ اس وقت اُن کے حالات پر خامہ فرسائی قبل از وقت ہے پس ہم نے تیسرے دور کو ہنگامۂ مشرق یعنی واقعہ ۱۸۵۷ء کے اختتام سے شروع کیا اور ہنگامۂ مغرب یعنی جنگ یورپ کے آغاز پر ختم کیا ہے۔

اگرچہ اِس ملک میں انگریزی سلطنت ۱۸۵۷ء سے بہت پیشتر قائم ہو چکی تھی اور مغلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا لیکن بہادر شاہ کا لال قلعہ میں برائے نام تختِ سلطنت پر متمکن نظر آنا مسلمانوں کے دماغ سے بوئے سلطنت نہیں نکلنے دیتا تھا جب ۱۸۵۷ء کے فتنہ کے بعد ہی اُن کی آنکھوں کے سامنے خاندانِ مغلیہ پر تباہی آئی اور سیکڑوں رؤسا اور امرا کے گھرانے تباہ و برباد ہو گئے اور اسلامی سلطنت کا نام و نشان تک مٹ گیا اور مسلمانوں کو فرمانروائی کا بارِ گراں سر سے اُتار کر حکومت کا بھاری طوق گردن میں ڈالنا پڑا تو اُن کی کچھ آنکھیں کھلیں لیکن جو لوگ ڈیڑھ صدی پیشتر سے خوابِ غفلت کی میٹھی نیند سو رہے تھے وہ یک بیک اپنی سستی اور کاہلی کو خیرباد کہہ کر کس طرح میدانِ عمل میں دوڑ دھوپ لگا سکتے تھے۔

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

چنانچہ زمانہ کی رفتار سے مسلمانوں کی بیگانگی اور عدم توجہی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ وہ اب تک بھی اپنے آپ کو اپنے خیالِ خام میں ہیچمدان دیگرے نیست سمجھتے رہے اور اُن کا یہ نشہ انیسویں صدی کے اختتام تک باقی رہا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد چند اصحاب ایسے بھی نکلے جن پر اُن دردناک مصائب و آلام کا جو خود اُن پر اور اُن کے بھائیوں پر گذرے کافی اثر ہوا اور انھوں نے قومی مصیبت و فلاکت کا احساس کر کے دل میں ٹھان لی کہ جس طرح ہو قوم کی خدمت کرنی چاہیے اور اس کو قعرِ مذلت سے بچانا چاہیے۔

یہ حالات تھے جنھوں نے ہمارے اُردو لٹریچر میں **قومی ہمدردی کا باب** کھولدیا اور سرسید کے قلم سے بہترین مضامین لکھوائے اور اُن کی زبان سے عمدہ تقریریں کرائیں۔ اور مولانا حالی سے مسدس مدوجزرِ اسلام اور قومی نظمیں لکھوائیں

دوسرا سبب یہ ہوا کہ انگریزی حکومت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ جانے سے طبعاً انگریزوں کی ہر بات کی تقلید کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ انگریزی علوم کی طرف بھی لوگوں کا میلانِ خاطر ہوا اور **انگریزی زبان کی تقلید میں ہر علم و فن کی کتابیں لکھنے کا خیال** روز بروز ترقی پاتا رہا۔

تیسرا سبب یہ ہوا کہ بعض کتابیں **ضروریاتِ زمانہ** کے پورا کرنے کی خاطر لکھی گئیں۔ اور یہ ضرورتیں انگریزی حکومت نے بیش از پیش پیدا کر دیں

چوتھا سبب یہ ہے کہ **مطبع کے عام رواج** نے کتابوں کی توسیع اشاعت میں بہت مدد دی اور اکثر کتابیں تجارتی اصول پر بھی لکھی گئیں۔

غرض یہ اسباب تھے جنھوں نے تیسرے دور کا قابلِ قدر لٹریچر پیدا کر دیا اور اُردو کو ایک زبان کا درجہ بخشدیا۔

تیسرا دور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ اگر پہلے دو دور کا حال نظر انداز کر جائیں یا ۱۷۹۸ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تصنیفات صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائیں تو ہماری زبان کے ادبی سرمایہ میں خشخاش کے دانہ کی برابر بھی کمی محسوس نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ مرزا غالب کے خطوط اگر دوسرے دور کی تصنیفات میں شمار کیے جائیں جیسا کہ ہم نے کیا ہے تو ضرور اُن کی گم شدگی ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ لیکن مرزا کے خطوط غدر کے بہت بعد شایع ہوے ہیں اس لیے ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان کے لیے سرمایۂ ناز و افتخار ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کی تصنیفات ہیں۔ البتہ یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ پہلے دو دور کی تصنیفات اُردو زبان کی عمارت کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر بنیاد کوئی عمارت قائم نہیں ہو سکتی۔

تیسرا دور نہ صرف اپنے ماسبق دو دوروں سے گوے سبقت لے گیا ہے بلکہ اب امید نہیں کہ ایسا شاندار، عظیم الشان اور مختلف النوع دور ہماری آنکھوں کے سامنے قائم ہو۔ یہ ممکن ہے کہ تصنیفات کی تعداد روز افزوں ہو اور مصنف بھی کثرت سے پیدا ہوں لیکن یہ بزرگ صورتیں جنکو زمانہ مٹا چکا ہے اب دوبارہ نظر نہیں آئینگی اور وہ جدت اور خوبی زبان اور وہ تلاش و تحقیق و تدقیق جو ان صاحبان کی تصنیفات میں پائی جاتی ہیں نہیں دکھائی دینگی۔

یارب زمانہ مجکو مٹاتا ہے کس لیے　　لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

چوتھا دور جس کا آغاز ہم ۱۹۱۴ء سے بتاتے ہیں دراصل ترجمہ کا دور ہے اگرچہ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے آغاز سے یا اس سے کچھ قبل شروع ہو گیا ہے لیکن آجکل زیادہ زوروں پہ ہے اور اسی بنا پر دور حاضر کو ہم ۱۹۱۴ء ہی سے شروع کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا حالی اور مولانا شبلی جو تیسرے دور کے

مصنفین میں اعلیٰ پایہ کے ہیں ابھی سنہ میں ہم لوگوں کو داغ مفارقت دے گئے ہیں
اور اُن کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ تیسرا دور ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مولوی عبدالحلیم
شررؔ جنکا شمار تیسرے دور کے مصنفین میں ہے سنہ ۱۹۲۶ء تک اپنی تصنیفات سے
برابر ہم لوگوں کو محظوظ فرماتے رہے اور اُردو زبان کے ناولوں اور تاریخ میں اضافہ
کرتے رہے لیکن اس سے تیسرے دور کی مدت کے تعین میں کوئی دقت نہیں ہوتی
کیونکہ آپ کی جملہ تصنیفات جو سنہ ۱۹۱۴ء سے قبل کی ہیں، اُن میں اور مابعد کی تصنیفات
میں کوئی مابہ الامتیاز فرق نہیں۔ سب ایک ہی زنجیر کی کڑی معلوم ہوتی ہیں۔

تیسرے دور سے اُردو کا عنفوان شباب شروع ہوتا ہے اور عالم طفولیت
ختم ہو جاتا ہے۔ اب اُردو زبان جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش
کرتی ہے اور جس طرح ایک نوجوان اظہار مطالب کسی بچہ کی نسبت بہتر طور پر کر سکتا
ہے یہی حال ہماری زبان کا ہو گیا ہے، اگرچہ اُس کو علمی اور سائنٹفک مضامین
کے اظہار پر پوری قدرت حاصل نہیں ہوئی لیکن وہ بطرز احسن اُن کو ادا کرنے کی
سعی بلیغ کر رہی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوتی جا رہی ہے۔ حکیم
ہربرٹ اسپنسر کی فلسفیانہ کتب کا ترجمہ اُردو میں مشکل اور سخت مشکل ہے
چنانچہ جب مولانا شبلی مرحوم نے ڈاکٹر **اقبال** سے دریافت کیا کہ حکیم موصوف کی
فلسفیانہ کتب کا ترجمہ اردو میں ہونا ممکن ہے یا نہیں تو انھوں نے نفی میں جواب دیا
لیکن ڈاکٹر موصوف نے جب حکیم ہربرٹ اسپنسر کی کتاب ایجوکیشن کا
ترجمہ جو مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی نے کیا ہے دیکھا تو انھوں نے
اپنی پہلی رائے بدل دی اور کہا کہ بلاشبہ حکیم ممدوح کی کتابوں کا ترجمہ بھی اُردو میں
کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مترجم دونوں زبانوں پر کامل قدرت رکھتا ہو۔

فی الحقیقت ہر زبان کی ترقی اور وسعت ترجموں پر منحصر ہے جسقدر علوم و فنون

کی کتب کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا جائے گا زبان وسیع ہوتی جائے گی اور اہل زبان علوم جدیدہ سے واقف ہوتے جائیں گے۔ عربی زبان میں جب تک لاطینی اور یونانی اور عبرانی کتب سے ترجمے نہیں کیے گئے کچھ اضافہ نہ ہوا اور نہ عربوں کی سلطنت میں شائستگی اور تمدن کا دور رہا۔ فتوحات کے بعد تہذیب کا دور شروع ہوتا ہے اور عربوں کا یہ دور، دور عباسیہ ہے جبکہ ہزاروں کتابیں دیگر ممالک سے اونٹوں پر لدکر آتی تھیں اور ترجمہ ہوتی تھیں۔ بقول مولانا حالی

یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم — کہ ہو جیسے مجروح جویائے مرہم
کسی طرح پیاس اُن کی ہوتی نہ تھی کم — بجھاتا تھا آگ اُن کی باراں نہ شبنم

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لد کر
چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن — پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جنکے اب تک مزین — کتب خانۂ پیرس و روم و لندن

پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

اس دور میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی، تاریخی، تمدنی غرضکہ ہر قسم اور ہر نوع کی کتابیں لکھی گئیں۔ اس عہد کے لکھنے والوں کی تعداد بھی معتد بہ ہے اگرچہ وہ مصنفین جنکو ہم نے لیا ہے ایک عشرہ سے زائد نہیں ہیں لیکن دوسرے درجہ کے مصنفین کی تعداد کسی طرح ایک ربع صدی سے کم نہیں۔ اگر ہزار ہا نہیں تو سیکڑوں کتابیں بلاشبہ اس دور میں لکھی گئی ہیں جو اعلیٰ سے لیکر ادنی درجہ تک کی ہیں۔

رفتار زمانہ سے ضرور امید ہے کہ اُردو زبان روز بروز ترقی کرتی جائیگی اگرچہ بعض تنگ خیال اصحاب اُردو کے مخالف نظر آتے ہیں لیکن انکی مخالفت سے سود

ثابت ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ شروع سے آج تک ہمیشہ اس کی عام فہمی اس کے رواج کی سفارش کرتی رہی ہے بشرطیکہ اس کے نادان دوست اس کا معیار بلند کرنے کے خیال سے اس کو اس صفت سے معریٰ نہ کردیں جیسا کہ دورِ حاضر کی بعض تصنیفات کو دیکھکر اس کے محبانِ صادق کو یہ خیال پیدا ہو چلا ہے۔

اس عہد کے سرتاج یا امام سرسید احمد خاں ہیں جنکی تحریرات نے اُردو کے قالب بیجان میں جان ڈالدی۔ اُن کی کتاب آثار الصنادید کسی یورپی تصنیف سے کم پایہ نہیں جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس وقت غالبًا فوٹو کا رواج نہ تھا یا وہ اس قدر گراں تھا کہ سرسید اس کے صرف کے متحمل نہ ہو سکتے تھے ورنہ وہ عمارات کے فوٹو لیتے اور اپنی کتاب میں چھاپتے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر عمارات کے کتبوں اور اُن کی پیمائش کو صحیح صحیح تحریر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب غدر سے پہلے شائع کی گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کا دماغ فطرتًا صحیح اور عمدہ باتوں کے قبول کرنے کے لیے موزوں ہوا تھا سفر انگلستان نے صرف جلا کردی۔ اسی کتاب کی بدولت سرسید کو انگلستان پہونچکر وہ وہ اعزاز اور خطاب حاصل ہوے جنکا اُن کو وہم وگمان بھی نہ تھا اور اہل یورپ نے اس کتاب کی کماحقہ قدر کی اور داد دی۔ اخبار نویسی مضمون نگاری اور مدلل بحث و تقریر کرنا دراصل سرسید نے ہم سب لوگوں کو بتایا ورنہ اُردو زبان ان ضروری اور اہم اصناف سے محروم رہتی۔

آزاد نے اُردو نثر کو نظم کا ہمپایہ بنایا۔ جو کچھ لکھا تلاش و تحقیق سے لکھا۔ تشبیہ و استعارات کو موزوں طریقہ سے برتا۔ انگریزی خیالات کو اُردو کا دلفریب جامہ پہنایا گویا یہ کتابیں ہیں کہ ہنستی بولتی تصویریں ہیں۔ جو خیالات ہیں بلند و ارفع اور رجحانات سے دلفریب و دلچسپ۔

مولوی نذیر احمد نے محاورات اور روزمرہ کو اس نہج پر استعمال کیا کہ اُن کا

اندازِ تحریر خاص ہو گیا۔ اگرچہ بعض مقامات پر موٹے موٹے عربی الفاظ بھی آ جاتے ہیں لیکن اُن کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس طرح لکھتے ہیں کہ مطالب کتاب پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں بلکہ کالنقش فی الحجر بن جاتے ہیں۔

مولوی چراغ علی مذہبی مضامین و کتب کے مصنف ہیں۔ آپ کی تصنیفات مدلل اور جامع و مانع ہوتی ہیں۔ متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس عنوان پر لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں اور تحقیق و جستجو کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔

مولوی ذکاء اللہ طرزِ تحریر کے لحاظ سے کوئی خوبی نہیں رکھتے۔ البتہ اُن کی کتابوں میں معلومات کا ذخیرہ دفن ہے اور مختلف مضامین پر اُن کی تصنیفات ہونے نے اُن کو اردو کا سچا بہی خواہ اور محسن قرار دیا ہے۔

مولانا حالی فنِ تنقید کے بادشاہ ہیں اور سوانح عمری لکھنے میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ طرزِ عبارت سادہ اور مؤثر ہے۔ مبالغہ سے پاک ہے اور واقعیت سے وہ کبھی تجاوز نہیں کرتے۔ تعریف ہے تو حدود کے اندر، اور اعتراض ہے تو صحیح۔ نہ اُستادی کا خیال ہے نہ دوستی کا، نہ بزرگی کا خیال ہے نہ پبلک کے مذاق کا بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف صاف بے کم و کاست کہتے ہیں اور کبھی بیجا طور پر نکتہ چینی نہیں کرتے اور واقعی نقائص کے دکھلانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔

مولوی شبلی ایک مؤرخ اور بے مثل مؤرخ ہیں۔ اگرچہ اُن کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے لیکن تاریخی رنگ نمایاں اور ممتاز ہے۔ عبارت صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ الفاظ مؤثر اور دلکش ہوتے ہیں۔ اپنے ممدوح کی تعریف خوب کرتے ہیں اور اگرچہ آپ کا ممدوح اکثر صفات سے متصف ہوتا ہے تاہم وہ انسان ہے اور اُسکے نقائص کا اظہار بھی تاریک پہلو پر روشنی ڈالتا تو اس کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔

ڈاکٹر سید علی بلگرامی ترجمہ کے اُستاد ہیں۔ اُن کا انتخاب بھی لاجواب ہے تمدن عرب اور تمدن ہند دونوں کتابیں مشہور و مقبول ہو چکی ہیں اور کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں عبارت رنگ آمیزی سے پاک ہے اور اس قدر مرغوب و دلنشیں ہے کہ انکی کتابوں پر ترجمہ کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

سرشار کا قلم ظرافت کے موتی ٹپکاتا ہوا چلتا ہے۔ اگرچہ فسانۂ آزاد پڑھنے کے بعد اُن کی ہر کتاب میں وہی طرز خاص پایا جاتا ہے تاہم جو کچھ لکھا ہے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ قلم برداشتہ لکھنا ہنسی کھیل نہیں اور اُن کی بہترین تصنیف یعنی فسانۂ آزاد اسی تیز قلمی کا نتیجہ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ طرز تحریر سے اُن کو کوئی شخص ہندو نہیں کہہ سکتا بلکہ لطف یہ ہے کہ اُن کے الفاظ اور مسلمانوں کے بارہ میں اُن کی معلومات اُن کو مسلمان کہنے پر مجبور کرتی ہیں۔

شرر کا طرز تحریر متانت آمیز ہے۔ اُن کے ناول دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں عبارت کا انداز علمی کتابوں کے لیے بھی موزوں ہے۔ مگر اکثر تاریخی ناول فرضی افسانے ہیں اور دو چار باتوں کے سوا قصے کی تمام جزئیات تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔

بہر حال یہ مصنف اس درجہ اور اس پایہ کے ہیں کہ ہر زبان کے لیے باعث افتخار ہو سکتے ہیں۔ اِن کی تصنیفات دوسری زبانوں کی تصنیفات کے مقابل پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کے کلام سے دوسری زبانوں کو مالامال کیا جا سکتا ہے۔

افسوس کہ اب ان کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا۔ اگرچہ دنیا روبہ ترقی ہے اور ہم ہرگز مایوس نہیں کہ آیندہ زمانہ میں ایسے قابل اور لائق مصنف پیدا نہ ہوں گے۔ نہیں ضرور پیدا ہونگے اور خدا کرے کہ وہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوں لیکن فی الحال امید نہیں کہ ہماری زندگی میں کوئی ایسا عالی دماغ مصنف پیدا ہو جو ان بزرگوں کی ہمسری کر سکے۔ چوتھا دور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ترجمہ کو چھوڑ کر تالیفات

وتصنیفات اگرچہ تعداد میں سیکڑوں ہوں لیکن مشکل سے دو چار کتابیں ایسی نکلیں گی جو
اُردو لٹریچر میں داخل ہونے کی عزت حاصل کر سکیں۔

اگرچہ اس دور میں صرف چیدہ چیدہ مصنفین کا ذکر خیر کیا گیا ہے لیکن
اس زمانہ کی حسب ذیل کتب بھی قابل الذکر ہیں افسوس کہ ہندوستان
بظاہر ان کتابوں کے وجود سے محروم ہے اور انڈیا آفس لائبریری لندن ان کے
موجود ہونے پر جسقدر فخر کرے وہ کم ہے۔ ممکن ہے بعض صاحب کے کتب خانوں
کو یہ کتابیں زینت دے رہی ہوں اسلیے بادب التماس ہے کہ ناظرین حضرات ان
کتابوں کے بعض بعض مقامات کی نقل اور مصنفین کے حالات جسقدر مل سکیں
بھیجدیں تاکہ آیندہ ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کر دیا جاے۔

فن زراعت

۱- علم الفلاحت از البرٹ اسکاٹ براؤن صفحات ۲۵۲، علی گڑھ ۱۸۶۵ء
۲- علم الفلاحۃ، میجر کاربرٹ الہ آباد ۱۸۶۹ء
۳- تجربۂ ملخ از غلام نبی میرٹھ ۱۸۶۵ء

کتب حکمت

۱- علم تعمیر- کالی پرستا اور سید علی، ۱۸۷۳ء پٹنہ

جغرافیہ

۱- ترجمۂ مراصد الاطلاع (عربی) در اُردو- عبد المومن ۱۸۶۱ء پورٹ بلیر ۳ جلد
۲- مختصر بیان جغرافیہ ہند- پنڈت چنتامنی، کانپور ۱۸۶۷ء

طبعیات

۱۔ دائرۂ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کرم بخش، لکھنؤ ۱۸۶۶ء

معاشیات

۱۔ اصول سیاست مدن، دھرم سبھا، علی گڑھ ۱۸۶۹ء
۲۔ علم انتظام مدن ترجمہ انگریزی ناسو ولیم سینیر، علی گڑھ ۱۸۶۴ء

علم المعاشرت

۱۔ دستور عمل امورات شادی و غمی از چراغ شاہ ملتانی ۱۸۶۸ء
۲۔ اشتہار کمیٹی در باب تخفیف مصارف شادی، آگرہ ۱۸۶۸ء
۳۔ ترمیم ضوابط شادی آگرہ ۱۸۶۸ء
۴۔ ضوابط شادی آرہ ۱۸۶۸ء
۵۔ 〃 〃 ۱۸۷۳ء

منطق

۱۔ میزان العلوم از سید عبد العلی پٹنہ ۱۸۶۹ء
۲۔ خلاصۃ المنطق، دیوی پرشاد بدایوں ۱۸۶۹ء

سر سیّد احمد خاں(۱)

تاریخ ولادت سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ وہ حسینی سید تھے **اور خاندان** اور اُن کے آباء و اجداد وطن چھوڑ کر پہلے **دامغان**(۲) میں آباد ہوئے اور پھر ہرات میں اُنھوں نے مستقل سکونت اختیار کی۔ ہندوستان میں اُن کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں آئے تھے اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانہ تک وہ شاہان مغلیہ کی مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔

سید احمد خاں کے والد میر متقی تیراکی اور تیراندازی میں صاحب کمال تھے۔ اکثر مرشد زادے اور شریف زادے اِن دونوں فنوں میں اُنکے شاگرد تھے۔ چنانچہ سید احمد خاں نے بھی تیراکی اور تیراندازی اپنے والد ہی سے سیکھی تھی۔ چونکہ میر متقی ایک آزاد منش آدمی تھے اس لیے سید احمد خاں میں بھی یہ اثر مرتے دم تک باقی رہا۔

سید احمد خاں کے نانا خواجہ فریدالدین احمد تھے جن کا شاہی خطاب دبیر الدولہ امین الملک تھا اور وہ صاحب علم و فضل تھے، خاصکر ریاضیات میں وحید عصر تھے سید احمد خاں کی والدہ کا نام عزیز النساء بیگم تھا اور اِن نیک بی بی نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت خود کی تھی۔ سرسید خود فرمایا کرتے تھے کہ میری سرگذشت کے لیے یہ ایک شعر کافی ہے :-

طفلی و دامان مادر، خوش بہشتے بودہ است ۔۔۔ چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

سرسید کی والدہ اگرچہ سرسید کی والدہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور انھوں نے **کا حال** فارسی کی دو چار ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں لیکن اُن میں اولاد کی

---

(۱) سرسید احمد خاں کے حالات "حیات جاوید" مصنفہ شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی سے ماخوذ ہیں۔

(۲) دامغان ایران کا ایک قدیم مشہور شہر ہے۔

تربیت کا خاص ملکہ تھا۔ وہ اپنے بچوں پر خفا تو ہوتی تھیں لیکن اُن کو کبھی مارتی نہیں تھیں
اپنے پُرانے اور بڈھے نوکروں کی تذلیل اپنے بچوں سے نہیں دیکھ سکتی تھیں اور اُن کو
بُرا بھلا نہیں کہنے دیتی تھیں۔ جب سرسید کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا تو انھوں نے
اپنے بیٹے کے مرنے کا صرف تین روز غم کیا اور چوتھے دن ایک رشتہ دار کے
یہاں خود پہنچ گئیں جن کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی اور وہ اس سانحۂ غم کی وجہ
سے شادی ملتوی کرنے والے تھے انھوں نے اُن سے اصرار کیا کہ وہ شادی کی تاریخیں
بدستور قائم رکھیں۔ وہ اپنی آمدنی میں سے پانچ فی صدی نیک کاموں میں صرف کرتی
تھیں۔ اُن کی امداد سے کئی نوجوان لڑکیوں کا نکاح ہوا۔ وہ اکثر پردہ نشین عورتوں کی
پوشیدہ خبر گیری کرتی تھیں۔ غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خاندانوں کی بیوہ
جوان لڑکیوں کو نکاح ثانی کی نصیحت کرتی تھیں اور دوسرے نکاح کو بُرا سمجھنے
والوں سے نفرت کا اظہار کرتی تھیں۔ غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور
خفیہ یا کسی حیلہ سے اُن کی امداد کرتیں۔ بعض رشتہ دار مردوں نے ایسی عورتوں
سے نکاح کر لیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر وہ اُن کے گھر برابر جاتیں اور اُن
کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔ انھوں نے خود کبھی کوئی منت یا نذر و نیاز
نہیں مانی۔ تعویذ یا گنڈے پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر ان کو مطلق
اعتقاد نہ تھا۔ جب سرسید دلّی میں منصف تھے تو ان کی والدہ کی ہمیشہ یہ نصیحت تھی
کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضرور ہے، وہاں کبھی سواری پر اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ
کا کچھ اعتبار نہیں۔ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اُسکو نباہ سکو
سرسید کی والدہ جیسی سمجھدار اور دانشمند تھیں، اُس سے زیادہ نیکدل اور پاک سرشت
تھیں۔ مسماۃ زینب ایک لاوارث بڑھیا تھی وہ اُسکی خبر گیری کیا کرتی تھیں۔
اتفاق سے سرسید کی والدہ اور زینب دونوں ایک ہی مرض میں ایک ساتھ بیمار ہوئیں

حکیم نے سرسید کی والدہ کے لیے ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا تجویز کیا۔ سرسید کی والدہ نے وہ معجون تیار کرا کر تمام وکمال زیبن کو کھلا دی۔ زیبن کو اس سے بہت فائدہ ہوا لیکن خدا کی قدرت سے سرسید کی والدہ بھی اس معجون کے استعمال کے بغیر اچھی ہو گئیں جب سرسید صدر امین تھے تو انھوں نے ایک شخص کے ساتھ کچھ سلوک کیا تھا اور اسکو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا مگر ایک مدت کے بعد اس نے درپردہ سرسید کے ساتھ برائی کرنی شروع کی اور مدت تک اُن کی شکایت کی گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا آخر تمام وجہ ثبوت جس سے اُسکو کافی سزا مل سکتی تھی سرسید کے ہاتھ آ گئی اور اتفاق سے اُس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اُسکے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ سرسید کے نفس نے اُن کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ جب اُن کی والدہ کو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے سرسید سے کہا کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو، اور اگر بدلہ ہی لینا چاہتے ہو تو اس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلہ دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے اُنکے اس کہنے کا سرسید پر ایسا اثر ہوا کہ اس دن سے مرتے دم تک کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال بھی نہ آیا۔

ہم نے سرسید کی والدہ کے حالات مجملاً یہاں اس وجہ سے بیان کیے ہیں کہ ہمارے ناظرین بخوبی سمجھ لیں کہ سرسید کی والدہ کس طبیعت اور مزاج کی تھیں کیونکہ سرسید کی آیندہ زندگی کا دارومدار اُن کی والدہ ہی کی تربیت پر تھا اور یہ اعلیٰ تربیت ایسا عمدہ نتیجہ پیدا کرنے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ نپولین اعظم ہمیشہ اپنی عظمت کو اپنی مادر مہربان ہی کی تربیت کا نتیجہ کہا کرتا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مائیں جو کچھ کر سکتی ہیں وہ اعلیٰ سے اعلیٰ کالجوں کی تعلیم نہیں کر سکتی۔

سید احمد خاں کا بچپن سید احمد خاں اپنے خاندان کے بچوں کی نسبت زیادہ قوی

توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندرست پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کیا کرتے تھے کہ جب اُن کے نانا کلکتہ سے دلی میں آئے اور اُن کو پہلے ہی بار دیکھا تو یہ کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے"

جیسے بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طباع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں سرسید میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی۔ اس سے بعض حکما کی اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے کہ محنت سے آدمی جو چاہے کر سکتا ہے۔

بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں اُن کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمھارا جی چاہے، شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو

سرسید اپنے کھیل کود کے زمانہ میں بہت مستعد اور چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جو استنجا کر رہا تھا، چپکے چپکے اس کے پیچھے جا کر چت کر دیا۔ اُس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لیکر اُن کے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر وہ بچ بچ گئے۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔ اسیطرح ایک بار وہ شطرنج کھیلتے میں ایک اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑے۔ اُن کے مُکے سے اُن کے ہاتھ کی اُنگلی اتر گئی اور کئی دن بعد اچھی ہوئی۔ ہمیشہ یونہیں لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔

سرسید خود بھی تیرتے تھے اور تیرنے والوں کے جلسوں میں بھی جو بہت

دلچسپ ہوتے تھے شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح تیراندازی کے جلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی سے جا کر بیٹھا تو اُن کے والد بہت خوش ہوئے اور کہا "مچھلی کے جائے کو کن تیرائے"

بسم اللہ کی تقریب حضرت شاہ غلام علی صاحب کے سامنے سرسید کی بسم اللہ ہوئی۔ جب شاہ صاحب نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم تو سید احمد خاں کچھ نہ بولے اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ انھوں نے اُن کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھکر پڑھیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اول بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اول آتیں مالم یعلم تک پڑھیں اور وہ بھی اُن کے ساتھ ساتھ پڑھتے گئے۔ سرسید اپنی بسم اللہ کی تقریب کا ذکر کر کے بطور فخر اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا پڑھا کرتے تھے۔

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی ز فیض نقشبند وقت جان جان جانانی

اس شعر میں شاہ غلام علی صاحب کی طرف اشارہ ہے جو مرزا **مظہر جانِ جاناں** کے مُرید تھے۔

سرسید کی تعلیم بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا قرآن ختم کرنے کے بعد **مولوی حمید الدین** سے معمولی کتابیں کریما، خالق باری اور آمدنامہ وغیرہ پڑھیں۔ فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں **شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی**، مختصر معانی اور مطول ما اقلت تک پڑھی۔ مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد ان کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں

تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیئات میں شرح چغمینی تک، اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں) پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی۔ کیونکہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہوگیا تھا اور اسکے متعلق چند رسالے پڑھے۔ اسی زمانہ میں طب پڑھنے کا شوق ہوگیا حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے، طب کی ابتدائی کتابیں مثل قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک اُن کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا جب اُنھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے، اُس وقت اُن کی عمر اٹھارہ، انیس برس کی تھی اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا۔ اور دلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب، اور آزردہ وغیرہ اُن سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ۱۸۴۶ء میں جب وہ فتحپور سیکری سے بدل کر دلی کی منصفی پر آئے اسوقت انھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی۔ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیا ہوگئی تھیں ان کو از سر نو غور اور توجہ سے پڑھا مولوی نوازش علی مرحوم سے پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری شرح وقایہ، اور اصول فقہ میں شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقالے اور سبعہ معلقہ کے قصیدے پڑھے۔ اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے حدیث پڑھنی شروع کی مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ جیساکہ

سرسید خود اقرار کیا کرتے تھے کہ اُستاد سے اُنھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔

عنفوانِ شباب سرسید کا عنفوانِ شباب نہایت زندہ دلی اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔ وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور تماشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے وہاں جاتے تھے خود اُن کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر چونسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلا ہوتا تھا، اس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔

سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے، جوانی میں اُس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی اُن کی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوائف **شیریں جان** نامی نہایت حسین تھی مگر سنا ہے کہ اُس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لیے آئی تھی، سرسید بھی موجود تھے اُن کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اُس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش بسیار تلخ ست" سرسید نے یہ مصرع پڑھا "گرچہ تلخ ست لیکن بر شیریں دارد"۔ غالباً یہ وہی **شیریں** ہے جسکی نسبت عبداللہ خاں **اوج** نے جب وہ حج کو چلی یہ شعر کہا تھا۔

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلی حج کو چلی   مثل ہے تو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

اگرچہ سرسید سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ ان صحبتوں کے اثر سے اپنے تئیں نہ بچا سکے۔ جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ باوجود غایت دلبستگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی۔ سرسید نے جس

حیرت انگیز طریقے سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ گویا یہ شعر اس وقت ان کے حسب حال تھا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں — جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

سرسید کے بھائی کا یہ قول تھا کہ "کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو اگر سید وہاں نہ ہو تو مجھکو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے" ایسا ہی حال سرسید کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بھائی کے مرتے ہی اُن کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اُچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع میں جو اُسوقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا سر گھٹوا لیا، داڑھی چھوڑ دی، پائچے متشرع کر لیے، کرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسان کا سمجھا جاتا تھا اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کے لیے اس مرحلے کا طے کرنا نہایت ضرور ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

لور و جنت جلوہ بر زاہد کند در راہ دوست — اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

سرسید نے بھی اپنی ایک تحریر میں اس نوجوانی کی لغزش کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قوم کی غفلت و بدمستی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ہم بھی اُسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رومی سے بڑھکر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار۔"

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی ہیں مری نگاہ میں ہر رند و پارسا ایک

ملازمت ۱۸۳۸ء میں جبکہ سرسید کے والد کا انتقال ہوا، اُن کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی۔ چونکہ قلعہ کی آمدنی میں سے کچھ قدر قلیل تو سرسید کی والدہ کے نام جاری رہا باقی سب تنخواہیں بند ہو گئیں۔ اس لیے سرسید کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں سے اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے عدالت کی کارروائی سے اطلاع حاصل کرنی چاہی۔ اُن کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس وقت دلی میں صدر امین تھے۔ اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں اُن کو کام سیکھنے کی اجازت دیں۔ انھوں نے خوشی سے اجازت دیدی اور سرسید نے وہاں کام سیکھنا شروع کیا۔ چند مہینے اُن کو کام سیکھتے گزرے تھے کہ مولوی خلیل اللہ خاں نے اُن کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جو فیصلہ کے لیے صدر امینی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ سرسید کو اس کام پر بہت دن نہ گزرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو بعد میں سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلی میں جج ہو کر آئے سرسید کو وہ پہلے سے جانتے تھے اس لیے یہ اُن سے ملنے کو گئے اور نوکری کی درخواست کی۔ انھوں نے ان کو عدالت سشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن سرسید نے اس کام کو مشکل جان کر انکار کیا۔ ہر چند صاحب جج نے بہت اصرار اور دلدہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے ہم تم سے بسہولت کام لینگے اور ہر ایک بات بتاتے رہینگے مگر سرسید نے کہا کہ جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اس کو کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ غرضکہ بدستور صدر امینی میں کام کرتے رہے پھر مسٹر ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہو گئے اور سرسید کو وہاں بلا کر فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہوا اُسپر مقرر کر دیا۔

یہاں سرسید نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کرلی اور ترتیب دفتر کا ایک دستورالعمل بنایا جس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا گیا۔ انھیں دنوں میں اُنھوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی تھی جسکا نام جام جم رکھا تھا اور جو ۱۸۴۰ء میں چھپکر شائع ہوئی تھی۔ اس میں امیر تیمور صاحبقراں سے لیکر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا ہے۔

عہدہ منصفی کا امتحان اسی زمانہ میں انھوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدہ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ ہو۔ جب وہ خلاصہ تیار ہوچکا تو صاحب کمشنر نے اس کو گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسید کے لیئے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے اسپر یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو سید احمد خاں کو اُسپر مقرر کیا جاے لیکن ابھی اُن کو یہ عہدہ ملنے نہ پایا تھا کہ عہدہ منصفی کے لیے قواعد امتحان جاری ہوگئے۔ صاحب کمشنر نے ان کو امتحان دینے کی ہدایت کی۔ انھوں نے امتحان کی تیاری کی اور پہلی ہی بار امتحان دے کر ڈپلوما حاصل کیا۔

امتحان کے بعد سرسید نے وہ خلاصہ چھپایا جو انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لیے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبہ میں شائع ہوگیا۔ لوگوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے امیدوار اسی کی بدولت منصف ہوگئے۔

منصف مقرر ہونا دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور ۲۴ دسمبر کو وہ مین پوری کے منصف مقرر ہوگئے۔ مگر ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو مین پوری سے تبدیل ہوکر فتحپور سیکری میں آگئے۔ اور چار برس تک وہاں منصف رہے۔

رسائل مذہبی وغیرہ اس زمانہ میں سرسید نے تین رسالے تالیف کیے۔

(۱) جلاء القلوب بذکر المحبوب مؤلفہ ۱۲۵۵ھ ہجری۔ یہ مختصر رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کے بیان میں ایسے لکھا تھا کہ مولود کی مجلسوں میں جتنے رسالے شائع تھے ان میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں۔ سرسید نے اسی زمانہ میں اُس زمانہ کے خیالات کے موافق محض صحیح روایتوں پر اکتفا کیا تھا (۲) تحفۂ حسن مؤلفہ سنہ ۱۲۶۰ھ ہجری۔ یہ ترجمہ ہے تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم اور باب دوازدہم کا، باب دہم میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبر پر کرتے ہیں مع اُن کے جوابات کے مذکور ہیں اور باب دوازدہم میں تولا اور تبرا کا بیان ہے (۳) تسہیل فی جرالثقیل مطبوعہ سنہ ۱۸۴۴ء یہ اُردو ترجمہ ہے بوعلی نام ایک عالم کے ترجمۂ فارسی موسوم بہ معیار العقول کا جو ابو علی کے عربی رسالہ سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس رسالہ میں مصنف نے جرثقیل کے پانچ اصول بیان کیے ہیں۔

خطاب بادشاہی اسی زمانہ میں بہادر شاہ نے سرسید کو اُن کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ سرسید کے دادا کا خطاب صرف جوادالدولہ تھا۔ بادشاہ نے اس میں عارف جنگ کا لفظ اضافہ کر کے جوادالدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا خطاب سرسید کو عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں۔

دہلی کا قیام ۱۸ فروری سنہ ۱۸۴۶ء کو سرسید فتحپور سیکری سے دلی تبدیل ہو گئے اور سنہ ۱۸۴۶ء سے سنہ ۱۸۵۴ء تک جب تک کہ وہ مستقل صدر امین مقرر نہیں ہوئے دلی ہی میں رہے۔

آثارالصنادید اسی زمانہ میں جبکہ وہ دلی میں منصف تھے اُن کو عمارات شہر اور نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا اور سید الاخبار جو اُن کے بھائی کا

جاری کیا ہوا اخبار تھا اُن کے انتقال کے بعد بھی اس کو بدستور جاری رکھا چاہا اگرچہ اُس کا اہتمام برائے نام ایک اور شخص کے سپرد تھا مگر زیادہ تر سرسید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ اخبار ایک مدت جاری رہ کر بند ہوگیا مگر عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی۔ سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لیے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے اُن کے ساتھ اکثر اُن کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے، اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا، بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہو گئے تھے، اور جو متفرق و پراگندہ اجزاء باقی رہ گئے تھے، ان سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اس سے کیا مقصود تھا، کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے، اُن کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی، بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی، پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول وارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورت حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اُتارنے، اور ہر ایک کتبہ کو بعینہٖ اُسکے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصوّر سے کھچوانا، اور اسی طرح کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برآ ہونا، فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے

جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے اُن کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا، اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اُتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے اُن کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا" سرسید کی آیندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور اُن کی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی۔

ویصعد حتی یظن الوری بان لہ حاجۃ فی السماء

(یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اُنکو آسمان پر کچھ کام ہے)

باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس اڈیشن میں چار باب ہیں۔ پہلا باب عمارات بیرون شہر کے بیان میں دوسرا باب لال قلعہ اور اُس کی عمارتوں کے بیان میں۔ تیسرا باب خاص شہر شاہجہان آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں۔ چوتھا باب دلّی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں، جو سرسید سے کچھ پہلے یا اُن کے زمانہ میں موجود تھے پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چند کے سوا باقی ہر عمارت کا کتبہ اور نقشہ اس کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ۳۲ عمارتوں کا بیان ہے اور اس کے کتبے اور نقشے مندرج ہیں۔ تیسرے باب میں تقریباً ۷۰ حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باؤلیوں اور کوؤں وغیرہ کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں اول کسی قدر اُن شہروں، قلعوں، اور محلوں وغیرہ کا بیان ہے جو سمبت ۱۳۰۰ بکرمی سے لیکر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبانِ اُردو کا ذکر ہے۔

پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے جس میں ایک سو بیس مشائخ مجاذیب، اطبا، قرّاء، شعراء، خوشنویس، مصوّر، موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے اس کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفات کے سبب سے آجکل کے مذاق کے موافق بہت پھیکی اور بے مزہ ہوگئی تھی مگر مضمون کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی۔ الغرض یہ اڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شائع ہوا بعد ازاں دوسرے اڈیشن میں جو کسریں رہ گئی تھیں انھیں پورا کیا اور عبارت میں نسبت سابق نہایت سادگی اختیار کی۔ دوسرا اڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر شائع ہوا ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع ہو کر مشتہر ہوا۔ اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے اسی ترجمہ کو دیکھکر سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا۔

رسائل مذہبی وغیرہ اس زمانہ میں جبکہ وہ دلّی میں منصف تھے آثار الصنادید کے علاوہ سرسید نے اور بھی کئی رسالے لکھے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے (۱) فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مترجمہ ۱۸۴۶ء (۲) قول متین در ابطال حرکت زمین (۳) کلمۃ الحق مؤلفہ ۱۸۴۹ء یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقۂ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے (۴) راہ سنّت در رد بدعت مؤلفہ ۱۸۵۰ء (۵) نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ مرقومہ ۱۸۵۲ء (۶) سلسلۃ الملوک مرتبہ ۱۸۵۲ء یہ ایک مختصر مگر مفید اور صحیح فہرست ان راجاؤں اور بادشاہوں کی ہے جو دلی میں پانچہزار برس سے نوبت بنوبت فرمانروا ہوتے چلے آئے (۷) آغاز کیمیاے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ مرقومہ ۱۸۵۳ء۔

دلّی سے بجنور کو تبدیل ہونا سرسید دلی سے ۱۲ جنوری ۱۸۵۵ء کو صدر امینی پر مستقل مقرر ہو کر بجنور تبدیل ہو گئے اور یہاں کچھ عرصہ کے بعد کلکٹر صاحب

کے ایماء سے تاریخ بجنور لکھنی شروع کی۔ یہ تاریخ بھی اپنی جبلی عادت کے موافق نہایت تحقیق، کاوش اور محنت کے ساتھ لکھی۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی تو صاحب کلکٹر نے اس کو ملاحظہ کے لیے صدر بورڈ میں بھیج دیا۔ ابھی وہ بورڈ سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا اور آگرہ میں تمام دفتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گئی۔

تاریخ بجنور کے بعد آئین اکبری کی تصحیح

تاریخ بجنور کی تحریر کے بعد سرسید نے آئین اکبری کی تصحیح کے اہم اور مفید کام کو شروع کیا۔ اور نہایت محنت اور تلاش کے بعد اس کام کو انجام تک پہنچایا۔ پہلی اور تیسری جلد صحیح اور درست کر کے مطبع میں چھپنے کو بھیج دی گئیں اور یہ دونوں جلدیں مطبوعہ ۱۲۷۲ھ ہجری کہیں کہیں اب بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن دوسری جلد جسکے ساتھ ایک طویل دیباچہ جو گویا آئین اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا تحریر کر کے دلی کو بغرض طبع بھیجی مگر یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہو گیا اور اسکے جسقدر فرمے چھپے تھے وہ اور تمام مسودہ اور دیباچہ سب تلف ہو گئے۔

ہنگامۂ غدر ایام غدر میں سرسید نے انگریزوں کی جان بچانے اور انکی خیر خواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ چونکہ ان کی اس کارگزاری سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں لہذا اس کو بالتفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں البتہ یہ بات ظاہر کرنی ضروری ہے کہ جب سرکار نے خیر خواہی غدر کے صلہ میں سرسید کو ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ دینا تجویز کیا تو انھوں نے اسکے لینے سے صرف اسی بنا پر انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی ان کو کسی طرح گوارا نہ ہوئی۔

ایک تحریر میں جو نواب محسن الملک نے لکھوائی اور مولانا نذیر احمد نے جو خاص بجنور کے تھے اپنے قلم سے لکھی اور جو ان دونوں نامور اور معزز شخصوں کے

خیالات کا مجموعہ ہے اس میں سے ہم ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں۔

"سید احمد خاں کو سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا اور وہاں کے ہندو مسلمانوں کی خانہ جنگیاں یادگار غدر ہیں۔ اس عموم بے تمیزی میں خود سید احمد خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجہ کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے اور قریب تھا کہ ہلاک کریں۔ عود تسلط کے بعد اس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سید احمد خاں کی مٹھی میں تھی، اگر ان کے سے اختیارات کسی دوسرے کو ہوتے تو بجنور کے حصہ میں قیامت آگئی ہوتی، مگر یہ معاملہ فہم، منصف مزاج، نرم دل، نیک طینت آدمی اس وقت بھی فرق کرتا تھا بغاوت اور خانہ جنگیوں میں، مخالفت اور جہالت میں، حملہ اور حفاظت میں، اور سید احمد خاں کی بدولت بجنور ہی ایک ضلع تھا جو عواقب و تبعات غدر سے محفوظ رہا۔"

مراد آباد کی تبدیلی اپریل ۱۸۵۸ء میں سر سید بجنور سے صدر الصدوری کے عہدہ پر ترقی پا کر مراد آباد گئے۔ ۱۸۵۹ء میں باغیوں کا تحقیقاتی کمیشن بیٹھا اور اس میں دو یوروپین ممبر ایک کمشنر روہیلکھنڈ، دوسرے جج مراد آباد اور ایک ہندوستانی ممبر یعنی سر سید مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے۔

مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد نے جو روہیلکھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے چند یوروپین عورتوں اور بچوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا جنکو باغیوں نے کسی ذریعہ سے اطلاع پاکر مولوی صاحب مرحوم کے مکان پر آگھیرا اور قتل کر ڈالا۔ اُن پر یہ الزام تھا کہ اُن کا کوئی رشتہ دار نہیں مارا گیا پس اُن یوروپین عورتوں اور

بچوں کا قتل اُن کے ایما سے ہوا حالانکہ باغیوں کو مولوی صاحب یا اُن کے عزیزوں سے کوئی مخاصمت نہ تھی اور باغی لوگ مولوی صاحب کی فہمائش کی کیا پروا کر سکتے تھے اور خود اُن میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی اس وجہ سے باغیوں نے مظلومین کو مار ڈالا۔ سرسید نے مولوی صاحب مرحوم کی بریت کی اور انھیں کی وجہ سے ایک ناکردہ گناہ سزائے موت سے بچ گئے۔

تاریخ سرکشی بجنور مراد آباد میں آکر سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور چھاپ کر شایع کی۔ اس تاریخ میں مئی ۱۸۵۷ء سے لیکر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقید تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

مدرسہ مراد آباد اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا جہاں اس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا۔ کچھ دنوں یہ مدرسہ بدستور اپنی حالت پر رہا بعد ازاں ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا گیا اور اسی مدرسہ میں اس فارسی مدرسہ کے طلبا بھی داخل ہو گئے۔

رسالہ اسباب بغاوت ہند مراد آباد ہی میں سرسید نے گورنمنٹ کی، ملک کی، اور خاصکر اپنی قوم کی وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو اُن کے اور بڑے بڑے کاموں کی طرح ہمیشہ یادگار رہیگی۔ انگریزوں کے دل میں جو غلطی سے ایک بدگمانی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئی تھی سرسید اس کے رفع کرنے کی فکر میں تھے۔ زمانہ نہایت نازک تھا، خیالات ظاہر کرنے کی آزادی مطلق نہ تھی، مارشل لا کا دور دورہ تھا، اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو، اس کو ایسا کام کرنا جس سے اچھے دل برے ہوں اور بھی زیادہ دشوار تھا۔ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو اپنا مخالف خیال کر لیا تھا اور ایسا خیال کرنے کے اسباب پہلے ہی سے موجود تھے

اگرچہ انگریز ہندوستانیوں کی عادت، طبیعت اور طرز خیالات سے ناواقف تھے مگر ملک کی حکومت اُنھوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور انھیں کو وہ اپنا حریف و سلطنت کا مدعی سمجھتے تھے اور بدقسمتی سے بقول سرسید بُھس بھری ہوئی مردہ کھال دلی میں موجود تھی، مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی شہرت تھی، اور ان تمام باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ انگریزوں کی غلط فہمی کے شکار ہو جائیں۔

پس سرسید نے اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاصکر مسلمانوں کو جن پر سارا نچوڑ انگریزوں کی بدگمانی کا تھا بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے۔ اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ پوست کندہ بیان کیے ہیں اور جو اسباب کہ عموماً انگریزوں کے ذہن میں جاگزیں تھے اُن کی تردید کی ہے اور اُنکو غلط بتایا ہے۔

سرسید نے ۱۸۵۹ء میں اس رسالہ کی پانسو جلدیں چھپوائیں۔ کچھ کم پانسو جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا۔ اور ایک جلد گورنمنٹ آف انڈیا میں بھیجدی اور چند جلدیں اپنے پاس رکھیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور مسٹر بارٹل فریر ممبر کونسل نے اُسکے مضمون کو خیر خواہی پر محمول کیا اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے۔ اور اشاعت کی نظر سے اس کا ایک ترجمہ ۱۸۷۳ء میں تیار ہو کر چھاپا گیا۔ اور جو اس کتاب کا مقصد اصلی تھا وہ پورا ہو گیا۔

سرسید نے ایک رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ لکھا۔ اور جہانتک معلوم ہوا ہے اس رسالہ کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔ ہم نے سنا ہے

کہ جب یہ رسالہ شایع ہوا تو کسی انگریزی اخبار نے لکھا تھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے کیونکہ کسی شخص کو نصارمی کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یوروپین افسر نے اس کا جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی۔

سنہ ۱۸۶۰ء میں جب کہ اس صوبہ میں قحط پڑا تو سر سید نے مراد آباد میں محتاج خانہ کا ایسا عمدہ انتظام کیا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا بیماروں کے لیے ڈاکٹر اور شفاخانہ موجود تھا۔ بیماروں کو پرہیزی کھانا ملتا تھا زچاؤں اور شیرخوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی مسلمانوں کے لیے مسلمان اور ہندوؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے۔ شہر کی پردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں نہیں آسکتی تھیں اُنکے پاس سوت کاتنے کے لیے آٹھ آٹھ آنہ فی اسم اور ایک ایک پھاڑی روئی کے گالوں کی محلوں کی معرفت بھیجدی جاتی تھی۔ جب سوت کتکر آجاتا تھا تو روئی کاتنے کی اجرت بھیجدیتے تھے۔ سُنا ہے کہ اُس زمانہ کی عورتیں جبتک جینتی رہیں سید احمد خاں کو دعائیں دیتی رہیں۔

راجہ جے کشن داس صاحب۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کی جو آخر کو سر سید کے نہایت گہرے دوست ہو گئے، اس وقت تک اُن سے ملاقات نہ تھی۔ اُن کا بیان ہے کہ جب سر سید نے رسالہ "رائل محمڈنز آف انڈیا" نکالنا شروع کیا تو اس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے ان کو ہمدردی نہیں ہے۔ اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیرخواہوں کے تذکرے میں نکالا جائے۔ انھیں دنوں میں میرا مراد آباد جانا ہوا محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا۔ وہاں سر سید سے مُٹ بھیڑ ہو گئی۔ میں نے اُن فقروں کا ذکر کیا جن سے اُنکے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے

معذرت کی اور اپنے قلم کی لغزش کا اقرار کیا۔ خیر یہ تو ایک اخلاقی جواب تھا مگر جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آرہے تھے اس کو دیکھکر میرا دل بالکل صاف ہو گیا اور مجھے حیرت ہوئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ان کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی اور اب جو کچھ میرا اور ان کا معاملہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔"

باوجود ایسے اچھے انتظام کے جس قدر رقم روپیہ ضلع مراد آباد میں خرچ ہوا ایسا کسی ضلع میں نہیں ہوا۔ سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عورت اور مرد محتاج خانہ میں کام کے لائق تھے، سب سے کام لیا جاتا تھا۔ بان اور دریاں بٹتے تھے، سوت کاتتے تھے، سڑکوں پر کام کرتے تھے۔ اور اور طرح طرح کے کام جو ان سے ہو سکتے تھے کرتے تھے اور اس طرح ان کے کام کی اجرت سے ہر روز ایک رقم کثیر جمع ہو جاتی تھی جو محتاج خانہ میں صرف ہوتی تھی۔

محتاج خانہ کے علاوہ خود سرسید اپنی ذات سے اور نیز ان کی نیک بی بی جو ان سے بھی زیادہ خدا ترس تھیں، غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری کرتے تھے ان کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی

مراد آباد ہی میں انھوں نے فیروز شاہی ضیائی برنی کی تصحیح کی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو یہ نایاب کتاب کا چھاپنا منظور تھا اُس نے سرسید سے تاریخ مذکور کا ایک صحیح نسخہ نقل کے واسطے طلب کیا تھا۔ انھوں نے بہت جستجو سے اس کا ایک نسخہ اسی غرض کے لیے خریدا اور سوسائٹی سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنا نسخہ صحیح کر کے بھیجوں گا۔ چنانچہ اُس کی تصحیح کے لیے ایک نسخہ کتب خانہ شاہ دلی کا۔ دوسرا وہ نسخہ جو مسٹر ایلیٹ نے تاریخ ہندستان

لکھتے وقت بہم پہنچایا تھا۔ تیسرا نسخہ مسٹر اڈورڈ ٹامس سے، اور چوتھا بنارس سے بڑی تلاش اور تجسس سے بہم پہنچا کر اپنی کتاب صحیح کی جس سے یہ تاریخ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپ کر شائع کی۔

یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے جس کا مصنف ضیاء الدین برن (یعنی بلند شہر) کا رہنے والا بہت بڑا فاضل اور رست بیانی میں ضرب المثل ہے سرسید نے اس کی تصحیح کے وقت اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جس میں اُن تمام تاریخوں کا جو شاہان ہند کے حال میں اس تاریخ سے پہلے اور خاص فیروز شاہ کے حال میں اس کے بعد لکھی گئی ہیں اور نیز ضیاء الدین برن کا حال درج ہے یہ دیباچہ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں چھپا ہوا موجود ہے۔

تبیین الکلام سرسید نے یہ کتاب سالم نامی ایک یہودی کو نوکر رکھ کر اور اس سے عبرانی پڑھ کر **غازی پور** کے ضلع میں **مولوی عنایت رسول صاحب** چڑیا کوٹی کی اعانت سے جو عربی اور عبرانی کے بہت بڑے عالم تھے لکھنی شروع کی اس کتاب میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی آسمانی کتابوں کی تطبیق کی گئی ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ کتاب بوجوہات چند در چند ناتمام رہی۔ اگرچہ سرسید نے اسکا بہت سا حصہ خطبات احمدیہ میں منتقل کر دیا ہے۔ نیز اس کتاب کا بھی پہلا حصہ چھپ چکا ہے۔

بی بی کا انتقال ۱۲۷۸ہجری مطابق ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بی بی کا انتقال مراد آباد ہی میں ہو گیا جنھوں نے سید حامد اور سید محمود دو بیٹے اور ایک بیٹی صغیر سن چھوڑی تھی سرسید کی عمر اسوقت ۴۴ برس کی تھی۔ اُنھوں نے اپنے بڑے بڑے ارادوں کی وجہ سے جنکی دُھن اُس زمانہ میں اُن کو لگی ہوئی تھی دوسری شادی نہیں کی۔ اور اپنی تمام باقی زندگی محض تجرد میں کمال عفت و پارسائی کے ساتھ گزار دی

اور اپنے تمام قویٰ اور اپنی عمر کا افضل ترین حصہ قومی خدمات کے لیے وقف کردیا

غازی پور کی بدلی اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا ۱۲ مئی ۱۸۶۲ء کو سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی۔ اب اُن کو پختہ یقین ہو گیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا۔

سرسید کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے نفرت اور وحشت کرتے ہیں اور ہندو جو انگریزی تعلیم کو محض نوکری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں دونوں کے دل میں انگریزی تعلیم کا نقش جمانے کے لیے ضرور ہے کہ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت اُن کے دل میں پیدا ہو اور یہ مقصد بغیر ایک علمی سوسائٹی قائم کیے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔

پس انھوں نے ۱۸۶۳ء میں **سائنٹفک سوسائٹی** غازی پور میں قائم کی اور تمام قواعد منضبط کیے۔ اور وہ خود اسکے آنریری سکرٹری مقرر کیے گئے ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مجلس مذاکرہ علمی میں ایک لمبا لکچر فارسی میں سوسائٹی کے مقاصد پر دیا جو چھپ گیا ہے اور کلکتہ سے آتے جاتے جس شہر میں اُن کا گزر ہوتا وہاں سوسائٹی کا چرچا کرتے۔

غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا ۱۸۶۳ء میں سرسید نے غازی پور میں ایک

انگریزی مدرسہ ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ طور پر قائم کیا۔ اور یہ مدرسہ آجتک وکٹوریہ سکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے۔ اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی برابر اس میں ہوتی ہے۔

غازیپور سے علیگڈھ تبدیل ہونا

سنہ ۱۸۶۴ء میں سرسید غازیپور سے تبدیل ہو کر علیگڈھ میں جس کی عزت اور شہرت خدا تعالیٰ نے اُن کی ذات سے وابستہ کی تھی، آگئے۔ چونکہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا اُن کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھ علی گڈھ میں لے آئے یہاں سوسائٹی کو بہت ترقی ہوئی اور ایک عالیشان عمارت، دلکشا چمن اور وسیع احاطہ کے ساتھ بنکر تیار ہوئی جو اب تک موجود ہے۔ یہ عمارت تقریباً تیس ہزار کی لاگت سے خاص سرسید کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوئی۔

اس مکان میں ہر مہینے متعدد جلسے ہوتے تھے اور مختلف مضامین پر جن سے لوگوں کو نئی نئی اطلاعیں حاصل ہوتی تھیں لکچر دیے جاتے تھے ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔ مترجم، مولوی، پریسمین، چپراسی اور مالی وغیرہ تقریباً پانسو روپیہ ماہوار کے تنخواہ دار سوسائٹی میں ملازم تھے۔ چند برس کے عرصہ میں بہت سی مفید کتابیں سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کراکے چھاپیں مثلاً الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رومن کی تاریخ مصر قدیم، تاریخ یونان قدیم اسکاٹ برن کا رسالہ علم فلاحت سینیر کا رسالہ سیاست مدن، سرجان میلکم کی تاریخ ایران، ریورنڈ اکیسوس کی تاریخ چین کا فارسی ترجمہ وغیرہ وغیرہ چنانچہ سنہ ۱۸۶۶ء میں ۱۸۔ اخبار اور میگزین انگریزی اور ۲۶۔ اخبار اردو

فارسی، عربی اور سنسکرت کے ہندوستان اور ممالک غیر سے یہاں آتے تھے۔

سرسید نے اس سوسائٹی کو آٹھ ہزار روپیہ کا ذاتی پریس جو **تبیین الکلام** کے چھاپنے کے لیے خرید کیا تھا مفت دیدیا اور ایک ہزار روپیہ کی انگوٹھی جو الماس کی تھی اور جس کو ہر ہائی نس بیگم **بھوپال** نے خاص سرسید کے لیے بھیجی تھی وہ بھی سوسائٹی کی نذر کر دی۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے ایک **برٹش انڈین ایسوسی ایشن** بغرض **طلبی حقوق** ہند قائم کی گئی اور نو معزز ہندو اور مسلمان اس کے ممبر مقرر ہوئے اور اس جماعت کا نام علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا گیا۔

سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالنا ۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے ان کے اخیر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا۔ پھر ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا۔ یہ اخبار جہاں تک ہمارا خیال ہے اب تک جاری ہے۔

اس میں شوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ ان **لیڈنگ آرٹکلوں** کے جو وہ خود لکھتے تھے انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ مضامین جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت، یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے۔

بنارس کی تبدیلی ۱۵۔ اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید عہدۂ جج خفیفہ پر ترقی پاکر علیگڑھ سے بنارس چلے گئے۔ یہاں سے چلتے وقت وہ تمام کاروبار سوسائٹی کے راجہ جے کشن داس۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کو جو اس وقت علیگڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کیے گئے انھوں نے نہایت توجہ اور دلسوزی سے سوسائٹی کے کام انجام دیے اور سوسائٹی کی جو عمارتیں سرسید کے زمانہ میں پوری نہیں ہوئی تھیں اُن کو پورا کیا۔ سرسید بنارس سے بھی سوسائٹی کے لیے مضامین لکھتے رہے اور ہر طرح اس کی امداد کرتے رہے سرسید کا تعلق ملازمت کے اخیر زمانہ یعنی جولائی ۱۸۷۶ء تک بنارس کے ساتھ رہا

ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک یکم اگست ۱۸۶۷ء کو جب کہ سرسید علیگڑھ ہی میں تھے انھوں نے ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں بھیجی جسکا خلاصہ یہ ہے

"(۱) یہ کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے (۲) یہ کہ دیسی زبان میں انھیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں کہ اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں (۳) جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں بجلدوے تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہیں وہی سندیں طلبہ کو عطا ہوا کریں جو انھیں مضمونوں کا دیسی زبانوں میں امتحان دیکر کامیاب ہوں (۴) یہ کہ یا تو اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمال مغربی اضلاع (یعنی صوبہ متحدہ) میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔"

اس درخواست پر گورنمنٹ ہند نے بڑی توجہ ظاہر کی اور ایک چٹھی اسکے جواب میں سرسید کو جبکہ وہ بنارس میں تھے بھیجی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ

کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو صرف بطور سیکنڈ لینگویج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی۔ سرسید نے اُس کی مخالفت کی اور ایک تقریر میں جہاں کہ نواب لفٹننٹ گورنر ممالک شمال و مغربی و اودھ بھی موجود تھے کہا کہ

"مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی، انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑہا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیونکر پہنچے"

غالباً زیادہ تر یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا سرسید نے ورنیکلر یونیورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہوگا

ہومیوپیتھک علاج کی حمایت

غالباً بنارس ہی میں پہنچکر اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ علاج کا عمدہ اور بے خطر نہیں ہے اور جیسا کہ اُنکی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جو بات یا جو کام یا جو تجویز ملک کے لیے مفید سمجھی، اُسکے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ انھوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں اُنھوں نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ہومیوپیتھک طبابت کا ہندوستان میں پھیلانا اور ہندوستانیوں کو اس کی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے پریزیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکرٹری سرسید قرار پائے۔ اور ۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں ایک شفا خانہ بنام "ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہوسپٹل" کھولا گیا۔ سرسید نے ہر طرح اس علاج کی حمایت کی جسکا یہ نتیجہ ہوا کہ پایونیر کے پرچہ مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۶۷ء میں اس شفا خانہ کی نسبت یہ چھپا تھا کہ "پہلے ہی مہینے میں پانسو سولہ بیمار معالجہ کے لیے ہوسپٹل میں آئے، حالانکہ اس سے پہلے کوئی اس طریقۂ علاج سے مطلق واقف نہ تھا"!

۱۷ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ایک طول طویل لکچر ہومیوپیتھک طبابت کی تاریخ

اور اُس کے اصول پر اور اس بات پر کہ یہ طریقۂ علاج تمام طریقوں سے زیادہ مفید اور بے خطر ہے کمیٹی کے عام جلسہ میں دیا اور ۱۸۶۰ء میں ایک رسالہ ہیضہ کے علاج پر بموجب اصول ہومیوپیتھک کے لکھا۔ یہ لکچر اور رسالہ سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔

اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت

سرسید ہمیشہ سے جیسا کہ اُن کی مذکورہ بالا کل خدمات سے ظاہر ہوتا ہے، اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اسکے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم مل جلکر رہیں کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ اُن کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔

انگریزی مدارس کی تعلیم میں تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا اُن کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقہ پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی برائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں۔ اس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو روابط، دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے وہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل باقی نہ رہے اور اس کا ظہور آج ہر شخص علانیہ تمام ہندوستان میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا اور نہ رہ سکتا تھا۔ جو عزت اور جاہ و منصب

اور امور سلطنت میں شرکت، تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھے اور واقعہ ۱۸۵۷ء نے اُن کو بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اُسنے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور امنگیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی اور حیلہ ہاتھ نہ آسے تو اسی بہانہ سے کہ دریا میں خاک کیوں اُڑاتے ہو، اس سے دست و گریباں ہو جاسے۔ اُردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی کے صرف کسی قدر اسماء اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے اس کو ہمارے ہموطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اُس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہانتک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جاسے اور بجاسے اسکے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جاسے۔

سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ غرضکہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جابجا اسکے لیے کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جسکے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں لیکن ہندوؤں کی

یہ تحریک نامنظور ہو گئی۔

۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید وائسرائے کی کونسل میں ممبر تھے۔ ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ اس دفعہ پنجاب کے ہندو بھی اس واویلا میں شریک ہو گئے تھے اور مسلمانوں نے بھی انجمن حمایت اردو قائم کی لیکن کمیشن نے دونو پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقہ سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ایک بڑا پولٹیکل مسئلہ ہے جسکے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں پس اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی

اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی۔ لارڈ میگڈانل (جو اس وقت اس صوبہ کے لفٹننٹ گورنر تھے) کے زمانہ میں بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے بھیجا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانہ میں ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتہ کا سا عالم تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر آرٹکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی، اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیئے اور لکھا کہ اگر مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہانتک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے۔ اس لیے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے

اور مرتے مرتے بھی وہ اپنے فرض کو ادا کیے بغیر نہ رہے۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اُردو سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعوی نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں بہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں اُردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں۔ فرانس کے مشہور مستشرق گارسن دتاسی جنھوں نے اُردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے وہ اسی متنازع فیہ مسئلہ کی نسبت اپنے ایک لکچر میں لکھتے ہیں کہ "ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے" لیکن ہم کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کرنا سکھایا ہے وہی آگے چل کر ان کو یہ سبق دے گی کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے مصلح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک قومی آزادی اور اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔

رسالۂ طعام اہل کتاب ۱۸۶۶ء میں سرسید نے ایک رسالۂ طعام اہل کتاب ایک استفتا کے جواب میں لکھا اور آیات و احادیث کے حوالہ سے اس امر کو جائز قرار دیا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے میں کوئی حرام چیز نہ ہو کھانا پینا درست ہے۔ اس رسالہ میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور روایات فقہی سے اور خاصکر شاہ عبد العزیز کے فتوے سے جس پر ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتبار ہے استدلال کیا ہے۔

سفر انگلستان ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک مولوی سید مہدی علی خاں[1] اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ

(۱) یعنی نواب محسن الملک مرحوم سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ۔

"جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا۔ اُنھوں نے اپنے کتب خانہ کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ اُنھوں نے بارہا مجھ سے اس بارہ میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جبتک کہ میں بذات خود اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں"

الغرض یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے۔ اُنکے ساتھ دونوں بیٹے سید حامد مرحوم اور سید محمود اور تیسرے مرزا خداداد بیگ اور چوتھا اُن کا قدیم خدمتگار چھجو یہ چار آدمی تھے۔ بنارس سے لندن تک پہنچنے کے حالات اُنھوں نے بطور ایک سفر نامہ کے نہایت عمدگی سے بیان کیے ہیں، جو سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق میں چھپ گئے ہیں

سفرنامہ اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں اُن کو پیش آیا ہے قلمبند کیا ہے اور سفر کی ضروریات جو ہر مسافر کو پیش آتی ہیں مفصل بیان کی ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً جو خیالات اپنے خاص مقصد یعنی وطن کی بھلائی کے ان کے دل میں گزرے ہیں اُن کو ہر موقع پر ظاہر کیا ہے۔ جا بجا ایشیا اور یورپ کی سوشل اور اخلاقی حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کیے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یوروپ کے سفر کی ترغیب ہو

لندن کے عمائد سے ملنا سرسید لندن پہنچکر میکلن برگ اسکوائر کے ایک مکان میں مقیم ہوئے۔ اور اپنے تمام دوستوں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی، مروت اور خلق سے اُن کے ساتھ پیش آئے۔ لندن میں وہ اکثر ان کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ ان سے ملنے کو آتے تھے۔ اُنھوں نے سرسید کو

لندن کے اکثر امرا و مشاہیر سے ملوایا۔ لارڈ اسٹینلی آف ایلڈولی جو قسطنطنیہ
میں بطور سفیر رہتے تھے وہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سرسید سے ملتے
رہتے تھے سر جان ولیم کے جو نائب وزیر ہند تھے سرسید کے ساتھ
خصوصیت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ملکۂ معظمہ کے سمدھی ڈیوک آف آرگائل
جو اس وقت وزیر ہند تھے اور سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کے پیٹرن بھی تھے
وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ ملتے تھے اور اپنے بیٹے
مارکوئس آف لارن سے بھی جو ملکہ معظمہ کے داماد ہیں اُن کو ملایا۔

جلسۂ سول انجنیرس سوسائٹی میں شریک ہونا

سرسید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام
کیا اور شب و روز اُن کاموں میں جنکے لیے
یہ سفر اختیار کیا تھا مصروف رہے۔ باینہمہ اُن کو
خاص خاص تقریبوں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ جہاں ان کا اعزاز ظاہر کرنے کے
لیے اُن کو بُلایا جاتا تھا۔ ۲۳ جون ۱۸۶۹ء کو وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک
بہت بڑے ڈنر پر بُلائے گئے۔ اور ۱۳ جولائی کو اسمتھونین سوسائٹی اوف
سول انجنیرس کے ایک عظیم الشان جلسے میں اور اسکے بعد جو اسی کے
متعلق گرینیچ میں ڈنر ہوا اس میں شریک ہوئے۔ سید حامد اور سید محمود نے بھی
ساتھ اسٹیمر میں جاکر حاضری کھائی اور ٹیمز کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے
تھے دیکھے۔ پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اس میں توپیں بھرنے
اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گرینیچ میں جاکر ڈنر کھایا اس ڈنر میں کئی
ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجنیر شریک تھے۔ تمام انجنیروں
نے جو اس جلسہ میں شریک تھے کھانے کے بعد اسپیچیں دیں۔ سب کے
بعد پریسیڈنٹ نے تقریر کی اور آخر میں لارڈ لارنس اور سرسید کا ذکر کرکے

اُن کے شامل ہونے پر فخر کیا اس کے شکریہ میں لارڈ لارنس نے تقریر کی
(سرسیّد بذریعۂ ترجمان تمام کارروائی اُردو میں سمجھتے رہے) لارڈ لارنس
کے بعد سرسید اٹھے۔ ایک ایسے جلسے میں جہاں انگلستان کے نامور انجنیر جمع ہوں
اور جلسہ کا موضوع انجنیرنگ کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہو، سرسید کو گفتگو کرنا
نہایت دشوار تھا باوجود اس کے ڈیلی نیوز نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ سید احمد خاں
کی تقریر شاندار اور دلچسپ تھی۔

خطاب اور تمغہ ملنا ۱۰۔ اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا آفس میں ڈیوک آف آرگائل
کے ہاتھ سے اُن کو سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب اور تمغا ملا۔ اس کی تحریک
لارڈ لارنس نے کی تھی۔

لطیفہ جس زمانہ میں سرسید کو ولایت میں سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب ملا
اس کے کچھ دنوں بعد راجہ جے کشن داس صاحب کو بھی خطاب ہندوستان
میں بمقام علیگڑھ ملا تھا اور اسکے تمام مراسم سوسائٹی کے بڑے ہال میں عمل میں
آئے تھے۔ جب جلسہ برخاست ہوا اور راجہ صاحب کے تمام دوست انکو
مبارکباد دینے لگے۔ سوسائٹی کا ایک ملازم ہر ایک کی زبان سے سی ایس آئی
کا لفظ سُنتا تھا اور نہایت تعجب کرتا تھا۔ باہر آکر اور نوکروں سے کہنے لگا۔ اے یارو
عجب تماشا ہے سید احمد خاں تو خیر! لندن گئے تھے وہاں جاکر عیسائی ہوے
کسی نے جانا کسی نے نہ جانا۔ ان راجہ صاحب کو کیا ہوا تھا کہ ہندوستان ہی میں
بھرے جلسے کے اندر عیسائی بن گئے۔ لوگوں کی زبان سے جو بار بار سی ایس آئی
کا لفظ نکلتا تھا وہ اس کو عیسائی سمجھتا تھا۔

ملکۂ معظمہ کی لِوی میں بلایا جانا ۱۱ مارچ ۱۸۷۰ء کو ملکہ معظمہ کی لِوی میں سرسید کو بُلایا گیا
جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو اور درباریوں کی طرح

انھوں نے بھی اپنے نمبر پر جا کر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ تھا کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے تھے جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہو لیتا تھا اس وقت تک ملکہ کھڑی رہتی تھیں۔

پرنس آف ویلز کی ریوی میں جانا

اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں اُن کو پرنس آف ویلز کی ریوی میں شریک کیا گیا۔ یہ ریوی صرف فوجی افسروں کے لیے تھی، کسی سویلین کو اُس میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن سرسید کو ریوی میں شریک ہونے کی خاص اجازت دی گئی تھی۔

اتھینیم کلب کی ممبری

لندن کی علمی مجلسوں میں بھی سرسید شریک ہوتے رہے لندن جانے سے پہلے وہ **رائل ایشیاٹک** سوسائٹی لندن کے فیلو مقرر ہو چکے تھے، جب لندن گئے تو اسکے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ **چارلس ڈکنس** کی آخری ریڈنگ پڑھنے میں وہاں موجود تھا۔ لیکن سب سے بڑا امتیاز جو اُن کو لندن میں ایک علمی حیثیت سے ملا وہ **اتھینیم کلب** کا آنریری ممبر مقرر ہونا تھا۔ یہ کلب لندن میں سب سے زیادہ نامی اور معزز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کلب معزز خیال نہیں کیا جاتا۔ کوئی شخص جو مشہور مصنف یا کسی دوسرے کمال علمی میں ممتاز نہ ہو وہ اس کلب میں ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بارہ سو تک محدود ہے سیکڑوں آدمی درخواستیں دے دیکر یہاں کی ممبری کے امیدوار رہتے ہیں۔ سرسید کہتے تھے کہ ۱۸۷۰ء میں جبکہ میں وہاں موجود تھا تین ہزار سے زیادہ امیدواروں کا نام درج رجسٹر تھا۔ اور دس دس بارہ بارہ برس امیدواری پر گذر گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو شخص اس کلب کا ممبر مقرر ہوتا ہے اس کے دوست اسکو مبارکباد کی چٹھیاں لکھتے ہیں اور اسکو ایسا فخر ہوتا ہے کہ ویسا فخر

اکثر خطابوں کے ملنے پر بھی نہیں ہوتا۔

غرض کہ سرسید خاص قاعدہ سے جو نامور اور مشہور باکمال لوگوں کے لیے مقرر ہے: وہ دفعۂ ایتھینیم کلب کے آنریری ممبر مقرر ہوئے اور جب تک لندن میں رہے اسکے ممبر رہے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں جانا

مگر یہ تمام اعزاز و امتیاز اور خاطر و مدارات جن کا ہندوستان سے چلتے وقت سرسید کو سان گمان بھی نہ تھا سب ضمنی اور غیر متوقع امور تھے۔ اُن کے اصلی مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا چنانچہ انھوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جاکر دیکھا اور بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کی اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کرلیا پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا تعلیم نسوان کو غور کی نگاہ سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اسکو نگاہ میں رکھا۔

انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کرنا

انگلستان کے طریقۂ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسید نے لندن ہی میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم کے نقصانات بالتفصیل ظاہر کیے تھے۔ تعلیم کے سوا یورپ کی عام شائستگی اور طرز تمدن اور حسن معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب ملاحظہ کیے۔ اور جہانتک ممکن تھا اپنی معلومات کو وسعت دی۔ یورپ کے طریق معاشرت کو دیکھا امراکے محل اور مکانات اور طرز ماند و بود پر نظر کی۔ عجائب خانوں اور کتب خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کیے انجنیری کے

عجائبات، جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندری تار کا بننا، انجنیروں اور عالموں کی سوسائیٹیاں عام کاریگروں اور اہل حرفہ کے کام اور عموماً اہل انگلستان کے علمی ذوق شوق اور علمی ترقیات کو دیکھا جس سرگرمی کے ساتھ اہل مذہب، مذہب کی حمایت کرتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت بے تعصبی سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اخلاق کہ وہ پردیسیوں اور مہمانوں کے ساتھ برتتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھا۔ اُن کے عیبوں سے قطع نظر کی اور اُن کی خوبیوں کو چُنا۔

۱۵۔ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کو چھ مہینے کے حالات مختصر طور پر قلمبند کر کے یہاں چھپنے کے لیے بھیجے۔ پھر ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۷۰ء کو ایک دوسری تحریر بعنوان "عذر از طرف گنہگار سید احمد" ہندوستان میں بھیجی۔ پھر ایک اور تحریر بعنوان "عرضداشت سید احمد بخدمت اہل وطن" اخبار میں چھپنے کے لیے روانہ کی۔ ان تمام تحریروں کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں سرسید کو اہل وطن کی بھلائی کا کس قدر خیال تھا۔ گو ان تحریروں سے قوم و ملک کے کان پر جوں نہیں چلی۔

خطبات احمدیہ کا لکھنا اور چھپوانا

ان سب باتوں کے سوا سرسید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرا کر شایع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاصکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف اوف محمد میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کے کیرکٹر ظاہر کرنے میں دانستہ یا نادانستہ کی ہیں ان کو رفع کیا جائے۔

ولایت میں سرسید نے کتاب کی لاگت بڑھ جانے کے خوف سے صرف

اپنی اردو یادداشتوں کا خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کر کے چھپوایا تھا مگر ہندستان میں پہنچنے کے بہت بعد اُنھوں نے اس کو اُردو میں بھی اپنی پوری یادداشتوں سے از سرِ نو مرتب کر کے **تصانیف احمدیہ** کے ساتھ بڑی تقطیع پر ٹائپ میں چھپوایا جس میں ہر ایک مضمون بہ نسبت انگریزی کے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

الغرض سرسید ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو مع سید حامد کے لندن سے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔

ولایت سے ہندوستان میں واپس آنا ۲۔ اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء کو سرسید مع سید حامد کے ولایت سے بمبئی پہنچے اور اسی مہینے میں بنارس پہنچکر اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ یہاں آتے ہی اُنھوں نے اس بڑے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی جس کے لیے درحقیقت ولایت کا سفر اختیار کیا تھا۔

تہذیب الاخلاق اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور اُن کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ انھوں نے اس پرچہ کے نکالنے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا ۲۴ دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء کو اس کا اول نمبر شایع ہوا اور پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا اور ہمیشہ اسکے اڈیٹر اور منیجر سرسید رہے۔ اگرچہ اس پرچہ میں مضمون لکھنے والے بہت سے لوگ تھے مگر سب سے زیادہ سرگرم خود سرسید، پھر مولوی سید مہدی علی خاں اور پھر مولوی چراغ علی تھے۔ اس پرچہ کے دو ہی تین نمبر نکلے تھے کہ چاروں طرف سے اس کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اس مدرسے بھی جس کو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور سرسید کی تکفیر کے فتوے جابجا لکھے جانے لگے یہاں تک کہ اُن کے ساتھ اُن کے دوست اور اخوان والصفا بھی نیچری بلکہ

کرسٹان کہلانے لگے۔

باایں ہمہ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتد بہ
گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ تھا۔ جیسے
اہل انگلستان ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کے دلدادہ تھے۔ وہ اس کے مضامین
پر وجد کرتے تھے اور تاریخ معین پر اُسکے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے۔
اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال
چھوڑ دیتے بلکہ صرف اُن کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہرا اُن کی مخالفت کم ہوتی
بلکہ شاید نہ ہوتی۔ مگر اسکے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی۔ اور جو تحریک چند سال
میں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

تہذیب الاخلاق میں عام خبریں درج نہیں ہوتی تھیں۔ مگر مدرسۃ العلوم
کے متعلق کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کی روئدادیں اور تمام حالات اس میں کئی برس
تک برابر چھپتی رہیں۔ اس لیے مدرسۃ العلوم کو اس سے بہت تقویت پہنچی۔

سنہ ۱۸۷۶ء میں جب سرسید پنشن لیکر علیگڈھ میں آ گئے تو ان کو ہمہ تن مدرسہ
کی تکمیل، اس کی عمارتیں تیار کرنے، اور ہر طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز
کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ چھ برس کے عرصہ میں ۲۲۶ مضمون تہذیب الاخلاق
میں چھپے جن میں سے چھوٹے بڑے ۱۱۲ مضمون صرف سرسید کے لکھے ہوئے ہیں
اور باقی اور لوگوں کے۔ آخر جمادی الاولی سنہ ۱۲۹۶ ہجری میں لوگوں کے اصرار پر
تہذیب الاخلاق دوسری بار جاری کیا گیا جو دو برس پانچ ماہ کے بعد بند ہو گیا
شوال سنہ ۱۳۱۱ ہجری میں سرسید نے نواب محسن الملک کی تحریک سے اُس کو پھر
جاری کیا مگر اس دفعہ بھی تین برس جاری رہکر بند ہو گیا۔

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء میں سرسید نے ایک اشتہار

تیار کیا اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا چنانچہ اسی مہینے میں
ایک ہزار ایک سو دو روپیہ جمع ہو گیا۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ جمع ہوتا رہا
نواب کلب علیخاں مرحوم رئیس رامپور، کنور وزیر علی خاں مرحوم رئیس اپنور
اور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر نے اس کام کی طرف خاص توجہ ظاہر کی۔
الغرض ۲۶ دسمبر کو بمقام بنارس کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان
منعقد ہو گئی جسکے سکرٹری سرسید قرار پائے۔

نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد
کے لیے جلسہ قرار پایا تھا اس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا تھا
رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے
تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ
لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو انکے پلنگ پر نہ پایا
میں انکے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں
اور زار وقطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے
کوئی افسوسناک خبر آئی؟ یہ سنکر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ اس سے
زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور
کوئی صورت اُن کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ پھر آپ ہی کہنے لگے کہ جو جلسہ کل
ہونے والا ہے مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات
اسی اُدھیڑبن میں گزر گئی کہ دیکھیے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے
کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔

کمیٹی خزنیۃ البضاعۃ ایک دوسری کمیٹی اس غرض سے کہ قیام مدرسہ
مجوزہ کے لیے وقتاً فوقتاً چندہ وصول کرتی رہے

مقرر کی گئی جس کا نام "کمیٹی خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین" رکھا گیا اور اُسکے حین حیاتی سکرٹری سرسید قرار پائے۔ اور یہ ٹھہرا کہ جب تک مدرسہ قائم کرنے کے لائق سرمایہ جمع نہ ہو جائے تب تک اس کمیٹی کا مقام وہیں رہے جہاں سرسید رہیں۔ چنانچہ جب تک مدرسہ علیگڑھ میں قائم نہ ہو گیا تب تک کمیٹی مذکور کا دفتر بنارس ہی میں رہا جہاں سرسید جج خفیفہ تھے۔

ابتدائی مدرسہ علیگڑھ میں قائم ہونا فروری ۱۸۷۳ء میں جو جلسہ صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرسۃ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے چنانچہ ۳۱۔ اگست ۱۸۷۳ء کو علیگڑھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا اور جس میں علیگڑھ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی تقریروں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی۔ صدر کمیٹی بنارس نے بھی علیگڑھ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکرٹری سے درخواست کی کہ علیگڑھ میں مدرسہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مذکورہ پر سرسید بنارس سے علیگڑھ آ گئے۔ اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی۔

پنشن لینا جولائی ۱۸۷۶ء کے آخر میں پنشن کی منظوری آ گئی اور سرسید اسی وقت ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔

کالج کا بنیادی پتھر الغرض سرسید علی گڑھ میں آ کر ہمہ تن کالج کے کام میں مصروف ہو گئے۔ کالج کی عمارتوں میں جلد جلد ترقی ہونے لگی۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر غیر معمولی اور غیر متوقع

شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ یہ رسم لارڈ لٹن ویسرائے و گورنر جنرل کشور ہند کے ہاتھ سے اس عظیم الشان دربار کے بعد جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا ادا ہوئی۔ سید محمود نے ایڈریس پڑھا اور وائسرائے نے اس کا جواب نہایت شیریں زبانی اور اپنی مشہور فصاحت کے ساتھ دیا۔

سید محمود نے جو اسکیم ۱۰ فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی اس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ بعد خرابی بسیار آخرکار مسلمانوں کا یہ دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔ اگرچہ نہ اب سرسید ہیں اور نہ سید محمود، مولوی سمیع اللہ خاں ہیں اور نہ نواب محسن الملک یہ وہ لوگ تھے جن کے علیگڑھ کالج پر بے شمار احسانات ہیں اور آخر الذکر تو وہ بزرگ ہیں جنکی بدولت حقیقتاً نہ صرف کالج قائم رہ سکا بلکہ کالج یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچا۔ مسلمانانِ ہند جسقدر بھی اس بزرگ کے شکرگزار ہوں وہ کم ہے سرسید کے بعد اگر کسی شخص کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ نواب محسن الملک مرحوم کا اسم گرامی ہے۔ خدا دونوں کو غریق رحمت کرے۔

تفسیر القرآن معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا، اسی وقت سے اُن کو اس بات کی فکر تھی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مُضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اس سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہانتک ممکن ہو بچایا جائے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی

مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے اُن کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم کا یہی خراب نتیجہ اسلام کے حق میں نہ پیدا ہو جائے۔ پس اُنھوں نے سنہ ۱۸۸۳ء میں مدرستہ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہو اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے، اور جب ہی ہماری قوم کو عزت ہوگی۔" ایک مرتبہ انھوں نے کہا "اگر یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے اگر آیندہ غلط ثابت ہو۔ جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعوی کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہو گا جیسا کہ اب سچا ہے، اور غور کرنے کے بعد ثابت ہو گا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا۔"

الغرض سرسید نے تفسیر القرآن لکھنے کا ارادہ کیا اور جس اصول پر سرسید نے تفسیر لکھنی شروع کی تھی وہ ایسا مشکل کام تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا کام شروع کرتا تو چند روز بعد اس کا خیال بالکل چھوڑ دیتا۔ یہ کہدینا تو بہت آسان ہے کہ اسلام میں کوئی بات قانون فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ مگر اس کی تمام جزئیات کو قانون فطرت پر منطبق کرنا خصوصاً اس حالت میں جبکہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اسکے سرسید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور باوصف سخت مخالفتوں کے جو قوم کی طرف سے ہوئیں اور باوجود ان بے شمار مشکلات کے جو تفسیر لکھتے وقت اُن کو پیش آتی تھیں نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض سمجھ کر انجام دیتے رہے۔

مولانا حالی اس تفسیر کی بابت لکھتے ہیں کہ اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں بانیہمہ اس تفسیر کو ہم اُن کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی کے علاوہ ان کی لٹریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔

لطیفہ ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجیے۔ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اسکے واسطے سفارش کر دیں" سرسید نے ان کو لکھ بھیجا کہ "میری عادت کسی کی سفارش کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھکر چھپوائیں خدا چاہیے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہیگی" غالباً یہی لطیفہ سنکر مولانا حالی نے حسب ذیل قطعہ لکھا ہے۔

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے — برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا — لیکن نہ اس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی
اخبار بھی نکال کے سخت آزمائی کی — تدبیر بھی اس کی نہ تقدیر سے چلی
روزی کی خاطر اُسنے کیے سیکڑوں جتن — پر کی کہیں نصیب نے اسکے نہ یاوری
راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت — اک خضر پے خجستہ نے کی آکے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اُسکے کہ آج کل — سنتا ہوں چھپ رہی ہیں تصانیف احمدی
جا اور لفظ لفظ کو اس کے چھیڑ کر — تردید اُس کی چھاپدے جو ہو بُری بھلی
پھر دیکھنا کہ راس وچپ و گرد و پیش سے — لگتی ہے کیسی آکے زر و سیم کی جھڑی

دنیا طلب کو چاہیے ابلہ فریب ہو
دنیا پہ جب تلک کہ مسلط ہے الٰہی

وائسرائے کی کونسل کی ممبری

۱۸۷۸ء میں سر سید کو لارڈ لٹن نے وائسرئگل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور ان کے بعد دوسری دفعہ لارڈ رپن نے ان کو ممبری کونسل کے لیے انتخاب کیا۔ ہندوستانیوں میں سر سید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے قانون بنایا۔ وہ چار برس ممبر رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے دو مسودے کونسل میں پیش کیے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے پاس ہو گئے اور اس وقت سے آج تک ان کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عملدرآمد چلا آتا ہے۔

قانون وقف خاندانی

ان دونوں قانونوں کے علاوہ سر سید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ایک اور نہایت مفید خدمت بنی قوم کی کرنی چاہی تھی، مگر افسوس ہے کہ بعض موانع کے سبب وہ تدبیر پوری نہ ہو سکی۔ انھوں نے ایک مسودہ قانون وقف خاندانی کے نام سے تیار کیا تھا جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانا مقصود تھا۔ یہ قانون سنہ ۱۹۱۱ء میں مسٹر محمد علی جناح کی سرگرمی سے پاس ہوا جس میں زیادہ تر کوشش مولانا شبلی مرحوم کی تھی۔ لیکن یہ قانون اس وقت پاس ہوا جبکہ اس کی چنداں ضرورت نہ رہی تھی اور امیر خسرو کا یہ شعر مسلمانوں کی جائداد کے مصداق ہو گیا۔

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

ایجوکیشن کمیشن میں شہادت

۱۸۸۲ء میں جبکہ سر سید لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے ان کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی

اُن کا طولانی اظہار علی گڑھ گزٹ کے متعدد پرچوں میں چھپا ہوا موجود ہے جس سے اُن کا ایک بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ دراصل سرسید کمیشن مذکور کے ممبر مقرر ہوئے تھے مگر کمیشن کی کارروائی کا طریقہ اُن کی رائے کے خلاف تھا اس لیے اس کی ممبری سے کچھ روز شرکت کے بعد استعفا دیدیا لارڈ رپن کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے سرسید سے کہا کہ اگر آپ ممبری سے علٰحدہ ہوتے ہیں تو سید محمود کو اپنی جگہ ممبری قبول کرنے پر راضی کر دیجیے۔ اور آپ خود کمیشن میں شہادت دیجیے۔ چنانچہ سید محمود ان کی جگہ مقرر کیے گئے۔ اور سرسید نے شہادت دی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرنا

۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ محمڈن کالج کی حالت جب کسیقدر اطمینان کے قابل ہو گئی تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اگر یہ کالج ہر طرح سے مکمل ہو گیا، تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ پس انھوں نے ایک کانفرنس قائم کی اور اس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علی گڑھ منعقد ہوا۔ یہ کانفرنس اب تک جاری ہے۔

اس کانفرنس کی تحریک یا اقتضاء سے علاوہ دیگر فوائد کے جو اسکا مقصد اصلی تھا بہت سے عمدہ رسالے، مضامین، اور لکچر ایسے تیار ہو گئے جن سے اُردو لٹریچر میں ایک معقول اضافہ ہوا ہے جیسے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم۔ الجزیہ۔ مضمون کتب خانہ اسکندریہ۔ حقوق الذمیین۔ مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب ابوریحان بیرونی کی لائف۔ کتاب کلیلہ دمنہ کے تاریخی حالات۔ اشاعت اسلام بلا استعانت حسام۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک اور آنریبل سید محمود کے لکچر اور اسپیچیں وغیرہ وغیرہ۔

پبلک سروس کمیشن کی ممبری

۱۸۸۷ء میں سرسید کو لارڈ ڈفرن نے سول سروس کمیشن کی ممبری کے لیے انتخاب کیا اس کمیشن میں سرسید کے سوا کوئی ہندوستانی ممبر ایسا نہ تھا جو انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت نہ رکھتا ہو۔ صرف سرسید ہی ایک ایسے ممبر تھے جو انگریزی میں سوائے اپنا نام لکھنے یا ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں معمولی بات چیت کرنے کے اور کچھ نہ جانتے تھے باوجود اس کے جیسا کہ سنا گیا ہے۔ ممبری کمیشن کے فرائض انھوں نے نہایت عمدگی سے ادا کیے جس طرح وائسریگل کونسل کی ممبری میں انھوں نے ہر ایک قانون پر جو ان کی موجودگی میں پیش ہوا۔ بڑی بڑی تقریریں کیں اور قانونی لیاقت کا بہت بڑا ثبوت دیا اسی طرح سول سروس کمیشن میں تمام سوالات پر جو کمیشن کے زیر بحث تھے نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی۔

انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت

سرسید کی زندگی میں کانگرس کی مخالفت کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا اثر ہندوستان سے لیکر انگلستان تک ایک نہایت تعجب انگیز صورت میں مختلف طور سے ظاہر ہوا ہے لیکن ہم مختصر طور پر یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ سرسید نے مسلمانوں کو اس کی شرکت سے اس وجہ سے باز رکھا کہ مسلمانوں میں اسوقت مغربی تعلیم بمنزلہ صفر کے تھی اور اپنے قومی حقوق کی نگہداشت کرنے کے وہ اسوقت ناقابل تھے۔ اس لیے سرسید نے پسند نہ کیا کہ مسلمان اپنی ہستی کو ہندوؤں میں مدغم کردیں۔ اب اسوقت اسپر بحث کرنا فضول ہے اور یہ کہنا کہ ان کی رائے صحیح تھی یا غلط بیکار ہے۔ بہرحال انھوں نے جو شرکت کانگرس کی مخالفت کی وہ دلائل کے ساتھ تھی یہ لکچر انھوں نے لکھنؤ میں دیا تھا جو چھپ گیا تھا اور آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی نے اسکو ۱۹۱۶ء میں دوبارہ چھپوا کر لوگوں میں مفت تقسیم کیا تھا۔

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

اس کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے بمقام علی گڑھ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگریس میں شریک نہیں ہیں اُن کی رائیں اور خیالات اور خط و کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے ولایت کو بھیجی جاے اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شایع کیجاے۔

کے۔سی۔ایس۔آئی۔کا تمغہ ملنا

۱۸۸۸ء میں سرسید کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقہ اعلی ستارہ ہند" سے ممتاز کیا گیا۔

ڈاکٹر اوف لاز کی ڈگری

۱۸۸۹ء میں سرسید کو اڈنبرا یونیورسٹی سے بحیثیت ایک اعلے مصنف اور حامی علوم ہونے کے ایک بڑا علمی امتیاز دیا گیا یعنی ان کو اِل۔اِل ڈی کی ڈگری دی گئی۔

کالج کے روپے میں غبن

۱۸۹۵ء میں ان کو کالج کی بدولت ایک ایسا دھچکا لگا جس کا صدمہ اخیر دم تک فراموش نہیں ہوا۔ منجملہ اہلکاران دفتر سکرٹری کے ایک شخص شام بہاری لال جون ۱۸۸۳ء سے ہیڈ کلرک کے عہدہ پر مامور تھا۔ جو علی گڑھ کے ایک ممتاز کایستھ خاندان کا آدمی تھا سرسید کو اسپر اطمینان تھا اور چونکہ وہ خود انگریزی نہیں جانتے تھے اس لیے چک بک پر دستخط اس کے اطمینان پر کر دیتے تھے۔ وہ جسقدر رقم چاہتا تھا لکھ لیتا تھا کبھی کبھی سرسید کے جعلی دستخط بھی بناے۔ اور ایک دفعہ ٹرسٹیوں کی جانب سے ایک جعلی مختارنامہ بنایا غرض اس طرح سے ۶۲ ہزار روپیہ تو وہ زر امانت میں سے کھا گیا اور بیالیس ہزار پانسو ستر روپیہ نوٹوں کی کفالت پر بنیک سے قرض و صول کیا اور ایک لاکھ پانچ ہزار چارسو نو روپیہ شراب خواری اور عیاشی میں برباد کر دیا

وہ سخت منحوس اور نامبارک زمانہ تھا جس کے بعد کالج کی تعمیر بالکل بند اور آگے کو چندہ کی راہ مسدود ہو گئی۔ سرسید کا اس رنج میں گویا کام ہی تمام ہو گیا۔ لیکن انھوں نے مولانا حالی کو اس حالت میں ایک خط لکھا۔ جس کا کچھ حصہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

اگرچہ ان دنوں میری طبیعت نہایت پریشان ہے اور عدالت میں حاضر ہونے اور مقدمات میں حلفی اظہار دینے کی تکلیف نہایت سخت معلوم ہوتی ہے مگر یہ امور تقدیری ہیں۔ ان سے کچھ چارہ نہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، ایک دن میں مر جاؤں گا اور جو کچھ اسنے جعلسازی کی ہے وہ سب لپیٹ ہو جاوے گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اس کی جعلسازی اور فریب کھل گیا۔ ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپیہ تصرف کیا ہے۔ پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی یہ راز کھل گیا۔

بعض لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضہ میں تھا، حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے۔ قانون ٹرسٹیان میں حکم ہے کہ روپیہ بنک میں جمع کیا جاوے۔ چنانچہ کل روپیہ بنک میں جمع تھا اور بینک کے خزانہ سے بذریعہ جعلی چکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چکوں کو روکنا جب تک کہ ان کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں بہرحال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھل گیا گو کہ مجھکو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو"

الغرض شام بہاری لال دفعتہً فالج میں مبتلا ہو گیا اور اُس کی غیبت میں بنیک سے چٹھیاں موصول ہوئیں تو اُن کا مضمون سُنکر سرسید کو شبہہ پیدا ہوا اُنھوں نے چک بک نکلوا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہت سے چکوں کے نصف ٹکڑے جو بنیک میں بھیجے جاتے ہیں نداردہیں اور اُن کے ٹُنٹے جو چک بک میں لگے رہتے ہیں وہ کورے بغیر لکھے ہوئے لگے ہیں۔ جب روزنامچہ دیکھا تو اُن نمبروں کے کسی چک کی روانگی روزنامچہ میں مندرج نہ پائی گئی۔ اور جو ڈرافٹ کہ چکوں کے ساتھ حسب قاعدہ بنیک میں بھیجے گئے تھے اُن کی نقل بھی رجسٹر میں نہ ملی۔ آخر جب سرسید نے بنیک سے خط کتابت شروع کی اور وہاں سے تمام کاغذات کی نقلیں منگوائیں تو کلرک کی تمام چوریاں اور جعلسازیاں من وعن ظاہر ہوگئیں۔ انھوں نے حسب منشائے قانون ٹرسٹیاں فوراً اس واقعہ کی اطلاع گورنمنٹ میں بھیجدی اور دس مقدمے شام بہاری لال پر فوجداری میں دائر کیے گئے۔ یہانتک کہ صاحب مجسٹریٹ نے ان کو سشن سپرد کر دیا لیکن ابھی عدالت سشن میں روبکاری کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ وہ حوالات ہی میں غالباً کچھ کھا کر دفعتہً مرگیا۔

سرسید کی وفات

اگرچہ غبن کے واقعہ نے سرسید کی خوشدلی کو بہت کچھ مکدر کر دیا تھا مگر اس صدمہ سے ان کی طبیعت ایسی مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ اُن کی ہمت اور کوشش میں فتور آجائے وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادت کے موافق برابر انجام دیتے رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس خلش سے کبھی نجات نہوئی تھی کہ اُن کو ایک ایسی لاعلاج مصیبت پیش آئی جس کا اعادہ کرنا اس سے زیادہ سخت مصیبت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء کے نصف اخیر میں اس بیٹے کی علالت اور سوء مزاج نے جس پر نہ صرف باپ کو بلکہ تمام قوم کو فخر تھا سرسید کو آوے کی طرح بٹھا دیا ورنہ بقول ایک بڑے ڈاکٹر کے سرسید کے قویٰ ایسے عمدہ تھے کہ اگر یہ صدمہ

ان کو نہ پہنچتا تو پندرہ بیس برس تک اور زندہ رہ سکتے تھے۔ مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے اُن کو چپ لگ گئی تھی، بولتے بہت کم تھے اور ہاں یا نہیں کے سوا، بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟ سرسید نے کہا کہ اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا اسلیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔"

باایں ہمہ قومی خدمات کی دُھن اور خاصکر کالج کی بہبودی کا خیال کبھی انکے دل سے فراموش نہ ہوتا تھا۔ اسی حالت میں انھوں نے متعدد مضامین تعلیم پر لکھے انھیں دنوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کے خلاف جب تیسری بار جھگڑا اٹھا تو انھوں نے اس معاملہ کی نسبت پھر اپنی قدیم راے مرنے سے آٹھ دن پہلے ظاہر کی اور گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ انھیں دنوں میں ایک عیسائی نے رسالہ امہات المومنین اسلام کے برخلاف شایع کیا تھا۔ سرسید نے اول لطیفہ تمہید کے ایک بڑا آرٹکل اصول تنقید روایات پر اسی رسالہ کو دیکھکر لکھا۔ اُسکے بعد اس رسالہ کا جواب لکھنا شروع کیا۔ یہ جواب ابھی ختم نہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ ۹۸ء کو احتباس بول کا عارضہ لاحق ہوا۔ صاحب سول سرجن علی گڑھ بڑی توجہ سے علاج کرنے لگے مگر چونکہ وقت موعود آپہونچا تھا کوئی تدبیر کارگر نہوئی ۲۶ کی شام کو علامات ردیہ ظاہر ہونے لگیں ۲۷ مارچ کی صبح سے نہایت سخت دردِ سر لاحق ہوا۔ اسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ تپ چڑھی اور تھوڑی سی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہوگئی۔ تین گھنٹے سخت کرب و بےچینی رہی اور رات کے دس بجے نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں مرحوم کی کوٹھی میں جہاں مرنے سے دس بارہ روز

[1] نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں مرحوم دتاولی ضلع علی گڑھ کے رئیس تھے۔ یہ بزرگ سرسید مرحوم کے جاں نثار دوستوں میں تھے۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی تھے۔ تصنیف و تالیف سے بھی شغف رکھتے

پہلے حالت صحت میں وہ سید محمود کی کوٹھی سے اٹھ گئے تھے وفات پائی۔ اُن کی زبان پر حسبی اللہ و نعم الوکیل اور دو تین آیتیں قرآن شریف کی جاری تھیں۔

الغرض بعد نماز جنازہ مسجد مدرسۃ العلوم کے شمالی پہلو پر جو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اس کے احاطہ کے اندر بیکار پڑی تھی وہاں اس قوم کی امیدگاہ اور پشت پناہ کو دفن کیا گیا۔

قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت — بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند
تا قیامت گوئی از تاراج ما فارغ شدند — کایں مصیبت بر سر اسلامیاں انداختند

بقیہ صفحہ ۴۳۔ تھے چند کتابیں اُن سے یادگار ہیں۔ ایک رسالہ افادہ بھی آگرہ سے نکالتے تھے۔ آخر عمر میں زیادہ تر آگرہ ہی میں توطن اختیار کر لیا تھا اور وہیں غالباً اُن کا انتقال ہوا۔

مرحوم نہایت وجیہ اور شکیل آدمی تھے مسلمانوں کے سچے بہی خواہ تھے۔ اگرچہ بعض نوجوان انگریزوں کی تملق و خوشامد کی وجہ سے ان کو برا کہتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ عیب تھا تو کم و بیش اس زمانہ کے تمام مسلمانوں میں یہ نقص پایا جاتا تھا۔ مرحوم کو ہدفِ ملامت بنانا بیجا تھا۔

مرحوم رسالہ معارف علی گڑھ کے بھی جوائنٹ ایڈیٹر رہ چکے تھے اور اس زمانہ کے بعض ترجمے جو انھوں نے ترکی سے اردو میں کیے تھے بیحد نفیس ہیں۔ سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کو بھی ترکی زبان سیکھنے کا فخر مرحوم ہی کی بدولت حاصل ہوا۔ مرحوم ترکی زبان کے اخبارات و رسائل منگایا کرتے تھے اور ان کو دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ اگرچہ مرحوم ایک پرانے بزرگ تھے لیکن آزاد خیال اور آزاد منش تھے راقم کو مرحوم کی خدمت میں باریابی سنہ ۱۹۰۶ء میں ہوئی جبکہ راقم نینی تال پر مقیم تھا اور سنہ ۱۹۰۵ء میں انٹرنس پاس کرنے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ راقم کی نظمیں اور مضامین روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں دیکھکر مرحوم نے نینی تال کے بعض اشخاص سے راقم کا پتہ دریافت کیا اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا جسوقت راقم کو مرحوم کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تو مرحوم نے بیحد اصرار کیا کہ راقم اپنا سلسلۂ تعلیم دوبارہ جاری کرے اور اسکو تکمیل تک پہونچائے۔ چنانچہ یہ خاکسار علی گڑھ کالج میں جاکر داخل ہوگیا اور وہاں سے ایف اے پاس کرکے میرٹھ کالج چلا آیا جہاں سے بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی نواب صاحب مغفور خاکسار سے بیحد محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ اپنا رسالہ افادہ بھی خاکسار کو بھیجتے رہتے تھے۔ غالباً سنہ ۱۹۱۲ء میں مرحوم نے چھپن برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

سرسید کے اخلاق سرسید کے اخلاق کی نسبت مسٹر بک کا قول نقل کر دینا کافی ہے۔ انھوں نے سرسید کے انتقال کے بعد کہا تھا کہ "گو اُن کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اس کے اخلاق اُن سے بھی بڑے تھے"

سرسید کے حالات زندگی ہماری کتاب کے لحاظ سے کسی قدر طویل ہو گئے ہیں لیکن یہ ایک ایسا محب قوم گزرا ہے جس کی مثال شاید اس صدی میں مشکل سے ہندوستان پیدا کر سکے۔

لہذا ناظرین با تمکین اس طوالت سے منغص نہ ہوں گے بلکہ سرسید کی زندگی کے حالات سے استفادہ حاصل کریں گے اور دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔ اب ہم کو سرسید کے انداز تحریر کی نسبت رائے ظاہر کرنا ہے اور کچھ نمونہ اُن کی تحریر کا پیش کرنا ہے یہ کام بہت دشوار تھا لیکن مولانا حالی کے طفیل سے آسان ہو گیا۔ لہذا حیات جاوید سے ہم مولانا حالی کی رائے بجنسہ نقل کرتے ہیں۔

طرز تحریر اگرچہ سرسید کی طبیعت ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ جو کام ان کو پیش آتا تھا اس میں وہ ایسی دلچسپی ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہی اُن کا خاص کام اور ضروری فرض تھا مگر خود ان کا یہ بیان تھا کہ جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا اور کسی کام میں نہیں لگتا۔ سرسید میں قوت استدلال بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے تیس بتیس برس کے عرصہ میں اردو لٹریچر کا رخ پھیر دیا اور مسلمانوں کے پولیٹیکل، سوشل اور مذہبی خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اُن کے یہاں تشبیہات و استعارات صنائع لفظی و معنوی، شاعرانہ نزاکتیں، فاضلانہ و منشیانہ تراش خراش نظر نہیں آتیں البتہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی سرسید کی تحریر کی عام خاصیت ہے وہ قواعد اردو کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے چنانچہ بچپن میں انھوں نے

اپنے نانا کو بوستاں کا سبق سنایا تو اس مصرع کا ترجمہ "طمع را سہ حرف ست و ہرسہ تہی"، انھوں نے "طمع کے تین حرف تینوں خالی" کیا نانا نے تین دفعہ ٹوکا اور بہت خفا ہوے مگر یہ وہی معنے کیے گئے۔ چونکہ محاورہ کے موافق صحیح بھی فصیح تھا اس لیے قواعد اردو کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال ان کا اس بچپن کے زمانہ میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تحریر یا تقریر کی رو میں قواعد اردو کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ وہ اُن قیدوں سے جو شاعروں اور انشا پردازوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے۔ وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص وعام کی زبان پر جاری ہوں صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی زبان لی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی اُن کی زبان اور وہی بول چال تھی۔

غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اسی ایک مقصد کے لیے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے۔ اور کوئی سادگی۔ کوئی کلام کی بنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر۔ کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ ڈھونڈھ کر اہل زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے اس طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر۔ مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو ان باتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔

بیشک کلام کے موثر ہونے کے لیے اس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا

وہ موثر بھی ضرور ہوگا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت ان کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔ باوجودیکہ مسلمان صدہا سال سے ہر چیز میں اگلوں کی لکیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات جس سے کبھی اُن کے کان آشنا نہ ہوئے ہوں ہرگز سننی نہیں چاہتے تھے مگر سچ میں وہ کرشمہ ہے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا۔ سرسید کی تحریر میں یہی چیز تھی جس نے ان سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادو کا اثر پیدا کر دیا تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی۔

سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں موجود ہیں مگر وہ ایسی اجاگر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنفوں کے کلام میں ہوتی ہیں۔ ورنہ صنائع لفظی کے سوا اس میں تمام محاسن لفظی و معنوی پائے جاتے ہیں۔ تشبیہیں بھی ہیں استعارے بھی ہیں کنائے بھی ہیں۔ تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں۔ بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش اور دلفریب ہیں۔ کہاوتیں اور اشعار برمحل جا بجا نظر آتے ہیں۔ مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اس میں ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنف کے قلم سے ٹپکی ہے۔

مگر جو چیز کہ سرسید اور دیگر مصنفوں اور مضمون نگاروں میں ما بہ الامتیاز ہے وہ **قدرت بیان** ہے جس کے ثبوت کے لیے خود ان کی مختلف تحریروں کا دیکھ لینا کافی ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو پانی کی طرح بہا دیتے تھے۔ وہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں جو اس کے لیے موزوں ہے۔ حالانکہ خود ان کو خبر نہیں ہوتی کہ کس مضمون کے لیے کونسا پیرایۂ بیان موزوں ہے مگر تحریر کی قدرتی قابلیت بغیر قصد و ارادہ کے قلم کو اسی راہ پر ڈال دیتی ہے جس پر اس کو چلنا چاہیے۔ اگر علمی

اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کیسی روانی ہے تو مذہبی اور پولٹیکل تحریریں
میں چڑھاؤ کی تیزی کا ساز و رہے۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور
سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلے میں ظرافت و خوش طبعی
نصیحتیں نشتر سے زیادہ دلخراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں۔ عفو مہربانی
سے زیادہ پر لطف ہے۔ اور نفرین آفرین سے زیادہ خوش آیند۔ وہی ایک
قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں سعدی کے ہاتھ میں ہے تو عدالت کے
فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں۔ اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں
کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکریٹری کے ہاتھ میں۔

تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں آدم کی سرگذشت ایک قصہ
کے پیرایہ میں بیان کی ہے، وہاں اس موقع پر جبکہ آدم نے محض تنہائی اور سناٹے
کے عالم میں حوا کو اچانک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے پایا اور اس سے بے انتہا
خوشی حاصل ہوئی۔ خدا کے شکر کے چند الفاظ فرضی طور پر آدم کی زبان سے اس
بات کا تصور دلانے کے لیے لکھے ہیں۔

گویا آدم کہتا ہے کہ "جب میں نے اپنے ہمجنس (یعنی حوا) کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھا
تو میں بہت خوش ہوا اور تالیاں بجا کر خوب اُچھلا اور خوب کودا، اور اوپر کو
دیکھ دیکھ کر ایک بڑی ہستی کا خیال کر کے خوب گیت گائے اور نہایت ذوق
و شوق میں یوں چلایا "او! او! ارے او! ارے او! ارے وہ جو ہے! ارے وہ جو ہے! ارے
وہ جو رہے گا! ارے وہ جو رہے گا! ارے وہ جو تو ہی ہے! ارے وہ تو ہی ہے
میرا شکر لے۔ اس انجان جانب کا دینے میرا شکر لیا۔ اب تم سب اسی برکت
کے پھل پھول ہو۔"

اگرچہ بادی النظر میں یہ مثال بہت کم وزن اور حقیر معلوم ہوگی مگر موقع کا

تصور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو حالت ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے اس کے بیان کرنے کے لیے ان سے بہتر الفاظ ملنے کسقدر مشکل تھے۔

دوسرے مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب کو اس طرح سلجھا کر ادا کر جانا کہ جو مضمون لفظوں میں سماتا نظر نہ آتا ہو وہ ایسی خوبی سے ادا ہو جائے جیسے انگوٹھی پر نگیں جڑ دیا۔ اس لحاظ سے جو قدرت سرسید کے قلم میں دیکھی گئی ہو وہ فی الواقع نادر الوجود تھی۔

تیسرے واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ جو برائیاں بسبب الفت و عادت کے دلوں میں کھب گئی ہوں اُن کی برائی اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں اُن کی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔ یہ کمال بھی جو سرسید کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے دوسری جگہ آج تک نہیں دیکھا گیا۔

ایک مضمون میں بے تہذیب آدمیوں کی بحث و تکرار کی تصویر اس طرح کھینچی ہے :-

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا تھوڑا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں، اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں، اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں، اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ

اس کی کمر ہیں، اس کا کان اس کے منہ میں اور ایک ٹینٹوا اس کے جبڑے میں
اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا

"نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے، ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ! یوں نہیں، یوں ہے؛ وہ کہتا ہے واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراونی ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں، اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اُس کی مٹھی میں پاڈکی ہونے لگتی ہے، کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جسقدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں تو تکار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گزر جاتی ہے مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔"

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ سرسید نے جہاں مذہب میں، لٹریچر میں، رسم و رواج میں، اخلاق و عادات میں، طریق معاشرت میں انقلاب برپا کر دیا، وہاں

اردو کی طرز تحریر کو بھی بدل دیا۔ جو صفائی اور سلاست، تہذیب اور شائستگی اور گھلاوٹ آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے اور جسقدر مضمون نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہاں تک اہل قلم میں ہر قسم کے معاملات پر آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے اگر ذرا غور کرکے دیکھا جائے تو یہ سب اسی ایک قلم کی آواز بازگشت ہے۔ انیس نے جو یہ شعر۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے میں انبار

خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

محض تعلّی سے لکھا تھا سرسید کے حال میں واقعہ ہوگیا۔

ذیل میں تہذیب الاخلاق جلد دوم اور آثار الصنادید اور سیرت فریدیہ سے مختصر اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

(از تہذیب الاخلاق جلد دوم۔)

امید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی چمکنے والی دھنک۔ اے آسمان کے تارو تمہاری خوشنما چمک۔ اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنیوالی دھندلی چوٹیو۔ اے پہاڑوں کے عالی شان درختو۔ اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دل کش بیل بوٹو۔ تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں کے اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے کہ ہم سے بہت دور ہو۔ اس دوری نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے۔ اس دوری ہی سے تمھارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھاتا ہے۔ ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی ہمکو زیادہ خوش کرنیوالی ہے۔ وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے؟ جس کو سب

سب سے اعلےٰ سمجھتے ہیں۔ کیا وہ ہم کو آیندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے
ہرگز نہیں۔ اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے، بڑی دوڑ دھوپ کرے تو
پنجر تک اس کی رسائی ہے جو سب کے سامنے ہے۔

اے نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی امید! یہ خدائی
روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی
دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی
بدولت نہایت دور دراز خوشیاں ہم کو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی
سہارے سے زندگی کی مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے
ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لیے؛
نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری، بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے
لیے محبت، محبت کے لیے نیکی، نیکی کے لیے تیار رہتی ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں
اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں۔

وہ پہلا گنہگار انسان جبکہ شیطان کے چنگل میں پھنسا اور تمام بدیوں نے اسے
گھیرا تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی۔ تو نے اس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا
تو نے ہی اس موت میں پھنسے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو نے ہی اس کو اس ذلت
سے نکالا اور پھر اس کو اعلیٰ درجہ پر پہونچایا جہاں کہ فرشتوں نے اسکو سجدہ کیا تھا۔

اس نیک نبی کو جس نے سیکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت
اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا
ناخدا جب کہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر
نہیں آتا تھا تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار
لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔

اے آسمانوں کی روشنی اور اے ناامیدوں کی تسلی امید! تیرے ہی شاد آب اور سرسبز باغ سے ہر ایک کی محنت کا پھل ملتا ہے۔ تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے تجھ سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے۔

عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈھتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں، اس کے دل کو راحت دیتی ہیں۔ اُس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ نادان اے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے، اُس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے سورہ میرے بچے سورہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ۔ اے میرے دل کی کونپل سورہ۔ بڑھ اور پھل پھول۔ تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے۔ تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجکو نہ آوے کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے۔ سورہ میرے بچے سورہ میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ۔ تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کریگا آخرکار ہمارے دل کو تسلی دینگے۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہوگی۔ تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کرینگی۔ تیری آواز ہمارے لیے خوش آیند

راگنیاں ہوں گی۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ اے ہماری امیدوں کے
پودے سورہ۔ بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاوینگے تو تم کیا
کروگے۔ تم ہماری بیجان لاش پاس کھڑے ہوگے۔ تم پوچھوگے اور ہم کچھ
نہ بولیں گے۔ تم روؤگے اور ہم کچھ رحم نہ کرینگے۔ اے میرے پیارے رونیوالے
تم ہمارے ڈھیر پہ آکر ہماری روح کو خوش کروگے۔ آہ ہم نہ ہوں گے اور تم
ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤگے۔ اپنی ماں کا محبت بھرا چہرا، اپنے باپ
کی نورانی صورت یاد کروگے۔ آہ ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت
یاد کر کر تم رنجیدہ ہوگے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ سورہ میرے پالے سورہ۔

یہ امید کی خوشیاں ماں کو اسوقت تھیں جبکہ بچہ غوں غاں بھی نہیں
کرسکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل
کو شاد کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا، اُس کی پیاری آواز، ادھورے
لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی۔ آنسوؤں سے اپنی ماں کی
آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو
اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غمزدہ دل سے سنانے لگا اور جبکہ وہ
تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح
کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے اپنے بھولے
خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہوگئیں
اس کے ماں باپ، اس معصوم سینہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے
ہیں اور ہماری پیاری امید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو وہ بڈھا آنکھوں سے اندھا، اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا
پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہوگیا ہے۔ وہ اسکو ڈھونڈتا پھر

پر وہ نہیں ملتا۔ مایوس ہے۔ پر امید نہیں ٹوٹی۔ لہو بھرا دانتوں بھٹا کرتا دکھتا ہے پر ملنے سے ناامید نہیں۔ فاقوں سے خشک ہے۔ غم سے زار نزار ہے۔ روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں، کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ مگر صرف ایک امید ہے جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ اور اس خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھو وہ بے گناہ قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات تہ خانوں میں بند ہے اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے۔ بے یار و دیار غیر قوم غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم، اس کی روح کو صدمہ پہنچاتا ہے عزیز بھائی کی جدائی اس کے دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانہ کی مصیبت، اس کی تنہائی، اس گھر کا اندھیرا اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال اس کو نہایت ہی رنجیدہ رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید۔ تجھ ہی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے در پیش ہیں مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے لڑائی کے میدان میں جبکہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سن سان کا عالم ہوتا ہے۔ دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے۔ اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہنچتی ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے۔ اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے

تو اے بہادروں کی قوت بازو۔ اور اے بہادری کی ماں۔ تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال اُن کے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کان نقارہ کیا سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے، ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ اُن کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے، انھیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم، فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی، بند، عزیز، اقارب، سب سمجھاتے ہیں اور یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں کر کر محنت اور دلسوزی سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں، پر کوٹھی کھٹلے سے الگ کر کر۔ دل ہر وقت بیقرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ مگر اے بیقرار دلوں کی راحت اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت! تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ رہ تو ہی ہمارے دل کی تسلی ہے، تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچیں گے۔ تیرے ہی سبب گو ہر مراد کو پاوینگے۔ او ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے ہمدی کی پیاری "امید" تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید، جبکہ زندگی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور

دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے۔ منھ پر مردنی چھاتی ہے، ہوا ہوا میں، پانی پانی میں مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔

اس وقت اس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے، تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے، تیری صدا کان میں آتی ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی امید ہوتی ہے۔ یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لیے موسم بہار کی آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس لازوال آنے والی خوشی کی اُمید تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے۔

او ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہنچی۔ تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشہ اور امید کے ہادی اور توکل کی سواری سے مگر ان سب میں جسکو سب سے زیادہ قوت ہے وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام "امید" ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرنے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے۔ اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے وہ اپنے اس بے تکلف

آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

(مضمون مندرجۂ بالا میں فلسفیانہ عمق اور انشاپردازانہ انداز دونوں موجود ہیں اس عنوان پر اس سے بہتر مضمون لکھنا مشکل ہے۔ خیالات کی روانی اور الفاظ کی برجستگی ہویدا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سرسید نے یہ مضمون اسوقت لکھا تھا جب علی گڑھ کالج کی ضروریات نہایت شدید تھیں اور لوگ اُن کی امداد بہت کمی کے ساتھ کرتے تھے۔ مایوسی کے عالم میں یہ مضمون لکھکر اپنے دل کو تسکین دی ہے اور کالج کے لیے چندہ کی حسن طلب بھی اس میں پنہاں ہے۔ تنہا)

تعلیم

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے، جیسے کہ بے سنگ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے کہ جب تک سنگتراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کا دھندلا اور کھردراپن دور نہیں کرتا، اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اسکو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا۔ اسوقت تک اس کے جوہر اسی میں چھپے رہتے ہیں اور اُس کی خوشنمانسیں اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیا ہی نیک ہو مگر جب تک اسپر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا۔ اسوقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہوسکتیں ظاہر نہیں ہوتیں۔

ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسم مورتوں کے بنانے کی تشبیہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موہنی مورت، ایک پتھر کے ڈھوے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر مورت بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو اس میں سے گھڑ دیتا ہے۔ مورت تو پتھر ہی کی ہوتی ہے مگر آذر صرف اس کو نمود کر دیتا ہے جو نسبت کہ گھڑنے والے کو اس پتھر کے ڈھوے سے ہے، وہی نسبت تعلیم کو انسان کی روح سے ہے۔ بڑے بڑے حکیم اور عالم اولی و ابدال نیک و عقلمند، بہادر و نامور ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں جب میں جاہل اور وحشی قوموں کے حالات پڑھتا ہوں تو ان نیکیوں سے جو ان میں ہیں مگر ناشایستہ اور اس دلیری اور جرأت سے جو ان میں ہے مگر خوفناک اور اس استقلال سے جو ان میں ہے مگر بے ڈھنگا اور اس دانائی اور عقلمندی سے جو ان میں ہے مگر جانوروں کے سے مکر و فریب سے ملی ہوئی اور اس صبر و قناعت سے جو ان میں ہے اور گویا ناامیدیاں ہی ان کی امیدیں ہیں نہایت خوش ہوتا ہوں۔ سچ ہے کہ انسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں اور جس قدر کم و بیش عقل کی ہدایت ان کو ہوتی ہے اور جسقدر کہ عقل ان جوشوں کو درست کرتی ہے، اسی قدر مختلف طور پر ان سے کام ہوتے ہیں۔ امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب ہم یہ حال سنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر یا ایک کام پر سے چھٹ کر دوسرے کام میں لگنے پر جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دیتے ہیں یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر ستی ہو جاتی ہے تو کون شخص ہے جو ان کی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کریگا

گو کہ کیسے ہی ناشائستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس قسم کی جاہل اور وحشی قوموں کے دلوں میں بھی نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں گو وہ وحشی پنے ہی کی حالت میں کیوں نہ ہوں لیکن اگر ان کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے درستی کی جاوے تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پا سکتی ہیں اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب اور شائستہ نیکیاں اُن سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

مجھ کو اس بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ۔ ان میں نہایت دلیری اور جرات پاتا ہوں، پر خوفناک۔ اُن میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا۔ ان کو نہایت دانا اور عقلمند پاتا ہوں پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے ہوئے۔ اُن میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع۔ پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی اُن کی عمدہ صفتیں۔ عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی کچھ مفید ہوں*۔"

(از آثار الصناديد)

قطب صاحب کی لاٹھ یا مینار یا مادنہ

اس عمارت کی رفعت اور شان اور بلندی اور خوشنمائی کا بیان نہیں کیا جا سکتا حقیقت میں یہ عمارت ایسی ہے کہ روئے زمیں پر اپنا مثل نہیں رکھتی نقل مشہور ہے کہ

*یہ مضمون کسی انگریزی مضمون کا چربہ ہے۔ لیکن سرسید نے اس کو اس عمدگی کے ساتھ لکھا ہے کہ اصل سے بڑھ گیا ہے حقیقتاً سرسید کا انداز تحریر قابل رشک ہے کیا کوئی شخص تعلیم پر اس سے بہتر انشا پردازی کا مدعی ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جو انداز لائق مضمون نگار نے اختیار کیا ہے اس سے بہتر سمجھ میں نہیں آتا۔

(تنہا)

اگر اس کے نیچے کھڑے ہو کر اوپر دیکھو تو ٹوپی والے کو ٹوپی اور پگڑی والے کو
پگڑی تھام کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لاٹھ پر سے نیچے کے آدمی ذرا ذرا سے
معلوم ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے آدمی ننھے ننھے ہاتھی گھوڑے دکھائی
دینے سے عجب کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح نیچے والوں کو اوپر کے
آدمی بہت چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا
فرشتے آسمان سے اُترتے ہیں۔ غرضکہ یہ لاٹھ عجائب روزگار سے ہے۔
باوجود اس قدر بلندی اور عظمت کے ایسی خوبصورت اور خوش قطع بنی
کہ بے اختیار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس لاٹھ کے نیچے کے درجے کی
ایک پخ مدور اور ایک کمر کی بنائی ہے اور دوسرے درجے کی سب پخیں مدوّر
ہیں اور تیسرے درجے کی سب پخیں کمر کی ہیں اور اوپر کے دونوں درجے
گول ہیں اور تمام پتھر سنگ سُرخ کا لگا ہوا ہے۔ مگر چوتھے درجے میں سنگ مرمر
بھی ہے اور ہر جگہ مبنت کاری اور گلکاری ایسی خوبصورتی سے کی ہے
کہ اس کی ہر ایک بیل مسلسل پر ہزاروں معشوقوں کی زلف دوتا قربان ہے
اور اسکے ادنی سے ادنی پھول پنکھڑی پر سیکڑوں گلرخوں کے لب جاں بخش
نثار ہیں۔ مگر اس لاٹھ کی بنا میں بہت گفتگو ہے مسلمانوں میں بہت مشہور ہے
کہ یہ لاٹھ سلطان شمس الدین التمش کی بنائی ہوئی ہے اور اکثر تاریخ[۱] کی کتابوں
میں اور کتبۂ عہد سکندر بہلول میں اس لاٹھ کو سلطان شمس الدین التمش کی لاٹھ کر کر
لکھا ہے اور بعضی کتابوں میں اس لاٹھ کو مسجد کا ماذنہ[۲] لکھا ہے اور بعضی کتابوں[۳]
میں اس لاٹھ کو سلطان معز الدین کی لاٹھ لکھا ہے۔ مگر اس سبب سے کہ اس لاٹھ
کا پہلا دروازہ شمال رویہ ہے اور ہندوؤں کے مندر کی عمارت کا دروازہ

[۱] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف [۲] تقویم البلدان [۳] فتوحات فیروز شاہی۔

ہمیشہ شمال رویہ ہوتا ہے، برخلاف ماذنوں کے کہ اُن کے دروازے ہمیشہ
شرق رویہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ سلطان علاء الدین نے جو لاٹھ بنانی شروع کی
اس کا شرق رویہ دروازہ رکھا اور نیز اس سبب سے کہ اکثر مسلمانوں کی عادت
ہے کہ ایسی عمارت کو کرسی دیکر بناتے ہیں جیسے کہ سلطان علاء الدین نے
اپنی لاٹھ کو کرسی دیکر بنانا شروع کیا تھا۔ برخلاف ہندؤں کے کہ وہ بدون
کرسی بناتے ہیں جیسے کہ یہ لاٹھ بنی ہوئی ہے اور نیز اس سبب سے کہ اس
لاٹھ کے پہلے درجے کے پتھر کتبوں کے مقام سے ایسے معلوم ہوتے ہیں
جیسے چھیپ کر لگائے ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ جس طرح اصل بت خانہ میں
زنجیروں میں گھنٹے لٹکتے ہوئے پتھروں پر کھودے ہیں، اسی طرح اس پہلے کھنڈ
پر زنجیروں میں گھنٹے لٹکتے ہوئے کھدے ہوئے ہیں اور نیز اس دلیل سے کہ
جس طرح کتبہ فتح ملنے کا بنام قطب الدین ایبک سپہ سالار اور دوسرا
معز الدین کے نام کا اصل بت خانے پر ہے، اسی طرح اس لاٹھ پر غالب ہے
کہ پہلا کھنڈ اس لاٹھ کا ہندوؤں کے وقت کا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اس پہلے
کھنڈ میں جہاں جہاں کتبہ کھدا ہوا ہے وہاں پہلے بتوں کی مورتیں ہوں۔ اس
سبب سے وہ پتھر نکال کر یہ کتبے جنمیں بادشاہوں کے نام اور قرآن کی آئتیں
ہیں لگائے ہوں اور جن میں بادشاہ کی تعریف ہے۔ جو بات کہ مدت سے مشہور
چلی آتی ہے کہ یہ لاٹھ رائے پتھورا نے اپنے قلعہ اور بت خانے کے ساتھ یعنی
سمبت ۱۱۔۔ بکرماجیت مطابق ۱۱۔۔ عیسوی موافق ۵۔۔ ہجری کے بنائی،
صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کی بیٹی سورج مکھی مذہب کی تھی اور ہندو جمنا کو سورج
کی بیٹی اعتقاد کرتے ہیں۔ اس واسطے اس مذہب والے جمنا کا درشن کرنا بھی
بڑا دھرم جانتے ہیں۔ اس سبب سے جمنا کے درشن کو اس لاٹھ کا پہلا کھنڈ بنا

سنہ ۵۸۷ ہجری مطابق سنہ ۱۱۹۱ء میں جب یہ بت خانہ مسلمانوں نے فتح کیا
تو اس پر اپنے نام کے کتبے لگائے[51] اور **فضل ابن ابو المعالی** کو متولی کیا
اور اس کا نام پتھر[52] پر کھود کر دروازے کے پاس لگا دیا۔ جس زمانے میں سلطان
شمس الدین التمش نے اس مسجد کے ادھر ادھر تین تین در بڑھائے یعنی سنہ ۶۲۷ھ
مطابق سنہ ۱۲۲۹ء کے اسی زمانہ میں اس لاٹھ کو بھی بڑھایا اور دوسرے
کھنڈ کے دروازے پر اس[53] کا حال کھدوایا۔ اور جب سے اس کا نام مأذنہ لکھا
اور ہر درجے پر اس کا نام کتبہ[54] اور جمعے کی نماز کی آیت کو کھودا اور معمار کا نام لکھا
اگرچہ اب اس لاٹھ کے پانچ کھنڈ ہیں لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ جس طرح
مشہور ہے پہلے اس لاٹھ کے سات کھنڈ تھے اور منارہ **ہفت منظری**
کے نام سے بھی یہ لاٹھ مشہور ہے اور جہاں اب کٹہرا لگا ہوا ہے وہاں ایسے
کنگورے بنے ہوئے تھے جیسے فصیلوں کے ہوتے ہیں اور پانچویں درجے پر
ایک درجہ تھا کہ اس کے چاروں طرف دروازے تھے اور اس کے اوپر لٹو
یعنی برجی کے مثل راس مخروط لدا ہوا تھا کہ ساتواں درجہ شمار میں آتا تھا۔
یہ ساتواں درجہ سنہ ۷۷۰ ہجری مطابق سنہ ۱۳۶۸ عیسوی میں فیروز شاہ نے بنایا تھا
کیونکہ وہ لکھتا ہے کہ مرمت[55] کے وقت میں نے اس لاٹھ کو جتنی پہلے تھی اس سے
اونچا کر دیا اور اس لاٹھ کی مرمت کا حال پانچوں کھنڈ کے دروازے پر کھدوا[56] دیا
بعد اس کے پھر لاٹھ مرمت طلب ہو گئی تھی۔ سنہ ۹۰۹ ہجری مطابق سنہ ۱۵۰۳ء
میں فتح خاں نے سلطان سکندر بہلول کے وقت میں مرمت کی اور اس کا حال
کھدوا کر پہلے دروازے کی پیشانی پر لکھوا دیا[57]۔ مشہور ہے کہ تخمیناً سنہ ۱۲۱۱ھ مطابق سنہ ۱۷۹۴ء

[51] دیکھو کتبہ نمبر ۹ [52] دیکھو کتبہ نمبر ۱۰ [53] دیکھو کتبہ نمبر ۱۱ [54] دیکھو کتبہ نمبر ۱۲ [55] فتوحات فیروز شاہی
[56] دیکھو کتبہ نمبر ۱۳ [57] دیکھو کتبہ نمبر ۱۴۔

کے کالی آندھی اور بھونچال کے صدمے سے اوپر کے کھنڈ گر پڑے تھے اور نیز
بسبب پُرانے ہونے کے پہلے کھنڈ کے پتھر بہت گر پڑے تھے اور اکثر جگہ کے
شکستہ ہو گئے تھے ۱۸۱۶ء مطابق ۱۲۳۵ھ کے سرکار دولتمدار انگریزی کے
حکم سے مسٹر سمٹ صاحب، گذمہ کپتان نے اس لاٹھ کی اول سے آخر تک
مرمت کی اور جس جگہ کہ کنگورے تھے وہاں سنگین کٹھرا بہت مستحکم لگا دیا اور پانچویں
درجے پر برجی کٹھرا بہت خوبصورت بنا دیا اور چھٹے کھنڈ کی جگہ سنگین آٹھ دری
برجی نہایت خوبصورت اور ساتویں کی جگہ کاٹ کی برجی لگائی تھی اور اسپر پھریرا
کھڑا کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ وہ دونوں برجیاں قائم نرہ سکیں۔ اس سبب سے
سنگین برجی کو لاٹھ پر سے اُتار کر نیچے کھڑا کر دیا ہے اور کاٹ کی برجی ضائع
ہو گئی۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ مرمت کے وقت اس لاٹھ کے کتبوں کے
حرف جو گر پڑے تھے بالکل غلط بنائے ہیں۔ اکثر جگہ صورت لفظوں کی بنا دی
ہے جب غور کر کر دیکھو تو وہ لفظ نہیں ہے، صرف نقش ہیں اور بعضے غلط لفظ
بنا دیے ہیں اور بعضی جگہ اپنی طرف سے ایسی عبارت کھود دی ہے کہ اصلی
کتبے کے مضمون سے بالکل علاقہ نہیں رکھتی۔ آج تک اس لاٹھ کے کتبے نہیں
پڑھے گئے تھے ہمنے سارے کتبے دوربین کی استعانت سے پڑھے۔ پہلا کھنڈ
اس لاٹھ کا بتیس گز کئی انچھ اور دوسرا کھنڈ سترہ گز کئی انچھ اور تیسرا کھنڈ سوا آٹھ
گز اور پانچواں کھنڈ بھی مع اس تھوڑی سی اونچائی کے جو کٹھرے کے اندر ہے سوا
آٹھ گز اونچا ہے۔ اس حساب سے کل اونچائی اس لاٹھ کے پانچوں کھنڈوں
کی جواب موجود ہیں قریب اسی گز کے ہوتی ہے اور سنگین برجی کی اونچائی
جو سرکار انگریزی نے چڑھائی تھی اور اب اُتار کر نیچے رکھدی ہے چھ گز ہے
کہ چوبی برجی اور پھریرے کی اونچائی ملکر یہ لاٹھ سو گز اونچی ہے اور مشہور

بھی یہی ہے کہ جب اس لاٹھ کے ساتوں کھنڈ قائم تھے تو یہ لاٹھ سو گز اونچی تھی۔ اس لاٹھ کی جڑ کا پچاس گز محیط ہے اور سرے پر کا دس گز ہے۔ یہ لاٹھ اندر سے بالکل خالی ہے اور اس میں چکردار سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ پہلے درجے میں ایکسو چھپن اور دوسرے درجے میں اٹھتر اور تیسرے درجے میں باسٹھ اور چوتھے میں اکتالیس اور پانچویں میں بھی اکتالیس ہیں کہ کل سیڑھیاں اس لاٹھ کی تین سو اٹھتر ہوئیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی قدر سیڑھیاں ہوں گی کیونکہ اوپر کے دونوں درجوں میں چڑھنے کا راستہ نہ تھا۔

تعمیر سلطان علاء الدین

لاٹھ کے پاس کا بڑا دروازہ

"جبکہ سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی بادشاہ ہوا اور اس کے دل میں عمارت کا شوق آیا اس نے سنہ [illegible] ہجری مطابق سنہ [illegible] عیسوی اسی مسجد کے لیے بہت بڑا دروازہ لاٹھ کے پاس بنوایا۔ یہ دروازہ[۵۱] بالکل سنگ سرخ کا ہے اور کہیں کہیں سنگ مرمر بھی لگا ہوا ہے اس کے چاروں طرف چار دروازے بنائے ہیں اور چھت کا بطور برج کے بہت اونچا لداؤ لادا ہے۔ ہر ایک جگہ بہت تحفہ منبت کاری اور گلکاری کی ہے اور حدیثیں اور قرآن کی آیتیں کھدوا دی ہیں اور غربی[۵۲] اور جنوبی[۵۳] اور شرقی[۵۴] دروازے پر اپنے نام کا کتبہ لگایا ہے مگر اس کتبے کے بہت پتھر گر پڑے ہیں۔ اور بعضے حرفوں کو شمد بھی کھا گیا ہے اس دروازے کے بن چکنے کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ اس مسجد میں

۵۱ خزائن الفتوح یعنی تاریخ علائی ۵۲ دیکھو کتبہ نمبر ۱۵ ۵۳ دیکھو کتبہ نمبر ۱۶ ۵۴ دیکھو کتبہ نمبر ۱۷۔

چوتھا[1] درجہ سلطان علاء الدین کے حکم سے بننا شروع ہوا۔ یہ درجہ ایک سو پچیس گز کا سہ فٹے گز سے بنایا تھا اور نو دروں کی بنیاد رکھی تھی اور بیچ کا در سولہ گز کا چوڑا رکھا سنہ ۷۱۱ ہجری مطابق سنہ ۱۳۱۱ عیسوی میں یہ عمارت بن رہی تھی افسوس کہ بادشاہ کی عمر نے وفا نہ کی کہ سنہ ۷۱۵ ہجری مطابق سنہ ۱۳۱۵ عیسوی کے مر گیا۔ اور یہ مسجد ناتمام رہ گئی اگر یہ عمارت پوری ہو جاتی تو ساری مسجد بلکہ ضلع شرقی غربی اس کا دو سو اکتالیس گز کا لنبا اور ضلع جنوبی شمالی ایک سو بیس گز کا لنبا ہوتا۔ اس جانب کو بادشاہ نے ایک دروازہ بنانا شروع کیا تھا مگر وہ بھی ناتمام رہ گیا۔ ان ناتمام عمارتوں میں بھی نہایت جنبت کاری کے پتھر لگے تھے اور کتبے اور حدیثیں کھدوائی تھیں۔ معلوم نہیں کہ پتھر کون اکھیڑ لے گیا کیونکہ صاف پتھر اکھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اب بجز چونے اور پتھر کی چنائی کے اور کچھ نہیں رہا۔ اس مسجد کی تعریف قران السعدین میں امیر خسرو نے لکھی ہے اور یہ ایک شعر اسمیں کہا ہے

مسجد او جامع فیض الہ   زمزمۂ خطبۂ او تا بماہ"

اقتباس مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو قلم انشا پردازی میں کمال رکھتا ہو وہ تعمیرات کے حالات بیان کرنے میں بھی یگانہ ہے۔ کس سادگی اور خوبی کے ساتھ عمارات کے حالات لکھے ہیں۔ گذشتہ دو مضمونوں میں بلند پردازی کے ساتھ محاکات و تخئیل موجود ہیں۔ عمارت کا حال لکھنے میں وہی قلم واقعات نگاری سے کام لیتا ہے اور اب ذیل میں سیرت نگاری سے کس عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتا ہے۔

از سیرت فریدیہ۔

"خواجہ فرید الدین احمد سنہ ۱۲۱۱ ہجری مطابق سنہ ۱۷۹۶ عیسوی کے دلی سے

---

[1] خزائن الفتوح یعنی تاریخ علائی۔

نکلے تھے اور ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء کے بارہ تیرہ برس کے بعد واپس آئے
اس عرصہ میں دلّی میں بہت سے واقعات گزر چکے تھے۔

جب وہ گئے تو شاہ عالم بادشاہ تھے، اُن کی آنکھیں نکل چکی تھیں اور اُن کی حالت نہایت خستہ اور خراب تھی۔ اُنھوں نے اپنی خستہ حالی کے بیان میں ایک غزل لکھی ہے اور ہر ایک سے اور نیز انگریزوں سے مدد چاہی ہے ہم اس غزل کو بطور تاریخانہ یادگار کے اس مقام پر لکھتے ہیں۔ یہ غزل مفتاح التواریخ مؤلفہ ولیم بیل میں چھپی ہے۔ مگر نہایت غلط چھپی ہے۔ ہم اس کو صحیح کی ہوئی چھاپتے ہیں۔ اور جو اشارات اس غزل میں ہیں حاشیہ پر اس کی تصریح بھی لکھ دیتے ہیں

(وہ غزل یہ ہے)

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواری ما
داد برباد سر و برگ جہانداری ما

آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم
بُرد در شامِ زوال آہ سیہ کاری ما

چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد
تا نہ بینیم کہ کند غیر جہانداری ما

داد افغان[1] بچہ شوکتِ شاہی برباد
کیست جز ذاتِ مبرّا کہ کند یاری ما

بود جانکاہ زر و مالِ جہاں ہمچو مرض
دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماری ما

کردہ بودیم گناہے کہ سزائیش دیدیم
ہست امید کہ بخشند گنہگاری ما

کردہ سی سال نظارت[2] کہ مرادش برباد
زود تر یافتہ پاداشِ ستمگاری ما

عہد و پیماں بہ میاں دادہ نمودند دغا
مخلصاں خوب نمودند وفاداری ما

شیر دادم افعی بچۂ را پروردم
عاقبت گشت مجوزِ گرفتاری ما

حق طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم
کردہ تاراج و نمودند سبکباری ما

قومِ مغلیہ و افغاں ہمہ بازی دادند
بسکہ گشتند مجوزِ گرفتاری ما

[1] مراد از افغان بچہ غلام قادر خان ہست [2] مراد ازاں منظور علی خاں ناظر ہست۔

ایں گدا زادۂ ہمداں کہ بدو زخ برود | بانی جور و ستم شد بدل افگاری ما
گل محمد کہ ز مرداں بشرارت کم نیست | چہ قدر کرد وکالت پئے آزاری ما
آں نیازو و سلیمان و بدل بیگ لعیں | ہر سہ بستند کمر بہر گرفتاری ما
شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت یا من | ز دو پا شد کہ بیاید بہ مددگاری ما
ما دھوجی سیندھیہ فرزند جگر بند منست | ہست مصروف تلافی ستمگاری ما
آصف الدولۂ انگریز کہ دستور من اند | چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما
راجۂ و راؤ و زمیندار امیر و چہ فقیر | چیست باشد کہ ننازند بغمخواری ما
نازنینانِ پری چہرہ کہ ہمدم بودند | نیست جز محلِ مبارک بہ پرستاری ما
گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم | باز فرزند او بدہا ایزد سر سرداری ما

نواب[1] اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی

باپ دادا کا حال مولوی چراغ علی کے آبا و اجداد در اصل سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ اُن کے دادا ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے اور وہاں سے میرٹھ آئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے۔ اُن کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ میں ملازم ہوئے۔ بعد ازاں اُن کا تبادلہ سہارنپور ہو گیا جہاں وہ کلکٹر کے دفتر کے ہیڈ کلارک تھے۔ سہارنپور میں یہ محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور تھے کرانی کا لفظ اُس زمانے میں انگریزی کلارکوں کے لیے بجائے بابو کے استعمال ہوتا تھا چونکہ مولوی محمد بخش انگریزی داں تھے اور کسی قدر انگریزی لباس بھی پہنتے تھے لہذا لوگ انھیں کرانی کہنے لگے۔

جب انگریزوں سے سکھ مغلوب ہوئے اور پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط

[1] یہ حالات مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمۂ اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام سے اخذ کیے گئے ہیں۔

ہو گیا تو اس جدید صوبے کے انتظام کے لیے ہندوستان سے جہاں اور تجربہ کار اور لائق عہدہ داران منتخب کیے گئے وہاں مولوی محمد بخش کا بھی انتخاب ہوا چنانچہ ۱۸۴۹ء میں مولوی محمد بخش محکمہ بندوبست میں داخل ہوے اور رفتہ رفتہ مہتمم بندوبست ہو گئے اور کچھ عرصہ تک ملتان۔ ڈیرہ غازی خاں۔ بنوں۔ وغیرہ میں مامور رہے سرحدی ضلاع کے بندوبست سے فارغ ہونے کے بعد ضلع سیالکوٹ میں متعین کیے گئے۔ اس کے بعد ضلع شاہ پور میں اسی اہم کام پر مامور رہے۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مہتمی بندوبست جیسا وقیع اور اعلیٰ عہدہ جبکہ آج کل بھی دیسی لوگوں کو شاذ و نادر ہی ملتا ہے تو اس زمانہ میں جبکہ نہ ہندیوں کے حقوق تسلیم کیے گئے تھے اور نہ ان حقوق پر زور دینے والے ابھی میدان میں آئے تھے کیسا کچھ وقیع اور معزز نہ سمجھا جاتا ہوگا۔

سُنا گیا ہے کہ مولوی محمد بخش کو اپنی اولاد کی تعلیم کے متعلق بڑے بڑے خیال تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی اور عین عالم جوانی میں (جبکہ اُن کی عمر غالباً ۳۰ سال سے زائد نہ تھی) ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا اور سارے منصوبے دل کے دل ہی میں رہ گئے وہ میرٹھ میں مدفون ہوے اور ان کا مقبرہ ابتک وہاں موجود ہے۔

مولوی محمد بخش کے انتقال کے بعد اُن کے سب اہل و عیال یعنی اُن کی والدہ بیوی اور چاروں بچے (چراغ علی۔ ولایت علی۔ عنایت علی اور منصب علی) میرٹھ واپس آ گئے اور یہیں رہنے لگے۔ سب سے بڑے مولوی چراغ علی تھے اور باپ کے انتقال کے وقت ان کی عمر بارہ سال سے زائد نہ تھی۔

تعلیم اور مشاغل علمی

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی۔ لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی۔ اور سوائے معمولی اُردو۔ فارسی۔ انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی امتحان پاس کرنے پائے۔ اسی زمانہ میں کمشنری گورکھپور میں ضلع بستی نیا نیا قائم ہوا تھا وہاں کے

خزانے کی منشی گری پر جس کی تنخواہ بیس روپیہ تھی مولوی صاحب کا تقرر ہوا۔ مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں ابتدا سے تھا۔ سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے چنانچہ پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں آپ کا رسالہ تعلیقات اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے علاوہ اسکے منشور محمدی مخبر صادق لکھنؤ وغیرہ میں بھی ان کے اکثر مضامین شائع ہوئے

ڈپٹی منصری اسی زمانہ میں مولوی محمد زکریا صاحب سہارنپور سے بستی میں محکمہ انجنیری میں مقرر ہو کر آئے اور چونکہ مولوی صاحب کے تعلقات ان سے اور ان کے خاندان سے قدیم تھے لہذا دونوں صاحب ایک ہی جگہ رہنے سہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد مولوی محمد زکریا صاحب بستی کی خدمت سے مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں اُن کا ایک اچھی خدمت پر تقرر ہو گیا۔ وہاں سے اُنھوں نے مولوی چراغ علی کو اطلاع دی کہ آپ کے والد کے محسن مسٹر گوراوسلی یہاں جوڈیشل کمشنر ہیں اگر آپ یہاں آئیں اور ان سے ملیں تو اغلب ہے کہ کوئی معقول خدمت مل جائے چنانچہ اس اطلاع پر غالبًا سنہ ۱۸۶۷ء یا سنہ ۱۸۶۸ء میں مولوی چراغ علی لکھنؤ گئے اور مسٹر گوروسلی سے ملے اتفاق سے اس وقت جوڈیشل کمشنری میں عارضی طور پر ڈپٹی منصری کی جگہ خالی تھی لہذا اس وقت ان کا تقرر اسی خدمت پر مشاہرہ [illegible] روپیہ ہو گیا۔ کچھ دنوں بطور قائم مقام رہے بعد میں مستقل ہو گئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد سیتاپور میں تبادلہ ہو گیا

سرسید سے ملاقات اور حیدرآباد کی ملازمت مولوی چراغ علی کا میلان طبع شروع سے مذہب کی طرف تھا انھوں نے ہمیشہ یا تو عیسائی معترضین کے جواب لکھے یا مذہب اسلام کی حقانیت ظاہر کی۔ چونکہ اس عالم کا یہ قانون ہے کہ قوی تر شے اپنے سے کم قوی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس لیے مولوی چراغ علی بھی خود بخود امام وقت کی طرف جھکے اور وحدت ذوق سرسید سے اُن کے تعارف کا باعث ہوئی۔ اگرچہ ابتک ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔ اور تہذیب الاخلاق میں بھی انکے بعض مضامین شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ جب سرسید لکھنؤ تشریف لے گئے تو مولوی صاحب ان سے ملنے کے لیے سیتاپور سے لکھنؤ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد جب ریاست حیدرآباد سے ترجمہ وغیرہ کا کام سرسید کے پاس آیا تو انھوں نے مولوی چراغ علی کو اس کام کے سرانجام دینے کے لیے منتخب کیا۔ اس بنا پر ۱۸۷۲ء میں مولوی چراغ علی رخصت لیکر علی گڑھ گئے اور کئی مہینے سرسید کے پاس رہ کر اس کام کو بکمال خوبی انجام دیا جس کا معاوضہ بھی ریاست سے ان کو ملا۔ اس کے ایک سال بعد (۱۸۷۴ء) میں نواب سرسالار جنگ اعظم نے بتوسط مولوی مہدی علی[1] (نواب محسن الملک) سرسید سے

[1] نواب محسن الدولہ محسن الملک منیر نواز جنگ مولوی سید مہدی علی خاں بہادر کا شمار ان افراد قوم میں ہے جو اپنی ذاتی استعداد کی بدولت گوشۂ گمنامی سے نکلکر شہرت کی بلند ترین چوٹی پر پہنچتے اور اپنی پوشیدہ قابلیتوں کو دنیا پر ظاہر کرکے تحریک عمل کا باعث ہوا کرتے ہیں۔

سادات بارہہ کا ایک شیعہ خاندان اٹاوہ میں سکونت پذیر ہو گیا تھا جسکے ایک فرد میر ضامن علی تھے۔ ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو میر ضامن علی کے یہاں میر مہدی علی پیدا ہوئے انگریزی تعلیم کا اسوقت تک مسلمانان ہند میں مطلق رواج نہ تھا۔ چنانچہ میر مہدی علی کی عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اٹاوہ ہی میں ہوئی۔ اس کے بعد دیگر اہل خاندان کی طرح گوشہ عافیت میں زندگی بسر کرنے کی تلقین ہونے لگی مگر ہونہار نوجوان کے دل میں دینی اور دنیاوی امور کے متعلق نئے نئے خیالات اور نئی نئی امنگیں جوش زن تھیں۔ طبیعت میں ایک طرف سنی و شیعہ کے مذہب پر غور کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ دوسری جانب سرکاری ملازمت کی دھن سمائی۔ چنانچہ کلکٹری میں ۱۰ روپیہ ماہوار کے ملازم ہوگئے مسٹر ایلن ہیوم مشہور حامی کانگریس کلکٹر تھے وہ ایسے خوش ہوئے کہ بعد چندے یعنی ۱۸۵۷ء میں اہلمدی پر ترقی کر دی۔ اسی اثناء میں غدر برپا ہوا۔ اٹاوہ بھی اس ہنگامہ سے مستثنیٰ نہ رہا۔ مگر سید مہدی علی اور ان کا خاندان سرکار انگریزی کا دم بھرتا رہا اور قابل قدر

ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسید نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدر آباد

بقیہ صفحہ ماقبل خدمات انجام دیں۔ امن قائم ہونے کے بعد جب انگریزی تسلط از سرنو ہوا تو مسٹر
ہیوم نے مہدی علی اہلمد کو اپنا پیشکار مقرر کر دیا۔ اور آخر ان کی محنت و مستعدی نے انہیں سررشتہ داری
تک پہونچا دیا۔ اس جگہ پر کلکٹر صاحب کو سید مہدی علی کی قابلیت سے آگاہ ہونے کا بہت اچھا
موقع ملا۔ چنانچہ دو سال بعد ۱۸۶۱ء میں وہ تحصیلدار ہو گئے۔ اسی دوران میں مذہبی تحقیقات
بھی جاری رہی اور بالآخر ایک روز اپنے سنی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور اسی موضوع پر ایک
معرکۃ الآراء کتاب **آیات بینات** کے نام سے لکھی جو ابتداء میں جزوًا جزوًا شائع ہوا کرتی
تھی۔ ان کے اس طرز عمل نے انکے تمام خاندان اور برادری کو ان سے برافروختہ کر دیا اور سب
لوگ ان سے کنارہ کش ہو گئے۔ مولوی مہدی علی اپنے وطن اٹاوہ ہی میں تحصیلداری پر مامور
ہوئے اور اٹاوہ کا مدرسہ، منصفی، کوتوالی وغیرہ عمارتیں سب انہی کے زیر اہتمام تیار ہوئیں
اسی زمانہ میں سرسید سے شناسائی ہوئی اور یہ شناسائی آگے چلکر دوستی اور دوستی بھی یک جان و
دو قالب کے مصداق ہو گئی۔ ۱۸۶۳ء میں مولوی مہدی علی نے ڈپٹی کلکٹری کا امتحان مقابلہ
پاس کیا اور بہت سے انگریزوں سے امتحان میں اول نمبر پر رہے۔ اگرچہ ڈپٹی کلکٹری کے
اختیارات تحصیلداری اٹاوہ ہی کے زمانہ میں مل گئے تھے مگر ۱۸۶۷ء میں مرزاپور کی ڈپٹی
کلکٹری پر باقاعدہ ترقی ملی جہاں وہ ریاست دودھی کی سپرنٹنڈنٹی اور راجہ بہل کے کورٹ
آف وارڈس کی ممبری بھی کرتے رہے ۷۰-۱۸۶۹ء میں صاحب کمشنر الہ آباد کی سفارش
پر گورنمنٹ سے خلعت ملا۔ جس پر سرسید احمد خاں بہادر نے ولایت سے مبارکباد کا خط لکھا۔
حیدر آباد کے مدبر وزیر سرسالار جنگ کلکتہ سے لوٹتے ہوئے مرزاپور میں ٹھہرے تو
سید مہدی علی سے بھی واقف ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۷۲ء میں برٹش گورنمنٹ سے انکی خدمات
حیدر آباد میں منتقل کرالیں اور بارہ سو روپیہ ماہوار پر بندوبست ملک محروسہ وعہدہ انسپکٹر
جنرل مال کا کام سپرد ہوا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں حسن کارگزاری نے سرسالار جنگ کو انپر بہت زیادہ

چلے گئے جہاں وہ اسسٹنٹ ریونیو سکرٹری (مددگار معتمد مالگزاری) پر بمشاہرہ

بقیہ صفحہ ماقبل متوجہ کر دیا چنانچہ تین سو روپیہ کا مشاہرہ میں اضافہ اور منیر نواز جنگ بہادر کا خطاب ہوا اور محکمہ پیمائش و بندوبست کے کمشنر بھی ہو گئے ۱۸۸۶ء میں سر سالار جنگ کے مالی سکرٹری مقرر ہوئے ۱۸۸۳ء میں سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد معتمد فنانس و پولٹیکل سکرٹری مقرر کیے گئے اور تمام خدمتوں کو قابل تعریف طریقہ پر سرانجام دینے کے صلہ میں نواب محسن الملک محسن الدولہ منیر نواز جنگ مہدی علی خاں بہادر کا خطاب اور سہ ہزاری منصب اور تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ چند روز بعد معدنیات کے چند معاملات طے کرنے کے لیے منجانب ریاست انگلستان گئے اور کامیابی کے ساتھ اپنی خدمت کی بجاآوری کے علاوہ انگلستان کے بہترین اشخاص سے تعارف حاصل کیا۔ مسٹر گلیڈسٹن سابق وزیر اعظم انگلستان سے ایسی خصوصیت ہوئی کہ ہمیشہ مراسلت رہی ۱۸۹۳ء میں نواب محسن الملک آٹھ سو روپیہ پنشن پر اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور حیدرآباد سے واپس آئے یہاں آکر سرسید کے ساتھ علیگڈھ کالج اور کانفرنس کی قومی خدمت میں مصروف ہو گئے اور ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو سرسید کے انتقال کے ایک سال بعد علیگڈھ کالج کے سکریٹری منتخب ہوئے اور آخر وقت تک یہی قومی خدمت انجام دیتے رہے ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ ہند سے قیصر ہند کا طلائی تمغہ ملا۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شملہ میں آپ نے وفات پائی اور آپ کی نعش علیگڈھ لائی جاکر سرسید کے مقبرہ کے متصل دفن کی گئی۔

نواب محسن الملک نے علیگڈھ کالج کو اس بادسموم کے جھونکے سے بچایا جس کا زہریلا اثر اس کے رگ وپے میں سرایت کرنے والا تھا۔ یعنی ایک لاکھ روپے کے قریب غبن ہو جانے سے کالج بنک کا قرضدار ہو گیا اور آمدنی مفقود تھی۔ کئی کئی مہینوں کی تنخواہیں عملۂ تعلیمی اور دیگر ملازمین کالج کی چڑھی ہوئی تھیں۔ نواب صاحب کی سحربیانی اور تدبیر نے کالج کی اس وقت دستگیری کی جبکہ کالج یتیم ہو گیا تھا یعنی سرسید کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا تھا اور معاملات کی

چار سو روپیہ ماموار ہوئے معتمد مالگزاری اس وقت نواب محسن الملک تھے اُسوقت سے مولوی چراغ علی کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔

بقیہ صفحۂ ما قبل حالت نازک بلکہ ناگفتہ بہ تھی۔ یہ نواب محسن الملک ہی کی اعجاز بیانی تھی جس نے اطراف ہندوستان سے چندوں کی بھرمار کرادی اور کالج اپنا قرضہ ادا کرکے اپنے پیروں پرآپ کھڑا ہوگیا سرسید کے زمانہ میں کلج کو ایک قومی کلج ہونے کا کبھی فخر نہ حاصل ہوا لیکن آپ کے سکرٹری ہونے پر مسلمانوں نے اس کو اپنا کالج قولاً و فعلاً تسلیم کیا پانچ برس کے عرصہ میں ساڑھے پانچ لاکھ روپیہ کالج کو چندہ ملا۔ حالانکہ سرسید کے زمانہ میں پانچ سال کے اندر صرف چھیاسی ہزار روپیہ ملا تھا۔ گریجوایٹوں کی اوسط تعداد ۸۶ سے ۱۲۵ ہو گئی عمارات جو نا تمام تھیں اور جنکی صرف بنیادیں ہی پڑی تھیں اب سربفلک کشیدہ ہوگئیں۔ الغرض اس بارہ میں جسقدر نواب محسن الملک کی ہمدردی اور سرگرمی کا ذکر کیا جائے وہ بجا ہے اور جسقدر اُن کی تعریف کیجائے وہ کم ہے۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

نواب محسن الملک اعلیٰ درجہ کے مقرر اور شیریں زبان تھے۔ برجستہ تقریر کرتے تھے اس فن میں وہ سرسید اور مولوی نذیر احمد سے سبقت لے گئے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے مصنف نہ تھے لیکن وہ ایک بڑے مقرر ضرور تھے۔ تہذیب الاخلاق میں نواب صاحب کے اکثر مضامین شائع ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اظہار خیال میں زبان پر کسقدر قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی عبارت صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے اور اُن کا انداز تحریر قابل تعریف ہے منطقی استدلال اور تحقیق و تدقیق کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ آپ سرسید کے مقلد ہیں لیکن پھر بھی آپ کی عبارت میں جدت پسندی پائی جاتی ہے۔

ہم یہاں مولانا حالی کی ایک رباعی اور ایک قطعہ جو نواب محسن الملک کے انتقال پُرملال پر لکھا تھا اور کراچی میں پڑھا تھا درج کرتے ہیں۔

معتمدی مالگزاری صوبہ داری مولوی چراغ علی نے ریاست حیدرآباد میں اپنے فرائض کمال وفاداری اور قابلیت سے ادا کیے اور وہ ہمیشہ عزت وحرمت کے ساتھ یاد کیے جاتے تھے اور یاد کیے جائینگے۔ کچھ عرصہ کے بعد اُن کی ترقی ہوئی اور وہ سات سو روپیہ ماہوار پانے لگے۔ بعد ازاں

بقیہ صفحۂ ماقبل۔

رباعی

مدراس میں سوتوں کو جگایا جاکر
غُل علم کا برہما میں مچایا جاکر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی
واں آبِ حیات اُن کو پلایا جاکر

قطعہ

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آگیا آخر
یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر
وہ ملک کا **محسن** وہ مسلمانوں کا غمخوار
سر کرکے مہم۔ قوم کے کام آگیا آخر
سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا
اُس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
رہنا تھا نہ بس قوم کی تقدیر میں یکبس
لکھا ہوا تقدیر کا پیش آگیا آخر
نکبت کا پتہ ڈھونڈتا پھرتا تھا مقدر
نکبت کا مقدر کو پتہ پا گیا آخر
جیتا تھا تو لوگوں کو گمان اسپہ تھے کیا کیا
پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اُسکے
وہ خون کے آنسو انھیں رلوا گیا آخر
یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی
دنیا کو تماشہ یہ، وہ دکھلا گیا آخر

مہدی کے لیے قوم عزادار ہی ساری
کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔ مضامین تہذیب الاخلاق۔ مکمل مجموعہ لکچر۔ تقلید عمل بالحدیث۔ کتاب المحبت والشوق۔ مکاتیب۔ مسلمانوں کی تہذیب۔ اور آیات بینات۔

عہد وزارت نواب عماد السلطنت میں جب نواب محسن الملک معتمد پولیٹیکل و فینانس
مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی کا تقرر معتمدی مالگزاری پر بشاہرہ پندرہ سو روپیہ ہوا
عہدِ وزارت سرآسمان جاہ میں جبکہ بہ مصالح وقت مولوی مشتاق حسین (نواب
وقار الملک) معتمد مالگزاری مقرر ہوئے، تو مولوی چراغ علی صوبہ داری ورنگل پر مامور
ہوئے اور پھر صوبہ داری گلبرگہ پر تبادلہ ہو گیا۔ دو سال بعد نواب محسن الملک کے
چلے جانے پر معتمد مال و فینانس مقرر ہوئے۔

مولوی صاحب سرکاری کام کس طرح انجام دیتے تھے

غالباً مولوی چراغ علی سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری
کام کو اس طرح بے لاگ بے تعلق اور بے لوث رہکر
انجام نہ دیا ہو گا۔ وہ رعایت اور جانب داری جانتے
ہی نہ تھے معاملات میں وہ یہ بالکل بھول جاتے تھے کہ ان کا تعلق کس سے ہے صرف
واقعات اُن کے پیش نظر رہتے تھے اور انھیں پر وہ بلا رو و رعایت فیصلہ دیتے تھے
یہی وجہ ہے کہ اہل حیدرآباد جو ان باتوں کے عادی نہیں ان سے کبھی خوش نہیں رہے
وہ روزانہ سوائے اہم امور کے بہت کم کام کرتے تھے۔ جب کام بہت سا جمع
ہو جاتا تھا تو دو تین روز جم کر کام کرتے تھے اور سب کو ایک ہی دفعہ ختم کر دیتے
تھے۔ وہ کبھی طول طویل فیصلہ نہیں دیتے تھے۔ بڑی بڑی ضخیم مسلوں اور مدتوں کے
پیچیدہ معاملات کو چند سطروں میں سلجھا دیتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا معاملے
کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔ اُن کی تحریر جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی
تھی اور یہی حال ان کی تمام تصانیف کا ہے۔

اشد ضروری

لفظ اشد ضروری سے انھیں سخت چڑ تھی اور اس قسم کے
جو مراسلات آتے وہ انھیں الٹ کر پھینک دیتے تھے۔ اُن کا خیال
تھا کہ لوگ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں، خواہ مخواہ مراسلات پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں

چنانچہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب نے لکڑی کا ایک صندوق بنا رکھا تھا جو اشد ضروری لفافہ آتا وہ اس میں بے پڑھے ڈال دیتے تھے۔ ایک بار مدارالمہام بہادر کے یہاں کمیٹی تھی۔ اس میں اُن کے بعض ہمعصر ہم رتبہ معزز عہدہ داران نے مدارالمہام بہادر کے سامنے مولوی صاحب سے شکایت کی کہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے ہیں یا سوتے رہتے ہیں کہ ہمارے ضروری اور اشد ضروری مراسلات کا بھی جواب نہیں دیتے مولوی صاحب نے کہا ذرا تامل فرمائیے، میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ آدمی سے کہا وہ صندوق لاؤ۔ صندوق آیا اور انھوں نے مدارالمہام بہادر سے مخاطب ہو کر کہا کہ سرکار دیکھیے ان صاحبوں کے تمام اشد ضروری لفافے اس میں موجود ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک لفافہ بھی نہیں کھولا، سب کے سب بند پڑے ہیں۔ اب میں ان میں سے کوئی سا ایک اٹھالیتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے اُن میں سے ایک لفافہ اٹھالیا۔ اسے کھولا تو اُس میں یہ لکھا تھا کہ فلاں تختہ بھیج دیجیے۔ مراسلہ پڑھ کر سُنایا اور مدارالمہام سے عرض کی کہ اس کا اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ یہ کونسا اشد ضروری کام تھا۔ یہ لوگ اشد ضروری کے معنی نہیں سمجھتے اور خواہ مخواہ لفافوں پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ میں جواب نہیں دیتا۔ پھر فرمایا کہ شاید سال بھر میں دو تین ہی واقعہ اشد ضروری پیش آتے ہوں گے۔ ان حضرات نے ہر ایک بات کو اشد ضروری خیال کر لیا ہے

تیز فہمی اور صائب الرائی

اگرچہ حیدرآباد میں ایسے ایسے عہدہ دار تھے جو اپنے اپنے کمال اور خصوصیات کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے لیکن مولوی صاحب میں بعض ایسی خصوصیات تھیں کہ پھر کسی میں نظر نہ آئیں۔ وہ نہایت مستقل مزاج تھے۔ بڑی غور و خوض کے بعد رائے

قائم کرتے، اور راے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے گویا وہ راے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سر سالار جنگ نے ایک خاص معاملہ کے متعلق جبکہ مولوی صاحب مددگار معتمد مالگزاری تھے ان کی راے سے اختلاف کیا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا رجحان معتمد (نواب محسن الملک) کی راے کی طرف ہے اور مولوی صاحب کی راے پر چند سوالات کیے۔ انھوں نے نہایت مدلل جواب دیا۔ اس پر سر سالار جنگ نے کچھ اعتراض اور سوال کیے۔ ادھر سے پھر اس کا جواب دیا گیا۔ کوئی چار پانچ مرتبے ایسے ہی سوال وجواب ہوے اور آخر نواب سر سالار جنگ قائل ہوگئے اور یہ فرمایا کہ میں دیکھتا تھا کہ آپ اپنی راے کے متعلق کیا دلائل رکھتے ہیں اور بے شک آپ کی راے صحیح اور درست ہے۔ اگرچہ وہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے اور ان کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا صرف کام کے ایک دو لفظ کہہ دیتے تھے جس سے مافی الضمیر ادا ہو جاے جب کسی مسودے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ نہایت تیز فہم اور صائب الراے تھے۔

اخلاقی جرات

ایک بار نواب سر وقارالامرا مدارالمہام بہادر نے خود بیان کیا کہ مولوی چراغ علی بھی عجیب وغریب آدمی تھے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک پارسی جنٹلمین کو وظیفہ رعایتی یا رقم دینے کے لیے مولوی صاحب کو حکم دیا گیا۔ انھوں نے معاملہ کو ڈال رکھا۔ اس نے آکر نواب صاحب موصوف سے شکایت کی۔ نواب صاحب نے پھر لکھا مگر مولوی صاحب ٹس سے مس نہ ہوے بیچارہ سائل کچھ دنوں تک اپنے معاملہ میں تگ ودو کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ

یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی تو پریشان ہو کر پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو دیا دھویا۔ مدار المہام بہادر نے جو مروت کے پتلے تھے فرمایا کہ اچھا جب مولوی چراغ علی یہاں آئیں تو ہمیں یاد دلا دینا۔ غرض وہ تاک میں رہا جس دن مولوی صاحب بارگاہ وزارت میں حاضر ہوے تو اس نے یاد دہانی کرائی۔ نواب صاحب نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ میں نے فلاں معاملہ میں آپ کو تین بار حکم دیا مگر آپ نے ابتک اس میں کچھ نہ کیا۔ مولوی صاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور مسل صندوق میں سے نکال کر سامنے رکھدی۔ مدار المہام بہادر نے کسیقدر جھنجھلا کر کہا کہ میں مسل کو کیا کروں آپ کو کئی بار لکھا گیا ہے اور آپ نے ابتک ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ مولوی صاحب نے اسکے جواب میں کہا کہ "آپ اس لیے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لٹا دیں۔ آپ کا کام خزانہ کی حفاظت ہے" یہ جواب سُنکر نواب صاحب بالکل ساکت رہے اور پھر کبھی آپنے مولوی صاحب سے اس معاملہ کے متعلق تحریک نہیں کی۔ حق یہ ہے کہ سوائے مولوی چراغ علی کے کوئی دوسرا شخص یہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے ان کی اخلاقی جرات اور راست بازی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے

دقت نظر اضلاع پر سے جو تختے (گوشوارے) آتے تھے اور ان پر جو مولوی صاحب تنقیح کرتے تھے اس سے ان کی دقت نظر اور اعلے درجہ کی ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ جو عہدہ دار کہ بڑے بڑے دورے کرتے ہر معاملہ کی چھان بین کرتے اور انتظامی معاملات میں باخبر رہتے تھے، ان سے تعلقدار لوگ اتنا نہیں ڈرتے تھے، جتنا مولوی چراغ علی کی گھر بیٹھے تحقیقات کی تنقیح سے۔

مطالعۂ کتب اور انہماک مطالعہ میں بیحد شغف تھا۔ گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی اور وقتاً فوقتاً نشان کرتے جاتے تھے اور انتہا ہے کہ بیت الخلا

میں بھی کتابیں رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ آرام کرسی پر پڑھتے پڑھتے سو گئے اسکے بعد جاگے اور پلنگ پر جا لیٹے اور پھر پڑھنے لگے اتنے میں سو گئے۔ کچھ دیر کے بعد میز پر جا کر لکھنے لگے۔ مولوی صاحب کے بیٹے مسٹر محبوب علی نے اپنی والدہ کی زبانی ایک مرتبہ کہا کہ وہ فرماتی تھیں کہ میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ رات کو ان کے سینے پر سے کتاب اٹھا کے رکھوں، ورنہ کتاب کے جلد پٹھے سب ٹوٹ کے رہ جاتے تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ ہوا خوری میں تو البتہ صرف ہوتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاصکر مطالعۂ کتب اور تالیف و تصنیف میں گزرتا تھا۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔ ان کا کتب خانہ قابل دید تھا، اور اس میں بہت کم ایسی کتابیں تھیں جو ان کی نظر سے نہ گزری ہوں، یا جن پر ان کے نشان یا نوٹ نہ ہوں۔ مطالعہ میں انھیں ایسی محویت رہتی تھی کہ کچھ ہو جائے انھیں خبر تک نہ ہوتی تھی۔

مولوی صاحب مرحوم کے ملازم کلّو کی زبانی معلوم ہوا کہ بلدہ میں مرحوم کا جو بنگلہ ہے اس میں ڈرائنگ روم کے سامنے ایک شہ نشین ہے۔ اسکے نیچے تہ خانہ بنا ہوا ہے جس میں کاٹ کباڑ اور ڈیرے خیمے پڑے رہتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب اس شہ نشین پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اتفاق سے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور دھواں نکلنا شروع ہوا۔ ملازموں نے بہتیرا شور و غل مچایا کہ آگ لگی۔ مگر حضرت کو کچھ خبر نہیں۔ غرض آگ لگی اور بجھ بھی گئی، مگر آپ جس طرح کتاب پڑھ رہے تھے پڑھتے رہے اور یہ بھی تو خبر نہ ہوئی کہ کیا تھا اور کیا ہوا۔ مولوی انوار الحق صاحب نے اپنا چشم دید واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کھانا کھا رہے تھے اور اس کے نیچے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور وہ اسی طرح بے تکلف بے ہراس کھانا کھاتے رہے

یا تو یہ دونوں واقعے ایک ہیں یا کلو کے بیان کرنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ مگر دونوں کی نوعیت ایک ہے اور اس سے ان کے استقلال طبع کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ایک دوسرا واقعہ اسی قسم کا اور مشہور ہے کہ ایک مقام پر ٹانگہ میں سوار دورہ کر رہے تھے راستے میں ٹانگہ ٹوٹ گیا۔ آپ اسی میں پڑے پڑھے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے لوگ گئے اور کسی دوسری جگہ سے ٹانگہ کا انتظام کیا اور لے کر آئے تو آپ اس میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔

تحقیق وتفتیش ان میں تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے اور اس کے مالہ وما علیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے، اور پتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے، اور لوگوں کو بھیجکر مصر و شام و دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے چنانچہ اسی غرض سے مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی کو بغرض تلاش کتب مصر کو روانہ کیا تھا اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے۔ اُن کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور مواد فراہم کرنے کے لیے انھوں نے کسقدر محنت اور مشقت اُٹھائی ہے۔

جب برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ریاست میں مسٹر کرالی کے کنٹرولر جنرل مقرر ہونے کی خبر آئی تو چونکہ مولوی صاحب فنانشل سکرٹری تھے، انھیں فکر ہوئی آخر انھوں نے فنانس پر انگریزی میں جسقدر مستند اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں تھیں سب منگوالیں اور ان کا خوب مطالعہ کیا اور دو مہینہ میں اسقدر عبور حاصل کیا کہ جب

مسٹر گرالی سے ملاقات ہوئی اور فنائشل معاملات پر گفتگو آئی تو وہ مولوی صاحب کی وسیع معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اسی طرح جب انھیں معلوم ہوا کہ ہندی موسیقی پر یورپین لوگوں کو اعتراض ہے تو انھوں نے اسے سیکھنا شروع کیا۔ اور بیانو پر گتیں نکالنی شروع کیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ہندی موسیقی کو سائنٹفک طور پر مدون کریں چنانچہ لکھنا بھی شروع کیا تھا۔ اور اس کا نا تمام سا مسودہ اب تک موجود ہے لیکن اس کام کے لیے بڑی فرصت درکار تھی لہذا اسے انجام نہ دے سکے۔ علم ہیئت میں بھی انھیں خوب دخل تھا۔

متعدد علوم جانتے تھے

متعدد علوم اور کئی زبانوں کے عالم تھے چنانچہ سرسید ان کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں "متعدد علوم میں نہایت دستگاہ رکھتے تھے، عربی زبان و عربی علوم کے عالم تھے، فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے، عربی وکالڈی زبان میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے، اعلے درجہ کے مصنف تھے، انگریزی زبان میں بھی انھوں نے تصنیفیں کی ہیں"۔ زیادہ تر اُن کی تصانیف انگریزی زبان میں ہیں جن کا مفصل ذکر ان کی مذہبی تصانیف کے تحت میں آئے گا۔ لیکن یہاں اسقدر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُن کی ابتدائی تعلیم خاصکر انگریزی زبان میں بہت کم ہوئی تھی لیکن اُنھوں نے صرف اپنے مطالعہ کے زور سے انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت اور دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ یہ صرف ان کی مطبوعہ کتب ہی کو دیکھ کر رائے قائم نہیں کی گئی بلکہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے نے اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے بھی دیکھے ہیں۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ان کی انگریزی کتابوں پر ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات نے جو زبردست ریویو کیے ہیں اُن میں ان کی انگریزی تحریر کی بھی تعریف ہے۔ ہم بطور نمونہ یہاں ایک دو ریویو درج

صرف اُن کی انگریزی دانی کے متعلق چند فقرے نقل کرتے ہیں:۔

اسے تھی نیم نے جو انگلستان کا ایک مشہور پرچہ ہے اور جس کی ادبی تنقید کی دھوم ہے اُن کی کتاب اعظم الکلام فی ارتقاء اسلام پر ایک بڑا ریویو لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "مولوی صاحب کی انگریزی قابل قدر ہے" بابتہ ۵ جنوری ۱۸۸۴ء

بمبئی گزٹ جو بمبئی پریسیڈنسی کا بہت قابل قدر اخبار ہے لکھتا ہے کہ "یہ کتاب نہایت عمدہ انگریزی میں لکھی گئی ہے" (بمبئی گزٹ بابتہ ۱۲ جولائی ۱۸۸۳ء)

جرنل آف دی انجمن پنجاب نے دو نمبروں میں اس کتاب پر بہت بڑا ریویو لکھا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "مصنف کو انگریزی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور وہ شرع و مذہب اسلام کا بڑا عالم ہے۔"

جسٹس سید محمود نے بھی اپنے ایک خط میں مولوی صاحب کی وسیع معلومات اور اُن کی انگریزی دانی اور انگریزی تحریر کی بڑی تعریف کی تھی۔

سرکاری تالیفات یہاں اُن کی بعض تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے سرکاری تعلق اور حیثیت سے لکھیں۔ یہ سب انگریزی زبان میں ہیں۔

(۱) **بجٹ** (میزانیہ) سب سے اول مولوی چراغ علی نے تیار کیا اگرچہ میزانیہ اب کچھ کا کچھ ہو گیا ہے اور خاصہ ایک دفتر ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کا یہ قول ہے کہ جو اختصار اور صفائی اس میزانیہ میں پائی جاتی ہے وہ موجودہ میزانیہ میں نہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آج کل میزانیہ کی ترتیب میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے لیکن الفضل للمتقدم فضیلت کی دستار مولوی صاحب ہی کے سر رہے گی۔

(۲) **اڈمنسٹریشن رپورٹ** (رپورٹ نظم و نسق) بابت ۱۸۸۴ء

لکھی جو چھ سو تینتیس بڑے بڑے صفحوں پر ہے۔ اس قسم کی پہلی رپورٹ ہے اور بعد ازاں جتنی رپورٹیں لکھی گئیں وہ سب اسی کی پیروی میں لکھی گئیں۔

(۳) **حیدرآباد دکن انڈر سر سالار جنگ** یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور ریاست کی انتظامی حیثیت سے نہایت قابل قدر اور بے مثل کتاب ہے مولوی صاحب نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر بحث اس میں ان تمام انتظامات اور اصلاحات سے ہے جو سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں عمل میں آئیں لیکن جس انتظام اور صیغے پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے، اسے ابتدا سے لیا ہے اور اس کی اصل، تغیرات، وجہ تسمیہ اور تاریخی حیثیت وغیرہ کو محققانہ طور سے بیان کیا ہے اور اس کے متعلق تمام مواد اور اعداد کو گوشواروں کی صورت میں مہیا کر دیا ہے اور اس تاریخی اور انتظامی حیثیت کے علاوہ ممالک محروسہ سرکار عالی کا مقابلہ آس پاس کے صوبہ جات سے بھی کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھے بغیر کوئی شخص حیدرآباد کی گذشتہ اور موجودہ حالت انتظامی سے پورا واقف نہیں ہو سکتا خصوصاً جن لوگوں کے ہاتھ میں انتظام کی باگ ہے، انھیں اس کتاب کا مطالعہ کرنا بہت ضروری بلکہ لازمی و لابد ہے اس کتاب کو مولوی صاحب نے نواب سر سالار جنگ کے نام معنون کیا ہے اگرچہ کتاب نواب صاحب کے زمانہ میں خود ان کی اجازت سے لکھنی اور چھپنی شروع ہو گئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کے اختتام سے قبل راہی ملک بقا ہو گئے۔ بعد میں فاضل مولف نے اپنی احسانمندی کے اظہار میں نواب مرحوم کے نام سے منسوب کیا۔ انگریزی اخبارات نے اس پر بہت عمدہ عمدہ ریویو لکھے ہیں اور فاضل مؤلف کی محنت و تحقیق کی داد دی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ اپنے نمبر مورخہ ۴۔ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ء میں اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب کے تاریخی اور اعدادی حصہ میں بڑی محنت اور احتیاط صرف کی ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ وہ حصہ ہے جس میں موجودہ نظم ونسق کی کیفیت درج ہے۔ اس میں منجملہ ناظرین اُن مختلف محکموں اور سررشتوں کے طرزِ عمل اور حقیقت کو دیکھیں گے جو سر سالار جنگ کی بدولت ایسے وقت میں ظہور میں آئے جبکہ بے عنوانی اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی اور اُنھوں نے نظم و ترتیب کی صورت قائم کی"

اسی طرح اس وقت کے رزیڈنٹ مسٹر کارڈری نے اپنے خط مورخہ ۲ کتوبر ۱۸۸۴ء میں جو مولوی صاحب مرحوم کے نام ہے اس کتاب کی بہت تعریف لکھی ہے۔

اسی کا ایک ضمیمہ **صرف خاص انڈر سر سالار جنگ** ہے جن میں اُن اصلاحات اور ترقیات کا ذکر ہے جو سر سالار جنگ کی تدبیر و دانشمندی سے علاقہ صرف خاص میں عمل میں آئیں۔

(۴) **جاگیرات و جاگیرداران**۔ افسوس یہ کتاب ناتمام رہ گئی مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اس میں تمام جاگیرداران ممالک محروسہ سرکار عالی کی اصل اور تاریخ، ان کا رقبہ، اور آمدنی، پیداوار، حرفت و صنعت اور دیگر تمام دلچسپ اور مفصل حالات درج کریں۔ لیکن اس کے لیے انھیں مواد بہم پہنچانے میں بہت دقت پیش آئی۔ حیدرآباد کے جاگیردار صاحبان مولوی صاحب کے اس کام کو غالباً شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور مراسلوں کے جواب میں حوصلہ شکن تساہل سے کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب کی زندگی میں یہ کتاب ختم نہ ہونے پائی اور ان کے بعد جو لوگ عہدۂ فنانشل سکرٹری پر ان کے جانشین ہوئے اُن میں سے نہ کسی کو اس سے دلچسپی تھی اور نہ اتنی فرصت کہ اس کام کو پہنچا سکتے

پہنچاتے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو نہ صرف دلچسپ ہوتی
بلکہ بہت سی عمدہ معلومات کا خزانہ ہوتا جو حکومت اور ملک دونوں کے لیے مفید ہوتا

وقت کی قدر

غرض مولوی چراغ علی نہ صرف ایک مصنف کی حیثیت سے
بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے بھی عجیب وغریب شخص
تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی نسبت رائے قائم کرنے میں اکثر لوگوں کو مغالطہ
ہوا ہے عموماً ہر شخص دوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے
اور چونکہ وہ تقریباً ہر شخص سے جدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم
لوگ ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور پر قدر کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب ایک
تو طبعاً خاموش طبع تھے دوسرے انھیں اپنے وقت کی بہت قدر تھی وہ اسی بیش بہا
شے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے وہ عام طور
پر لوگوں کی ملاقات سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے
صرف کام کی بات کے سوائے، دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ
بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو
وہ بہت جز بز ہوتے تھے کبھی اخبار اُٹھا لاتے، کبھی کتاب پڑھنے لگتے۔ عام طور
پر بہت کم سخن تھے بہت اختصار کے ساتھ اپنا مطلب ادا کرتے تھے، اور سوائے
بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔

چھوٹے بچوں سے محبت اور باتیں کرنے کا شوق

لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے
اور اُن سے مزے مزے کے سوالات کرتے
اور اُن کے سوالوں کے جواب نہایت شرح
وبسط اور خوبی کے ساتھ دیتے۔ مثلاً اگر کسی بچے نے کسی پودے کی نسبت پوچھا
تو آپ پورا حال اس پودے کا اور پودوں کی نشوونما اور آب وہوا اور زمین

کے اثر کا بیان کر دیتے اور اُن چھوٹی چھوٹی مگر مشکل باتوں کو نہایت صفائی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ مگر جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو بھولا پن، خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہے وہ بڑے ہو کر نہیں رہتی۔ بڑے ہو کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تو تصنع اور کچھ ادب اور لحاظ مانع ہوتا ہے، پھر وہ مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا، خوردی و بزرگی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے زیادہ پیارے ہوتے ہیں اور اگر کوئی بتانے والا ہو تو اسوقت انھیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔

بعض خصائل مولوی صاحب اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی بہت سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ روپیہ پیسہ کی بالکل محبت نہیں تھی بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے، نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے، نہ کبھی کسی معاملہ میں اُن سے بازپرس کرتے، اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے اُن کی کوئی عزیز یا بیش قیمت چیز توڑ ڈالی، مگر خفا ہونا تو درکنار اُنھوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیونکر ٹوٹی اور کس نے توڑ دی۔

رات کا کوئی وقت ایسا نہ ہوتا تھا کہ وہ کام نہ کرتے ہوئے ہوں۔ تھوڑی دیر سوئے، پھر اُٹھ کر لکھنے یا پڑھنے بیٹھ گئے، اور پھر سو گئے، اور اس کے بعد کسی دوسرے کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں، چونکہ ذیابطیس کی شکایت تھی، پانی زیادہ پیتے تھے، اور یوں بھی رات کے وقت وہ اکثر کام کرتے رہتے تھے لیکن کبھی کسی نوکر کو نہ بلاتے اور خود ہی سب کام کر لیتے تھے۔

غرض مولوی صاحب ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج، کوہ وقار، عالی خیال شخص تھے۔ کبھی اپنا وقت بیکار اور ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہر وقت مطالعہ یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے، اور ایسے وقت میں کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے انھیں طبعی نفرت تھی۔ یہ حال غیروں سے ہی نہ تھا بلکہ بیوی بچوں سے بھی یہی کیفیت تھی۔ سب کی سُن لیتے تھے مگر اپنی کچھ نہیں کہتے تھے، کبھی کسی سے مناظرہ اور بحث نہیں کرتے تھے؛ کوئی کچھ کہا کرے، انھیں جو کچھ کرنا ہوتا تھا کر گزرتے تھے۔

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں　　　ہر کوئی بھیدی اور اُن کا راز داں سب سے الگ

وقار اور متانت اُن پر ختم تھی، استقلال میں پہاڑ تھے، آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کہیں نہ چوکتے تھے، مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اسلام کے سچے حامی تھے، اور اُن کی عمر اور محنت کا زیادہ حصہ اسی میں گزرا۔ ان سے پہلے صرف دو شخصوں نے انگریزی زبان میں یوروپین مصنفین کے اعتراضات کی تردید اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی تھیں، ایک تو سر سید جن کی کتاب خطبات احمدیہ کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور دوسرے رائٹ آنریبل مولوی سید امیر علی بالقابہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس مبحث پر کتابیں لکھی ہیں اس کی اس وقت تک نظیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود اُنکے حریف پادری کینن میکال نے اُن کے علم و فضل اور تحقیق کو تسلیم کیا ہے مگر باوجود اس کے نہایت بے تعصب تھے اور کسی مذہب و ملت سے انھیں خصومت یا پرخاش نہ تھی، یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ جب مردم شماری ہوئی تو انھوں نے مذہب (فرقہ) کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے تو لفظ شیعہ لکھدیا، لیکن اپنے اور اپنے

بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھ دیے۔ اس سے اُن کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اُس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے کی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے اور باقی تمام تفریقوں کو فضول اور بیکار سمجھتے تھے۔

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے خطوط

اس موقع پر یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مولوی صاحب کے کاغذات میں سے چند خطوط مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے بھی ملے جو انھوں نے مولوی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پر زور کتاب **براہین احمدیہ** کی تالیف میں مدد طلب کی تھی۔ چنانچہ مرزا صاحب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ کا افتخار

نامہ محبت آمود عزّ ورود لایا۔ اگرچہ پہلے سے مجھکو بہ نیت التزام خصم اجتماع براہین قطعیہ اثبات نبوت وحقیت قرآن شریف میں ایک عرصہ سے سرگرمی تھی مگر جناب کا ارشاد موجب گرم جوشی و باعث اشتعال شعلہ حمیت اسلام علی صاحبہ السلام ہوا اور موجب ازدیاد تقویت و توسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اولوالعزم صاحب فضیلت دینی و دنیوی تہ دل سے حامی ہو اور تائید دین حق میں دل گرمی کا اظہار فرماوے تو بلا شائبہ ریب اس کو تائید غیبی خیال کرنا چاہیے جزاکم اللہ نعم الجزاء۔

ماسوائے اس کے اگر ابتک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائج طبع عالی سے جمع فرمائے ہوں تو وہ بھی مرحمت ہوں"

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ کے مضمون اثبات نبوت کی اب تک میں نے انتظار کی[1] پر ابتک نہ کوئی

---

[1] اُردو کا یہ صحیح محاورہ نہیں ہے انتظار مذکر ہے لہذا یہ جملہ یوں ہونا چاہیے" آپ کے مضمون اثبات نبوت کا اب تک میں نے انتظار کیا۔ مولف

عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا۔ اس لیے آج مکرر تکلیف دیتا ہوں کہ براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کرکے میرے پاس بھیج دیں، اور میں نے ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے اور نام اس کا براہین احمدیہ علی حقانیہ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں اور اپنے مختصر کلام سے ان کو زیب و زینت بخشوں۔ سو اس امر میں آپ توقف نہ فرمادیں اور جہاں تک جلد ہو سکے مجھ کو مضمون مبارک اپنے سے ممنون فرمادیں"

اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور و شغب اور عداوت اسلام کا کسیقدر تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے، اور امید کہ عنقریب آجائے گا اور پنڈت دیانند کی وید بھاش کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں اور ان کا ستیارتھ پرکاش بھی موجود ہے، لیکن تاہم آپ کو بھی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کو جو اپنی ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوئے ہوں یا جو وید پر اعتراض ہوتے ہوں، اُن اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے مضمون اپنے کے بھیج دیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کتب مسلمہ آریہ سماج کی صرف وید اور منو اسمرتی ہے، اور دوسری کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے بلکہ پرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں میں اس جستجو میں بھی ہوں کہ علاوہ اثبات نبوت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہنود کے وید اور ان کے دین پر بھی سخت سخت اعتراض کیے جائیں کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلاف حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو تب تک گو کیسی ہی خوبیاں اور

لائل حقانیت قرآن مجید کے ان پر ثابت کیے جائیں۔ اپنے دین کی
طرفداری سے باز نہیں آتے، اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اسی میں گزارہ
کرلیں گے۔ سو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیقات اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیہ
کے کتاب کے اندر درج کردوں گا۔"

ایک اور خط مورخہ ۱۹ فروری ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

قرآن مجید کے الہامی اور کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعث
ممنونی ہے نہ موجب ناگواری۔ میں نے بھی اسی بارہ میں ایک چھوٹا سا رسالہ
تالیف کرنا شروع کیا ہے اور خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ عنقریب چھپکر
شائع ہو جائے گا۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہات صداقت قرآن جو آپ کے
دل پر القا ہوں میرے پاس بھیج دیں تا ائی، رسالہ میں حسب موقع اندراج
پا جائے یا سفیر ہند میں .... لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ)
زمانہ گزشتہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کا تحریر کرنا ضروری نہیں کہ منقولات
مخالف پر حجت قویہ نہیں ہو سکتیں۔ جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ
میں پائی جائے یا جو عند العقل اس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہیے۔ بہر صورت
میں اس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی
آپ بمقتضا اس کے کہ الکریم اذا وعد وفا مضمون تحریر فرما دیں۔ لیکن یہ
کوشش کریں کہ کیفیت ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے اور آخر میں دعا
کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد تر توفیق بخشے کہ منکر کتاب الٰہی کو دندان شکن
جواب سے ملزم اور نادم کریں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

اس کے بعد ایک دوسرے خط مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

"کتاب (براہین احمدیہ) ڈیڑھ سو جزو ہے جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس روپیہ ہے

اور آپ کی تحریر محققانہ ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائے گی"

مولوی صاحب کی حمایت و حفاظت اسلام خطوط مندرجہ بالا کے اقتباسات سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے مرزا صاحب کو براہین احمدیہ کی تالیف میں بعض مضامین سے مدد دی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو حمایت و حفاظت اسلام کا کس قدر خیال تھا یعنی خود تو وہ یہ کام کرتے ہی تھے مگر دوسروں کو بھی اس میں مدد دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ نیز مولوی صاحب کس بلند درجہ کے شخص تھے کہ مرزا غلام احمد صاحب جیسے زبردست عالم بھی انکی امداد کے متمنی تھے۔

جب مولوی احمد حسن صاحب امروہی نے اپنی کتاب تاویل القرآن شائع کی تو مولوی صاحب نے بطور امداد کے سو روپیہ مصنف کی خدمت میں بھیجے اسی طرح جو لوگ حمایت اسلام میں کتابیں شایع کرتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح امداد کرتے تھے اور اکثر متعدد جلدیں اُن کی کتابوں کی خرید فرماتے تھے۔ چنانچہ مولوی محمد علی صاحب کی کتاب پیغام محمدی کی کئی سو جلدیں خرید کر دکن میں تقسیم کر دیں۔

مولوی صاحب کا حلیہ وہ میانہ قد اور بھاری جسم کے آدمی تھے۔ اُن کے چہرے سے رعب داب اور متانت ٹپکتی تھی چہرہ بھاری بھر کم، سر بڑا، اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ اُن کے اکثر ہم عصر اور ہم رتبہ لوگ ان کا بہت احترام اور ادب کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل و صورت کے لوگوں پر اُن کے علم و فضل اور قابلیت کا بھی رعب پڑتا تھا۔

مولوی صاحب کسی جتھا ورفرقے کے آدمی نہ تھے

حیدرآباد میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا اکھڑا ہو جاتا ہے، وہ اس طرح سے رہے جیسے طوفان موج خیز میں لائٹ ہوس۔ حالانکہ وہ ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے اور نواب اعظم یار جنگ کا خطاب بھی اپنی خدمات کے صلہ میں ریاست سے حاصل کیا۔ لیکن کبھی کسی جھگڑے کسی سازش یا کسی پولیٹکل یا سوشل تحریک میں اُن کا نام نہیں آیا وہ ہمیشہ دھڑے بندیوں سے الگ رہے نہ اپنا کوئی جتھا بنایا اور نہ کسی کے جتھے میں شریک ہوئے۔ وہ اپنے تمام سرکاری نیز خانگی امور میں ہر قسم کے تعصبات سے بری تھے وہ اُن سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے، ان کی توجہ اور ان کا دل کہیں اور تھا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

علالت اور وفات

مولوی صاحب کو ذیابیطس کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی، اب اسی کے اثر سے ایک گلٹی ذہنی کنپٹی اور گردن کے درمیان دائرہ کے نیچے نمودار ہوئی، ڈاکٹر ہیمر اُن کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ اور ڈاکٹر لاری مشہور سرجن (سابق ناظم محکمہ طبابت سرکار عالی کی یہ رائے ہوئی کہ عمل جراحی کیا جائے۔ اسوقت تک مرحوم بالکل تندرست اور صحیح معلوم ہوتے تھے اور سرکاری کام میں برابر مصروف تھے چنانچہ حسب مشورہ باہمی ڈاکٹر لاری نے نشتر دیا۔ اُس کے بعد صحت میں کیا رنگ فرق آگیا وضعف طاری ہوگیا۔ بعد ازاں دو تین بار پھر نشتر کیا گیا اور ہر بار حالت ردی ہوتی ہوگئی اور زہر آلود خون پھیلتا گیا۔ حالانکہ یہ زخم بہت ہی نازک ہوگیا تھا

اور پکے پھوڑے سے زیادہ اس میں تکلیف ہوتی تھی، لیکن جب ڈاکٹر زخم صاف کرتا اور اسے اندر باہر سے صاف کر کے دھوتا تھا، تو نواب صاحب خاموش اسی طرح بیٹھے رہتے تھے، کیا مجال جو زبان سے اف نکل جائے، یا تیور سے کسی قسم کا درد یا تکلیف کا اظہار ہو، چونکہ حالت ناقابل اطمینان تھی لہذا مولوی صاحب اور اُن کے اعزہ واحباب کی یہ رائے قرار پائی کہ بمبئی جا کر علاج کیا جائے چنانچہ بروز سہ شنبہ تاریخ ۱۱ جون ۱۸۹۵ء مرحوم مع اہل وعیال کے بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، حالت بہت ردی ہو چکی تھی، زہر آلود خون جسم میں پھیل گیا تھا حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ وہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جاندار بچ نہیں سکتا آخر آ پہونچا۔ پندرھویں جون روز شنبہ صبح کے آٹھ بجے سے تنفس شروع ہو گیا اور گیارہ بجتے بجتے دار فنا کا مسافر زندگی کی پچاس منزلیں طے کر کے راہی ملک بقا ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کل من علیہا فان، ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ مولوی صاحب بمبئی کے قبرستان میں دفن ہوئے

اولاد مولوی صاحب سے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار ہیں اور ۱۹۱۲ء میں بفضل خدا سب کے سب صحیح سلامت اور بقید حیات تھے۔ بعد کا حال معلوم نہیں

مولوی صاحب کی وفات پر اظہار رنج وافسوس مولوی صاحب کی وفات پر تمام اُردو انگریزی اخبارات میں اظہار افسوس وملال کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں ہم بخوف طوالت صرف دو تحریروں کی نقل کرتے ہیں۔ ایک نواب وقار الامراء بہادر مرحوم (مدار المہام وقت) کا اظہار افسوس جو انھوں نے سرکار نظام کی طرف سے کیا

اور جو جریدہ اعلامیہ سرکار عالی میں طبع اور شایع ہوا دوسرا سرسید کا نامۂ الم جو
اس دردناک خبر کے سنتے ہی انھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھا تھا
حقیقت میں یہ دونوں تحریریں سچی اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

مولوی چراغ علی کی وفات سے ریاست کا ایسا بے لاگ بے لوث مستقل
مزاج، تجربہ کار عہدہ دار جاتا رہا کہ پھر اس کا بدل نہ ملا۔ ادھر قوم میں سے
ایک حامی ملت اور فاضل محقق گم ہو گیا۔ جن مضامین پر مولوی چراغ علی مرحوم
نے قلم اٹھایا ہے اس پر اور بھی بہت سے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور زمانہ
آیندہ اس سے بھی بہتر لوگ پیدا کرے گا۔ لیکن ایسے دھن کے پکے، دنیا و مافیہا سے
بے خبر اور اپنے کام میں ہمہ تن محو مشکل سے پیدا ہوں گے۔

از جریدۂ اعلامیہ احکام سرکار نظام الملک آصف جاہ، جلد بست و ششم
نمبر چہل و یکم مطبوعہ ہفدہم امرداد ماہ الٰہی ۱۳۰۴ فصلی مطابق سی ام
ذی الحجہ ۱۳۱۲ ہجری۔

نواب مدارالمہام سرکار عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سنا کہ مولوی چراغ علی
صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال و فینانس سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد
۱۳۰۴ فصلی بروز شنبہ بمقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بغرض علاج و تبدیل
آب و ہوا گئے تھے، انتقال کیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق، کارگزار، واقف کار
ذی علم مستقل مزاج، اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدارالمہام سرکار عالی
مکرر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ طبقہ عہدہ داران میں سے مولوی چراغ علی
صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے سرکار کو
درحقیقت بہت نقصان پہونچا۔"

(صفحہ ۳۹۵ نشان ۱۶۴)

(از تہذیب الاخلاق علی گڑھ) سلسلہ سوم جلد دوم مطبوعہ یکم محرم الحرام ۱۳۱۳ھ

"افسوس! ہزار افسوس! صد ہزار افسوس! کہ پندرھویں جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتہ کی بیماری میں انتقال کیا۔ ان کا خط خود اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا مورخہ نہم جون مقام حیدرآباد سے ہمارے پاس آیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ تین ہفتہ سے بیمار ہوں، ڈاڑھ کے نیچے ایک گلٹی نکلی ہے، ڈاکٹروں نے اس اندیشہ سے کہ مغز میں ورم نہ ہو جائے کلورفارم کا عمل کر کے کاٹا اور بعد میں پھر دوبارہ کلورفارم کا عمل کیا۔ بہت ہی کمزور ہو گیا ہوں۔ کھاتا پیتا نہیں، چلنا پھرنا موقوف، مگر اب زخم بھرتا چلا آتا ہے، اور ارادہ ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لیے بمبئی جاؤں۔ اس کے بعد بارھویں جون کا بمبئی سے انھیں کا بھیجا ہوا تار ہمارے پاس آیا کہ میں بمبئی آگیا ہوں، افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جب کہ ہم بعض کاغذات ان کے نام روانہ کر رہے تھے اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے، اسی وقت انھوں نے بمبئی میں انتقال کیا،

مولوی چراغ علی مرحوم ایک بے مثل اور مرنج و مرنجان شخص تھے ہمارے کالج کے ٹرسٹی اور بہت بڑے معاون تھے۔ حیدرآباد میں سالار جنگ اعظم نے ان کو بلایا تھا اس زمانہ سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے اور پارٹیاں بھی قائم ہوئیں مگر ان کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ اُن کو بجز اپنے کام یا علمی مشغلے کے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حیدرآباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجے کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے، عبری و کالڈی میں

نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انھوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانہ میں کہ ان کی عمر کچھ بھی زیادہ نہ تھی نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو انھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا، اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔

تاریخہائے وفات نواب اعظم یار جنگ کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ اُن میں سے چند یہاں لکھی جاتی ہیں۔

سید محمود (خلف سرسید) نے بھی جو فارسی صنائع میں تاریخ کی صنعت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی۔

"حیف چراغ علی از دنیا نہان شد"
۱۸۹۵ء

مولانا حالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے۔

زخمے از مرگ چراغ علی آمد بر دل — کہ از و خاطر افگار بصد غم شدہ جفت
از خرد سال وفاتش چو بجستم "محمود" — "شد نہان حیف چراغ علی از دنیا" گفت

مولانا حالی نے خود بھی ایک قطعہ مولوی چراغ علی کی وفات پر لکھا ہے جس میں اُن کے کام اور کیرکٹر کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے وہ یہ ہے۔

آہ آہ از رحلت بے گاہ اعظم یار جنگ — کز میان رہ زہمراہاں عناں پیچیدہ رفت
حیف دنیا را بہ پنجاہ سالگی کردہ وداع — بزم مارا بزم ماتم باز گردانیدہ رفت
مستفیداں پرسش کردہ دامن معنی ہنوز — مشتے از گنجینہ لعل و گہر پاشیدہ رفت

از سحاب فیض کلکش ناشده سیراب خلق — ساعتے برق یمانی از افق تابید و رفت
عقدہا نکشودہ ماند و نکتہ ہا نانوشتہ ماند — ہمچو جوے شیر کوہ بے ستوں کندید و رفت
کرد بے آزار خلق اعمال سلطانی ادا — نے زکس رنجید و نے کس را برنجانید و رفت
یاوران قوم را تا زیست یاور بود و یار — ہر چہ بتوانست در تائید شاں کوشید و رفت
از دل پر درد او گاہے صدائے برنخاست — مدتے چوں بحر کاہل در نہاں جوشید و رفت
طبع آزادش بہر ملت کہ بینی مصلح داشت — در دل خویشش دو دل بیگانہ درگنجید و رفت
گر زید صد سال کس انجام او مرگست و بس — چوں شرر بر وضع دوراں بیتواں خندید و رفت

مولوی محمد اعظم صاحب چریاکوٹی نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک زمانہ تک حیدر آباد میں ملازم تھے اور بعد ازاں وظیفہ یاب حسن خدمت ہو گئے تھے، ایک اچھا قطعۂ تاریخی لکھا ہے، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آں گرامی معتمد کز حسن رایش بیدرنگ — یافت آرے در دکن مال و خزانہ آب و رنگ
محکم اخلاص دلی با ملت اسلام داشت — در معیشت بود رفتارش برآداب فرنگ
علم را جوہر شناسے، قدر دان اہل علم — طالب حکمت نگہدارندہ آئین ہنگ
با علو فکرتش مرغ ہما برکندہ بال — عقل کل در مرغزار جودتش آہوے لنگ
با سبک روحی متینے بود چوں کوہ گراں — کلک او در دشت معنی برق رفتارے سرنگ
بہر معنیہا دلش دریائے گوہر خیز بود — وقت گویائی دہانش بود شکر بار تنگ
شد نمایاں ناگہاں از گوشہ رخسار او — دانۂ ریش قضا چیزے کم از قدر پشنگ
بارہا از بہر اصلاحش بر و نشتر زدند — تا شد از نشتر زنیہا کار بر بیمار تنگ
رفتہ رفتہ شد بس ابتر حال او ہر چند روز — بود گویا صورت تصویر بر پشت پلنگ
عاقبت بے وقت مرگ از گلشن گیتی ربود — آنچنانش کز کمیں ساحل نشیناں را نہنگ
الغرض چوں رخت ہستی بست از دنیائے دوں — ہاتفی گفتا زجلالی ولے اعظم یار جنگ
۱۳۱۲ھ

سید محمد واحد علی صاحب کاکوروی نے بھی دو تاریخیں ایک سنہ عیسوی میں دوسری سنہ ہجری نبوی میں کہی تھیں۔ جو یہ ہیں:۔

۱۔ ہاتفے گفت از سر تنہوس   گوہر شب چراغ بود نماند
                                              ۱۸۹۵ء

۲۔ ہائے اعظم یار جنگ
      ۱۳۱۳ھ

تصانیف پر ریمارک مولوی چراغ علی اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ محقق اور وسیع النظر تھے اور ایک زبردست مصنف تھے ان کی تقریباً تمام تصانیف اسلام کی حمایت میں ہیں، ان کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا مطالعہ کس قدر وسیع، اس کی نظر کیسی غائر اور اس کی تحقیق کس پایہ کی تھی۔ وہ لفاظی اور عبارت آرائی کچھ نہیں جانتے اور نہ ان کو فصاحت و بلاغت سے کچھ سروکار ہے، جیسا کہ اکثر مذہبی تصانیف کے مصنفین کا قاعدہ ہے مگر ان کی کتابیں معلومات علمی سے لبریز ہیں۔ واقعات کی تنقید و تنقیح صحیح نتائج کے استخراج میں انھیں کمال حاصل ہے۔ وہ کبھی اپنی بحث سے الگ نہیں ہوتے کبھی کوئی غیر متعلق بات نہیں کہتے اور نہ کبھی الزامی جواب دیتے ہیں۔ بلکہ امر زیر بحث کو ہمیشہ مد نظر رکھتے اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر ایک وسیع نظر ڈالتے ہیں۔ تمام واقعات متعلقہ کو جمع کر کے ان کی تنقید کرتے اور حتی الامکان قرآن مجید سے استدلال کرتے اور نہایت صحیح اور عجیب نتائج استنباط کرتے ہیں اور اسی ضمن میں وہ بڑے بڑے مستند لوگوں کی رایوں کو پیش کرتے ہیں یا ان کی غلطیوں پر نظر ڈالتے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ جس بات کو وہ لیتے ہیں اس پر اس خوبی اور جامعیت سے بحث کرتے ہیں کہ پھر اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ البتہ ان کی مذہبی تصانیف میں ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ان کی تحریر۔ دلکش کچی ہے اور اس میں وہ جوش اور گرمی نہیں جو مذہبی بحث و مباحثہ میں ہونی چاہیے

تاکہ انسان کے نیند بادت لطیفہ پھڑک اٹھیں اور قلب پھڑک جائے۔ مولوی صاحب کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سرد مہر منطقی ایک ایسے بحث پر جس سے اسے دلچسپی ہے بحث کر رہا ہے اور واقعات اور دلائل وبراہین پیش کر کے بال کی کھال نکال رہا ہے۔ اور بس۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مقصد مذہب کے صرف اس حقیقت سے تھا جس کا تعلق امور دنیا سے ہے اور وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مذہب اسلام کسی طرح انسان کی دنیاوی ترقی کا مانع نہیں بلکہ اس کا ممد و معاون ہے اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں وہ غلطی پر ہیں اور کچھ شک نہیں کہ اس میں مولوی صاحب کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔

تصانیف مذہبی تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ **تعلیقات** یہ رسالہ پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں ہے۔ مولوی صاحب نے اس رسالہ میں اس امر کو ثابت کیا ہے کہ پادری صاحب کے ماخذ سب کے سب غلط اور پوچ ہیں اور ایسی کمزور بنیاد پر اعتراضات کی عمارت قائم کرنا خلاف دانشمندی ہے۔ اسی ضمن میں احادیث کی تنقید صحت و غیر صحت پر بحث کی ہے اور بعض منصف مزاج یوروپین فاضلوں کی رایوں کا اقتباس بھی درج کیا ہے۔ نیز جناب مسیحؑ و اناجیل اربعہ پر تفصیلی رد و قدح کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ مسیحؑ کی سوانح عمری نہایت غیر معتبر ہے اور چاروں انجیلیں تاریخی اعتبار سے گری ہوئی ہیں (مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۲ء)

۲۔ **تحقیق الجہاد** یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔ عیسائیوں کی طرف سے اسلام پر یہ بہت بڑا اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ مذہب جہاد کے ذریعہ یعنی بزور شمشیر دنیا میں پھیلایا گیا ہے۔ نواب صاحب نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ جہاد کی حقیقت اور ماہیت پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ

آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ تمام حالت مجبوری میں اور اپنے
بچاؤ کے لیے تھیں۔ ان سے اسلام کا بزور پھیلانا یا کفار کا قتل کرنا مقصود نہ تھا۔ اس ضخیم
کتاب میں بحث اس صفائی اور خوبی اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ کی گئی ہے کہ آج تک کسی نے
اس مسئلہ پر اس عمدگی کے ساتھ بحث نہیں کی تھی۔ تمام بڑے بڑے یوروپین مصنفین
مثلاً مسٹر ویلیم میور، ڈاکٹر اسپرنگر، مارکس ڈاڈز، ہیوز، سیل، ڈاکٹر جیمس
گرین، ریورنڈ [illegible] وغیرہ نے جو اس بحث پر تحریریں لکھی تھیں ان کے اقوال
نقل کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ان کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ مرحوم کی یہ کتاب
حقیقت میں نہایت قابل قدر ہے اور گویا [illegible] کہ یہ کتاب دنیا میں اپنی نوعیت
اور طرز کی ایک ہی کتاب ہے۔

۳۔ ریفارمز انڈر مسلم رول (اصلاحات زیر حکومت اسلام)
یا اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام۔ یہ کتاب بھی انگریزی زبان میں لکھی ہے لیکن مصنف
نے اس کے پہلے چودہ صفحات کا ترجمہ خود کیا ہے یا یہ کہیے کہ اس حصہ مضمون کو اپنی
مادری زبان میں ادا کیا ہے۔ ہم آئندہ چل کر ان پہلے چودہ صفحات کو بطور نمونہ نقل
کر کے ہدیہ ناظرین کریں گے تاکہ مولوی صاحب کی تصنیفات کے متعلق ایک حد
تک وہ خود رائے قائم کر سکیں۔

۴۔ محمد دی ٹرو پرافٹ (محمد صلعم پیغمبر برحق ہیں) یہ کتاب بھی
انگریزی زبان میں ہے اور مولوی صاحب کی تصانیف میں بڑے پایہ کی کتاب ہے
اس کتاب میں آنحضرت کی زندگی اور خصائل و عادات کے متعلق تمام شکوک
اور اعتراضات کو عالمانہ اور محققانہ تحقیق سے رفع کیا ہے اور بڑے زور شور سے
اس امر کو ثابت کیا ہے کہ محمد صلعم پیغمبر برحق ہیں۔ آج کل کے زمانہ میں عموماً اور تعلیم یافتہ
نوجوان مسلمانوں کے لیے خصوصاً ایسی کتابوں کی بہت سخت ضرورت ہے۔

۵۔ **اسلام کی دنیوی برکتیں**۔ اس رسالے میں مولوی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام دنیا میں کن کن برکات کے نزول کا باعث ہوا ہے اور اہل عالم کو اس سے کیا کیا نعمتیں حاصل ہوئی ہیں یہ کتاب پنجاب میں کئی بار طبع ہو چکی ہے بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔

۶۔ **قدیم قوموں کی مختصر تاریخ**۔ ایام الناس ایک اردو کا چھوٹا سا رسالہ ہے قرآن مجید پر ایک یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں بعض ایسی قوموں کا ذکر ہے جن کا دنیا میں کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اور یہ صرف بے بنیاد قصے اور فسانے ہیں۔ مولوی صاحب نے عجیب و غریب تحقیق و تدقیق اور کاوش سے ان اقوام کا تاریخی ثبوت بہم پہنچایا ہے، اور قدیم یونانی اور عبرانی کتابوں سے مدد لی ہے اور ثبوت میں ان قدیم مؤرخوں کی تاریخوں کو پیش کیا ہے جن میں **ثمود و عاد** کا ذکر ہے اور وہ سب نزول قرآن پاک سے کئی صدیوں پیشتر کی تصنیف ہیں۔

نواب اعظم یار جنگ نے کئی رسالے مثلاً **بی بی ہاجرہ۔ ماریہ قبطیہ** وغیرہ ناتمام چھوڑے لیکن ان سب سے زیادہ قابل قدر اور بے مثل

تعلیق نیاز نامہ

کتاب "العلوم الجدیدۃ والاسلام" ہے جسے وہ اپنی آخری عمر میں لکھ رہے تھے اور جس کا ابتدائی حصہ تہذیب الاخلاق سلسلۂ جدیدہ کی جلد دوم کے ابتدائی پرچوں میں چھپ چکا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی بے وقت موت نے اس بے نظیر کتاب کو پورا نہ ہونے دیا یہ کتاب درحقیقت مصنف نے سرسید کے ایک سوال کے جواب میں لکھنی شروع کی تھی اس کی پوری حقیقت ظاہر کرنے کے لیے ہم یہاں سرسید کا وہ خط نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے اس تصنیف کے موضوع پر بحث کی ہے۔

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب کو جو مضمون لکھنا ہے وہ نہایت ہی مشکل اور نہایت دلچسپ اور نہایت مفید و بکار آمد ہے۔ ابھی تک انھوں نے

صرف تمہید ہی تمہید لکھی ہے۔ فلسفہ کے طرفداروں اور مخالفوں کا حال لکھا ہو اُن کے نام اور ان کا زمانہ بتایا ہے۔ پھر علمائے اسلام میں جو بڑے بڑے فلسفی گزرے ہیں۔ ایک ایک کو گنایا ہے۔ اس کے بعد اب وہ اصل مضمون کی تحریر پر متوجہ ہوں گے جس کو ہمارے ناظرین اخبار پڑھ کر امید ہے کہ تعجب کرینگے۔ نواب اعظم یار جنگ درحقیقت ایک لاحل سوال حل کرنے پر مستعد ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہمارے ناظرین پرچہ کو اس کا کہ وہ کیا سوال ہے خیال ہے یا نہیں۔ اس لیے ہم سوال کو بطور یاددہانی کے اس مقام پر چھاپتے ہیں تاکہ اُن کو معلوم ہو کہ کیا مشکل لاحل سوال ہے۔ اور اس کا جواب جو ہو وہ کیا قابل توجہ اور ہماری قوم کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ مدت سے یہ سوال کیا گیا ہے اور آجتک کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ خدا کرے کہ نواب صاحب ممدوح پورا اور قابل تشفی جواب دیں۔

سوال مذکور یہ ہے :۔

اکثر لوگوں کی رائے میں یہ مسلم ہے کہ یورپین علوم و فنون کی تعلیم عقائد اسلام سے برگشتگی پیدا کرتی ہے۔ اور اُن کی رائے میں اس کا علاج ان علوم کے ساتھ دینی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا ہے۔ اگر یہ رائے صحیح ہے تو یورپین علوم و فنون کے اُن مسائل اور ان کے دلائل کو جو اس برگشتگی کا باعث ہیں بیان کرنا چاہیے۔ اور ان کتب دینیہ اور اُن مقامات کا نشان دینا ضرور ہے جنکے تعلیم میں داخل کرنے سے اس برگشتگی کو روک ہوسکے مع اس بیان کے کہ کس وجہ سے وہ کتابیں اور مقامات روک ہوسکینگی۔ اگر یہ رائے صحیح نہیں تو جہانتک مفصل اور دلیل سے اس کی عدم صحت کا بیان ممکن ہو بیان کیا جاوے''

(تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۲ مطبوعہ یکم ذیقعدہ ۱۲۸۷ھ)

اس کے بعد سرسید نے اس کتاب کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ:-

جس سوال کا جواب نواب اعظم یار جنگ بہادر کو لکھنا ہے۔ اس جواب کے قبل انھوں نے بہت سی تمہیدات قائم کی ہیں۔ ہم سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اصل سوال کا جواب کب آئے گا۔ واضح ہو کہ نواب صاحب ممدوح کا ایک خط ہمارے پاس آیا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے جواب کے مضامین کی ترتیب کیونکر ہے۔ ہم اس خط کو جہاں تک کہ ترتیب مضامین سے متعلق ہو ذیل میں چھاپتے ہیں

انتخاب خط

وہ لکھتے ہیں کہ چھٹی صدی تک حکمائے اسلام کی فہرست کھینچ دی گئی ہے (جو چھپ بھی گئی ہے) اس کے بعد تھوڑا سا ذکر اس انقلاب عظیم کا ہے جو ایشیائی اسلامی دنیا میں چنگیز خاں کی طرف سے ہوا اور اس کی وجہ سے تصنیفات و تعلیم علوم حکمیہ بند ہو گئی۔ اس کے بعد حال کے زمانہ تک کے اہل حکمت و منطق کی فہرست مختصر سی ہے اس کے بعد تصنیفات یعنی کتب مصنفہ علوم حکمیہ و معقولات کا بیان ہے ان کے بعد اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہونے کا ذکر ہے۔ اور معتزلہ اور دیگر متکلمین کے اسماء مذکور ہوئے ہیں اس کے بعد کتب علم کلام و عقائد کی تفصیل ہے ان سب کے بعد اصل بحث آتی ہے کہ علم کلام و عقائد کی رو سے کون کون سا مسئلہ حکماء فلاسفہ کے خلاف ہے اور انھیں مسائل کے متعلق علوم جدیدہ میں ان کی تائید ہوتی ہے یا مخالفت۔ اور بتایا گیا ہے کہ علوم جدیدہ ان مسائل اختلافیہ میں علم کلام کی تائید میں ہیں اور علم کلام کے ذکر کے قبل ہی میں لکھنا بھول گیا ہوں کہ علوم دینیہ کیا کیا ہیں اور وہ کہاں تک فلسفہ و حکمت کے اعتراضات کی تردید کر سکتے ہیں۔ فقہ و تفسیر و حدیث حکماء کے مقابلہ میں کچھ کارآمد نہیں ہیں۔ اور اس غرض سے علم کلام ایجاد کیا گیا تھا مگر اب وہ بھی مفید و کارآمد نہیں رہا

اخیر یہ اس سوال کا جواب ہے جو اس مضمون کی ابتدا میں تھا۔ اس کے بعد میں کچھ اس کا ذکر ہوگا کہ اب تک اس قسم کی کتابیں جن میں تطبیق بین الحکمۃ والاسلام ہوتی ہے کیا تصنیف ہوئیں اور آیندہ کس قسم کی کتابیں تصنیف ہونی چاہییں غرض کہ یہ ایک مختصر سی کیفیت اور فہرست مضامین رسالہ ہے جو آپ کی اطلاع کے لیے عرض کی گئی۔ والسلام"

تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۳ مطبوعہ یکم ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ

افسوس ہے کہ اسی زمانہ میں مولوی چراغ علی صاحب کا انتقال ہو گیا اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں سرسید نے اس حادثہ جانگزا پر تہذیب الاخلاق میں نہایت غمناک مضمون لکھا اور اس مضمون کے ناتمام رہنے پر بھی بہت افسوس ظاہر کیا علاوہ مذکورۂ بالا تصانیف کے مرحوم کے دیگر متعدد رسالے بھی طبع ہو چکے ہیں مثلاً

(۱) غلامی۔

(۲) تسری۔

(۳) تعدادِ ازدواج۔

(۴) ناسخ و منسوخ۔

(۵) ردِ شہادت قرآنی بر کتب ربانی مصنفہ سر ولیم میور وغیرہ۔

جیسا کہ اُن کی تمام تصانیف کا خاصہ ہے یہ رسالے بھی بڑی محنت اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔

اب ہم نواب اعظم یار جنگ کی کتاب "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" یا "مجوزہ اصلاحات سیاسی و تمدنی و فقہی زیر حکومت اسلام" سے حسب ذیل اقتباس کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی تھی جیسا کہ بیشتر ذکر کیا جا چکا ہے لیکن اردو میں اسکے پہلے چودہ صفحات خود نواب اعظم یار جنگ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اسکے ترجمہ کو

یا اُن خیالات کا اپنی زبان میں اعادہ سمجھو۔ جو کچھ ہو تحریر خود حضرت کی ہے اس لیے ناظرین کرام کی دلچسپی کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

کیا خوب دلائل و براہین ہیں۔ قرآن پاک سے تمام عیسائی مصنفین کے اعتراضات کا جواب ہے اور ریورنڈ مسٹر میکال کا تو ناطقہ بند کر دیا ہے جس کے جواب مضمون میں نواب صاحب نے یہ رسالہ تصنیف فرمایا۔

عورتوں کی حالت

اسلام سے پہلے اہل عرب میں عورتوں کی بری حالت

۹۲۔ آنحضرت صلعم کی تعلیم سے عورتوں کی حالت اس درجہ بہتر ہو گئی کہ آپ سے قبل کے تمام مصلحین اور انبیاء کی تعلیم سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی آنحضرت کی تمدنی اصلاحوں سے پہلے تمام ملک عرب میں کثرت ازدواج کی کوئی حد نہ تھی طلاق کا کوئی اصول نہ تھا۔ اور اس کے ساتھ لونڈیوں کے رکھنے کا نہایت مکروہ طریقہ الگ رائج تھا۔ بعض قبائل میں یہ ناپاک ظالمانہ و وحشیانہ رسم جاری تھی کہ وہ اپنی شیر خوار لڑکیوں کو اس لیے قتل کر ڈالتے تھے کہ انھیں سسرے بننے کی ذلت نہ سہنی پڑے اور جو بدنصیب لڑکیاں ان کی خونخواری سے بچ جاتی تھیں وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد وراثت سے محروم رہتی تھیں بعض قبائل ایسے تھے جن میں یہ دستور تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا باپ کی بیوہ (سوتیلی ماں) سے شادی کر لیتا تھا۔ نیز دو بہنوں سے ایک ساتھ عقد کر سکتا تھا۔ متوفی باپ کی بیبیاں بیٹے کی نظروں میں ایسی ہی تھیں جیسے اور بے جان اشیاء۔ ان کے دلوں میں عورتوں کی مطلق وقعت نہ تھی۔ بات چیت میں بھی کسی قسم کی تعظیم کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اور بعض جو نہایت وحشی تھے وہ عفیف اور پاکدامن عورتوں کی نسبت فحش اور ناپاک کلمات استعمال کرتے تھے۔ خود عورتوں

کے عادات و اطوار اور ان کا لباس قابل اصلاح تھا۔ جو یتیم لڑکیاں جوان ہوتی تھیں ان کے ولی ان میں سے کسی کسی سے شادی کر لیتے تھے تاکہ ان کا مال ختم کر لیں۔ اور آخر میں ان کو بے یار و مددگار مصیبت کی حالت میں چھوڑ دیتے تھے قرآن مجید کی تعلیم نے رفتہ رفتہ اُن کی ذلیل حالت کو سدھارنا شروع کیا سب سے اول تو کثرت ازدواج کو چار تک محدود کیا۔ یہ اجازت بھی اس شرط کے ساتھ ہے کہ شوہر کو پورا یقین ہو کہ ان سب کے ساتھ عدل کا برتاؤ کرے گا اور پھر اس امر کا اظہار کر دیا کہ ایک سے زیادہ بیبیوں کے ساتھ عدل کرنا ناممکن ہے اگرچہ مرد ایسا کرنے پر آمادگی ظاہر کریں اور اس طرح درحقیقت کثرت ازدواج کو موقوف کر دیا

۹۴۔ جدید قانون متعلقہ زن و شو کی وجہ سے جس کی پیغمبر خدا نے اپنے پیرووں کو تلقین کی اور بعض دانشمندانہ۔ عادلانہ اور سخت قیود سے آپ نے طلاق کی سہولت کو بھی رفع کیا۔ یہ قیود بہت ہی معقول ہیں اور ان میں طرفین کے فائدے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ قرآن میں اہل عرب کو نصیحت اور تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنی بی بیوں کے بارہ میں خراب رسوم کو ترک کر دیں آنحضرت صلعم نے غلامی کو موقوف کر کے لونڈیوں کے رکھنے کے رواج کو بھی موقوف کیا اور اس وقت جو عورتیں غلامی کی حالت میں تھیں ان سے عقد کر لینے کی تاکید کی ورنہ وہ لونڈیاں بنا کر رکھی جائیں[۹۲]۔ شیر خوار لڑکیوں کے ہلاک کرنے کے خلاف نہایت سخت اور شدائد احکام ہیں۔ اور اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ عقبیٰ میں اس کا بڑا عذاب ہوگا[۹۳]۔ اس طرح عرب اور دیگر اسلامی ممالک سے دختر کشی کی رسم بالکل اٹھ گئی۔ سب سے اول قرآن میں قانون وراثت

آنحضرت صلعم نے طلاق میں عورتوں کی حالت کو ترقی دی

۹۱ سورہ تحریم ۶۶۔ آیت ۵ ۹۲ النساء ۴۔ آیت ۲۹۔ المعارج ۷۰۔ آیت ۲۹ و ۳۰۔ المومنون ۲۳۔ آیت ۵ و ۶ ۹۳ الانعام ۶۔ آیت ۱۵۲ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۳۔ التکویر ۸۱۔ آیت ۸ و ۹۔

ایسا قائم کیا گیا کہ اس میں عربؑ کی عورتوں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھا گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماؤں سے اور وقت واحد میں دو بہنوں سے عقد کرنے کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی اور انھیں سنگین جرائم میں شمار کیا گیا ہے اور یہ ہدایت کی گئی کہ بیواؤں کے ساتھ مثل املاک و جائداد کے برتاؤ نہ کرو۔

مردوں کو تاکید کی گئی ہے کہ عورتوں سے عزت کے ساتھ پیش آئیں اور ان سے بات چیت کرنے میں ادب ملحوظ رکھیں۔ پھر آنحضرت صلعم نے عورتوں پر بہتان باندھنے کے مسئلے کی طرف توجہ فرمائی اور جو لوگ پاکدامن اور نیک عورتوں کے خلاف اتہام لگاتے تھے اُن کے لیے جسمانی سزا مقرر کی۔ نیز عورتوں کے اطوار وعادات اور لباس میں بھی اصلاحیں فرمائیں۔ جو لوگ کم سن یتیم لڑکیوں کے ولی تھے انھیں ممانعت کر دی گئی کہ اُن سے شادی نہ کریں۔

عورتیں جو اس وقت ذلت وخواری کی حالت میں تھیں اُن کے لیے یہ مفید تدابیر بے شمار فوائد سے مملو تھیں اور ان نئی اصلاحوں کی بدولت انھیں اس ذلت وخواری اور مصیبت سے نجات ہو گئی جو اب تک مردوں کے ہاتھوں سے انھیں سہنی پڑتی تھیں۔

اس مسئلہ کے متعلق قرآن مجید کے احکام

۹۴۔ اس مسئلہ کے متعلق قرآن مجید میں جو آیات وارد ہوئی ہیں وہ ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

۱۵۱ النساء ۴۔ آیت ۸ ۱۵۲ النساء ۴۔ آیت ۲۶ ۱۵۳ النساء ۴۔ آیت ۲۷ ۱۵۴ النساء ۴۔ آیت ۲۱ ۱۵۵ النساء ۴۔ آیت ۲۲
۱۵۶ النساء ۴۔ آیت ۲۳ ۱۵۷ النور ۲۴۔ آیت ۴ و ۶ و ۲۳ ۱۵۸ الاحزاب ۳۳۔ آیت ۵۹۔ النور ۲۴۔ آیت ۳۱
۱۵۹ النساء ۴۔ آیت ۲ و ۱۲۶ ۱۶۰ یتیم لڑکیوں کا مال ہضم کرنے کی نیت سے اولیا کو اُن کے ساتھ نکاح کرنے کی ممانعت کی گئی ملاحظہ ہو سورہ نساء ۴۔ آیت ۳۔ مگر جو ولی محض نیک نیتی سے یتیم لڑکی کے ساتھ عقد کرے تو مضائقہ نہیں النساء ۴۔ آیت ۱۱۔

(ہم یہاں بغرض اختصار صرف ترجمہ لکھتے ہیں اور اصل آیات قرآنی سے قطع نظر کرتے ہیں ورنہ اصل کتاب میں ترجمہ اور آیات قرآنی ساتھ ساتھ تحریر ہیں۔)

۱۔ لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو نفس واحد (آدم) سے اور اس سے اس کے جوڑے (حوا) کو پیدا کیا اور ان دو سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا۔ اور آپس میں تم جس خدا کا واسطہ دیتے ہو اس سے ڈرو اور ارحام کا احترام و لحاظ کرو (النسا ۴۔ آیت ۱۔)

۳۔ اور اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے حق میں تم انصاف نہ کروگے تو اپنی مرضی کے مطابق دو دو تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کرو لیکن اگر تم ڈرو کہ (متعدد بیبیوں میں) برابری نہ رکھوگے تو بس ایک ہی یا جو لونڈیاں تمہارے قبضہ میں ہوں (انہی پر قناعت کرو) اس طرح ناانصافی سے بچنے کے قریب تر ہوگے۔ اور عورتوں کو اُن کے مہر خوشی سے دیدو۔ پھر اگر وہ اپنی خوشی سے تم کو کچھ چھوڑ دیں تو اسے کھاؤ پیو۔ نوش جان کرو۔ (النسا ۴۔ آیت ۳)

۸۔ ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں تھوڑا ہو یا بہت مردوں کا حصہ ہے اور ایسا ہی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکے میں تھوڑا ہو یا بہت عورتوں کا بھی حصہ ہے اور یہ حصہ ہمارا ٹھیرایا ہوا ہے (النسا ۴۔ آیت ۸)

۲۳۔ اے مسلمانو! تم کو روا نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور اُن کو اس لیے بند نہ کر رکھو کہ جو تم نے اُن کو دیا ہے اس میں سے کچھ چھین لو۔ ہاں اُن سے کوئی کھلی ہوئی بدکاری سرزد ہو (تو بند رکھنے کا مضائقہ نہیں) اور بیبیوں کے ساتھ حسن سلوک سے رہو سہو۔ اور اگر تم کو بی بی ناپسند ہو تو عجب نہیں کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ اسی میں بہت سی خیر و برکت دے (النساء ۴۔ آیت ۲۳)

۲۴۔ اور اگر تمھارا ارادہ ایک بی بی کو بدل کر اس کی جگہ دوسری بی بی کرنے کا ہو تو اگرچہ تم نے پہلی بی بی کو ڈھیر سا مال دیدیا ہو مگر اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا کسی قسم کا بہتان لگا کر اور صریح گنہگار بنکر اپنا دیا ہوا اس سے واپس لینا چاہتے ہو (النساء ۴۔ آیت ۲۴)

۲۵۔ اور اس (اپنے دیے ہوئے) کو کیونکر واپس لے لو گے۔ حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے ہو اور ان عورتوں نے تم سے پکا قول لے لیا ہے (النساء ۴۔ آیت ۲۵)

۲۶۔ اور جن عورتوں کے ساتھ تمھارے باپ نے نکاح کیا ہو ان کے ساتھ نکاح نہ کرو مگر جو ہو چکا سو ہو چکا۔ بے شک یہ بڑی بے حیائی اور غضب کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا (النساء ۴۔ آیت ۲۶)

۲۹۔ اور تم میں سے جسکو آزاد مسلمان بی بیوں سے نکاح کرنے کا مقدور نہ ہو تو مسلمان لونڈیاں جو تمھاری ملکیت میں ہوں خیر انہی سے (نکاح کر لو) اور اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ تم سب ایک ہی ہو پس لونڈیوں کے مالکوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کر لو اور دستور کے مطابق انکے مہر ان کے حوالے کر دو مگر (شرط یہ ہے کہ) وہ لونڈیاں پاک دامن ہوں نہ تو علانیہ بدکار ہوں اور نہ پوشیدہ (النساء ۴۔ آیت ۲۹)

۳۸۔ مرد عورتوں کے سرپرست ہیں اس سبب سے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر برتری دی ہے اور اس سبب سے بھی کہ انھوں نے اپنا مال (ان عورتوں پر) خرچ کیا ہے پس جو نیک بیبیاں ہیں مردوں کا کہا مانتی ہیں اور (خدا کی عنایت سے) ان کی غیبت میں ہر چیز کی حفاظت رکھتی ہیں اور تم کو جن بیبیوں سے نافرمانی کا خوف ہو تو (پہلی دفعہ) ان کو سمجھا دو

پھر اُن کو بستر پر تنہا چھوڑ دو۔ (پھر بھی نہ مانیں) تو ان کو مارو پس اگر وہ اطاعت کریں تب ان پر الزام کے پہلو نہ ڈھونڈو بے شک اللہ برتر و بزرگ ہے (النساء ۴۔ آیت ۳۸)

۳۹۔ اور اگر تم کو میاں بی بی میں نا چاقی کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے کنبے سے اور ایک ثالث عورت کے کنبے سے مقرر کرو اور اگر یہ دونوں ان میں میل کرا دینا چاہیں گے تو خدا دونوں میاں بی بی میں موافقت کرادیگا اللہ واقف اور خبردار ہے (النساء ۴۔ آیت ۳۹)

۱۲۶۔ (اے پیغمبر) تم سے یتیم لڑکیوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ اللہ تم کو ان کے ساتھ (نکاح کے) بارے میں اجازت دیتا ہے + اور خدا کی کتاب میں تم کو جو حکم (یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرنے کی بابت) سنایا گیا وہ ان یتیم لڑکیوں کے لیے ہے جن کو تم ان کا مقررہ حصہ نہیں دیتے اور چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کرلو اور بے بس (کم سن) لڑکیوں کے باب میں (اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ ان کی خبرگیری کرو) اور یہ کہ یتیموں کے بارے میں انصاف پر قائم رہو۔ اور تم جو کچھ بھلائی کروگے بے شک اللہ اس کو جانتا ہے (النساء ۴۔ آیت ۱۲۶)

۱۲۷۔ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے مخالفت یا بے رغبتی کا اندیشہ ہو تو میاں بی بی دونوں میں کسی پر کچھ گناہ نہیں کہ اصلاح کی کوئی بات ٹھیرا کر آپس میں صلح کریں اور صلح (ہر حال میں) بہتر ہے اور حرص تو جان سے لگی ہوئی ہے اور اگر تم اچھا سلوک اور پرہیزگاری کرو تو خدا تمھارے ان نیک کاموں سے باخبر ہے (النساء ۴۔ آیت ۱۲۷)

۱۲۸۔ اور تم (اپنی طرف سے) بہتیرا چاہو لیکن یہ تم سے ہرگز نہ ہو سکیگا کہ کئی کئی بی بیوں میں پوری پوری برابری کرسکو (خیر) بالکل ایک ہی طرف

نہ جھک پڑو اور دوسری کو اس طرح نہ چھوڑ بیٹھو کہ گویا بیچ میں لٹک رہی ہے اور
اگر درستی سے چلو اور زیادتی کرنے سے بچے رہو تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے
(النساء ۴۔ آیت ۱۲۸)

۱۲۹۔ اور اگر صلح نہ ہو سکے یا میاں بی بی جدا ہو جائیں تو اللہ اپنی وسعت
فضل سے ہر ایک کو آسودہ رکھے گا اور اللہ گنجائش والا اور حکمت والا ہے
(النساء ۴۔ آیت ۱۲۹)

۱۵۱۔ (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو کہ ادھر آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر
سناؤں جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہیں وہ یہ ہیں کسی کو خدا کا شریک
نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو اور مفلسی کے ڈر سے اپنے
بچوں کو قتل نہ کرو ہم ہی تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائی کی
باتیں جو ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ ہوں ان کے قریب نہ جاؤ اور جان جس کے مار ڈالنے
کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو مار نہ ڈالو مگر حق پر یہ وہ باتیں ہیں جن کا حکم خدا
نے تم کو دیا ہے تاکہ تم سمجھو (الانعام ۶۔ آیت ۱۵۱)

۳۳۔ اور اے لوگو! افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ان کو اور تم کو
ہم ہی رزق دیتے ہیں اولاد کا مارنا بڑا بھاری گناہ ہے (الاسرٰی ۱۷۔ آیت ۳۱)

اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور چار گواہ
پیش نہ کریں تو ان کو اسی درے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ بے شک
یہ لوگ بدکار ہیں (النور ۲۴۔ آیت ۴)

۲۳۔ پاکدامن "بھولی" اور ایمان والی عورتوں پر جو لوگ بدکاری کی تہمت
لگاتے ہیں وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ملعون ہیں اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے
(النور ۲۴۔ آیت ۲۳)

۳۱۔ اور اے پیغمبر مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر جو اس میں چارو ناچار کھلا رہتا ہے اور اپنے گریبانوں پر اوڑھنیاں ڈالے رہیں اور اپنی زینت کے مقامات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ پر یا اپنے خاوند کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنی لونڈیوں پر یا گھر کے ایسے مرد خدمتیوں پر جن کو عورتوں سے کچھ غرض و مطلب نہو یا لڑکوں پر جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے آگاہ نہیں۔ اور چلنے میں اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ لوگوں کو ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو اور مسلمانو! تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ (النور ۲۴۔ آیت ۳۱)

۵۹۔ اے پیغمبر اپنی بی بیوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں اس سے غالباً یہ الگ پہچان پڑینگی پھر وہ ستائی نہ جائینگی اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (الاحزاب ۳۳۔ آیت ۵۹)

۸۔۹۔ اور جس وقت اس لڑکی سے جو زندہ دفن کر دی گئی تھی پوچھا جائیگا کہ کس قصور کے بدلے ماری گئی (التکویر ۸۱۔ آیت ۸ و ۹)

قرآن مجید میں عورت اور مرد کی مساوات

۹۵۔ قرآن مجید میں عام طور سے جسمانی قوت اور وراثت کے سوا باقی تمام قانونی، تمدنی اور روحانی حیثیتوں سے مرد اور عورت میں کامل مساوات تسلیم کی گئی ہے۔

۲۲۷۔ اور جیسے مردوں کا حق عورتوں پر ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا حق مردوں پر، ہاں مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے (البقرہ ۲۔ آیت ۲۲۷)

۳۲۔ مردوں نے جیسے عمل کیے ہوں ان کے لیے اُن کا حصّہ اور عورتوں نے جیسے عمل کیئے ہوں اُن کے لیے اُن کا حصّہ ہے اور ہر وقت اللہ سے اس کا فضل مانگتے رہو اللہ ہر چیز سے واقف ہے (النساء ۴۔ آیت ۳۲)

۳۴۔ مرد عورتوں کے سرپرست ہیں اس سبب سے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر برتری دی ہے اور اس سبب سے بھی کہ انھوں نے اپنا مال (اُن عورتوں پر) خرچ کیا ہے (النساء ۴۔ آیت ۳۴)

۳۵۔ بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور راست گو مرد اور راست گو عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خاکساری کرنے والے مرد اور خاکساری کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور کثرت سے خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لیے اللہ نے اُن کے گناہوں کی معافی تیار کر رکھی ہے اور بڑے بڑے اجر

(الاحزاب ۳۳۔ آیت ۳۵)

ان آیات میں جو کچھ مذکور ہے آنحضرت صلعم نے عورتوں کی بہتری کے لیے اس سے کہیں زیادہ کیا ہے۔ کیونکہ علاوہ کثرت ازدواج اور شرمناک کثرت طلاق کے خلاف سخت احکام اور قیود قائم کرنے کے آپ نے اپنے پیروؤں کے دلوں میں عورتوں کی طرف سے محبت و مودت کے پاکیزہ خیالات پیدا کیے۔ اور اپنے الہامی احکام میں عورتوں کی عزت اور زن و شو کے باہمی آرام و آسائش اور مسرت کی تعلیم دی۔

۲۱۔ اور اسی کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس کی بی بیاں پیدا کیں تاکہ تم کو ان کی طرف رغبت کرنے سے راحت ملے۔ اور تم میاں بی بی میں محبت و مہربانی پیدا کی۔ بے شک جو لوگ سوچتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں قدرت خدا کی نشانیاں ہیں (الروم ۳۰۔ آیت ۲۱)

۱۸۶۔ عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو (البقرہ ۲۔ آیت ۱۸۶)

معاملات معاشرت میں مرد اور عورت کی مساوات اس تشبیہ سے پورے طور پر ظاہر کر دی گئی ہے کہ مرد اپنی بیویوں کا لباس ہیں اور عورتیں اپنے شوہر کا لباس ہیں اور لفظ زوجین یعنی جوڑے سے ایک ہی عورت سے شادی کرنے کا جواز پایا جاتا ہے اور یہ تاکید نکلتی ہے کہ یہ رشتۂ عقد ٹوٹ نہیں سکتا۔

عیسائی ممالک میں عورتوں کی ذلیل حالت

۹۶۔ بت پرستی۔ یہودیت اور عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام نے عورتوں کے لیے بہت زیادہ آزادی اور تمدنی ترقی کو جائز رکھا ہے جو قبل اسلام نہیں پائی جاتی۔ حضرت موسیٰ کی شریعت یہودی عورتوں کی اخلاقی اور تمدنی بہبودی کو کوئی بڑا فائدہ نہ پہنچا سکی اور عہد جدید یا انجیل نے ان کی دنیاوی ترقی کے لیے اتنا نہ کیا جتنا کہ اسلام نے کیا۔ یوروپین ممالک میں عورتوں کی حالت جو اچھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روما کے قانون اور ٹیوٹانک[1] اقوام کا فطرۃً عورتوں کے ساتھ عزت کے برتاؤ اور صدہا سال کے تمدن نے یوروپین ممالک میں عورت کو اس کی مناسب حیثیت پر ترقی دی ہے۔ ورنہ مشرقی ٹرکی شام و فلسطین میں عیسائی عورتوں کی دماغی اور تمدنی حالت ویسی ہی ادنیٰ ہے جیسی ان کی مسلمان اور نیم بت پرست (سیمی پیگن) بہنوں کی حالت مشرق یا ایشیائی ممالک میں ہے۔

[1] جرمن کے قدیم باشندے۔

عورتوں کی ادنیٰ حالت کے متعلق بائبل کی انتباس

۹۷۔ یہودی اور عیسائی پیشوا از روے شریعت توریت و انجیل عورتوں کے ذلیل و حقیر اور کم رتبہ اور تابعدار ہونے پر عام طور سے یقین رکھتے تھے ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا میں گناہ عورتوں کی بدولت آیا۔ اور انسانی گناہ کا سارا وبال انھیں کی گردن پر ہے لہذا ان کی یہ ذلیل حالت خود انھیں کے ہاتھوں سے ظہور میں آئی اور اس ذلت کی یہ نوبت پہونچی کہ وہ مردوں کی محکوم بن گئیں کتاب پیدائش (باب ۳ آیت ۱۶) میں شوہر کی نسبت عورت سے کہا گیا ہے کہ "وہ تجھ پر حکومت کرے گا" اس کلمہ کو اگر پیشین گوئی تصور کیا جائے تو یہ پیشین گوئی مشرقی ممالک میں حیرت انگیز طریقے سے پوری ہو گئی ہے۔

سنہ مسیحی سے کچھ قبل مسئلہ ازدواج کے متعلق ایک بڑا تغیر پیدا ہوا اور اس سے انسانی فطرت کے روحانی اور دماغی حصہ پر خاص اثر پڑا۔ اس زمانہ میں جو عہد عتیق اور عہد جدید کے مابین گذرا۔ رہبانیت کی ہوا پھیل چکی تھی..... فرقہ **ایسی نس** نے سب سے پہلے جواز نکاح کے متعلق شبہات ظاہر کیے۔ اس فرقہ کے بعض لوگ تو شادی سے بالکل محترز رہے اور بعض نے خاص قیود کے ساتھ شادی کو اختیار کیا (جوزفس فصل ۲ باب ۸ فقرہ ۲ و ۱۳) **تھیراپیوٹ** کے اور بعد کے زمانہ میں فرقہ **ناسٹک** کے خیالات بھی اسی قسم کے تھے (برٹنس لکچرز باب ۱ صفحہ ۲۱۴) بعد ازاں یہ خیالات وہاں سے مسیحی کلیسا میں پہنچے اور فرقہ **این کریٹی** کے خاص عقائد میں شریک ہو گئے (برٹن باب ۲ صفحہ ۱۶۱) اور آخر کار ایسے ہی خیالات سے طریقۂ رہبانیت کی صورت قائم ہوئی۔ رہبانیت سے ایک مضر نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ عورتوں کی حیثیت اور فطرت کو حد سے زیادہ حقیر خیال کرنے کا میلان پیدا ہو گیا۔ اس رجحان میں کسی قدر قدیم یہودی تصنیفات

---

[۱] ڈکشنری آف بائبل مولفہ اسمتھ جلد ۲ ملاحظہ ہو مضمون ازدواج صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۳ مطبوعہ لندن ۱۸۶۳ء

کے اثر کا بھی پتہ چلتا ہے ایک غیر متعصب شخص ان تصانیف میں مشرقی عورتوں کو حقیر سمجھے جانے کی صریح شہادت پائے گا۔ یہ جائز رکھا گیا ہے کہ دُلہن کے باپ کو دُلہن کی قیمت[1] ادا کی جائے کثرت ازدواج کو جائز قرار دیا گیا ہے اور ان کے بڑے بڑے عالم اور دانشمند لوگ نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ اس رسم کے پابند تھے۔ عورت تمام انسانی گناہوں کی اصل قرار دی گئی ہو بچے کی پیدائش کے بعد اس کے تزکیہ و تصفیہ کا ایک زمانہ معین کیا گیا لیکن خاص کر لڑکیوں کے لیے دُگنی مدت مقرر کی گئی۔ ایک یہودی مصنف بڑے زور سے لکھتا ہے کہ "مردوں کی بُرائی عورتوں کی نیکی سے بہتر ہے" قدیم یہودی تاریخ میں عورتوں کے جو اعلیٰ نمونے دکھلائے ہیں وہ عموماً ادنےٰ درجے کے ہیں۔ اور بلاشبہ اُن عورتوں سے بہت کم درجے ہیں جو رومن تاریخ اور یونانی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ عہد عتیق (توریت و زبور میں) غالباً سب سے زیادہ جس عورت کی مدح و ثنا کی گئی ہے۔ یہ وہ ہے جس نے دغابازی سے ایک سوتے ہوئے شخص کو قتل کر ڈالا جو اس کے گھر میں پناہ گزیں تھا۔

یہودی تصانیف اور راہبانہ میلان نے جس نے عورت کو مرد کے ہوا و ہوس کا اصلی سرچشمہ قرار دیا، مشترکہ اثر سے وہ سخت مذمتیں ظہور میں آئیں جو ان عالموں کی تصانیف کا ایک بڑا اور بے سرو پا حصہ ہیں اور یہ نہایت عجیب بات ہے کہ وہ ان تعریفوں کے بالکل برعکس ہیں جو بعض خاص عورتوں کی کی گئی ہیں۔ عورت کی نسبت یہ لکھا ہے کہ وہ دوزخ کا دروازہ اور تمام انسانی گناہوں کی ماں ہے۔ اسے اس خیال سے شرم آنی چاہیے کہ وہ عورت ہے اس لعنت اور آفت کی وجہ سے جو اس کی وجہ سے عالم پر نازل ہوئی ہے

---

[1] قرآن نے اس رسم کو اٹھا دیا (چراغ علی)

"اسے ہمیشہ نفس کشی کرنی چاہیے۔ اُسے اپنے لباس سے شرم کرنی چاہیے اسلیے کہ یہ اُس کے جنت سے نکالے جانے کی یادگار ہے۔ خاص کر اسے اپنے حسن سے شرمندہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ شیطان کا سب سے قوی آلہ ہے" جسمانی حسن ایک ایسا مضمون ہے جس پر مذہبی لوگوں کی طرف سے ہمیشہ لعنت پڑتی رہی ہے اگرچہ اس میں ایک عجیب استثنا کیا گیا ہے کیونکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں بشپوں کے جسمانی حسن کا ذکر خاص طور پر ان کی قبروں پر لکھ دیا جاتا تھا۔ چھٹی صدی میں کونسل صوبجات کے حکم سے عورتوں کو عشائے ربانی کو خالی ہاتھوں میں لینے کی ممانعت کر دی گئی تھی کیونکہ وہ فطرتاً ناپاک ہیں۔ ان کی یہ ذلیل حالت برابر قائم رہی۔

غالباً اسی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ عورتوں کے متعلق قانونی اصول بھی اسی قسم کے قائم ہو گئے۔ عورتوں کی عدم مساوات اور ناواجب حالت کا قانون جو قدیم سے چلا آتا تھا۔ اس میں رومن سلطنت کے ختم ہونے تک دو ترمیم ہوتی رہی۔ اور یہ قانونی انصاف کی تحریک کانسٹن ٹائن کے زمانہ سے لے کر جسٹینین کے عہد تک برابر جاری رہی اور بار بیرین (جہالت) دور کے بعض ابتدائی قوانین میں بھی یہ تحریک پائی جاتی ہے۔ لیکن تمام فیوڈل قانون جو عورتوں کے متعلق تھا بمقابلہ اس قانون کے جو پہلے غیر مسیحی اقوام میں جاری تھا ادنیٰ درجہ کا تھا۔ علاوہ ان ذاتی قیود کے جو رومن کیتھولک تعلیم کی وجہ سے طلاق اور عورتوں کے تابع رکھنے کے متعلق موجود تھیں ہم دیکھتے ہیں کہ اور بے شمار سخت سے سخت قانون ایسے موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ ناممکن تھا کہ عورتیں معتد بہ املاک اپنے قبضہ میں رکھ سکیں اور اس لیے وہ مجبور تھیں کہ یا تو وہ شادی کر لیں یا راہبہ ہو جائیں۔ یہ ذلیل حالت قانون کے ذریعے

قائم رکھی گئی تھی۔ اور ۱۸۰۶ء میں جو لوگ اکثر اس بے انصافی پر سابق میں مخالفت کرتے اور شور وغل مچاتے تھے کہ "لڑکیاں وراثت سے بلا وجہ کیوں محروم کی جاتی ہیں" رفتہ رفتہ وہ مخالفت بھی جاتی رہی۔ جہاں جہاں شریعت عیسوی کی بنیاد پر قوانین بنائے گئے وہاں ہم ایسے قوانین وراثت دیکھتے ہیں جنھوں نے لڑکیوں اور نیز بیوی کے حق کو بالکل پامال کر دیا ہے اور عام رائے بھی ان ہی قوانین کی تابع ہوگئی ہے اور گذشتہ صدی کے آخر تک کبھی اس قانون کے منسوخ کرنے کی کوئی بڑی کوشش نہیں کی گئی۔ فرانس کے انقلاب پسندوں نے سی اسے یے اور کان ڈورسی کی یہ تجویز کردی کہ "عورتوں کو کامل پولیٹیکل آزادی دی جائے" لیکن کم از کم انھوں نے بیٹوں اور بیٹیوں کے حقوق وراثت مساوی کر دیے اور اس طرح انھوں نے قانون اور رائے دونوں کی بہت بڑی اصلاح کی بنیاد ڈالی جو کسی دن تمام دنیا میں ضرور پھیل جائیگی۔

۹۸۔ باسورتھ اسمتھ نے اس امر کی تعریف کی ہے کہ حضرت محمد صلعم باسورتھ اسمتھ نے غیر محدود ازدواج کے جواز کو محدود کیا اور بے سمجھے بوجھے طلاق کو جس کی کہ بلائے مشرق میں کثرت ہے مذموم قرار دیا اور آپ کے قوانین کی بدولت اعلےٰ اخلاقی خیالات پیدا ہوئے۔ وہ ان امور کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"میں نے یہ امر فراموش نہیں کر دیا ہے کہ پیغمبر اسلام نے انتہائی اور نازک حالات میں خاوند کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی بی بی کو جسمانی سزا دے بشرطیکہ وہ اسے اعتدال کے ساتھ کام میں لائے انھوں نے عورتوں کو پردہ میں رہنے کی اجازت دی اور تاکید کی ہے۔ انھوں نے کثرت ازدواج کے متعلق ان

سلہ لیکی کی ہسٹری اوف یوروپین مارلز فرام آگسٹس ٹو شارلیمین جلد ۲ باب ۵ صفحہ ۳۳۲-۳۴۰ (چراغ علی)

قیود کو جو اوروں پر لگائی گئی تھیں اپنے حق میں کم کر دیا۔ انھوں نے ان عورتوں کو جو جنگ میں گرفتار ہوں۔ لونڈیاں بنانے کی اجازت دی اور اسے میں تسلیم کرتا ہوں کہ آنحضرت صلعم کے پیرووں نے بہ نسبت اس تعلیم کے جو اصلی ہے آنحضرت کے اس تعلیم اور نمونہ کی پیروی و اطاعت میں جو (معاذ اللہ) ناقص ہے زیادہ تر مستعدی ظاہر کی لیکن میں نہایت اعتماد کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ پیغمبر اسلام نے یہودیوں کے اور زمانہ جاہلیت کے مقابلہ میں عورتوں کی حالت کو بہت زیادہ ترقی دی اور ان کے حق میں بہت قابل تعریف کام کیا۔[1]

مجھے افسوس ہے کہ مسٹر باسورتھ اسمتھ بھی اس غلطی میں پڑ گئے ہیں جو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بعض امور کو نقائص[2] سے تعبیر کیا ہے اور انھوں نے ان الزامات کی کامل تحقیق نہیں کی جیسی کہ انھوں نے دوسرے امور میں کی ہے۔

(قرآن میں بی بی کے مارنے کی اجازت)

۹۹۔ (۱) یہ امر کہ آنحضرت صلعم نے شوہروں کو اجازت دی ہے کہ انتہائی حالات میں وہ اپنی سرکش بی بیوں کو جسمانی سزا دے سکتے ہیں۔ (النساء ۴۔ آیت ۳۴) صحیح ہے لیکن یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ یہ حالت ابتدا کے زمانہ کی ہے جبکہ مدینہ کے ہر گھر میں بزرگ خاندان کی حکومت تھی جہاں کوئی

---

[1] محمد اینڈ محمڈنزم صفحہ ۲۲۱ لیکچر جو رائل انسٹی ٹیوشن آف گریٹ برٹن میں ماہ فروری و مارچ ۱۸۷۴ء میں آر باسورتھ اسمتھ ایم اے نے بمقام لندن دیا۔

[2] یوس جی لس نے اس فقرہ کو منضبط کیا ہے جو یہ ہیں: کیلیٹو نے یہ لکھا ہے کہ خاوند کو اپنی بی بی پر کامل اختیار حاصل ہے۔ مستثنیٰ یہ ہے کہ اگر وہ بیجا فعل مثلاً شراب نوشی یا بدکاری کی مرتکب ہو تو وہ اسے ملزم قرار دے اور سزا دے" ہسٹری آف یوروپین مورلز فرام آگسٹس ٹو شارلمین مصنفہ ڈبلیو اسے۔ لیکی ایم اے جلد دوم صفحہ ۹۳ - ۹۴ -

باقاعدہ عدالت جیوں یا منصفیوں کی نہ تھی۔ خاندان کا سردار اپنے گھر کا جج ہوتا تھا لیکن جب یہ صورت بدل گئی عدالتیں قائم ہو گئیں اور انصاف ایک خاص قاعدہ اور طرز پر ہونے لگا تو شوہر کو جو اختیار دیا گیا تھا وہ اُٹھا دیا گیا اور پھر طرفین یعنی میاں بی بی کو منصف کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرنا ہوتا تھا اور منصفیوں نے لوگوں کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی ممانعت کر دی۔ دوسری بھی آیت (النساء ۴۔ آیت ۳۵) کی رو سے پہلے جو اختیار شوہروں کو بی بیوں کے مارنے کا دیا گیا تھا بالکل جاتا رہا آیت یہ ہے:-

۳۵۔ اور اگر تم کو میاں بی بی میں ناچاقی کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے کنبے سے اور ایک ثالث عورت کے کنبے سے مقرر کرو اگر یہ دونوں ان میں میل کرا دینا چاہیں گے تو خدا میاں بی بی میں موافقت کرا دیگا۔ اللہ واقف و خبردار ہے (النساء ۴۔ آیت ۳۵)

۱۰۰۔ (۲) آنحضرت صلعم نے عورتوں کو پردہ میں رہنے کی نہ اجازت دی اور نہ تاکید کی۔ آپ نے اُن کے عادات و اطوار اور لباس میں البتہ اصلاح کی تاکہ اُن کی عزت و وقعت بڑھ جائے۔ نیز آپ نے ایسی تدبیریں بتائیں کہ جب وہ رستوں اور گلیوں میں نکلیں تو ناشائستہ اور بیہودہ لوگوں کی تذلیل و توہین سے محفوظ رہیں قرآن مجید میں مندرجہ ذیل آیتیں اس مضمون کی ہیں۔

لے یونانیوں کی عورتیں بالکل پردہ میں رہتی تھیں اور بچپن ہی میں اُن کا بیاہ ہو جاتا تھا۔ ان کے معمولی کام یہ تھے کہ چرخہ کاتیں، کپڑے بنیں، کشیدہ نکالیں، خانہ داری کا انتظام کریں، اور بیمار غلاموں کی خدمت کریں اور گھر کے الگ حصہ میں رہتی تھیں۔ جو زیادہ دولتمند تھیں وہ تو باہر جاتی تھیں مگر وہ بھی باندیوں، لونڈیوں کے ہمراہ، مگر کبھی کسی عام جلسے یا تماشہ مقام میں نہیں جا سکتی تھیں اور سوائے خاوند کی حضوری کے کسی مرد سے گھر میں نہیں مل سکتی تھیں اور جب مہمان آجاتے تھے تو وہ کھانے پینے کی میز پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں (لیکی کی ہسٹری آف یوروپین مارلز جلد دوم صفحہ ۲۸۷)

۵۹۔ اے پیغمبر اپنی بی بیوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی چادروں[۵۱] کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً یہ الگ پہچان پڑ جائیگی پھر وہ نہ ستائی جائینگی اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے (الاحزاب ۳۳۔ آیت ۵۹)

۳۱۔ اور اے پیغمبر مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر جو اس میں سے چار و ناچار کھلا رہتا ہے اور اپنے گریبانوں پر اوڑھنیاں[۵۲] ڈالے رہیں۔ اور اپنی زینت کے مقامات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ پر یا اپنے خاوند کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنی لونڈیوں پر یا گھر کے لگے ہوئے ایسے مرد خدمتیوں پر جن کو عورتوں سے کچھ غرض و مطلب نہ ہو۔ یا لڑکوں پر جو عورتوں کے پردے کی بات سے آگاہ نہیں اور چلنے میں اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ لوگوں کو اُن کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔ اور مسلمانو! تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ (النور ۲۴۔ آیت ۳۱)

---

۵۱ عربی میں لفظ جلابیب ہے جس کا واحد جلباب ہے اور اس کا ترجمہ راڈول نے غلطی سے پردہ کیا ہے۔ اس کے معنی ہیں عورتوں کی بیرونی چادر (دیکھو لینز اریبک لیکسی کان جلد اول حصہ دوم صفحہ ۴۴۰) سیل نے اس کا ترجمہ "بیرونی لباس" اور پامر نے "بیرونی چادر" کیا ہے

۵۲ عربی میں اصل لفظ خمر جمع خمار استعمال ہوا ہے جس کے معنی عورت کے لباس سر کے ہیں یہ ایک کپڑا ہوتا ہے جس سے عورتیں اپنا سر چھپا لیتی ہیں۔ دیکھو لین کی اریبک لیکسی کان بی آئی حصہ دوم صفحہ ۸۰۹ سیل اور راڈول نے جو "خمر" کا ترجمہ پردہ کیا ہے وہ غلط ہے البتہ پامر نے اس کا ترجمہ صحیح کیا ہے (چراغ علی)

فقہ[1] اسلامی میں بھی اس امر کا خیال رکھا گیا ہے اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ شریف عورتوں کے ہاتھ منہ کھلے رہنے چاہییں۔ کیونکہ جسم کے یہ حصے "عورۃ" نہیں کہلاتے سوائے ہاتھ اور منہ اور بعض کے نزدیک پاؤں بھی۔ باقی تمام جسم "عورۃ" کہلاتا ہے اور اچھی طرح ڈھکا رہنا چاہیے۔

ازدواج میں آنحضرت کے لیے کوئی رعایت نہیں رکھی

۱۰۱۔ (۳) یہ خیال کہ کثرت ازدواج کے بارہ میں آنحضرت نے جو قیدیں قانون قائم کیں انھیں اپنے حق میں کم کر دیا بالکل غلط اور مہمل ہے اور یورپین مصنفین اس غلطی میں پڑا ہوا ہے پہلی مرتبہ (النساء ۴۔ آیت ۳) تعداد ازدواج کو محدود کرنے کے بعد آپ نے کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا بلکہ اصل یہ ہے کہ آپ نے گویا اس رسم کو اٹھا دیا (النساء ۴۔ آیت ۲۳ و ۱۲۔ ملا کر پڑھو) اس قانون سے قبل جس قدر بی بیاں آنحضرت صلعم کی زوجیت میں تھیں اُن کے باقی رکھنے کی اجازت دی گئی۔ حالانکہ دوسرے مسلمان کو یہ اختیار تھا کہ جس کے پاس چار سے زیادہ بیبیاں ہیں (اور ایسے بہت کم تھے) تو الگ کر سکتے ہیں۔ گویا پیغمبر کے لیے یہ خاص رعایت تھی (الاحزاب ۳۳۔ آیت ۴۹-۵۰) کیونکہ جب انھوں نے کثرت ازدواج کی ان قیود کی وجہ سے اپنی بیبیوں کو

---

[1] یہ ایک ایسا مضمون ہے جس میں بہت سی فضول باتیں آ گئی ہیں اس پر صرف اس خیال سے بحث کرنی چاہیے کہ شایستگی اور نیک اطواری کا معاملہ ہے اس میں خاص طور پر عورتوں کی حیا پر توجہ کی گئی ہے اور اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی فعل ایسا ظہور میں نہ آوے جو حیا داری کے خلاف ہو بلکہ ایسی بات کا خیال تک بھی نہ آئے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس سے کسی طرح عورتوں کا پردہ مراد نہیں ہے جیسا کہ بعض مصنفین نے خیال کر رکھا ہے۔ یہ پردہ درحقیقت کوئی فقہی حکم نہیں ہے بلکہ محض رشک، رقابت اور فخر و غرور کا نتیجہ ہے جیسا ہدایہ کے اس حصہ اور بعض دوسرے حصوں سے ظاہر ہے البتہ یہ کوئی ایسا رواج ہے جو عام طور پر اسلامی ممالک میں پایا جاتا ہے (ہدایہ ترجمہ مسٹر ہملٹن جلد اول ابتدائی بحث صفحہ ۸)

علیحدہ کرنا چاہا تو انھوں نے الگ ہونے سے انکار کیا۔ اور آپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی (الاحزاب ۳۳۔ آیت ۲۸۔ ۲۹۔ ۵۱) اور اس طرح انھیں دہی تعداد کی اجازت دی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس رعایت کے معاوضہ میں انھیں موجودہ بیبیوں کے بجائے جب کوئی مرجائے یا الگ ہوجائے تو کسی اور شادی کی اجازت نہیں دی گئی۔ خواہ انھیں ان کے سوا دوسری عورتوں کا حسن کیسا ہی اچھا کیوں نہ معلوم ہو (الاحزاب ۳۳۔ آیت ۵۲) غرض جتنی بی بیاں آپ کی اس وقت تھیں اسی قدر رکھنی پڑیں۔ اور اس طور پر اس قانون میں آپ کے لیے کوئی رعایت نہیں کی گئی۔ البتہ اتنی رعایت ضرور ہوئی کہ انھیں سب کی سب بیبیاں رکھنی پڑیں۔ دوسرے مسلمانوں کو اختیار تھا کہ چار سے زیادہ جتنی بیبیاں تھیں انھیں وہ الگ کرسکتے تھے لیکن آپ کو یہ نقصان رہا کہ سوائے ان بیبیوں کے جو پہلے سے تھیں۔ وہ کوئی دوسری شادی نہیں کرسکتے تھے۔ دراں حالیکہ دوسرے لوگوں کو یہ اجازت تھی کہ اگر چار بیبیوں میں سے کوئی مرجائے یا الگ ہوجائے تو انھیں شرائط اور حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کے دوسری کرسکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد آنحضرت صلعم کے متعلق کوئی شخص یہ غلط خیال نہ کرے گا کہ اس قانون میں ان کے حق میں بیجا رعایت کی گئی ہے۔

(الاحزاب ۳۳۔ آیت ۵۲) جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے:-

۵۲۔ اے پیغمبر اس وقت کے بعد سے دوسری عورتیں تم کو درست نہیں اور نہ یہ درست ہے کہ ان کو بدل کر دوسری بیبیاں کرو ہر چند ان کا حسن وصورت تم کو کتنا ہی اچھا کیوں نہ معلوم ہو۔ مگر اپنے ہاتھ کے مال یعنی لونڈیوں کا مضائقہ نہیں اور اللہ ہر چیز کا نگراں ہے۔

(الاحزاب ۳۳۔ آیت ۵۲)

آنحضرت نے ان کی کبھی اجازت نہیں دی کہ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں انکو لونڈیاں بنا کر کام میں لیا جائے

۱۰۲-(۴) مسٹر باسورتھ سمتھ نے یہ بڑی غلطی کی ہے جو کہا ہے کہ آنحضرت نے اجازت دی ہے کہ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں وہ لونڈیاں بنا کر کام میں لائی جائیں۔ ہم نے اس مسئلہ پر فقرات (۱۵۲ تا ۱۶۴) میں پورے طور پر بحث کی ہے۔

قرآن میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ جنگ کی گرفتار شدہ عورتیں لونڈیاں بنا کر اپنے کام میں لائی جائیں۔ آنحضرت نے ہر جگہ یہ تاکید کی ہے کہ نکاح یا تو "حرہ" عورت سے کیا جائے یا غلام عورت سے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں غلامی لونڈیوں کی شکل میں عموماً موجود تھی، اگرچہ شرع نے اس کی اجازت نہیں دی اور قرآن نے ہر جگہ صاف صاف طور سے نکاح کرنے کی تاکید کی ہے۔

بنام آیت کی تفسیر جو لین اور سیل نے

۱۰۳- مسٹر باسورتھ سمتھ اس اقتباس کے متعلق جو فقرہ ۹۰ میں نقل کیا گیا ہے بطور فٹ نوٹ کے لکھتے ہیں:-

"سیل کی یہ رائے ہے اور نیز اکثر مسلمان علما بھی اس کے موید ہیں اور کی ہے قرآن کے الفاظ سے بھی بظاہر اس کی تائید نکلتی ہے (النساء ۴- آیت ۲) کہ کسی حالت میں بھی کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ غلام عورتوں کو لونڈی بنا کر اپنے استعمال میں لائے۔ اگر اس کے پاس انتہائی تعداد میں از روئے شرع (شریعت) چار عورتیں موجود ہوں۔ مگر مسٹر لین کی رائے اس کے مخالف ہے اور وہ دوسرے علماء اور نیز بعض صحابہ کے عمل کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس پر (سیل کی رائے پر) زور دینا یقیناً خطرناک ہے اور کوئی مسلمان اس پر اعتراض نہ کرے گا کہ صحابہ کا عمل قابل تقلید ہے۔

اندروئے اصول تعبیر مسٹر سیل کی تعبیر (النساء ۴- آیت ۳) بالکل درست ہے
اور مسٹر لین کا ترجمہ غلط ہے (النساء ۴- آیت ۳) سے ظاہراً یا باطناً کسی طرح غلام
لونڈیوں کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت نہیں نکلتی۔ یہ صرف مرد اور عورت
کے اجتماع کو عقد کے ذریعہ سے ظاہر کرتی ہے۔ اور وہ بھی خاص تعداد کے
اندر ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ فعل "انکحوا" صورت امر کے معنی نکاح کرنے
کے ہیں۔ یہ لفظ آیت کے پہلے جملے میں آیا ہے اور باقی دو جملوں میں محذوف
ہے۔ ہمیں حق نہیں ہے کہ سوائے اس فعل کے جو پہلے جملے میں ہے کسی دوسرے
فعل کو ان دو جملوں میں داخل کریں۔ مسٹر لین نے "انکحوا" کے ترجمہ میں جو لفظ
"نکاح" سے نکالا ہے یہ غلطی کی ہے کہ بجائے "نکاح کرو" ترجمہ کرنے کی پہلی جگہ
"نکاح میں لو" ترجمہ کیا ہے۔ اور دوسری جگہوں میں صرف لفظ "لو" بریکٹ
کے اندر لکھا ہے۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے:-

"نکاح کرو۔ انکحوا" ان عورتوں سے جو تمہیں بھلی معلوم ہوں دو یا تین یا
چار۔ لیکن اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم (ان سب کے ساتھ) عدل نہیں کر سکتے
تو ایک سے (نکاح کرو) یا (نکاح کرو) اُن سے جنھیں تمہارے سیدھے ہاتھ نے

---

[1] میں نے سیل کے ترجمہ پر ریورنڈ وہیری کے نوٹ دیکھے (اے کمپری ہینسو کمینٹری آن
دی قرآن۔ اے۔ یم وہیری۔ ایم اے جلد ۱ مطبوعہ لندن ٹرنر اینڈ کو ۱۸۸۲ء صفحہ ۲۰۶) میں بھی
انھوں نے بھی مسٹر میور کی طرح غلطی کی ہے اور ان کا حوالہ بھی دیا ہے مسٹر میور لکھتے ہیں (لائف آف محمد جلد ۳
صفحہ ۳۰۳) "لونڈیوں کی تعداد جن کے ساتھ ایک مسلمان بغیر عقد یا کسی اور رسم یا اقرار دوام کے
رہ سکتا ہے محدود نہیں ہے جیسا کہ سیل نے محدود خیال کیا ہے" لیکن سیل اندروئے اصول تعبیر صحت
پر ہے اور اس کا زور قرآن کے الفاظ پر ہے۔ یہ اس کا محض خیال ہی نہیں جیسا کہ میں متن میں ظاہر
کر چکا ہوں۔ (چراغ علی)

حاصل کیا ہے[1]۔

مسٹر لین اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں :۔

"نکاح میں لو اُن عورتوں کو جو تمھیں بھلی معلوم ہوں دو تین یا چار لیکن اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکتے (ان سب کے ساتھ) تو لو ایک یا ان کو جنھیں تمھارے سیدھے ہاتھ نے حاصل کیا ہے[2]۔

بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے جیسا کہ باسورتھ کا خیال ہے کہ آنحضرت نے جنگ میں گرفتار شدہ لونڈیوں کے استعمال کی اجازت دی لیکن جب آپ نے بعد میں غلامی کو موقوف کر دیا۔ اور جنگ میں جو لوگ گرفتار کیے جائیں وہ غلام نہیں بنائے جا سکتے (سورہ محمد ۴۷۔ آیت ۴ و ۵) تو اسی آیت کی رو سے ضمناً لونڈیوں کا استعمال بھی ممنوع ہو گیا"

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی کی متذکرہ بالا تحریر کس قدر مدلل ہے اور کس عمدگی اور خوبی کے ساتھ مضمون زیر عنوان پر بحث کی ہے۔ واقعی یہ انھیں کا حصہ تھا۔

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

[1] یعنی جو تمھاری لونڈیاں ہیں۔

[2] ترجمۂ قرآن مترجمہ لین باب ۴ و ۵۔ دی ماڈرن انجیشین مولفہ لین جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ مطبوعہ لندن ۱۸۷۱

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آزاد کی صحیح تاریخ ولادت کا کچھ پتہ نہیں چلتا البتہ اس امر سے کہ وفات کے وقت اُن کی عمر ستتر سال کی تھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقیناً ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے جو اُن کا آبائی وطن ہے۔ آپ کے والد مولوی محمد باقر تھے جو شیخ ابراہیم ذوق کے دلی دوست تھے اور جو ہندوستان میں اردو اخبار نویسی کے موجد[1] کہلائے۔

حضرت آزاد نے استاد ذوق کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور نکات عروض و فن سخن انہیں کے فیض سے حاصل کیے۔

دہلی کالج کا داخلہ

بعد ازاں دہلی کالج میں داخل ہوگئے اور آپ اس کالج کے مشہور ترین طلبا میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ نے علوم مروجہ میں اسی درسگاہ سے اچھی استعداد حاصل کی تھی۔

مشاعروں کی شرکت

آپ کو اپنے استاد کی بدولت اکثر نامی گرامی اشخاص سے ملنے جلنے کا موقع ملا۔ اور معرکوں کے مشاعروں میں شرکت کی اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ اُن کو کمال حاصل ہوا وہ حضرت ذوق کی فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔ آزاد جو کچھ اپنے اُستاد سے سُنتے تھے یا اُن کی صحبت میں دوسرے بزرگوں کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہوتا تھا اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتے جاتے تھے جب غدر کے ہنگامہ کا خاتمہ ہوا اور آزاد کو اطمینان نصیب ہوا تو لاہور میں بیٹھکر بفراغت تمام اگلی پچھلی باتوں کو از سر نو یاد کیا اور اُن صحبتوں کو صفحۂ قرطاس پہ دہرایا کچھ اپنی بیتی تھی، کچھ جگ بیتی، غرض وہ کہانی سنائی کہ جس کو سنکر ہر کہ و مہ اُس کا والہ و شیفتہ ہوگیا اور دو سو برس سے لیکر اسوقت تک شعرا کی جتنی محفلیں قائم

ہوئی تھیں اور یہ فلک تفرقہ انداز اُن کو درہم برہم کر رہا تھا۔ سب کا نقشہ اس خوبی سے کھینچکر دکھلا دیا کہ وہ تمام بزرگ چلتی پھرتی تصویروں کی طرح نظر آنے لگے اس مرقع کا نام **آبِ حیات** ہے جس نے نہ صرف اگلے جلسوں کو تازہ کر دیا اور اُن مٹی ہوئی تصویروں میں جان ڈال دی بلکہ مصنف کا نام بھی زندہ جاوید بنا دیا اور زمانہ نے اُن بزرگوں کے طفیل میں آزاد کو بھی خلعت بقائے دوام عنایت فرمایا

کلامِ ذوق کی ترتیب

آپ نے حضرت **ذوق** کی وفات کے بعد بڑی سرگرمی اور تندہی سے اُنکے کلام کی ترتیب کا اہم کام شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء نے کئی سال کی علی الاتصال محنتوں اور مشقتوں پر پانی پھیر دیا اور وہ تمام مجموعہ دہلی کی تباہی کے ساتھ ساتھ برباد و تاراج ہو گیا اور حضرت خاقانی ہند کے صلبی فرزند کے ساتھ روحانی اخلاف بھی واصل رحمت الٰہی ہوئے چونکہ آزاد کی تصانیف میں سے کوئی مجموعۂ نظم ۱۲۷۶ ہجری سے پیشتر کا دستیاب نہیں ہوتا اور جو چند غزلیں **کلامِ آزاد** میں طبع ہوئی ہیں، وہ غدر کے بہت بعد کی کمائی ہے، اغلب یہ ہے کہ وہ اپنا پرانا ذاتی سرمایہ بھی غدر کے طوفان کی نذر کر بیٹھے

حکیم آغا جان عیش سے استفادہ

حضرت آزاد نے استاد **ذوق** کی وفات کے بعد حکیم آغا جان **عیش** سے بھی جو دربار شاہی میں بزمرۂ اطبا منسلک تھے استفادہ کیا۔ اگرچہ حکیم صاحب **ذوق** کے ہم پلہ نہ تھے تاہم وہ بھی اہل کمال تھے ایک ہی طرح میں ایک ہی قافیہ پر دونوں صاحبان نے فکرِ سخن کی ہے اور حق یہ ہے کہ اپنے اپنے موقع پر دونوں شعر بہت اچھے ہیں مشاعرہ میں **عیش** نے پہلے اپنی غزل پڑھی تو **ذوق** ہم قافیہ شعر کے پڑھنے میں متردد ہوئے لیکن آزاد کے والد ماجد نے باصرار کہا کہ ضرور پڑھیے تاکہ معلوم ہو کہ استاد اس مضمون کو اس طرح باندھتے ہیں۔ چنانچہ **عیش** کہتے ہیں:-

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہو کس لیے — تھوڑی سی رہ گئی ہو اسے بھی گزار دو ہنس

اور ذوق فرماتے ہیں۔

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

آزاد وطن مالوف کو خیر باد کہتے ہیں

جب ہنگامۂ غدر میں آزاد کے والد بزرگوار نے شہادت کا درجہ پایا تو آخر سال ۱۸۵۷ء میں آزاد اپنے عیال و اقربا کے ہمراہ اسی شہر کی طرف گامزن ہوئے جو محمد شاہ رنگیلے کے بعد سے دہلی کے بجائے اہل کمال کا ملجا و ماویٰ تھا اور مرجع خلائق تھا لیکن یہاں غدر سے ایک سال قبل ہی خاک لٹ چکی تھی اور وہ خاندان جو اہل کمال کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دیتا تھا زمانہ کی دست برد سے خود بھی محفوظ نہ رہا تھا اور جہاں عیش و نشاط کی محفلیں گرم تھیں اب وہاں ہو کا عالم تھا یعنی لکھنؤ اب وہ لکھنؤ نہ تھا جب میر تقی میر اور مرزا رفیع السودا اور سید انشاء اللہ خاں جیسے صاحب علم و فن وہاں پہنچے تھے۔ اسوقت وہ خود اپنے حال پر نوحہ خوانی کر رہا تھا۔ بیچارے آزاد کے غم میں کون درد شریک ہوتا۔ پس حضرت آزاد چند روز وہاں کے مشاہیر سے ملتے جلتے رہے اور کچھ عرصہ تک اطراف و جوانب میں سفر کرتے پھرے۔ بعد ایک مدت ۱۸۶۴ء میں تقدیر راہ پر آئی اور آزاد لاہور پہنچے یہاں آکر آپ سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔

لاہور کا قیام اور سکونت

آپ کی بابرکت زندگی کا بڑا حصہ لاہور ہی میں گزرا آپ انجمن پنجاب کے جلسوں کا بانی اگر آپ کو کہا جائے تو بیجا نہیں۔ انھیں کی کوششوں سے حکام بالا کی عموماً اور افسران تعلیم کی خصوصاً زبان اردو کی نشوونما اور ترقی کی طرف خاص توجہ مبذول ہوئی۔ یہ بھی آپ ہی کی کوشش کا یادگار نتیجہ تھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب کے قدوم میمنت لزوم سے

انجمن پنجاب میں مشاعرہ کی بنا ڈالی۔ حضرت آزاد کچھ عرصہ تک اسسٹنٹ سکرٹری رہے اور یونیورسٹی کالج کے صیغۂ علوم شرقی میں بعہدہ پروفیسری قدر توں کام کیا۔ اسی اثنا میں تعلیمی کاموں کے علاوہ ملکی خدمات بھی وقتاً فوقتاً کمال لیاقت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں بکار سرکار کلکتہ کا سفر کیا بعد ازاں پنڈت من پھول کے ہمراہ کابل و بخارا گئے سنہ ۱۸۸۵ء میں دوبارہ ایران گئے حضرت آزاد کو خدمات ماضیہ کے صلہ میں گورنمنٹ سے [illegible] ماہوار پنشن ملتی تھی لیکن حضرت موصوف نے اپنی تصانیف اور کفایت شعاری سے خاصا سرمایہ جمع کر لیا تھا یہ بھی امر قابل لحاظ ہے کہ آزاد کو پنشن اُن کی خدمات ملازمت کی وجہ سے ملی تھی ورنہ گورنمنٹ نے اپنے سرکاری کاموں کا کوئی صلہ نہیں دیا۔

آزاد کس طرح چھوٹی تنخواہ سے بڑے درجہ پر پہنچے ہیں

جب آزاد وارد پنجاب ہوئے تو اوّل اوّل مولوی رجب علی صاحب کے پاس جگراؤں میں مقیم رہے پھر مولوی صاحب کے ذریعے سے پنڈت من پھول صاحب میر منشی لفٹننٹ گورنر صاحب کے پاس آئے اور میر منشی صاحب کی سفارش سے لاہور میں ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے دفتر میں [illegible] ماہوار کے ملازم ہو گئے۔ ادنیٰ عہدہ کی وجہ سے انھیں ایسا موقع نہ ملتا تھا کہ اپنی لیاقت و استعداد کو اعلیٰ افسروں پر ظاہر کریں اسکے علاوہ میجر فلر صاحب ڈائرکٹر اگرچہ عربی، فارسی کا مذاق رکھتے تھے۔ علم دوست تھے مگر اجنبی کے لیے ان کا ظاہری رعب و داب اُن تک پہنچنے میں سدِّ راہ تھا اتفاق سے اسی زمانہ میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال[1] صاحب کسی سرکاری کمیٹی میں

---

[1] ماسٹر پیارے لال آشوب سنہ ۱۸۳۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے جو تین سو برس سے اسکے بزرگوں کا مسکن رہا ہے۔ ان کا نسبی سلسلہ شہنشاہ اکبر کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے آپ پرانے دہلی کالج کے تمام درجے طے کر کے سنہ [illegible] میں تکمیل علم کے لیے آگرہ کالج میں داخل ہوئے

شریک ہونے کی غرض سے لاہور تشریف لائے۔ چونکہ فلر صاحب ماسٹر صاحب سے از حد مانوس تھے۔ اس موقع پر حضرت آزاد نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ ہم کو میجر صاحب سے نہیں ملا دیتے؟ ماسٹر صاحب نے ان سے وعدہ کر لیا اور موقع کے منتظر رہے کمیٹی سے فارغ ہو کر میجر صاحب سے جو ملاقات ہوئی تو صاحب نے ایک تحریر

بقیہ صفحہ ۱۶۱۔ اور وہاں سے سند حاصل کرنے کے بعد ۱۸۵۵ء میں بریلی جا کر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مگر ایک سال کے بعد پنجاب چلے آئے۔ تھوڑے عرصہ تک گوجرانوالہ اور دہلی میں ہیڈ ماسٹر رہے ۱۸۶۴ء میں دہلی سے تبدیل ہو کر لاہور پہنچے اور وہاں کیوریٹر کے نازک عہدے کے اہم فرائض کو ۱۵-۱۶ برس تک نہایت ہوشیاری اور دیانت سے انجام دیا ۱۸۸۳ء میں انسپکٹر مدارس ہو گئے اور ۱۸۹۵ء تک اس عہدہ پر فائز المرام رہے۔ قیام لاہور کے زمانہ میں کئی برس تک سرکاری اخبار کے اڈیٹر رہے میجر فلر صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ان سے بہت خوش تھے انکے پاس کلکتہ یونیورسٹی سے سوال آیا کرتے تھے اور وہ انکے جواب میں اکثر رائے بہادر صاحب سے مشورہ لیا کرتے تھے، ایک مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی سے یہ سوال آیا کہ مسجع و مقفی عبارت میں کیا فرق ہے مع مثال بیان کرو حسب معمول یہ سوال بھی رائے صاحب کے پاس بھیجا۔ رائے صاحب نے یہ سوال بجنسہ مرزا غالب کے پاس بھیج دیا جنکی خدمت میں رائے صاحب کو نیاز حاصل تھا اور مرزا صاحب ان پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ انہوں نے اسکا جواب مع امثال نظم میں لکھکر دیا جسکا اخیر شعر یہ تھا۔ تقریر ہے یہ غالب یزداں پرست کی + تاریخ اسکی آج نویں ہے اگست کی + سنا ہے کہ [illegible] آزاد اور مولانا حالی کو نیچرل شاعری کا شوق اور خیال آپ ہی کی صحبت میں ہوا۔ اور آپ ہی سے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں لیکن ہمارے نزدیک جو کچھ شوق ہوا وہ کرنل ہالرائیڈ ہی کی تحریک اور ایما سے ہوا۔ اب جو چاہے اپنا نام کرے۔ آپ نے رسوم ہند کے پہلے تین باب، قصص ہند اول و سوم۔ اردو کی تیسری کتاب لکھی اور ترجمہ تاریخ انگلستان کلاں کیا۔ نیز رسالہ اتالیق پنجاب کے اکثر مضامین لکھے ترجمہ دربار قیصری ۱۸۷۷ء مولفہ مسٹر ویلر شستہ و بامحاورہ بلکہ برجستہ و دل آویز کیا اور اس کے صلہ میں آپ کو ایک تمغہ اور ایک جلد مطلا و مذہب مرحمت ہوئی۔ ۱۸۹۲ء میں آپ کو رائے بہادری کا خطاب ملا اور ۱۸۹۵ء میں ۳۶ سال کی ملازمت کے بعد پنشن لے لی آپ ایک علم دوست آدمی تھے۔ عرصہ ہوا کہ آپکا انتقال ہو چکا ہے افسوس کہ صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں ہوئی (تنہا)

ماسٹر صاحب کو دکھائی۔ اس میں صاحب بہادر نے لفظ ایجاد کو مونث لکھا تھا
ماسٹر صاحب نے دیکھ کر اعتراض کیا کہ یہ لفظ مذکر بولا جاتا ہے۔ صاحب نے جواب میں کہا
کہ مولوی کریم الدین صاحب سررشتہ دار کو یہ تحریر دکھالی ہے اور وہ اس عبارت کی
صحت کے ذمہ دار ہیں۔ مولوی صاحب بلائے گئے۔ میجر صاحب نے ماسٹر صاحب کا
اعتراض بیان کیا۔ مولوی صاحب نے جواب میں سند چاہی۔ ماسٹر صاحب نے آزاد
کے لیے یہ موقع مناسب خیال کر کے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے دفتر میں ایک
شخص محمد حسین آزاد دہلی کے رہنے والے ہیں۔ انھیں مثال کے ہزاروں شعر یاد
ہیں یہ سنتے ہی آزاد صاحب طلب کیے گئے اور فلر صاحب بہادر نے اُن سے
دریافت کیا کہ لفظ ایجاد مؤنث ہے یا مذکر آزاد نے جواب میں عرض کیا کہ مذکر
صاحب نے سند مانگی، انھوں نے برجستہ سودا کا یہ شعر پڑھ دیا۔

ہاسے لیں بھڑوے کا یہ ایجاد ہے   نسخے میں معجون زر انباد ہے

اسوقت سے فلر صاحب کی خدمت میں حضرت آزاد کی رسائی ہو گئی اور کچھ
ترقی بھی ہوئی۔ اس کے بعد کرنل ہالرائڈ صاحب نے ان کی قدردانی فرما کر ۔۔
تنخواہ کر دی اور اُن کو سب اڈیٹر مقرر کر دیا جس اخبار کے یہ سب اڈیٹر ہوئے اس کے
اڈیٹر رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب تھے۔ اخبار کا نام اتالیق
پنجاب تھا۔ یہ اخبار سرکاری تھا۔ سالانہ قیمت دیگر اخبارات سے نسبتہً کم تھی
کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ اخبار سرکاری تھا اور زیادہ اس سبب سے کہ اڈیٹر و سب اڈیٹر
دونوں قابل اور لائق تھے یہاں تک مقبول خاص و عام ہوا کہ اپنے معاصر اخباروں
سے گوئے سبقت لے گیا۔

---

۱ اس شعر سے لفظ ایجاد کا مذکر ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ "کا" کی جگہ "کی" بھی پڑھا جا سکتا ہے
آجکل ایجاد کو زیادہ تر مونث ہی لکھتے اور بولتے ہیں۔ تنہا۔

اتالیق پنجاب کی جگہ پنجاب میگزین کا اجرا اتالیق پنجاب کے مضامین کی خوبی، عبارت کی برجستگی اور خوش اسلوبی نے اس کو ہر دلعزیز بنا دیا۔ یہ کیفیت دیکھکر ہندوستانی اخباروں نے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ گورنمنٹ کا رسالہ کے مقابلہ میں اخبار شایع کرنا درپردہ ملکی لوگوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ گورنمنٹ نے یہ معقول عذر تسلیم کر کے اخبار مذکور کی جگہ ایک رسالہ پنجاب میگزین کے نام سے جاری کر دیا۔ حضرت آزاد کے بعد جب وہ پروفیسر ہو گئے تو خواجہ حالی نے بھی کچھ دنوں اتالیق پنجاب کی سب اڈیٹری کا کام انجام دیا تھا۔ دراصل یہ سب اڈیٹری نہ تھی بلکہ یہ دونوں صاحب اُن مضامین کی جو انگریزی سے ترجمہ کیے جاتے تھے، زبان کی اصلاح و درستی پر مامور تھے۔

شکل و صورت اور شمائل آزاد قدرت کے ظاہری محاسن میں بڑے حصہ دار نہ تھے میانہ بلکہ چھوٹا قد۔ گندمی رنگ۔ چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ مزاج کی طرح وضع اور لباس میں بھی سادگی تھی۔ اکثر چغہ پہنتے اور ہندوستانی فیشن کا عمامہ باندھا کرتے تھے۔ چہرے سے ذکاوت و فطانت ٹپکتی تھی۔ بشرہ سے کشادہ پیشانی ہنس مکھ۔ نکتہ رس اور ہمدرد و رحمدل معلوم ہوتے تھے۔ تالیف قلوب کا یہ عالم تھا۔ زبان میں یہ جادو اور خیالات میں یہ اثر تھا کہ جو شخص ایک گھنٹہ بھی آپ کی صحبت میں بیٹھ گیا، آپ کا کلمہ پڑھنے لگا۔ بذلہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے آج کل کے اسکول اور کالجوں کے شاگرد اور استادوں میں عقیدت اور یگانگت کا وہ رشتہ پیدا نہیں ہوتا جو پہلے شاگرد اور استاد میں ہوتا تھا۔ مگر صدہا نوجوان جنکو گورنمنٹ کالج لاہور میں مولانا آزاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کی خوش نصیبی میسر آئی، ان کو اسی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے کہ تفتہ مرزا غالب کو اور شیفتہ، مومن خاں کو دیکھتے تھے۔ ان کی شفقت بزرگانہ بھی یہانتک تھی

کہ اکثر شاگردوں کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد حصول معیشت میں انھوں نے بڑی امداد دی۔

علمی استعداد

مولانا آزاد فارسی کے عالم متبحر اور عربی کے اچھے عالم تھے اور اُن تمام علوم پر عبور رکھتے تھے جو ان زبانوں میں متضمن ہیں بھاشا اور ہندی کے نکات اور خوبیوں سے پورے آگاہ اور انگریزی علم ادب کی خصوصیات سے واقف تھے۔ اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے، صرف و نحو، عروض اور صنائع و بدائع میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فارسی ایسی سلیس اور با محاورہ بولتے تھے اور لب و لہجہ ایسا تھا کہ ان میں اور اہل ایران میں تمیز کرنا غیر ممکن تھا۔

اُردو کی ترقی میں آزاد کا حصہ

اُردو پر آزاد کے احسانات عظیم ہیں۔ صرف یہ کہ تمام صوبہ پنجاب خاص اُردو کی واقفیت کے لیے انکا ممنون ہے بلکہ پنجاب کو اُردو سکھانے کے لیے جو تصنیفات و تالیفات انھوں نے کیں اسوقت اُردو زبان کو اُن کی اشد ضرورت تھی پرانے سلسلے میں اُردو کی پہلی۔ دوسری اور تیسری کتابیں۔ اُردو کا قاعدہ، قصص ہند کا دوسرا حصہ جامع القواعد اور نئے سلسلے کی بھی کئی پُرانی کتابیں مولانا آزاد ہی کی تصنیف سے ہیں فارسی میں بھی انھوں نے کئی مقتدر کتابیں لکھیں۔ اور انھوں نے ہم کو زندہ فارسی سکھائی۔ ایران کے روز مرہ کی تعلیم دی۔ جو کچھ انھوں نے لکھا، جو محاورات اور روز مرہ انھوں نے ہم کو سکھائے وہ قدما کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد ان کی مروجہ ملک کی ذاتی تحقیق و تلاش کے نتیجے تھے ایران اور تاتار وغیرہ ممالک میں جہاں فارسی بولی جاتی ہے ان کی سیاحت موجودہ زبان کی تحصیل میں بہت معاون ہوئی

محاورہ کی صحت استعمال کا ذکر

دوسری مرتبہ آزاد جب ایران کے سفر سے واپس آئے تو ایک پشتارہ نوٹوں مسودوں

یادداشت اور تحقیقات کا اپنے ساتھ لائے۔

تقریباً ۱۸۸۵ء میں وہ کتب خانۂ آزاد کی عمارت تعمیر کرا رہے تھے۔ ایک کمرہ بن چکا تھا اور فرط اشتیاق سے اس میں چند الماریوں کی ترتیب اور خانہ پری میں مصروف تھے۔ اتفاق سے محاورہ کی صحت استعمال کا ذکر چھڑ گیا۔ فرمانے لگے کہ ایک غیر زبان کے محاورہ کو صحیح اور با موقع استعمال کرنا بہت مشکل ہے اور یہ دلچسپ روایت بیان کی کہ ایک دن میں ایران کے ایک صاحب خانہ کا مہمان تھا کھانا پک رہا تھا۔ ماں دس بارہ برس کی لڑکی کو چولھے کے پاس چھوڑ کر آپ اندر کے دالان میں کوئی کام کرنے لگی۔ اور لڑکی سے کہتی گئی کہ دیگچی کا خیال رکھے تاکہ کھانا جوش کھا کر ابل نہ پڑے۔ رفتہ رفتہ آنچ تیز ہوتی گئی۔ اب میں نے سوچا کہ چاول ابل کر باہر نکل پڑینگے۔ دیکھوں تو اس کیفیت کو یہ لڑکی کن الفاظ میں ظاہر کرتی ہے اور فرمایا کہ میں اپنی فارسی کی لغات اور زبان دانی کے دفتروں کو اپنے ذہن میں دہراتا تھا اور اس خیالی کیفیت کے مختلف اظہار گھڑتا تھا کہ شاید یہ کہے گی یہ کہے گی کہ وہ وقت آپہنچا اور میرے تمام خیالی دفتر خیالی پلاؤ ثابت ہوئے۔ جوں ہی دیگچی میں چاول جوش کھانے سے اس کا ڈھکنا ایک طرف سے ایک آدہ انچ اوپر کو اٹھا کہ لڑکی چیخی۔

"اماں اماں دیگچہ سر کردہ"

یہ لفظ گویا میرے کانوں میں الہامی کلمہ کی طرح پڑے اور میری آنکھیں کھل گئیں۔

جس شخص کو زباندانی کا یہانتک مذاق ہو جو شخص اسقدر نکتہ رس اور صاحب تلاش ہو جسنے غیر زبانوں کی تحقیق میں اس درجہ کاوش اور کوشش کی ہو وہ خود اپنی زبان میں کیا کچھ نہ کر دکھاتا۔ اور حق الامر یہ ہے کہ اردو میں آزاد نے وہ کچھ کر دکھایا جسکی ان جیسے شخص سے توقع کی جا سکتی تھی۔

قدیم شاعری کی کساد بازاری

جب آزاد لاہور پہونچے ہیں، اس وقت بازار علم میں دہلی اور لکھنو کی ٹکسالی شاعری کی کساد بازاری ہو چکی تھی اور چونکہ کسب معاش علوم مغربی کی تحصیل پر موقوف تھا اس لیے قدیم شاعری کی بے قدری ہو گئی تھی چنانچہ ایک جگہ آزاد لکھتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعض طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔

نیچرل شاعری

ان حالات سے متاثر ہو کر اور دیگر زبانوں سے اپنی زبان کی شاعری کا موازنہ کر کے آزاد کی جدت طبیعت نے اردو میں ایک نئے طرز یا نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی۔ پہلے خود کئی نظمیں لکھیں۔ کئی حکیمانہ مضامین اس ایجاد کی حمایت میں لکھے اور پھر ایک مشاعرہ قائم کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی اپنی کتاب مجموعہ نظم حالی کے دیباچہ کے شروع میں اس واقعہ کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:۔

سنہ ۱۸۷۴ء میں جب راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ، ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ در دبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے"

اس مشاعرہ میں مطالب تجویز کیے جاتے تھے اور دیگر محفل مشاعرہ کی طرح کوئی مصرعۂ طرح نہیں ہوتا تھا۔ برسات، حب وطن، تعصب و انصاف پر مولانا حالی کی بے نظیر نظمیں موجود ہیں۔ وہ اسی یادگار مشاعرہ کی یادگار ہیں۔ بہر حال اس نئی شاعری کے لیے مولانا آزاد نے ملک کو پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ انجمن کے

اکثر جلسوں میں وہ اردو ادب اور نظم کی اکثر شقوں پر مبصرانہ اور نقادانہ لکچر دیا کرتے تھے۔ انجمن کے ایک جلسہ میں جو ماہ اگست ۱۸۶۷ء میں منعقد ہوا تھا آپ نے ایک بسیط مضمون "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" پڑھا اس میں سے چند سطور پیشکش ناظرین ہیں۔

شاعر اگر چاہے تو اموات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ ہیچ کو گویا کر دے درختان بادرنگل کو رواں کر دے۔ ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے۔ دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان، خاک کو طلا۔ اندھیرے کو اجالا کر دے روشندلان اہل درد کے نزدیک طلوع وغروب آفتاب اور انقلاب صبح وشام ہزاروں باغ، نو بہار قدرت الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلان بےخبر کے نزدیک کارگاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن رات چکر میں چلا جاتا ہے .... اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فن شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے .... اسی طرح شاعروں کی بدزبانی وبدخیالی سے شعر بھی تہمت کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہیے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے۔ جو جوش وخروش خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں، مرتبہ شاعری کو پہونچتے جاتے ہیں ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور ان تصنیفات میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین وآسمان کا ہے۔

مئی ۱۸۶۸ء میں آپ نے اس طرز جدید کے مشاعرہ کا پہلا جلسہ منعقد کیا اور اپنی افتتاحی تقریر میں ایک پر مغز اور ادیبانہ تقریر کی۔ اس میں اردو شاعری کے متعلق نہایت عمدہ خیالات ظاہر فرمائے امید ہے کہ ذیل کے اقتباس سے

موجودہ اور آیندہ اُردو نظم کی حالت کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

بے شک مبالغہ کا زور۔ تشبیہ اور استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک .... ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں، سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اور ہے ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ ہار۔ طرّے۔ ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے"

آگے چل کر اسی مضمون میں فرماتے ہیں :۔

"اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان، تمھارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمھاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھِر کر محبوس ہو گئی ہے۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف، بہت سے حسرت و ارمان، اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبالمندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں اور بعض وقت ایسے دور دور کے استعاروں میں ادا ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی

مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہوجاتے ہیں
اے میرے اہل وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں جب مجھے نظر
آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا وجہ
اس کی یہ ہے کہ بسبب بیقدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہوں گے کئی پرانی
موذنیں باقی ہیں وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے
بالکل محروم ہوجائے گی اور اُردو میں نظم کا چراغ گل ہوجائے گا"
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب قدیم طرز کا بھی کوئی باکمال کہنے والا نظر نہیں
آتا، وہ پرانی موذنیں جن کی نسبت آزاد نے چراغ سحری کہا ہے مدت ہوئی کہ
خاک کے ڈھیروں کے تلے چھپ گئیں اور انکی ہڈیاں بھی زیر زمین گل کر مٹی
ہوگئیں۔ آجکل جو لوگ نیچرل شاعری میں گامزن ہیں وہ آزاد اور حالی کے
طفیل میں کچھ کہہ لیتے ہیں ورنہ درحقیقت نظم اُردو کا چراغ گل ہوگیا۔ اب
نثر کا دور دورہ ہے۔

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

کہنے کے لیے ڈاکٹر اقبال جناب سر محمد اقبال ہوگئے ہیں اپنے بلند خیالات
کے لحاظ سے ضرور اعلےٰ درجہ پر ہیں لیکن ان کے یہاں صحت و سقم الفاظ کا
خیال کم ہے جس کی وجہ سے وہ بلحاظ فن اس درجہ پر نہیں پہونچے جس پر
شاعر مسلم الثبوت اُستاد ہوجاتا ہے۔ ہاں! اس سلسلہ میں سید اکبر حسین صاحب
(سابق جج) الہ آبادی نے اپنا نیا رنگ نکالا اور وہ اس درجہ مقبول ہوا کہ
اکبر ملک سخن کے بادشاہ تسلیم کیے گئے اور ہر شخص ان کے اشعار بڑے ذوق
شوق سے سنتا اور لطف اٹھاتا ہے۔ لیکن اب وہ بھی نہ رہے۔

تصنیفات وتالیفات آزاد کی تصنیفات وتالیفات حسب ذیل ہیں:-

آب حیات ۔ نیرنگ خیال (دو حصے) سخندان فارس ۔ نگارستانِ
فارس ۔ دربار اکبری ۔ جانورستان ۔ مجموعہ نظم اُردو ۔ قصص ہند کا
دوسرا حصہ ۔ ابتدائی درسی کتب اُردو ۔ نصیحت کا کرن پھول
قند پارسی ۔ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب ۔ جامع القواعد فارسی
قواعد اُردو ۔ دیوان ذوق ۔ ان کے علاوہ اور بہت سی نظمیں اور مضامین
جنوں کے زمانہ کی سپاک و نمک مزید برآں ۔

آزاد کی ہر کتاب میں ایک خاص وصف ہے اور وہ یہ کہ تلاش اور جستجو کا
مادہ ان کی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے ۔ جو کتاب لکھی ہے نہایت سلیقہ کے ساتھ
اور اپنی تلاش اور جستجو کی داد دی ہے ۔ زبان جو اختیار کی ہے اس کا تو ذکر ہی کیا ہے
جو شیرینی اور گھلاوٹ اُن کی زبان میں ہے جسقدر اس کی تعریف کی جائے وہ کم ہے
تشبیہات و استعارات بکثرت پائے جاتے ہیں اور ان کو اس قرینہ سے سجایا ہے کہ
بے اختیار زبان سے سبحان اللہ اور واہ واہ کے نعرے نکل جاتے ہیں ۔ اُن کی نظمیں
بھی بجائے خود اچھی ہیں لیکن دراصل وہ اقلیم سخن کی بجائے اقلیم نثر کے بادشاہ ہیں اور یہ طرز
خاص ان کا ہے وہ کسی دوسرے مصنف کو نصیب نہیں ہوا ۔ یہ اور بات ہے کہ
کوئی شخص ان کی تقلید میں دو چار صفحے لکھ دے ۔ لیکن کتاب کی کتاب لکھ دینا نہ صرف
مشکل بلکہ ناممکن ہے ۔ قدرت نے انکے انداز تحریر میں وہ دلکشی پیدا کی ہے کہ دوسرے
مصنف کو مشکل سے یہ بات نصیب ہوگی ۔ البتہ ان کا قلم جنبہ داری ضرور لیے ہوتا ہے
وہ ہندو مسلمانوں کے معاملات میں بے تعصب ہیں اور اکثر صاحب قلم اہل ہنود اس کا
اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن دہلی اور لکھنو کے معاملہ میں ضرور انھوں نے لکھنؤ کے
بعض باکمال اصحاب کو اپنی کتاب آب حیات میں نظر انداز کر دیا ہے مولوی
عبدالحلیم شرر نے اپنے ایک مضمون اُردو لٹریچر میں اسکی سخت شکایت کی ہے

اور ایک حد تک صحیح ہے اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ جن بزرگوں کا ذکر آب حیات میں کیا گیا ہے ان کے پہلو بہ پہلو وہ صاحب جن کو نظر انداز کیا گیا ہے بمشکل بیٹھ سکتے تھے البتہ اسی **آب حیات** میں **آزاد** نے اپنے استاد **ذوق** کو بعید آسمان پر چڑھایا ہے اور جا و بیجا ان کی مدح سرائی کی ہے۔ حالانکہ آج زمانے نے ورق الٹ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہرگز اس تعریف کے قابل نہ تھے جس کی بوچھار ان پر کی گئی ہے۔

الحاصل آزاد فن تنقید سے دراصل ناآشنا نہ تھے لیکن اپنے محسن استاد کی تعریف میں رطب اللسان ہونا ہی وہ جوہر شرافت جانتے تھے۔ اور یہ نہ سمجھتے تھے کہ اپنے ممدوح کو فرشتہ بنا دینا آسان ضرور ہے لیکن وہ جوہر بشریت سے معرّیٰ ہو جاتا ہے اور اسکے تمام محامد اسکو انسانیت سے خارج کیے دیتے ہیں۔

آزاد کو اگر ہم کسی انگریزی مصنف سے تشبیہ دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے **لارڈ میکالے** تھے۔ اور اگر اردو زبان کی بے بضاعتی پر خیال کریں تو ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان ہی کی تصنیفات نے اردو کے خالی خزانے کو مالامال کر دیا۔ اور جب تک یہ زبان اور اس کے بولنے والے قائم رہیں گے **آب حیات۔ دربار اکبری** اور **نیرنگ خیال** زندہ رہیں گی اور اپنی دلفریبیوں سے سب کو اپنا گرویدہ کرتی رہیں گی۔ چونکہ اردو زبان جلد جلد ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے اس لیے بعض الفاظ جو آزاد کے یہاں پائے جاتے ہیں اب متروک ہو گئے ہیں لیکن اس سے ان کی انشا پردازی کے کمال پر کوئی حرف نہیں آتا

آزاد کی شہرت انکے علمی کارناموں کی وجہ سے ہوئی

آزاد حقیقتاً آزاد تھے نہ وہ کسی ایسوسی ایشن کے ممبر تھے نہ وہ کسی کانفرنس میں شریک ہوئے اور نہ وہ کسی ملی و ملکی تحریک کے بانی ہوئے۔ ان کو شروع سے اپنی زبان کے تحفظ کا خیال تھا اور اسی کو دلچسپ اور ہر دلعزیز

بنانے میں انھوں نے اپنی تمام عمر صرف کر دی۔ پس اُن کی شہرت کا آفتاب کبھی
سوشل یا پولیٹیکل پلیٹ فارم کے افق سے نمودار نہیں ہوا۔ بلکہ اُن کے کلام کی
مقبولیت محض اپنے اصلی معیار اور جوہر ذاتی کی وجہ سے ہوئی ورنہ وہ نہ کسی
دربار کے مدح خواں تھے، نہ کسی مدون جماعت کے آرگن۔ قلم اُن کی چوب بھی اور
کاغذ اُن کا نقارہ اور انھیں سے اُن کی شہرت کا آوازہ سارے ہندوستان میں گونج اُٹھا

شمس العلما کا خطاب

مولانا آزاد کو گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب ۱۸۸۷ء کی جوبلی پر دیا تھا۔

آزاد کی بعض کتابوں پر رائے

نیرنگ خیال کی نثر ہزار نظموں پر فوقیت رکھتی ہے
رنگین بیانی کا ایک دلفریب مرقع ہے۔ اخلاقی اور
تمدنی اصلاح کا ایک پختہ کار دستور العمل ہے۔ پند
و نصائح کا ایک دفتر ہے استعارے اور تمثیل میں وہ وہ مطلب کی باتیں بتائے گئے
ہیں کہ پڑھنے والا شستہ خیالات سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کتاب نے
اُردو نثر کی نئی طرز قائم کی اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں زیادہ تر
انگریزی روش کا پیرو تو ہے جس میں مضمون نویسی کی جدید طرز کا چربہ اُتارا ہے۔

آب حیات۔ طرز بیان، سلاست زبان، شستگی الفاظ، برجستگی
بے ساختگی اور روشن خیالی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ تذکرہ تمام تذکروں سے ہر طرح
فائق و ممتاز ہے اس لیے کہ حتی المقدور محققانہ طریقے سے ہر ایک شاعر کا حال
قلمبند کیا ہے۔ آزاد نے سیدھے سیدھے صاف اور سادے بیانوں میں جا بجا رنگینی
طبع کی ایسی جدولیں کھینچی ہیں کہ واہ واہ بعض اوقات وہ سیدھی بات کو پیچیدہ
الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں مگر کیا مقدور کہ پڑھنے والے کو مطلب سمجھنے میں ذرا بھی
دقت یا رکاوٹ ہو۔ حضرت آزاد نے اردو نثر کے باغ میں نئے گل بوٹے نکالے

نئی کیاریاں اور نئی روشیں نکالیں اور اس کے بوسیدہ جسم میں نئی روح پھونکی
ایجاد اور نو آئینی اسے کہتے ہیں کہ انہدام کے ساتھ تعمیر بھی ہو۔ سادگی کے ساتھ
رنگ آمیزی بھی ہو۔ پرانے ملبہ میں ایک اینٹ بھی کام کی ہوئی تو اٹھائی اور
نئے چونے سے نئی عمارت میں چن دی۔ ماضی کی عزت۔ حال پر شفقت۔ مستقبل
کی فکر۔ یہ طرز عمل اس ادبی مصلح کا رہا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اردو ادب میں یہ
اختراع و اصلاح کر کے مولانا آزاد نے زباندانان ملک کے لیے ایک شاہراہ
بنادی ہے خواہ کوئی اس پر چلے یا نہ چلے۔

آزاد نے آب حیات لکھ کر احیائے قدامت کیا ہے۔ اردو نثر کو نظم کا
ہمپایہ بنادیا ہے اور اردو زبان کو تاریخی حیثیت بخشی ہے۔ پہلے شعرا یا شاعر کے
کلام پر تقریظیں یا تعریفیں ہوتی تھیں۔ آزاد نے کسی قدر تنقید سے بھی کام لیا ہے
لیکن جو تنقید کا حق تھا اسے وہ ادا نہیں کر سکے یا تو ان بزرگوں کی عزت دل پر
اس قدر چھا گئی تھی (جنکا حال انھوں نے حوالۂ قلم کیا ہے) کہ کھل کر ان پر
حرف گیری کرنا ان کے بس میں نہ تھا، یا زمانہ ان کڑوی مگر سچی باتوں کے گھونٹ
اپنے حلق سے اتارنے کے لیے آمادہ نہ تھا اور اس لیے انھوں نے استعارات و تشبیہات
کی قند ملا کر ان کو لوگوں کے گلے سے اتارا ہے[۱]

۱؎ آب حیات کے ابتدائی صفحات تاریخ زبان اردو کے لیے وقف کیے گئے ہیں
اور حق یہ ہے کہ خوب داد تحقیق دی ہے آج کل بعض لوگوں کی رائے میں کتاب کا یہ
ناقص حصہ ہی ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ آزاد نے ولی کو اردو نظم کا آدم مانا ہے اور ادھر
نثر میں فضلی کی کتاب دہ مجلس کو اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب کہا ہے جو ۱۱۳۵ھ
کی تصنیف ہے حالانکہ اب جدید دلدادگان تحقیق و تدقیق نے اس امر کا سراغ لگالیا ہے
کہ سلطان قلی قطب شاہ ولی سے بہت پہلے اپنا دیوان مرتب کر چکا تھا۔ اور نثر میں شیخ

دربارِ اکبری بھی اپنی عبارت کی رنگینی کے اعتبار سے آزاد کی بہترین

بقیہ صفحہ ماقبل عین الدین گنج العلم اپنے اردو رسالے آٹھویں صدی ہجری میں تصنیف کر چکے تھے۔ آبِ حیات سے پیشتر اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اردو شعراء کے دس بیس تذکرے ضرور لکھے گئے۔ کوئی تذکرہ قطب شاہ کی شاعری کا معترف نظر نہیں آتا اور جو تذکرہ نویس بھی اردو شاعری کو شروع کرتا ہے وہ ولی ہی سے اس کی ابتدا کرتا ہے اور شمالی ہند میں واقعہ بھی یہی ہے کہ ابتدا سے ولی ہی کے کلام کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی ان حالات کے ہوتے ہوئے اگر آزاد نے ولی کو اردو نظم کا آدم مانا تو کیا بُرا کیا؟ کیا ان کو چاہیے تھا کہ وہ برسوں دکن کی خاک چھانتے؟ اگر وہ ایسا کرتے تو بھی گوہرِ مقصود شاید ہی انکے ہاتھ آتا جواب حسنِ اتفاق سے دلدادگانِ تحقیق کے ہاتھ آگیا ہے جس کی بنا پر انھوں نے آزاد کو ہر نام غلط کہنا شروع کر دیا ہے۔ ہم تو باوجود اُن کی اس تحقیق کے اب بھی حضرت آزاد کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے ولی کو اُردو شاعری کا آدم مانا۔ ذرا قطب شاہ کے کلام کو ولی کے بالمقابل رکھکر دیکھیے کہ کس کلام کو اُردو کا کلام کہا جائے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ فرماتے ہیں

رکھ ایک ہی ہر ٹیک کدہن لاکھ جتن ہے
کہ جوت ہی ہر ٹھار دسے ٹیک رتن ہے

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا

ولی کا ارشاد ہے

خوبی اعجازِ حُسنِ یار اگر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

اگر کچھ نہ کچھ کہنا ہی تمغلۂ اُردو شاعری ہے تو ہم کہیں گے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ سے بہت پیشتر امیر خسرو اُردو کے شاعر ہوئے ہیں اور اُن کی کتاب خالق باری جو ان کی تصنیف ایک ضخیم کتاب تھی کیوں نہ نظم کی پہلی کتاب مانی جائے جس کے مقبول و مشہور ہونے کی یہ ادنیٰ دلیل ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک مکتبوں میں ہندی طلباء کو پڑھائی جاتی تھی حقیقت یہ ہے کہ اعتراض کرنا بہت آسان کام ہے لیکن تمام باتوں پر

تصنیفات میں سے ہے۔ اگرچہ یہ کتاب وہ خود ترتیب و نظر ثانی کے بعد نہ چھپوا سکے

بقیہ صفحۂ ماقبل
نظر ڈال کر صحیح رائے قائم کرنا دوسری شے ہے۔ آزاد نے فارسی زبان کی تحقیق میں ایک عمر صرف کی تھی اور اردو زبان کے متعلق بھی کاملین فن کی صحبت اٹھائی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ کسی زبان کی ابتدا میں کیا حالت ہوتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ قالب بدلتے بدلتے کس وقت اس قابل ہوتی ہے کہ اُسے زبان کہا جائے۔ اگر معترضین کی نظر کسی زبان کی ارتقائی حالت پر پڑی ہوتی تو وہ ہرگز یہ رکیک الزام آزاد پر نہ لگاتے کہ انھوں نے چونکہ ولی کے بجائے قطب شاہ سے اُردو شاعری کا دور قائم کیا اور اردو نثر میں شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو اُردو نثر کی پہلی کتابیں نہیں قرار دیا لہذا اُن کی تصنیف

آبِ حیات
پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہے اور وہ تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیتے۔ ذرا معترضین آزاد کی تاریخ وفات اگلے صفحوں پر ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ مولانا حالی جو اُنکے ہمعصر تھے اور جو ہم لوگوں سے زیادہ بہتر طور پر اُن کو جانتے تھے وہ آزاد کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مولانا حالی حقیقت نگار تھے۔ اگر فی الواقع اُن کی یہ رائے نہ ہوتی تو وہ ہرگز آزاد کو اپنے اشعار میں محقق نہ فرماتے۔

بعض صاحبان اردو شعراء کے حالات میں حوالہ اور ماخذ چاہتے ہیں کہ آزاد نے یہ باتیں کس سے سُنیں یا کن کتابوں سے اخذ کیں۔ میرے نزدیک یہ سراسر غلطی ہے کہ دو صدی کے بعد جن بزرگوں کے سوانح لکھے جائیں، اُن کے حالات کا حرف حرف تاریخ کی طرح حوالہ جات سے مستند کرایا جائے ورنہ عدم حوالہ جات کی صورت میں اُن واقعات سے انکار کیا جائے۔ اول تو شاعروں کا تذکرہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہوتا جسکی صحت و عدم صحت پر کسی قسم کا اثر مترتب ہو، دوسرے آزاد نے اپنی کتاب اس وقت لکھی تھی جب کہ ماخذوں کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا جیسا کہ آجکل لازمی ہو گیا ہے۔ پس جس وقت تک کوئی واقعہ غلط نہ ثابت ہو جائے، اس وقت تک ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے

کیونکہ عرصہ سے وہ پیرانہ سالی اور بعض امراض میں مبتلا تھے اور اُن کے دماغ کی حالت خراب ہو گئی تھی تاہم کتاب کے دلاویز ہونے میں کوئی شک نہیں دربار اکبری کی عبارت دیکھ کر انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو ضرور لارڈ میکالے کی تاریخ نویسی یاد آجاتی ہے۔ جو لطف انگریزی میں لارڈ موصوف کی تحریر سے پیدا ہوتا ہے بعینہ آزاد کی تحریر اُردو میں دل پر وہی اثر کرتی ہے اور جس طرح لارڈ میکالے کی تاریخ انگلستان ناقابل اعتماد ہے بعینہ یہی حال ایک حد تک دربار اکبری کا ہے کیونکہ آزاد نے اپنی آراء اور اپنے جذبات کو ہر جگہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ امر اصول فن تاریخ نویسی کے بالکل خلاف ہے۔ اگرچہ اکثر مورخ اسی دام میں پھنس جاتے ہیں

بقیہ صفحہ ماقبل: نہ ہم کسی امر کی خواہ مخواہ تکذیب کریں اور ایک واقعہ غلط ہونے پر تمام کتاب کو لغو قرار دیں۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ شاعروں کے حالات جس دلچسپی کے ساتھ وہ بیان کیے گئے ہیں اُسی دلچسپی سے تیقن کے ساتھ پڑھے جائیں تو بہتر ہے کہ اس سے لطف دوبالا ہوتا ہے اور ہم کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا، اگرچہ ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ جو واقعات ہم نے پڑھے ہیں وہ دراصل وقوع میں نہیں آئے۔ علاوہ ازیں آزاد کی نسبت میرا یہ خیال ہے کہ موصوف شاعروں کے تمام حالات یا حضرت ذوق اور اُن استادوں سے سُنے تھے جن سے ان کو دوچار ہونے کا موقع ملا یا اُنھوں نے مختلف تذکروں سے جمع کیے ہیں وہ ایسے آدمی نہیں معلوم ہوتے کہ خواہ مخواہ اُنھوں نے حالات کو دلچسپ بنانے کے لیے واقعات تراشے ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ جو کچھ اُنھوں نے سُنا ہو اس کا اکثر حصہ کچھ رد و بدل ہو کر ان تک پہونچا ہو۔ بہرحال ہم تو **آب حیات** کو ہر لحاظ سے ایک لاجواب کتاب سمجھتے ہیں موجودہ دور کے مصنفین جب اس سے بہتر کتاب لکھیں گے تو ہم اُن کی تحقیقات کو مان لیں گے۔ اب تک تو اردو میں جتنے تذکرۃ الشعرا لکھے جا چکے، **آب حیات** اپنی آپ نظیر ہے۔

تعلّی وخود بینی

آزاد طبع حضرتِ آزاد کے مزاج میں کچھ تعلّی و خود بینی کا مادہ بھی موجود تھا۔ اس وجہ سے اکثر اپنے معاصرین سے علمی نوک جھوک اور مخالفت رہا کرتی تھی پروفیسر آزاد کا خاندانی مذہب امامیہ تھا مگر بعض بعض باتوں میں اپنی ذاتی راے خاندانی مذہب سے الگ رکھتے تھے۔

جنون کے آثار پیدا ہونا

جناب آزاد کی صحت عرصے سے فرسودہ ہو گئی تھی اپنی صاحبزادی کے انتقال کا صدمہ، جسکو انھوں نے ایسی اعلی تعلیم دی تھی کہ وہ اُن کی تصانیف کی نظرثانی کیا کرتی تھی، انکے دل پر ایسا ہوا کہ اس حادثہ جانکاہ کے بعد پھر اُن کی طبیعت کبھی بحال نہ ہوئی۔ اسپر ایران کے دوسرے سفر کی تکالیف اور زیادہ ہوئیں۔ اِن سب واقعات نے دماغی مصروفیت کی انتہائی کثرت کے ساتھ ملکر اُن کی دماغی تر و تازگی کو خشک اور پریشان کر دیا اور اگست ۱۸۸۹ء سے جنون کے آثار پیدا ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ مرض پختہ ہو گیا اور آخر دم تک اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔

الٰہیات کا شغل

عالمِ جنون میں اُن کا شغل الٰہیات تھا۔ اسی کا ذکراذکار انکی زبان پر رہتا تھا۔ انھیں ایام میں ایک مرتبہ آپ راے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب سے ملنے آے۔ دو تین گھنٹے کے قریب ملاقات رہی لیکن بار بار یہی الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے تھے:-

"راے صاحب! آپ اِس شعر کو پڑھا کیجیے۔ اسکے معنی آپ جو چاہیں سمجھ لیں

پردہ درِ کعبہ سے اُٹھا دینا ہے آساں
پر پردۂ رخسارِ صنم اٹھ نہیں سکتا

حالتِ جنون کی تحریر

حضرت ممدوح نے اپنی ذاتی تالیفات و تصنیفات کے علاوہ اپنے استاد ذوق کا حقِ شاگردی بھی کما ینبغی

ادا فرمایا ہے یعنی اُستاد ذوق کا ایک دیوان خاص اپنے اہتمام سے مرتب کیا ہے
جس میں اُن کی سوانح عمری اور اوائل عمر سے بالترتیب کلام جمع کر کے دکھایا ہے
کہ فلاں غزل، فلاں قطعہ، فلاں محل اور موقع پر کہا تھا۔ یہ دیوان چھپ گیا ہے۔
بعض لوگوں کا اس کی نسبت خیال ہے کہ آپ نے اس میں جا بجا تصرف کیا ہے
بہرحال مجموعی حیثیت سے یہ امتیاز ضرور ہے کہ سابقہ مرتب دیوان سے اس کا کلام
زیادہ ترجیح ہے دیوان ذوق چھپنے کے بعد جب ایک کاپی اُن کے سامنے رکھی
گئی اور خاتمہ لکھنے کی درخواست کی گئی تو کئی دن تک انکار کرتے رہے ایک دن
خود ہی قلم دوات لیکر ایک صفحہ لکھدیا۔ جو دیوان ذوق کے خاتمہ پر درج ہے۔
اس میں اور حالت صحت کی تحریر میں کچھ فرق نہیں البتہ اس میں بھی تصوف اور
الٰہیات کی بو آتی ہے۔ بقول مؤلف خمخانہ جاوید "اس بگڑی ہوئی حالت میں بھی
جب کبھی قلم دوات کے نصیب کھل جاتے تو عجیب عجیب گل افشانیاں کرتے کہ اب
کوئی ذی ہوش بھی ایسی گلکاریاں نہیں دکھا سکتا"، اُن کے حال پر خود آزاد ہی کے
شعر کا مضمون صادق آتا ہے۔

گر میں ہوش میں ہوتا تو پھر کیا جانئے کیا ہوتا   فروغ دیدۂ عالم ہیں یہ مدہوشیاں میری

یہ قابل زیارت پروفیسر لاہور موچی دروازہ میں رہتے تھے اگرچہ دماغی
عارضہ کے سبب اُن کا عدم و وجود برابر تھا تاہم علم دوست طبیعتوں اور قدردان
نگاہوں کے لیے ان کا شربت دیدار مسرت افزا تھا۔ اور یہ شعر انکے حسب حال تھا
تیری دانائی کے قائل تھے سب افلاطون فش   شاعری نے کر دیا اے داغ سودائی تجھے

آخر اسی حالت بیخودی میں بعمر ستتر سال ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء مطابق
۹ محرم الحرام سنہ ۱۳۲۸ ہجری کو حضرت آزاد اس قید ہستی سے آزاد ہو گئے۔ اور
لاہور میں دفن ہوئے۔

مولانا حالی نے جو تاریخ وفات لکھی تھی اس کے اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں

آزاد وہ دریائے سخن کا دُر یکتا — جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ — جو اس کے قلم سے دم تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر — چھوڑا نہ دقیقہ کبھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ تھا ایسا کہیں اہل قلم میں — تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا ٹپکا
صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں — ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے مشتاق — بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شب عاشور کو تھی جس کی تمنا — آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا ہے رب کا
تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی — کہہ دو کہ "ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا"

ذیل میں پروفیسر آزاد کی کتابوں سے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین اُن کے کلام کی داد دے سکیں۔

(از آب حیات)

"ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق"

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بنکر جہان میں پھیلی۔ اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پہ رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا

ف اس تاریخ سے ۱۳۲۷ھ نکلتے ہیں حالانکہ آزاد کی وفات ۱۳۲۸ھ میں واقع ہوئی ہے لیکن ۱۳۲۸ھ کے صرف نو دن زیادہ ہوئے تھے لہٰذا اس قسم کی تاریخ جائز ہے۔ تنہا

قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا
وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستاں رہے۔ نہ اس بولی کے سمجھنے والے
رہے۔ جو خراب آباد اُس زبان کے لیے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا جانور
بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ امرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے
وارث، علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار
طبیعتیں کہاں سے آئیں۔ جو بات بات میں دلپسند انداز اور عمدہ ترشیں نکالتی تھیں
آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد و اختراع کی فرصتیں
دی ہیں وہ اور اور اصل کی شاخیں ہیں۔ انھوں نے اور پانی سے نشو و نما
پائی ہے۔ وہ اور ہی ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔ پھر اس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ"

مذکورۂ بالا اقتباس میں دلی کی تباہی اور اُردو زبان کے انحطاط کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔

بھاشا پر فارسی نے کیا کیا اثر کیے

"بیان مذکورۂ بالا سے تمھیں اجمالاً معلوم ہو گیا کہ اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت فارسی کے
استعارہ
اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ لاتشبیہ
بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا۔ اور ان کے معتقد باقی تھے لیا زبان نے آگر
کا رنگ
وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے اسواسطے گویا اُردو بھاشا میں بدل دیا۔
استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا یہ رنگ اگر اسی قدر آتا
کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ۔ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں
کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہماری قوت بیان کی آنکھوں کو
سخت نقصان پہنچایا۔ اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سونگ بنا دیا

نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اردو میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ چاہتا ہوں کہ دونو کے نمونے آمنے سامنے رکھ کر ان کے فرق دکھاؤں۔ مگر اس سے پہلے دو تین باتیں خیال میں رکھنی چاہییں۔ اول تو شاعرانہ اردو کا نوجوان جس نے فارسی کے دودھ سے پرورش پائی۔ اس کی طبیعت میں بہت سے بلند خیالات اور مبالغہ مضامین کے ساتھ وہ حالات اور ملکی رسمیں انواع کی انشا سے آ گئے جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ اور بھاشا کے طبعی مخالف تھے ساتھ اس کے فارسی کی نزاکت اور لطافت طبعی کے سبب سے اردو کے خیالات اکثر ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور ذہنوں میں جمتے چلے آتے ہیں۔ اس لیے ہمیں مشکل نہیں معلوم ہوتے۔ ان پڑھ انجان غیر زبان والا انسان سنتا ہے تو منہ دیکھتا رہ جاتا ہے کہ یہ کیا کہا۔ اس لیے اردو پڑھنے والے کو واجب ہے کہ فارسی کی انشا پردازی سے ضرور آگہی رکھتا ہو۔

بھاشا اور فارسی کی انشا پردازی میں کیا فرق ہے؟

فارسی اور اردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے۔ اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے۔ اس کی کیفیت ہمیں اس خط و خال سے سمجھاتی ہے۔ جو خاص اسی شے کے دیکھنے سننے سونگھنے چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا ہے وہ سننے سے آ جاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں صاف اسی کی برائی بھلائی نہیں دکھا دیتے بلکہ اس کے مشابہ اور ایک شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھا ہوا ہے

اس کے لوازمات کو شئے اول پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھول کہ نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے۔ جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حسن کا اندازہ دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے۔

خواجہ وزیر۔ وزیر سے

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا تو ہو کر   روح میری گل عارض میں رہے بو ہو کر

تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو تشبیہ کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب دور جا پڑیں تنزری اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لیے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہماے عقل۔ اوج اقبال سے سایہ ڈالے تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اسکے سینے میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقہ یونان کو غرق کر دے۔ اول تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے اور وہ بھی اسی ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا۔ اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھیے۔ وہاں ان کے فرضی ہما کا جانا دیکھیے۔ پھر زمین پہ اس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسانا دیکھیے۔ پھر اس فرضی ہما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھیے۔ جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

دوسرے فقرے میں۔ اول تو علماے ہند نے تنور سے طوفان کا نکلنا

مانا ہی نہیں ہے۔ اس پر طبقۂ یونان کا اپنے فلسفہ کی تہمت میں تباہ ہونا وغیرہ وغیرہ
ایسی باتیں اور روایتیں ہیں کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہوں۔ مگر غیر قوم
بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اس سے بے خبر ہیں۔ اس لیے بے سمجھائے کب سمجھیں گے
اور جب بات کو زبان سے کھکر سمجھانے کی نوبت آئی۔ تو لطف زبان کجا اور نہیں
تو تاثیر کجا! مزا وہی ہے کہ آدھی بات کہی آدھی منہ میں رہے۔ اور سننے والا پھڑک
اٹھا۔ تار باجا اور راگ بوجھا۔ ان خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ
ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں۔ ہماری تشبیہوں اور استعاروں[میں] فارسی کے خیالات
کے پیچ در پیچ خیالوں میں آکر وہ بھی عالم تصور میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے جو غیر زبان کے لوگوں
ادا کرنے میں ہم اول اشیائے بے جان کو جاندار بلکہ اکثر انسان فرض کرتے ہیں کی سمجھ سے بہت دور
بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لیے جو باتیں مناسب حال ہیں۔ ان ہیں
بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں جو اکثر ملک عرب یا فارس
یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں"
اگرچہ اقتباس مذکورۂ بالا میں عالمانہ خیالات ظاہر کیے گئے ہیں لیکن ادیبانہ
و انشا پردازانہ انداز ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

سید انشا اور اہل دہلی کے معرکے

"اگرچہ یہ بزرگ بھی پرانے مشاق تھے مگر وہ نوجوان شہباز جس کے سینہ مرزا عظیم بیگ
میں علوم و فنون کے زور بھرے تھے۔ اور طراری اور براقی کے بازو اڑائے لیے کا معرکہ
جاتے تھے۔ کسی کو خاطر میں کب لاتا تھا۔ خدا جانے طرفین نے زبان سے کیا کچھ
کہا ہوگا۔ مگر غزلوں کے مقطع میں فخریہ چشمکیں ہونے لگیں۔ اور ساتھ ہی نکتہ چینی کی
پھبتیاں لگ گئیں۔ ان میں **مرزا عظیم بیگ** تھے کہ سودا کے دعوے

شاگردی اور پرانی مشق کے گھمنڈ نے اُن کا دماغ بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ فقط شُدبُد کا علم رکھتے تھے مگر اپنے تئیں ہندوستان کا صائب کہتے تھے خصوصاً اُن معرکوں میں سب سے بڑھ کر قدم مارتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک دن میر ماشاء اللہ خاں کے پاس آئے اور غزل سنائی کہ بحر رجز میں تھی مگر ناواقفیت سے کچھ شعر رمل میں جا پڑے تھے۔ سید انشا بھی موجود تھے تاڑ گئے۔ حد سے زیادہ تعریف کی اور اصرار سے کہا کہ مرزا صاحب اسے آپ مشاعرہ میں ضرور پڑھیں۔ مدعی کمال کہ مغز سخن سے بے خبر تھا اس نے مشاعرۂ عام[1] میں غزل پڑھ دی۔ سید انشا نے وہیں تقطیع کی فرمایش کی۔ اُس وقت اس غریب پر جو کچھ گزری سو گزری مگر سید انشا نے اس کے ساتھ سب کو لے ڈالا۔ اور کوئی دم نہ مار سکا۔ بلکہ ایک مخمس بھی پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے ۔۔۔۔ کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے ۔۔۔۔ پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

اگرچہ مرزا عظیم بیگ نے بھی گھبرا کر اسی مخمس کی طرح میں اپنی بساط کے بموجب دل کا بخار نکالا مگر وہ مشت بعد از جنگ تھی۔ چند بند اس کے انتخاباً لکھتا ہوں کیونکہ اور بند بسبب بے لطفی اور نادرستی کے قابل تحریر بھی نہیں۔ مرزا عظیم بیگ کہتے ہیں :۔

[1] نواب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ عزت مرزا مینڈھو امیر تخلص خلعت زیر الممالک نواب شجاع الدولہ چند روز دلی میں آکر رہے تھے۔ اخلاق مروت۔ سخاوت میں ایسے تھے جیسا کہ وزیر زادوں کو ہونا چاہیے۔ مشاعرہ میں شعرا اور اکثر امرا و شرفا کی ضیافت بھی کرتے تھے اُن کے ہاں یہ معرکہ ہوا تھا (آب حیات)

وہ فاضل زمانہ ہو تم جامع علوم — تحصیل صرف و نحو سے جنکی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی حکمت و ہیئت جفر نجوم — منطق بیان معانی کہیں سب زمیں کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

اک دو غزل کے کہنے سے بن بیٹھے ایسے طاق — دیوان شاعروں کے نظر سے رہے یہ طاق
ناصر علی، نظیری کی طاقت ہوئی ہے طاق — ہر چند ابھی نہ آئی ہے تمیز جفت و طاق
ٹنگری تلے سے عرفی و قدسی نکل چلے

تھا روز فکر ہیں کہ کہوں معنی و مثال — تجنیس و ہم رعایت لفظی و وہم خیال
فرق رجز رمل نہ لیا میں نے گو سنبھال — نادانی کا مری نہ ہو دانا کو احتمال
گو تم بقدر فکر یہی کر عمل چلے

نزدیک اپنے آپ کو کتنا ہی سمجھو دور — پر خوب جانتے ہیں مجھے جو ہیں ذی شعور
وہ بحر کونسی ہے نہیں جس پہ یاں عبور — کب میری شاعری میں پڑے شبہ سے قصور
بن کر قمل نکالنے کو تم خلل چلے

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق — تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق — شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گریگا جو گھٹنوں کے بل چلے

کم ظرفی سے تمھیں تو یہی آئی ہے امنگ — کیجے نمود خلق میں اب کر سخن کی جنگ
اپنے تئیں تو کھینچتے آتا ہے یار ننگ — اتنا بھی رکھیے حوصلہ فوارہ سان تنگ.
چلو ہی بھر جو پانی میں گر بھر اچھل چلے

کیوں جنگ گفتگو کو تم اٹھ دوڑے اس قماش — کرتے جو بھاری پائچہ ہوتا نہ پردہ فاش
پر تمھیں کب یہ بات جو گندی ہو ناتراش — تیغ زباں کو میاں میں رکھتے تم اپنے کاش
ناحق جو تم ازار سے باہر نکل چلے

اب سید انشا کے طائر فکر کی بلند پروازی اور زیادہ ہوئی۔ ہر غزل میں مضامین فخریہ کا جوش ہونے لگا۔ یہاں تک کہا کہ میرا اور ان لوگوں کا کلام ایسا ہے جیسے **کلام الٰہی** اور **مسیلمہ کذاب کا الفیل ما الفیل**

انتخاب مذکورۂ بالا بیحد دلچسپ ہے اور زبان بھی بیحد مزیدار ہے۔ استعارات اور تشبیہات کو برمحل استعمال کیا ہے۔

ایک مشاعرہ میں **میر تقی** مرحوم بھی موجود تھے۔ شیخ **مصحفی** نے غزل پڑھی:۔

میر تقی مرحوم کی سند

تنہا نہ وہ باتوں کی حنا لے گئی دل کو | کھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا۔

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا | دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

تو میر صاحب نے بھی فرمایا کہ بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا

اُن کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا شیخ موصوف اسی قدر الفاظ کو فرمان آل تمغا اپنے کمال کا سمجھے بلکہ کئی دفعہ اٹھ اٹھ کر سلام کیے۔ اور کہا کہ میں اس شعر پر اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا تھا"

(ذیل کا اقتباس ہم نے قصداً کیا ہے تاکہ ہمارے یہاں کے اہل علم کا ذوق و شوق معلوم ہو سکے کہ وہ کسی کتاب کی تصنیف و تالیف میں امداد دینے سے کسقدر گریز کرتے ہیں۔ تنہا)

میر ضاحک

"ہر چند چاہا کہ ان کے جلسے اور باہمی گفتگوؤں کے لطائف و ظرائف معلوم ہوں۔ کچھ نہ ہو تو چند غزلیں ہی پوری مل جائیں کوئی کوشش کارگر نہوئی جب اُن کے چراغ خاندان **سید خورشید علی نفیس** بھی شعاع توجہ دریغ فرمایا تو غیروں سے کیا امید ہو۔ انھوں نے آزاد خاکسار کو آب حیات کی رسید سے بھی شاد نہ کیا

تشنہ بودم زدم تیغ تو آبم دادند
وزجواب لب لعل تو جوابم دادند

تاریخ وفات بھی نہ معلوم ہوئی۔ ممکن نہیں کہ باکمال صاحبزادہ نے تاریخ
نہ کہی ہو۔ مگر آزاد کو کون بتائے ؟"

میرحسن

ہمارے ملکِ سخن میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے
نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی ایک **سحرالبیان**
دوسرے **گلزار نسیم** اور تعجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں
آزاد کو واجب ہے کہ کچھ لکھے اور اہل سخن سے اپنی رائے کی صحت و سقم کا حال
پوچھے **مثنوی** حقیقت میں ایک سرگزشت یا بیان ماجرا ہے۔ جیسے تاریخ
سا شعبہ سمجھنا چاہیے۔ اس واسطے اس کے اصول میں لکھا ہے کہ چاہیے نہایت
سلیس گفتگو میں ہو جس طرح ہم تم باتیں کرتے ہیں۔
میرحسن مرحوم نے اسے لکھا اور ایسی صاف زبان فصیح محاورے
اور میٹھی گفتگو میں۔ اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا۔ جیسے آب رواں اصل واقعہ
کا نقشہ آنکھوں میں کھچ گیا۔ اور اُن ہی باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔
جو اسوقت وہاں ہو رہی تھیں۔ باوجود اس کے اصول فن سے بال بھر ادھر
یا اُدھر نہ گرے۔ قبول عام نے اسے ہاتھوں میں لیکر آنکھوں پر رکھا۔ اور آنکھوں
نے دل و زبان کے حوالے کیا اس نے خواص اہل سخن کی تعریف پر قناعت
نہ کی بلکہ عوام جو حرف بھی نہ پہچانتے تھے وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے
ارباب نشاط نے محفلوں میں اس کی نغمہ سرائی کرکے لوگوں کو لٹایا اور رُلایا
پنڈت دیا شنکر نے **گلزار نسیم** لکھی اور بہت خوب لکھی اس کا رستہ

اس سے بالکل الگ تھا کیونکہ پنڈت صاحب نے ہر مضمون کو تشبیہ کے پردہ اور استعارہ کے پیچ میں ادا کیا اور وہ ادا معشوقانہ خوش ادائی نظرائی اس کے پیچ وہی بانکپن کی مروڑ ہیں جو پریزادیں بانکا دوپٹہ اوڑھ کر دکھاتی ہیں اور اکثر مطالب کو بھی اشاروں اور کنایوں کے رنگ میں دکھایا ہے۔ باوجود اس کے زبان فصیح اور کلام شستہ اور پاک ہے۔ اختصار بھی اس مثنوی کا اختصار ایک خاص وصف ہے جس کا ذکر کرنا واجب ہے کیونکہ ہر معاملہ کو اس قدر کیونکر ہوا مختصر کر کے ادا کیا ہے جس سے زیادہ ہو نہیں سکتا۔ اور ایک شعر بیچ میں سے نکال لو تو داستان برہم ہو جاتی ہے۔ ان باتوں کے لحاظ سے واجب تھا کہ کتاب خاص پسند ہوتی باوجود اس کے عام و خاص سب میں شہرت پائی۔ اس کے نکتوں اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں جتنی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے جاتے ہیں مثنوی کو جب پہلے انھوں نے لکھی تو بہت بڑی تھی۔ خواجہ آتش اپنے استاد کے پاس اصلاح کو لے گئے انھوں نے کہا۔ بھیا اتنی بڑی کتاب کو دیکھے گا کون؟ وہ اپنا دہ یک کا قانون یہاں بھی جاری کرو (اس کنایہ میں یہ اشارہ تھا کہ پنڈت صاحب فوج شاہی میں منشی تھے اور بموجب قانون حکومت کے سب کی تنخواہوں میں سے دہ یکی کاٹ لیتے تھے۔ گھر گھر میں اس شکایت کا چرچا تھا۔ یہ مثنوی مذکور لے گئے اور اختصار کیا تو ایسا نچوڑا کہ عطر نکال لیا کس عمدگی کے ساتھ انتخاب مذکورہ بالا میں دونوں مثنویوں پر تنقید کی ہے اشاروں اور کنایوں میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔

پروفیسر آزاد کی کتاب سخندان فارس اگست ۱۸۸۷ء میں مطبوع ہو کر شائع ہوئی۔ اس میں سے کئی مقام کے اقتباسات ہدیۂ ناظرین ہیں۔

لغات اور زبانوں کی فلسفی تحقیقات کے اصول

یہ ایک قدیمی فن فلاسفہ یونان کا ہے اس سے مختلف زبانوں کی اصلیں اور اُن کا تعلق ایک دوسرے سے معلوم ہو جاتا ہے عرب اور فارس جہاں سے پہلے ہمیں علوم کے ذخیرے ملے۔ ان میں اس کے اصول و فروع کا پھیلاؤ بہت نہیں ہوا۔ اور جس قدر ہوا گم ہو گیا۔ اب جو کچھ ہے انگریزی میں ہے وہ اسے فلولوجی کہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی رسالہ اس کا ترجمہ ہو تو امید نہیں کہ ہموطن بھائیوں کا دل روشن کر سکے۔ کیونکہ انگریزی کے مصنف کئی کئی زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں وہ ہر زبان کی طاقت اس میں خرچ کرتے ہیں اور انگریزی یونانی لاطینی۔ عبرانی وغیرہ پر بنیاد رکھتے ہیں۔ یہاں ان طرفوں میں اندھیرا ہے ہم لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لیے میں فارسی اور سنسکرت لفظوں کی چقماق سے آگ نکالوں گا۔ امید ہے کہ کچھ نہ کچھ اجالا ہوگا۔ ایشیائی زبانوں میں تحقیقات فلولوجی کا ابھی تک رواج نہیں ہوا۔ اہل یورپ نے اسے یونان سے لیا تھا۔ اسی واسطے علم مذکور کا نام فلولوجی چلا آتا ہے (فلسفۃ اللسان) اب میرے دوست چند منٹ کے لیے اجازت دیں۔ کہ اوّل چند مطالب بیان کروں جن سے معلوم ہو کہ زبان جس سے تقریر یا گویائی مراد ہے وہ کیا شے ہے

وہ اظہار خیال کا وسیلہ ہے کہ متواتر آوازوں کے سلسلہ میں ظاہر ہوتا ہے جنھیں تقریر یا سلسلہ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔ اسی مضمون کو ایک شاعرانہ لطیفہ میں ادا کرتا ہوں کہ زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں ہیں۔ جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں۔ اور کانوں کے رستے اوروں کے دماغوں میں پہنچتے ہیں۔ اس سے رنگین تر مضمون یہ ہے کہ جس طرح تصویر اور تحریر قلم کی

دستکاری ہے۔ جو آنکھوں سے نظر آتی۔ اسی طرح تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر ہے۔ جو آواز کے قلم نے ہوا پر کھینچی ہے۔ وہ صورت اجرا۔ کام مقام اور ساری حالت کانوں سے دکھاتی ہے۔

خیالات کا مرتبہ زبان سے اول ہے۔ لیکن جب تک وہ دل میں ہیں ماں کے پیٹ میں ادھورے بچے ہیں۔ تقریر میں آکر پورے ہوتے ہیں اور تحریر کا لباس پہنکر بھرپور۔ لوگ جو خیالات سے مطلب نگاری اور نکتہ پردازی میں جان کھپاتے ہیں اس نکتہ کو انہی کا دل جانتا ہے۔

دنیا میں اظہار مراتب کی کارروائی تین طرح سے ہو سکتی ہے۔ اشارات تقریر۔ تحریر۔ ان میں زبان یعنی تقریر اپنی توضیح کی زیادتی اور محنت کی کمی سے اول نمبر ہو گئی ہے۔ اور حق پوچھو تو کارروائی کے لیے سب برابر ہیں۔ اب یہ کہو کہ زبان کیونکر پیدا ہوئی؟ سبحان اللہ۔ ہر مذہب کی کتاب یہی خبر دیتی ہے کہ ہماری زبان خاص خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ یہ ہمیں ساتھ لیکر بہشت میں جائیگی۔ اور اسی کے ذریعہ سے ہم اہل جنت سے باتیں کرینگے[1] لیکن غور کر کے دیکھو تو صانع مطلق نے اپنی صنعت کاملہ سے انسان ایک ایسا طلسم قدرت بنایا ہے کہ وہ خود زبان پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہ راز خیال کو وسعت دینے سے کھلتا ہے۔

ہوا انسان صانع قدرت کا اک صندوق سربستہ + ولیکن یہ نہیں کھلتا کہ اس میں بولتا کیا ہے

فلسفی خیالات کو کس سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے اور کیسی شستہ زبان سے ادا کیا ہے۔ اس کی تعریف نہ کرنا ظلم ہے۔

---

[1] یہ بھی درست ہے۔ یونان کی زبان نے فلسفہ الٰہی کو پھیلا کر خدا پرست فلاسفہ کو بہشت میں پہنچایا سنسکرت نے ہند میں دھرم۔ گیان۔ عرب نے معرفت الٰہی سکھایا۔

فارس کی زبان مروجہ میں دوسرا انقلاب

(صفحات ۶۷ تا ۶۹)

سنہ ۶۱۶ھ۔ فارس کی زبان اپنے فرزندوں کے لیے سلیس اور فصیح قالب ڈھال رہی تھی۔ ایجادی قوتیں خیالات کی ہوا میں پاک روحوں کی طرح اڑتی پھرتی تھیں اور ظہور کے موقع ڈھونڈتی تھیں۔ اس عالم میں ترکان چنگیزی کا قبضہ ملک پر ہو گیا تھا۔ زبان کے لیے بڑا خطر تھا۔ خوش نصیبی تھی کہ سر لاکھوں کٹ گئے۔ مگر زبان بچ گئی۔ وہ خونریز جاہل تھے زبان تاتاری تھی اور چینیوں سے ملتی جلتی۔ لکیریں حرفوں کی بھی کھینچتے تھے۔ آج اُن کی تحریروں کے نمونے چاہو تو معدوم ہیں۔ چنگیز کی طبیعت میں قواعد و قانون کے ایجادکی قوی طاقت تھی۔ طورہ چنگیز خانی کے کچھ کچھ ترجمے ہیں۔ فتحیاب لڑکے صاحب ملک اور صاحب زبان تھے۔ اُن کی حب الوطنی اور بلند نظری فارس کی زبان کو مخالفت کے کانوں سے سُنتی تو عجب نہ تھا۔ لیکن ان کی زبان کے لیے نہ مذہبی رعایت تھی نہ علمی طاقت تھی۔ اس لیے ملک کی زبان کو روک نہ سکی۔

چنگیز خود ایک ملک گیر بادشاہ تھا۔ اولاد کو ملک داری بھی کرنی پڑی بلند ہمتیں **ایران** میں اپنی ناموری کے ایوان سجا رہی تھیں۔ نہیں! بلکہ سلطنت کی بنیاد کو مضبوط کرتی تھیں۔ وہ اس وقت ایران کے علوم و فنون کو سلطنت کا مؤید سمجھ کر ایرانی عالموں اور کاردانوں کی پرورش کرنے لگے چنگیز کا پوتا **ہلاکو خاں** تھا۔ اس کی عقلیت **نصیر الدین محقق طوسی** کے دامن میں پلی تھی۔ اس لیے علوم و فنون کا تربیت اور پرورش کرنے والا تھا اس کے عہد میں ہر فن کے فاضل اور ماہر مصنف جمع ہوئے **مراغہ** میں

رصد خانہ تعمیر ہوا۔ تشریح لکھی گئی۔ منطق، فلسفہ اور اس کی تمام شاخیں عرب سے آکر فارس کی خاک میں سرسبز ہوئیں اور اکثر چنگیزی نسل کے دماغ انھی خیالات سے روشن رہے۔

اقبال مندوں کے دربار میں علوم و فنون کے ساتھ انشا پردازی بھی امیدوار آئی۔ انھوں نے فقط امید کا پیٹ نہ بھرا بلکہ ذوق شوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوا دیئے اس سے اقلیم سخن میں انقلاب عظیم نمودار ہوا زمین۔ آسمان۔ اور آسمان۔ زمین ہو گیا۔ عالم صورت کے تماشبین اسے زبان فارسی کا نوروز کہیں گے کیونکہ استعارہ اور تشبیہ کی گلکاری اور خیالات بہاری گل۔ بلبل۔ نغمہ۔ چمن۔ گلشن۔ سبزہ۔ شبنم۔ مے۔ جام۔ صراحی وغیرہ وغیرہ سے کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں۔ مگر آزاد تم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں۔ وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی۔ اور معنوں کی خزاں۔

سنہ ۸۰۰ھ

۶۹۹ھ میں عبداللہ وصاف ابن فضل اللہ نے غازان خاں شاہزادہ چنگیزی کے لیے تاریخ وصاف لکھنی شروع کی حقیقت میں بڑا زور مارا ہے اور فارسی اور عربی زباندانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی، فارسی، ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے۔ استعارہ اور تشبیہ نظم میں سو برس پہلے رنگ دینے لگے تھے نثر میں بہت کم تھے انھوں نے اس قدر بہتات کی کہ مطلب گم ہو گیا۔ عبارت کو مقفیٰ کیا اور ہر فقرے پر اس کا ہم معنی فقرہ اور سوار کیا۔ ہر صفحہ میں دو دو تین تین عربی شعر اور عربی عبارتیں کہیں کہیں کئی سطریں۔ آدھا صفحہ اور زیادہ بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غازان خاں کی حکومت کنارہ ایران سے سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی

خاکِ عرب کا اثر ضرور ظاہر ہونا تھا۔ ترکی الفاظ کیوں نہ آتے ترک بچوں میں بچپکر لکھتے تھے۔ اور ترک بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے۔ اور چونکہ فاضل تھے۔ صاحب زبان تھے۔ آمد طبع کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے کہیں چھوٹے کہیں بڑے بڑے فقرے لکھ کر لمبے لمبے ہاتھ مارتے تھے

یہ افسوس بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ فقرے طولانی ہو گئے مطالب صنائع و بدائع تشبیہ و استعارہ میں الجھکر پیچ در پیچ ہو گئے لغات کی بہتات لفظوں کے مبالغے، اصلیت حال پر پردہ ہو گئے۔ زبان۔ بیان واقعیت میں الجھ ہو گئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے۔ کلام کا اختصار۔ بے تکلفی۔ سادگی۔ اور حقیقت نگاری کا وصف ایسا گیا کہ آج تک ملک کی زبان اس قصور سے ملکوں میں بدنام ہے۔

تغیر مذکور کا چھ سو برس تک دور رہا۔ تیرھویں صدی ہجری کے اخیر میں ناصر الدین شاہ، بادشاہ ایران نے ملک کی تعلیم و تہذیب کو بدلا۔ اور تصنیفات کے نئے قالب میں ڈھالا۔ اب زبان فارس کے دامن سے یہ دھبا دھویا جائے گا کہ اس میں اصلیت کے ظاہر کرنے کی طاقت و لیاقت نہیں"

سنہ ھ سے سنہ ھ تک

میرے دوستو! یہ انشا پرداز۔ منہ زور گھوڑوں کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں بے ارادہ کسی منزل کے۔ خواہ مخواہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے اور حق پوچھو تو یہی بڑا کمال ہے۔ ذرا سی بات کو بلکہ بے بنیاد معاملہ کو۔ مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے یا باغ کا حال کہ خوب شاداب ہے یا تازہ ہی دو کانداروں کی تعریف کو اس قدر رلمبانا اور چڑھانا۔ بغیر دو دو کے ابال اٹھانا ہے۔ اور یہ انہی کا کام تھا۔ مگر بے حال

ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر قلعہ **فورٹ ولیم** کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جز اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا۔ یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک! دونوں نے بڑا کمال کیا۔ مگر اس قلعہ کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملک رانی کرے۔ اور جہاز میں کونسا لشکر سمندر پار اترے۔

انداز مذکور نے ایسا ذوق و شوق پھیلایا کہ تمام تحریریں تشبیہ و استعارہ میں مسلسل ہو گئیں۔ کوئی ماجرا۔ کوئی معاملہ۔ کوئی مراسلت نہ رہی کہ اس سے خالی ہو۔ اسے رنگین بیانی۔ نازک خیالی۔ معنی آفرینی کہنے لگے اور فقرے وہی ہم معنی جوڑہ جوڑہ۔ جو بہت بے تکلف سادہ نویس تھے۔ ان کا کلام رنگین نہ ہوتا تھا مگر بے رنگ ضرور ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ سادہ نویسی اور سلاست عبارت زبان سے گم ہو گئی۔ بلکہ اصلیت نگاری اور مطلب نویسی کی طاقت اس میں نہ رہی اور زبان پر یہ داغ لگ گیا کہ مبالغہ اور بناوٹ فارسی زبان کا جوہر ہے۔ اہل ایران مالک زبان تھے۔ افغانستان۔ ترکستان۔ ہندوستان سب اس کے شاگرد تھے۔ جو بات وہاں خوبی سمجھی گئی۔ اس کی نقل کو سب نے فخر سمجھا۔ ان کے قلم بھی انہی کی چال چلنے لگے۔ یہ صاحب زبان نہ تھے۔ ان بیچاروں کی زبانیں تھوڑے ہی عرصہ میں ضعیف بلکہ اپاہج ہو گئیں۔

میرے دوستو! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ کتب مذکورہ بالکل نکمی ہیں۔ ایسا کبھی خیال نہ کرو۔ ان کے نازک خیال۔ خوبصورت استعارے۔ نئی نئی تشبیہیں خوشنما ترکیبیں۔ لفظوں کی عمدہ تراشیں۔ خیالوں کی نزاکتیں۔ طبیعتوں کی بلند پروازیاں، صنعتوں کے ہجوم جواب نہیں رکھتے۔ **ظہوری** نے جس فقرہ کے تئیں

فقرہ جوڑا ہے۔ نہ ہی اس کا جوڑا ہے۔ مجال نہیں کہ ایک کو اٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اس کی جگہ رکھ سکے۔ ذرا دیکھنا! بادشاہ کی فصاحت کی تعریف میں کہتا ہے نکتہ ہائے برجستہ۔ غنچہ ہائے سربستہ (پھر کہتا ہے) ہر صفحش چمنے۔ ہر سطرش انجمنے ہر حرفش فصلے وہر فرعش اصلے (حسن کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے) ابروان خجستہ کلید دلہائے بستہ۔

بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو بڑی غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے انھوں نے خوبی الفاظ۔ اور نزاکت خیال اور زور طبع کو بے مطلب بے مدعا خرچ کیا ہے۔ تم انھیں لو اور بیان مطلب کے کام میں لاؤ پھر دیکھو گے تمھاری عبارت کیا کیفیت اور کیا تاثیر پیدا کرتی ہے۔"

اقتباسات مذکورہ بالا میں آزاد نے انشا پردازی کو درجہ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ ان خیالات کو اس سے بہتر زبان میں لکھنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

اسلام کے بعد اہل ایران کے آداب و رسوم

شاہ عباس ماضی نے ایک عورت سے جبراً نکاح کرنا چاہا۔ ایک بھائی کے سوا کوئی اس کا وارث نہ تھا۔ مولانا احمد اردبیلی اس وقت مجتہد تھے۔ عورت کا بھائی ان کی خدمت میں پہنچا اور حال بیان کیا۔ انھوں نے ایک کاغذ کے پرزہ پر لکھ کر دیدیا۔ صورۃ رقعہ۔ برادرم عباس! خواہر حال قصد را بدہ بازدہ فقط شاہ نے اسی وقت تعمیل کی اور وہ خط فخریہ سب کو دکھایا کہ سرکار مولانا نے مجھے برادر لکھا ہے۔ پھر خزینہ دار کو دیا کہ اسے احتیاط سے رکھو دفن کے وقت میرے کفن میں رکھنا۔

(از دربار اکبری)

اکبر کی شجاعت ذاتی اور بیجد دلاوری

یہ بات راجگان ہند کے اصول سلطنت میں داخل تھی کہ راج کا فرمانروا اکثر خطرناک اور جان جوکھوں کے کام کر کے خاص و عام کے دلوں میں ایک تاثیر پھیلائے جس سے وہ سمجھیں کہ بے شک تائیدِ غیبی اُس کے ساتھ ہے اور اقبال اس طرح مددگار ہے کہ ہم میں سے یہ بات کسی کو نصیب نہیں۔ اور یہی اُس کی عظمت، خدا کی عظمت اور اس کی اطاعت، اطاعت الٰہی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اور یہی بات ہے کہ ہندو، راجہ کو بھگوان کا اوتار اور مسلمان ظلِّ اللہ[1] (سایۂ خدا) کہتے ہیں۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھ گیا تھا۔ تیموری و چنگیزی لہو کی گرمی سے ہمت جرأت، جذبہ و جوش اور شوقِ ملک گیری جو اس کے لہو میں باقی تھا وہ خیالات کو اور بھی گرماتا رہتا تھا۔ بلکہ یہ جوش بابر کی طبیعت میں تھا یا اس میں کہ جب دریا کے کنارے پر پہنچتا تھا خواہ مخواہ گھوڑا پانی میں ڈال دیتا تھا جب وہ اس طرح دریا اترے تو نمک حلالوں میں کون ہے کہ جاں نثاری کا دعویٰ رکھے اور اس سے آگے نہ ہو جائے ہمایوں راحت پسند تھا کہیں ایسا ہی بوجھ پڑا ہے جب وہ اس طرح جان پر کھیلا ہے۔ یلغاریں کر کے مہمیں کرنی۔ ہمت کے گھوڑے پر چڑھ کر آپ تلوار مارنی۔ قلعوں کے محاصرے کرنے۔ سرنگیں لگانی۔ ادنیٰ سپاہیوں کی طرح مورچے مورچے پر آپ پھرنا اکبر ہی کا کام تھا۔ اس کے بعد جو ہوئے عیش ...

[1] تقلیداً ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی ظلِّ اللہ کا لقب گھڑ لیا کہ ایرانیوں سے کر دیا بھی آریائی قوم سے ہیں طبعاً بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے یہ لفظ ایجاد کیا۔ حقیقتاً اسلام میں ایسے الفاظ کا کہیں پتہ نہیں اور پتہ کہاں سے ہوتا جس کو جمہوریت کی تعلیم دی گئی ہو خود بادشاہت کا نام و نشان نہیں۔ تنہا

آرام سے کے بندے تھے بندگان خدا سے عبادت وصول کرنے والے، دربار شاہی کے رکھوالے اور پیٹ کے ماروں کے سر کٹوانے والے بنیے مہاجن سمجھتے کہ باپ دادا کی گدی پر بیٹھے ہیں یا پیرزادے کہ بزرگوں کی ہڈیاں بیچتے ہیں اور آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اکبر جب تک کابل میں تھا تو اونٹ سے بڑا کوئی جانور نظر نہ آتا تھا۔ اس لیے اسی پر چڑھتا تھا، دوڑاتا تھا لڑاتا تھا۔ کبھی کتوں سے کبھی تیر و کمان سے شکار کھیلتا تھا۔ اور نشانے لگاتا تھا۔ باز باشے اڑاتا تھا۔

جب ہمایوں ایران سے ہندوستان کو پھرا اور کابل میں آکر آرام سے بیٹھا تو اکبر کی عمر پانچ برس سے کچھ زیادہ ہوگی۔ یہ بھی چچا کی قید سے چھٹا اور سیر و شکار جو شاہزادوں کے شغل ہیں، ان میں دل خوش کرنے لگا۔ ایک دن کتے لیکر شکار کو گیا۔ کوہستان کا ملک ہے۔ ایک پہاڑ میں ہرن خرگوش وغیرہ شکار کے جانور بہت تھے۔ چاروں طرف نوکروں کو جما دیا کہ رستہ روکے کھڑے رہو۔ کوئی جانور نکلنے نہ پائے۔ اسے لڑکا سمجھ کر نوکروں نے بے پروائی کی۔ ایک طرف سے جانور نکل گئے۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ الٹا پھرا۔ اور جن نوکروں نے غفلت کی تھی۔ انھیں رسوائی کے ساتھ تمام اردو میں تشہیر کیا (پھرایا) ہمایوں سنکر خوش ہوا اور کہا شکر خدا کا کہ ابھی سے اس نونہال کی طبیعت میں سیاست شاہانہ اور ایجاد کے اصول ہیں۔

جب سنہ ۹۶۱ ہجری میں ہمایوں نے اکبر کو صوبہ پنجاب کا انتظام سپرد کرکے دلی سے روانہ کیا تو سرہند کے مقام میں حصار فیروزہ کی فوج آکر شامل ہوئی۔ ان میں استاعزیز سیستانی بھی تھا۔ اسے توپ اور بندوق کے کام میں کمال تھا۔ اور بادشاہ سے رومی خاں[1] کا خطاب

[1] اس عہد میں اکثر توپ انداز روم سے آتے تھے اسی واسطے بادشاہوں کے دربار سے رومی خاں خطاب پایا کرتے تھے۔ توپ و تفنگ کے کاروبار ممالک یورپ سے اول دکن میں آئے، پھر ہندوستان میں پھیلے۔ آزاد

حاصل کیا تھا۔ وہ بھی اکبر کے سلام کو آیا۔ اپنی نشانہ بازی اور تفنگ اندازی کے کمال اس خوبی سے دکھائے کہ اکبر کو بھی شوق ہو گیا۔ شکار کا عشق تو پہلے ہی تھا۔ یہ اس کا جزو اعظم ہوا۔ چند روز میں ایسا مشاق ہو گیا کہ بڑے بڑے گل چلے استاد کان پکڑنے لگے۔

از تتمہ دربار اکبری

ہمایوں نے جب شیر شاہ کے زور اور بھائیوں کی بے مروتی سے کہیں گزارہ نہ دیکھا تو ایران کا رخ کیا۔ جس وقت سے خاک ایران پر قدم رکھا شاہ طہماسپ نے بساط مہماں نوازی کو ایسے اوج رفعت پر پہنچایا کہ کسی بادشاہ کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچا ہوگا۔ مصاحبانِ باوفا اور امرائے خاص کو دربار سے بھیجا اور راہ میں جو بیٹے اور امرائے عظیم الشان شہروں میں حکومت کرتے تھے۔ انھیں حکم آیا کہ ایسے اولے ایسے احترام و اعزاز کے سامان اور اس اس قدر فوج لیکر اس طرح کے توزک اور آداب سے استقبال کریں۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے نوکروں کی امیروں سے بڑھ کر اور امیروں کی بادشاہوں کے برابر عظمت اور خاطرداری ہوئی۔ اور جو تعظیم و تکریم خود بادشاہ کی ہوئی اس سے ورق در ورق تاریخیں رنگیں ہیں جس منزل میں شاہ بے سپاہ پہنچتا تھا۔ وہاں کا حاکم زرق برق سپاہ لیکر سرحد پر استقبال کو آتا تھا۔ نذر دیکر لگام کو بوسہ دیتا تھا۔ رکاب پر سر رکھتا تھا اور ہاتھ باندھ کر ساتھ ہو لیتا تھا۔ پیدل چلتا تھا۔ جب بادشاہ اشارہ کرتا تھا تو سوار ہوتا تھا۔ اور لشکر سمیت پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ جو محل اترنے کے لیے تجویز ہوتا تھا، اس کی آرائش و زیبائش میں نہایت تکلف ہوتا تھا کوسوں تک مخمل و زربفت کا فرش پا انداز ہوتا تھا۔ جشن جمشیدی کے شکوہ سے دربار ہوتا تھا

شاہ ایران کے تمام امرا اور ملازم نذریں دیتے تھے۔ سواری کے وقت زر و گوہر نثار ہوتے تھے۔ لباس۔ اسلحہ اور دسترخوان کے تکلفات کا بیان بے تکلف نہیں ہو سکتا۔

تمام قلمرو ایران میں شاہ کا حکم پہنچ گیا تھا کہ کسی کی زبان پر شکست کا لفظ نہ آنے پائے کہ مہمان عزیز کا دل آزردہ ہو۔ ہرات میں شاہ ایران کا بیٹا فرمانروا تھا اس نے بڑی دھوم دھام سے دعوت کی باغ میں جشن سلطانی کیا۔ موسیقی کے ماہر جادوگری کر رہے تھے۔ ایک صاحب کمال نے غزل گانی شروع کی۔

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد   ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

ساری مجلس اچھل پڑی مگر جب اسنے دوسرا شعر گایا۔

ز رنج و محنت گیتی، مشو خنداں مرجاں دل   کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

اسپر ہمایوں کے آنسو نکل پڑے۔ اور سب دم بخود رہ گئے۔

اہل نظر نے یہ بھی لکھا ہے کہ خاک ایران جیسی گل انگیز ہے ویسی ہی دانش خیز اور نکتہ ریز ہے۔ چنانچہ شاہ نے ایک ہات سے مدارج مہمان نوازی کو اعلیٰ درجہ رفعت پر پہونچایا۔ دوسرے ہاتھ سے حفاظت ملک کے آئین میں انتہائے دور اندیشی کو کام فرمایا۔ وہ ہشیار ہو گیا کہ پانچویں پشت میں تیمور کا پوتا ہے۔ مبادا اس ملک میں آکر بغاوت برپا کرے اس واسطے وہ کرنا چاہیے کہ جس کی نیکنامی سے تاریخوں کے صفحے سنہرے ہو جائیں اور سلطنت خطرے سے محفوظ رہے۔ ظاہر میں جابجا استقبال ہوتے تھے اور حقیقت میں دیکھو تو ہمایوں برابر نظر بند ہوتا چلا آتا تھا شاہ نے لشکر اور سالار سپاہ نے قزوین سے بیرم خاں کو مراسلہ لکھ کر دربار شاہ کی طرف روانہ کیا

اس میں ایک قطعہ سلمان ساوجی کا بھی لکھا جس کا مطلع ہے۔

خسروا عمر نیست تا عنقائے عالی طبع من ۔۔۔ قلۂ قافِ قناعت را نشیمن کردہ است

وغیرہ وغیرہ اور مقطع تھا۔

التجا از لطف شہ دارم کہ با من آں کند ۔۔۔ ہرچہ با سلماں علی در دشت ارزن کردہ است

بیرم خاں دربار میں پہنچا۔ اور اپنی حسن رسائی اور جوہر دانائی کے ساتھ جواب باصواب لیکر آیا۔ شاہ نے حسن قدوم اور مضامین اشتیاق کے ذیل میں یہ شعر بھی لکھا۔

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد ۔۔۔ اگر ترا گزرے بر مقام ما افتد

اس مراسلہ کو دیکھ کر شاہ بے لشکر خوش ہو گیا اور لشکر گاہ شاہ کی طرف روانہ ہوا۔

دربار اکبری کے اقتباسات سے بھی ظاہر ہے کہ آزاد کا قلم انشا پردازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگرچہ تاریخ کو نہایت دلچسپ بنا دیا گیا ہے تاہم تاریخ کے لیے ایسی زبان موزوں نہیں ہے۔

(از قصص ہند حصّہ دوم)

محمد شاہ کا زمانہ اور نادر شاہ کا آنا

دہلی کا قتل عام

عصر کے وقت تک تمام شہر میں امن و امان سے عیش و عشرت ہو رہی تھی جو نہ ففنہ بھنگڑ خانے میں بیٹھے بیٹھے ایک بھنگڑ بولا کہ واہ محمد شاہ رنگیلے! آخر بادشاہی بیچ کھیل ہی گیا۔ دوسرا بولا کیا ہوا نے کہا

کہ حرم سرا میں موقع تاک کر ایک قلماقنی سے مغلیے کو مروا دیا۔ یہ ہوائی دفعتہً اڑی اور ہوا کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی۔ غضب یہ ہوا کہ نادری سپاہی جو ایک ایک دو دو گلی کوچوں میں بے تکلف پھرتے تھے انہیں لوگوں نے بے وارثا سمجھ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ رات کو نادر کو خبر پہنچی۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ اپنی جگہ پر قائم رہو اگر تم پر چڑھ کر آئیں تو جواب دو نہیں تو چپ چاپ کھڑے رہو۔ رات بھر برابر تلوار چلتی رہی اور صبح تک سات سو ولایتی شہر میں کٹ گیا۔ افسوس یہ کہ ارکان دربار چپکے بیٹھے تماشا دیکھا کیے بلکہ چند اشخاص جن کو **نادر شاہ** سے کہکر اپنے گھر لے گئے تھے وہ بھی مارے گئے **نادر** نے صبح کو اٹھ کر پوچھا تو وہی حال سنا۔ حیران ہوا کہ کرنال کے معرکہ جنگ میں کل تین ولایتی مریں اور بیس آدمی زخمی ہوں اور شہر میں میرا صدہا سپاہی اس طرح ضایع ہو جائے! دنیا آنکھوں میں اندھیر معلوم ہونے لگی اسی وقت نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر دیکھتا ہوا چلا کہ شاید مجھے زندہ و سلامت دیکھ کر یہ طوفان تھم جائے اور دہلی کے قتل عام کا دھبا میرے نام پر نہ آئے مگر شہر کے لوگوں نے اس پر بھی پتھر پھینکنے شروع کر دیے بلکہ بندوقیں بھی ماریں۔ یہاں تک کہ ایک مصاحب کا پہلو زخمی ہوا ساتھ ہی دیکھا کہ جا بجا ایرانی غریب الوطنوں کے لاشے پڑے ہیں۔ یہ دیکھکر اسکی آنکھوں میں خون اتر آیا اور قتل عام کا حکم دے کر کہہ دیا کہ جہاں تک کوئی قزلباش مرا ہوا نظر آئے ایک آدمی جیتا نہ رہے۔ یہ کہکر تڑپتے ہوئے[52] نکل آیا اور روشن الدولہ

---

[51] قلماق اگرچہ ترکوں میں ایک فرقے کا نام ہے۔ مگر ہندوستان میں قلماقنی اور اردا بیگنی ان عورتوں کو کہتے تھے جو اسلحۂ جنگ سے سجی رہتی تھیں اور حرم سرا میں سپاہیوں کی طرح پہرے وغیرہ کا کام کرتی تھیں

[52] یعنی نادر شاہ کو مروا ڈالا۔

کی مسجد میں آکر قتل عام کی علامت ظاہر کی یعنی تلوار کھینچکر مسجد میں بیٹھ گیا
کوچوں میں خون کے نالے بہ گئے اور گھروں میں آگ لگ کر زمین سے
آسمان تک دھواں دھار ہوگیا۔ نادر شاہ کا غصہ خدا کا قہر۔ بادشاہ اور
امیر سب دیکھتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔ ایک بڈھا خواجہ سرا محمد شاہ
کے پاس روتا ہوا آیا کہ حضور کے باپ دادا کی رعیت سب قتل ہوگئی بادشاہ
بھی آبدیدہ ہوئے اور اتنا کہا۔

دیدۂ عبرت کشا، قدرت حق را ببیں ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ شامت اعمال ما، صورت نادر گرفت

دوپہر کے قریب جب عالم میں کہرام مچ گیا تو پھر سب نے **آصف جاہ**
سے رجوع کی۔ وہ تلوار گلے میں ڈالے سر برہنہ کیے خاموش نادر کے سامنے
جا کھڑا ہوا اور رونے لگا۔ نادر شاہ کے دل میں بھی خدا نے رحم ڈالا۔ پوچھا کہ
چہ میخواہی؟ اُس نے یہ شعر پڑھا۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر نے شرما کر سر جھکا لیا۔ تلوار میان میں کی اور کہا کہ بہ ریش سفیدت
بخشیدم۔ اسی وقت شہر میں ایرانی نقیب اور چاؤش[1] امان امان کہتے
ہوئے دوڑے اور پل کے پل میں امن ہوگیا۔

تاریخ کو قصہ کے انداز میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

---

[1] منادی کرنے والے۔

شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں

ولادت مولوی ذکاء اللہ خاں یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام حافظ ثناء اللہ ہے۔ وہ نہایت دیندار اور پابند صوم و صلوٰۃ بزرگ تھے۔ پانچوں وقت کی نماز جامع مسجد میں باجماعت ادا کرتے تھے۔ دہلی میں کوچہ چیلاں میں اب بھی ان کا مکان موجود ہے لیکن آپ کے پابند مذہب ہونے کا اثر مولوی ذکاء اللہ پر بہت کم تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ کچھ نہ تھا۔

تعلیم مولوی ذکاء اللہ صاحب ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے یہ وہی کالج ہے جس سے آزاد اور نذیر احمد ایسے فاضل اجل فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ہمارے آج کل کے کالج باوجود اپنی متعدد ڈگریوں کے ایسے روشن خیال، آزاد منش اور لائق مصنف پیدا نہیں کر سکے۔ یہ سچ ہے کہ بعض اصحاب انگریزی دانی میں اپنا سکہ بٹھا چکے ہیں لیکن اپنی مادری زبان میں جن لوگوں نے کچھ نام پیدا کیا ہے وہ صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور جہانتک اردو لٹریچر کا تعلق ہے، ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کی برابری کسی ایک تعلیم یافتہ سے بھی نہیں ہو سکی۔

مدرسی اور ڈپٹی انسپکٹری تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہوئے جس نامور کالج میں ایک دن وہ طالبعلموں کی صف میں بیٹھتے تھے، اسی کالج میں آپ نے اپنی ذاتی لیاقت سے استادی کی

لے یہ حالات رسالہ ادیب الہ آباد سے ماخوذ ہیں جن میں ذاتی تحقیق سے بھی کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ اور رسالہ تمدن دہلی سے بھی ایک مضمون لیا گیا ہے۔ تنہا

کرسی کو مزین فرمایا۔ اس کے بعد آپ آگرہ کالج میں اردو لٹریچر کی تعلیم پر مامور ہوئے اس طرح آپ نے سات سال معلمی کا کام کیا اور ۱۸۵۸ء میں آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر اضلاع بلند شہر و مراد آباد میں رہے اور گیارہ سال تک اس عہدہ پر عمدگی سے کام کرتے رہے۔

پروفیسری میور کالج الہ آباد ۱۸۶۶ء میں آپ نے دہلی نارمل اسکول کی صدر مدرسی اختیار کر لی اور تین سال کے بعد ۱۸۶۹ء میں آپ کو "اورنٹیل کالج" میں لکچراری کی خدمت پیش کی گئی لیکن اس ملازمت پر جانے سے پیشتر آپ میور کالج الہ آباد کے پروفیسر مقرر کر دیے گئے۔ پندرہ سال تک آپ اس کالج میں ایم اے تک کی کلاسوں کو عربی و فارسی کا درس دیتے رہے جس خوش سلیقگی اور قابلیت سے آپ نے اپنی مختلف خدمات با حسن وجوہ انجام دیں اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کی علمیت کا شہرہ ملک میں ہو گیا اور آپ کے افسران بالا آپ کے کام سے ہمیشہ خوش رہے۔

پنشن لیکر خانہ نشینی میور کالج کی پروفیسری کی خدمات ایک عرصہ تک قابل اطمینان صورت میں انجام دینے کے بعد آپ نے پنشن لیکر خانہ نشینی اختیار کر لی۔ ۳۶ سال کی سرکاری ملازمت کے بعد آپ کو تصنیف و تالیف کے لیے اب بفراغت تمام وقت مل گیا اور چوبیس سال تک آپ نے اس وقت فرصت کو تصنیف و تالیف میں صرف کیا ہندوستان میں ایسی مثال کم ملے گی کہ کسی مصنف کی اسقدر کتابیں مختلف مضامین پر ہوں جن میں سے بعض نہایت مبسوط اور کارآمد ہیں اور کوئی کتاب ایسی نہیں جو مصنف کے لیے باعث ننگ و شرم ہو۔ آپ کی تصانیف کا سلسلہ زمانہ ملازمت ہی سے شروع ہو گیا تھا اور مرتے دم تک جاری رہا۔

فہرست کتب ایک اخبار میں آپ کی تصنیفات وتالیفات کی جامع فہرست شائع ہوئی تھی جس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

مضمون	مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۶	۸۷
تاریخ وجغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم ادب	۱۶	۰	۱۶
علم اخلاق	۶	۰	۶
طبعیات وہیئت	۷	۲	۹
سیاست مدن	۲	۵	۷
میزان	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

کثرت تصانیف کا اندازہ یہ ۱۴۳ کتابیں ۱۸۳۵ء سے لیکر ۱۹۱۰ء تک کی کمائی ہیں امام غزالی کا روزانہ اوسط تصنیف چار صفحے ہوتا ہے قریب قریب یہی اوسط مولوی ذکاء اللہ صاحب کی دماغی کاوشوں کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کی کتابوں میں سے ہر ایک کی ایک ایک جلد کا یکجائی وزن کیا جاتا تو خود آپ کے وزن سے وہ زیادہ ہوتا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں اور ممکن ہے اُن کا یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہو کہ اگر آپ کی تصانیف کی ایک ایک جلد اوپر تلے رکھی جائیں تو آپ کے قد سے زیادہ اونچی ہوتیں۔

خاص شوق اگرچہ آپ کو زیادہ عرصہ تک فارسی اور عربی کی تعلیم دینی پڑی لیکن آپ کو ریاضیات سے خاص شوق اور دلچسپی تھی اور اگر سچ پوچھو تو آپ کی طبیعت درحقیقت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ آپ کی تصانیف سے جہاں ریاضیات طبعیات وسیاست مدن کا شوق ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں ادب واخلاق وتاریخ کا بھی

تصنیف بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ نے جس مضمون پر بھی قلم اُٹھایا ہے اس کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔

اُردو زبان پر احسان حق یہ ہے کہ مختلف اصناف میں آپ کی گہر ریزی نے اُردو کی ضرب المثل مفلسی کو ایک حد تک دور کر دیا ہے اور جو خدمت آپ نے اُردو زبان کی اپنی کثیر تصانیف سے فرمائی ہے ہمیشہ قابلِ تحسین و تشکر رہیگی اور اُردو آیندہ زمانہ میں علمی ذخائر سے کتنی ہی مالا مال کیوں نہ ہو جائے آپ کے احسان سے سبکدوش نہ ہو سکے گی۔

مولوی سمیع اللہ کی سوانح عمری مولوی سمیع اللہ صاحب سی۔ ایم۔ جی جنکے قومی کاموں کا زندہ نمونہ الہ آباد میں مسلم ہوسٹل ہے اور جو ایک عرصہ تک سرسید کے دست راست رہ چکے تھے ان کی سوانح عمری مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مکمل کر دی۔ اور ایک محسن قوم کو زندہ جاوید بنا دیا۔ مولوی سمیع اللہ صاحب صاحب کے کارنامے ایسے نہیں جو فراموش کر دیے جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ سرسید سے ایک نجی معاملہ پر نقیض ہو جانے کے بعد انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور وہ عام طور پر قومی معاملات میں دلچسپی نہ لیتے تھے لیکن علی گڑھ کالج جو آج یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچ گیا ہے ہمیشہ اُن کا ممنونِ احسان رہے گا۔

تاریخِ اسلام سُنا گیا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ اپنی وفات سے قبل تاریخ اسلام جیسے وسیع مضمون پر طبع آزمائی فرما رہے تھے، جس کا سلسلہ افسوس ہے کہ آپکے دم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کاش آپ کی یہ سعی تکمیل کو پہنچ جاتی تو اس زمانہ میں آپ کی گلکاریاں کیا کیا بہار نہ دکھاتیں اور اردو کا خزانۂ ادب کن کن جواہرات بے بہا سے جگمگا نہ اُٹھتا۔

مضامین نویسی اگر مستقل تصانیف سے قطع نظر کی جائے اور اُن مضامین پر نگاہ ڈالی جائے جو وقتاً فوقتاً ملکی رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے ہیں تو یہ مجموعہ کئی ضخیم کتابوں کے برابر نکلے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ آپ ہندوستان کے تمام سربرآوردہ ماہواری اور ہفتہ وار پرچوں میں مضامین بھیجتے تھے۔ ایڈیٹران رسائل و اخبار آپ کے خلق و مروت کے ہمیشہ مداح رہے۔ ادھر مضمون کے لیے لکھا اور بواپسی ڈاک آپ نے مضمون بھیجا۔ آپ انکار کرنا گویا جانتے ہی نہ تھے۔ رسالہ حسن حیدرآباد دکن، تہذیب الاخلاق، سائنٹیفک گزٹ علی گڑھ، ادیب فیروزآباد، معارف علیگڑھ مخزن، زمانہ کانپور، علی گڑھ منتھلی وغیرہ وغیرہ رسائل آپ کے رشحات قلم معجز رقم سے ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔

وسعت معلومات پرانے اور نئے رسالوں اور اخباروں میں جو مضامین آپ کے قلم سے نکلے ہیں، اُن کے پڑھنے سے آپ کی وسعت معلومات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ تاریخ، فلسفہ، سائنس، کیمیا، طرز معاشرت، پالٹیکس، کیا علم المعیشت غرض مشکل سے کوئی مضمون بچا ہوگا جس پر آپ نے کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ شمس العلما مولانا حالی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ آپ کا دماغ "بنیے کی دکان" ہے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہوئی، وہاں سے مل گئی۔

زمانہ طالب علمی کے تمغے مضمون نویسی کا شوق آپ کو ابتدائے عمر سے تھا۔ دہلی کالج میں لڑکوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اول پاس ہونے پر وظائف دیے جاتے تھے۔ مولوی ذکاءاللہ ان وظائف کے زیادہ ترحقدار ٹھہرتے تھے۔ آپ کو "اعلیٰ قابلیت" کے تمغے بھی وہاں سے ملے آپ کالج سے جو علمی شوق لیکر باہر نکلے تھے وہ ہمیشہ قائم رہا۔ آپ کو بصلۂ خدمات تعلیم نسواں ڈپٹی انسپکٹری کے زمانہ میں گورنمنٹ نے خلعت مرحمت فرمایا تھا۔

گورنمنٹ کی قدر افزائی

آپ کی کتب ریاضی وطبیعیات الہ آباد اور پنجاب کی یونیورسٹیوں میں بہت عرصہ تک داخل کورس رہ چکی ہیں۔ اُردو کتابوں کا ایک سلسلہ جو حلقہ بندی مدارس کے لیے آپ نے ترتیب دیا تھا ایک مدت دراز تک رائج رہ کر آپ کی وفات سے دو چار سال پیشتر موقوف ہوا۔ سلسلۂ ریاضیات کے لیے برٹش گورنمنٹ سے آپ کو پندرہ سو روپیہ کا بیش قرار انعام عطا ہوا اور "خان بہادر" اور "شمس العلماء" کے خطابات سے مخاطب کیے گئے۔

کسر نفسی

آپ کو انیس سال کی عمر سے مضمون نگاری کا شوق تھا لیکن جو مضامین آپ لکھ کر اخباروں اور رسالوں میں بھیجتے تھے، اُن میں کسر نفسی سے اس وقت اپنا نام درج نہ فرماتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت پسند لوگ نمایش سے کس قدر گریز کرتے ہیں۔

اخلاق و عادات

بہرحال آپ بھی ان خوش قسمت مصنفین میں سے ہیں جن کی کتابوں کی قدر انھیں کی زندگی میں ہوگئی ہے اور ملک سے قبولیت عام کی سند اور خلعت بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کے اخلاق و عادات کی نسبت صرف اسقدر عرض کر دینا کافی ہے کہ آپ روشن خیال تھے اور تعلیم جدید کے سرگرم حامی تھے لیکن پرانی وضع کے پابند تھے۔ خلق و ہمدردی آپ کا شیوہ تھا۔ سرسید کے آپ قدیمی رفیق تھے۔ ایک مرتبہ سرسید کے انتقال پر آپ سرسید میموریل فنڈ ڈیپوٹیشن کے ہمراہ لاہور تشریف لے گئے اور ۱۹۰۵ء میں اسلامیہ مدارس کے معلمین کی جو کانفرنس علی گڑھ میں منعقد ہوئی تھی، اس کے آپ پریسیڈنٹ تھے۔ آپ کی طبیعت میں ظرافت بیحد تھی۔ افسوس ہے کہ آپ کے لطائف و ظرائف جو دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتے تھے ہم کو دستیاب نہ ہوسے۔ صرف ایک

لطیفہ ایک کتاب میں لکھا ہوا دیکھا تھا اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

لطیفہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ مرزا غالب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں؟ انھوں نے کہا: "ایسا ہی دخل تھا جیسا کہ مجھے شاعری میں ہے"

اُردو کی حمایت ۱۸۶۷ء میں جب سرسید نے ایک ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک کی تو گورنمنٹ نے اُنکے نام ایک چٹھی بھیجی جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ "ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ فقط یونیورسٹی کے کورس کی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ ہو جائیں بلکہ ہم علوم و فنون کے وسیع دائرہ میں طلبہ کو مستعد اور تیار کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اس مطلب کے لیے کافی ذخیرہ دیسی زبان میں اب تک موجود نہیں ہے، اس لیے کچھ عرصہ تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعے سے یہ بات حاصل کرنی ہوگی"

اس چٹھی کے آنے پر بڑے بڑے لائق تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی حامی بھری تھی جن میں مولوی ذکاء اللہ سب سے پیش پیش تھے۔ دلی کے دو اور نامور آدمی بھی خدمت اُردو کے لیے مستعد تھے۔ وہ کون؟ ماسٹر پیارے لال صاحب **آشوب** اور پنڈت دھرم نرائن صاحب۔

یادِ ذکاء اللہ از نذیر احمد مولوی ذکاء اللہ صاحب کے انتقال کے بعد جو ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو دہلی میں ہوا شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل۔ایل ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل۔ نے ایک مختصر مضمون آپ کے اخلاق و عادات پر رسالہ تمدن دہلی بابت اگست ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا وہ ہم یہاں بجنسہٖ نقل کرتے ہیں۔ اس سے آپ کے خصائل و شمائل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے بعد میں نے تو مسلمانوں کو کسی بات پر
اس عموم کے ساتھ متفق ہوتے دیکھا نہیں جیسا وہ آجکل اپنی یونیورسٹی کے بنانے پر
تلے ہوئے ہیں اسی تقریب میں بعض مسلمان یہ بھی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ کلکتہ، مدراس،
بمبئی، الہ آباد، پنجاب، ایک چھوڑ، پانچ پانچ سرکاری یونیورسٹیاں ہوتے
ہوئے تعلیم کی گاڑی میں مسلم یونیورسٹی کے پانچویں پہیے کی کیا ضرورت ہے اور
چھٹی مسلم یونیورسٹی کس قسم کے عالم پیدا کرے گی، جو پانچ یونیورسٹیاں آجتک
پیدا نہیں کر سکیں۔ طرفداران مسلم یونیورسٹی اس سوال کے جواب بھی دیتے ہیں مگر چونکہ
خالی خولی جواب ہوتے ہیں، سائل کی تشفی نہیں ہوئی۔ آج کو مولوی ذکاء اللہ زندہ
ہوتے تو میں انھیں کو پیش کر دیتا کہ مسلم یونیورسٹی درجۂ تکمیل کو پہنچکر وما ذلک علی اللہ
العزیز ان جیسے عالم پیدا کریگی۔ کریم النفس، وسیع الاخلاق، منکسر المزاج، روشن دماغ
متنوع المعلومات، کثیر التصانیف، خیر خواہ عامۂ خلائق، فیاض طبع، برٹش گورنمنٹ
کے قدر شناس، ارادتمند، راسخ الاعتقاد، صلح کل، مرنج و مرنجان ؂

مولوی ذکاء اللہ کے ساتھ میرا ربط و ضبط بچپن سے شروع ہوا جبکہ وہ دہلی
کالج یادش بخیر کی فارسی جماعت میں تھے اور میں عربی میں۔ با ایں ہمہ ہم ریاضیات
میں ہم سبق تھے۔ ماسٹر رام چندر مرحوم کے شاگرد، مولوی ذکاء اللہ کی طبیعت کو
ریاضیات کے ساتھ خداداد مناسبت تھی اور وہ جماعت میں سب سے پیش پیش
رہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ ماسٹر صاحب کے منظور نظر بھی تھے۔ اور چونکہ ماسٹر
صاحب نے بڑے بڑے مباحثوں کے بعد عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا
ماسٹر صاحب کی ہمہ وقت کی ہم نشینی کے شبہ سے لوگ مولوی ذکاء اللہ کو مذہب
کی طرف سے متہم بھی کرتے تھے لیکن میں مولوی ذکاء اللہ کا سب سے پرانا
ملاقاتی ہوں۔ ان کے معاصر جہاں تک مجھکو معلوم ہے اکثر مر چکے ہیں، ایک میں

گراں جاں کسی مصلحت سے ارذل العمر کی سختیاں جھیلنے کو بچا ہوں لیکن تا کجے
میں اب بھی گواہی دیتا ہوں اور مر کر بھی خدا کے حضور میں گواہی دوں گا کہ
جہاں تک آدمی کو آدمی کے بطون کا علم ہو سکتا ہے، میرے علم میں مولوی ذکاء اللہ
پکے موحد تھے۔ ایک، صرف ایک خدا کے بجمیع صفاتہ الکمالیہ قائل۔ اور ایسا
بالغ النظر آدمی جیسے مولوی ذکاء اللہ تھے، سائنس کے معموں کو حل کرنے والے
ہرگز منکر خدا یے واحد ہو نہیں سکتا۔ خیر یہ معاملہ تو بینہ وبین اللہ ہے میں مولوی
ذکاء اللہ کی جس ادا کو ہمیشہ نظر استحسان سے دیکھتا رہا وہ یہ تھی کہ حسد اُن کو
چھو تک نہیں گیا تھا ورنہ کالجوں اور اسکولوں میں امتحان اور کھیلوں کے ذریعے
سے تنافس پیدا کیا جاتا ہے اور وہ بالآخر فی اغلب الاحوال حسد کی صورت
پکڑ لیتا ہے۔ دنیاوی عروج کے اعتبار سے مولوی ذکاء اللہ نہ تو حکومت کے
کسی منصب جلیل پر پہنچے اور نہ انھوں نے کچھ ایسی دولت ہی جمع کی۔ اس حرمان کا سبب
یہ نہ تھا کہ ان کو اس کی قابلیت ہی نہ تھی بلکہ اصلی اور واقعی سبب یہ تھا کہ انھوں نے علمی فتوحوں کے
آگے دنیاوی عروج کی کچھ پرواہی نہ کی اور کی بھی تو اسی قدر کہ کسی کو دنیاوی عروج پر پہنچتے ہوئے دیکھ کر
خوش ہو گئے وہ علم ہی کو بڑی دولت اور بڑی حشمت سمجھتے تھے۔ انھوں نے
ساری عمر جو عمر طبعی سے تجاوز ہوئی طالب علمی میں صرف کی اور پھر بھی نفس
واپسیں تک اُن کو علم سے سیری نہیں ہوئی۔ اور وہ ہل من مزید ہی پکارتے ہوئے
دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ علم کو علم ہی کے لیے حاصل کرتے تھے یعنی علم ہی ان کا
مقصود بالذات تھا، نہ ان فائدوں کی طمع سے جو علم پر متفرع ہوتے ہیں اور
جن کے لیے سب پڑھنے والے پڑھتے ہیں الا ماشاء اللہ۔ جہاں تک فارسی کو
تعلق تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی کالج کی تعلیم صرف برائے نام تعلیم تھی۔ بدتر از جہل
جس نے ہندوستان کو تباہ کیا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ مدرسہ میں تو فارسی پڑھتے تھے

جہاں اور جس غرض سے ان وقتوں کے رواج نے ان کو داخل کرایا تھا مگر ماسٹر رام چندر کی صحبت اُن کے دل و دماغ میں ایک اور مفید تعلیم کا بیج بو رہی تھی جس نے آخر کار مولوی ذکاء اللہ کو مولوی ذکاء اللہ بنایا۔ انھوں نے مدرسے سے نکل کر نوکری کی حالت میں اور نوکری بھی سررشتۂ تعلیم کی نوکری **از خود انگریزی کا شوق** کیا اور اپنے مطالعے کے زور سے بے مدد استاد اس کو اس درجہ تک پہنچایا کہ گو وہ انگریزی بولنے میں بے مشقی کی وجہ سے ہچکچاتے تھے مگر اُن کی ہر طرح کی معلومات، جو انھوں نے انگریزی کی بدولت جمع کی تھی اتنی وسیع تھی کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کو نصیب نہیں ہوتی مولوی ذکاء اللہ حکیموں کی طرح بے فیض نہ تھے۔ کہ ان کو اتفاق سے کوئی نئی حکمی دوا معلوم بھی ہوگئی تو دوسروں کو بتانے میں دریغ کیا کرتے ہیں مولوی ذکاء اللہ نے جو کچھ پکایا تصنیفات، تالیفات، ملفوظات اور تراجم کے ذریعے سے اپنے سب ہم وطنوں کو چکھایا۔ مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی مبسوط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب کے لکھنے کے لیے کیسے فرصت پاتا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کی ایک اور ادا جس میں وہ منفرد سے تھے، ان کی مستقل مزاجی تھی کہ انھوں نے انگریزی کے اتنے تجربے پال برابر اپنی وضع کو نہیں بدلا۔ اور وہ باوجودیکہ سید احمد خاں کے گویا پٹھو تھے، مگر انھوں نے ساری عمر ترکی ٹوپی تک نہیں اوڑھی انگریزی جوتی تک نہیں پہنی۔ میں جاڑے کے دنوں میں ان کو بوڑھے بنیئے کی طرح کا روئی دار پائجامہ پہنے دیکھتا اور ہنسا کرتا۔

غرض مولوی ذکاء اللہ کی وضع ظاہر یا طرز ماندو بود یا گفتگو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی ان کو چھو بھی گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو مذہبًا

وہ بھی یقیناً مسلمان تھے مگر ان کا دامن عقیدت لوث تعصب سے بالکل پاک تھا۔ وہ باہمی میل جول میں مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے، سب خلوص کے ساتھ ملتے اور حاضر و غائب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے یہ ان کے اس خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ مرتو رہے تھے مولوی ذکاء اللہ اور سکرات کی سی بیقراری پادری[1] صاحب کو تھی۔ بہ ظاہر دونوں میں کسی ایک کی کوئی غرض دنیاوی دوسرے سے متعلق نہ تھی۔ مگر دونوں نے مذہب کی اصلیت کو سمجھا تھا اور ان کی باہمی محبت الحب للہ کی قسم سے تھی۔

مودۃ اہل صفا چہ در رو و چہ در قفا۔

میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر آدھے درجن پادری اینڈر روز جیسے انگریز اور آدھے درجن مولوی ذکاء اللہ جیسے مسلمان ہوں تو وہ وقت جلد آجائیگا کہ مسلمان اور انگریز دونو اپنی اپنی جگہ کہنے لگیں گے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تصانیف پر عام رائے اگرچہ آپ کے مزاج میں مزاح تھا اور ظرافت بدرجہ غایت تھی لیکن آپ کی تصانیف میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ خشک اور فلسفیانہ خیالات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے انگریزی کتابوں سے خیالات کو مستعار لیکر اپنی زبان کے لباس میں جلوہ گر کیا ہے مگر طرز ادا ضرور قابل تعریف ہے۔ بے شک آپ کی کتابیں روکھی پھیکی ہیں مگر اس قدر بدمزہ نہیں کہ ان کا پڑھنا ناگوار ہو۔ معلومات کے ذخائر جابجا پائے جاتے ہیں اور متین و سنجیدہ مطالعہ کے لیے نہایت ضروری

[1] پادری اینڈر روز صاحب۔

ہیں۔ آج کل کے تعلیم یافتہ انگریزی خیالات کو اپنی زبان میں ادا کرتے ہیں تو عجیب و غریب ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جس سے اُن خیالات کی ندرت اور اجنبیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ کے طرز بیان میں یہ خوبی ہے کہ وہ ٹھیٹھ اردو میں اپنے ذاتی خیالات معلوم ہوتے ہیں، ترجمہ یا ماخوذ نہیں معلوم ہوتے۔ بلاشبہ سرسید اس بارہ میں مولوی صاحب سے بہت آگے ہیں۔ انھوں نے جہاں انگریزی خیالات کو اپنی زبان کا جامہ پہنایا ہے، ان کو ایسا آراستہ و پیراستہ کر دکھایا ہے کہ خود اصلی خیالات میں اضافہ معلوم ہوتا ہے اور طرز بیان نہایت دلکش اور مؤثر ہو جاتا ہے۔ لیکن سرسید سے مولوی ذکاء اللہ کا موازنہ کرنا فضول ہے کیونکہ سید صاحب تیسرے دور کے امام ہیں اور کوئی مصنف ان کے انداز تحریر کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اُن کے لگ بھگ ہے۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے　　تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کہا جا سکتا ہے کہ **آزاد** نے **نیرنگ خیال** میں انگریزی خیالات کو نہایت عمدگی سے اپنی زبان میں بیان کیا ہے یہ سچ ہے لیکن مولوی ذکاء اللہ کم سے کم الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں اور **آزاد** کو ایک سطر کے مضمون کے لیے ایک صفحہ چاہیے **آزاد** کی کتابیں ناول اور قصہ کا مزا دیتی ہیں اور مولوی ذکاء اللہ کے یہاں ثقیل اور مقوی غذائیں ہیں، اگرچہ بعض انگریزی کھانوں کی طرح ہمیں پھیکی اور ابلی ہوئی معلوم ہوتی ہوں۔ لہٰذا دونوں کا انداز تحریر جداگانہ ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں کارآمد اور ناگزیر ہیں۔

مولوی صاحب کی کتاب تاریخ ہندوستان کے اٹھارہ حصے تیرہ جلدوں میں مجلد ہیں اور اُن کے سات ہزار ایک سو اکہتر صفحات ہیں۔

تفصیل حسب ذیل ہے:۔

ہندوؤں کے عہد سلطنت کی تاریخ	۱۱۰
مسلمانوں کے عہد سلطنت کی تاریخ جلد اول لغایۃ دہم	۵۱۰۱
انگریزوں کے عہد سلطنت کی تاریخ جلد اول لغایۃ چہارم	۱۹۵۸
میزان کل	۷۱۶۹

مولوی صاحب نے سوانح عمری ملکہ معظمہ وکٹوریا بھی لکھی ہے جو نہایت دلچسپ ہے اس سے انگریزی پارلیمنٹ اور اس کے وزراء کا حال بخوبی معلوم ہو جاتا ہے۔

آپ نے تاریخ ہندوستان میں ان یوروپین مورخین کی پیروی نہیں کی جو اپنی ناواقفیت، تعصب اور تنگ خیالی کی بنا پر واقعات کو خواہ مخواہ رنگ دیتے ہیں۔ آپ نے جس زمانہ کا حال لکھا ہے (کم از کم مسلمانوں کے عہد سلطنت کی بابت) اسی زمانہ کے مورخین کی تاریخوں سے واقعات اخذ کیے ہیں اور اس طرح سے ان تمام غلط خیالات کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو بوجہ لاعلمی یا کسی مقصد ذاتی کی بنا پر جھوٹے حالات سچے واقعات کی صورت میں مشتہر کیے گئے ہیں۔

مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ نویسی میں ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ آپ جا و بیجا انگریزوں کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ مورخ کا یہ کام ہے کہ واقعات کو ان کے اصلی رنگ میں ظاہر کرے نہ یہ کہ ان پر ملمع سازی کرے۔ جہاں تعریف کی ضرورت ہو بلا شبہ بلا لحاظ لوم لائم مدح سرائی کرے لیکن جہاں مذمت کی ضرورت ہو، ضرور برے کاموں کی خواہ کسی سے صادر ہوئے ہوں برائی کرے اور اگر دونوں باتیں نہ کرے تو اپنی رائے سے اجتناب کرے اور واقعات کی جانچ پڑتال کے بعد صحیح صحیح حالات لکھ دے۔

لیکن یہ ناانصافی ہوگی اگر ہم مولوی ذکاء اللہ کی محنت اور تلاش کی داد نہ دیں وہ جلد ہفتم ظفرنامۂ شاہجہاں کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

میرا قاعدہ ہے کہ میں سلاطین ہند کی تاریخ نویسی کے لیے وہ تواریخ لیتا ہوں جنکے مولف عہدنویس ہوں اور وہ سب سے زیادہ معتبر و مستند سمجھی جاتی ہوں ان سے تاریخی حالات اخذ کرکے لکھتا ہوں اور پھر انگریزی تاریخوں سے جنکا ایک انبار میرے پاس موجود ہے۔بعض مضامین التقاط کرکے لکھتا ہوں۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں اہل یورپ (فرانسیس، پرتگیز، انگریز، ڈچ) بہت ہندوستان میں آگئے تھے۔ان میں سے بعض فرنگیوں نے اس زمانہ کی تاریخیں اپنی زبانوں میں تصنیف کیں یا ان کی تاریخوں سے بعض معاصرین نے جو ہندوستان میں نہیں آئے، مضامین استنباط کرکے اور بعض اور سنی سنائی باتوں کو تحقیق کرکے تاریخیں تالیف کیں۔یورپ میں گو یہ قدیمی تاریخیں اپنے زمانہ میں شائقین تاریخ کے لیے ایک پرلطف غذائے علمی تیار ہوئی۔اس زمانہ کے مورخوں نے اس کے بڑے مزے لیے مگر اب وہ غذا ایسی باسی اور اُسی ہوگئی ہے کہ کوئی مورخ جس کا مذاق تاریخ صحیح ہو اس کو زبان پر نہیں رکھتا گو وہ اس زمانہ میں اپنے پایۂ وقعت سے ساقط ہوگئی ہوں مگر ان کے سبب سے جو اہل یورپ کے دل و دماغ میں غلط خیالات جم کر نقش کالحجر[1] ہوگئے ہیں وہ کسی طرح مٹائے سے نہیں مٹ سکتے۔اگر کوئی فرنگی مؤرخ یا کوئی ہندوستانی مؤرخ خواہ کیسا ہی اپنے ملک کی تعریف میں عالم فاضل ہو وہ اس پر کنہ لک حکٹ لگائے تو اہل فرنگ کے نزدیک بے فرنگ سمجھا جائے گا۔میں نے ان تاریخوں کا کہیں کہیں ذکر کیا ہے اور اُن کی غلطیوں کو بیان کیا ہے۔"

[1] کالنقش فی الحجر ہونا چاہیے شاید چھاپہ کی غلطی ہے۔ تنہا

مولوی ذکاء اللہ آزاد اور شبلی کا موازنہ

پس مولوی صاحب نے تاریخی واقعات لکھنے میں بہت تجسس اور مطالعہ سے کام لیا ہے لیکن یورپین مؤرخین کی غلطیاں فاش کرنے میں اُن کو ہمیشہ یہ خوف رہا ہے کہ اہل فرنگ کے نزدیک ہم جاہل بے فرنگ ہو جائیں لہذا وہ اُن کی غلطیاں ظاہر کرتے ہیں مگر دبی زبان سے۔ برخلاف اس کے مولوی شبلی نعمانی کا ڈھنگ بالکل جداگانہ ہے۔ انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر پر جو تاریخی مضامین لکھے ان میں تمام حالات پوست کندہ بیان کیے اور اہل یورپ کی غلط فہمی، تعصب، تنگ خیالی اور ناواقفیت کو علی الاعلان ظاہر کیا۔ تاریخ کے دو بڑے اصول روایت اور درایت لازم وملزوم ہیں روایت کے متعلق جسقدر اہتمام مسلمانوں نے کیا ہے اور جو قواعد اسکے مرتب کیے ہیں، اس قدر ترقی علوم وفنون کے بعد بھی ان میں اضافہ تو کیا، اُن کی تقلید بھی دوسری اقوام سے کماحقہٗ نہیں ہوسکی درایت کے متعلق البتہ یوروپین اصحاب نے تخیل سے خوب مدد لی ہے۔ اور تاریخ ہندوستان کے واقعات کو کچھ اس ملک کے رسم ورواج کی لاعلمی سے اور کچھ یہاں کے بھنگیر خانوں کے ثقہ راویوں کے سنے سنائے حالات سے غلط نتایج کی آماجگاہ بنایا ہے۔ اور اپنے ملکوں کے حالات سے ان کا موازنہ کرکے خوب نکتہ چینی کی ہے۔

آزاد نے دربار اکبری دوسرے طرز پر لکھی ہے۔ اس نے اکبر کی خوبیاں ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذشت نہیں کیا۔ بدقسمتی سے دانایان فرنگ کا بھی یہی شیوہ رہا ہے کہ اکبر کی خوبیاں اور عالمگیر کی برائیاں ظاہر کریں۔ اور اُن کی تاریخ نویسی کا یہی اصل اصول ہے تاکہ مسلمانوں و ہندوؤں

ہیں نا اتفاقی کا بیج ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم
اکبر کی پالیسی اور اس کی لا مذہبی کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتے اور اگر غور سے
دیکھا جائے تو سلطنت مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ اکبر کی پالیسی تھی اکبر نے راجپوتوں
سے رشتے ناطے کرکے ان کو اندر اور باہر سلطنت میں دخیل کر لیا حالانکہ محکوم قوم کا
تالیف قلوب کرنا کتنا ہی عمدہ اور قابل ستائش فعل کیوں نہو لیکن حاکم کو اپنی گردن
اُس کے ہاتھ میں دیدینا موت اور زوال کی نشانی ہے۔ اورنگ زیب نے سلطنت
کو ان مہلک نتائج سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں کیں اور اس کا یہ فعل غیر اقوام کی نظروں
میں کانٹا سا کھٹکتا ہے۔ حالانکہ انگریزوں نے ہم بیچارے ہندوستانیوں کو باوجود دعوے
تہذیب و ترقی آج بیسویں صدی میں بھی ان حقوق کا عشر عشیر نہیں دیا جو عالمگیر کے
زمانہ میں ہندوؤں کو حاصل تھے۔

لہٰذا آزاد کی جہاں یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ اس نے اکبر کے زمانہ کی تاریخ
کو صرف شاہی کارناموں تک محدود نہیں کیا ہے بلکہ اس زمانہ کے رسم و رواج طرز
ماند و بود، ملک کی عام حالت، رعایا کی مرفہ الحالی اور دیگر خیالات کا نقشہ کھینچ کر
پڑھنے والوں کو یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اس زمانہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی آنکھوں
سے تمام حالات مشاہدہ کر رہے ہیں۔ وہاں یہ بھی نقص ہے کہ اسنے اکبر کے ہر فعل کو
اچھا ہی اچھا کہا ہے۔ اپنی طرف سے وہ وہ توجیہات پیدا کی ہیں کہ باید و شاید۔ یہ کہنا
آسان ہے کہ بادشاہ کو امور ملکی میں مذہب کو دخل نہ دینا چاہیے اور ہم کو بھی اس کے
ماننے میں تامل نہیں لیکن کیا بادشاہ کو ایک بانی مذہب بھی ہونا چاہیے اور باوجود
ادعائے اسلام اس کے لیے توہین مذہب جائز ہے۔ آزاد نے ان امور کو بھی سراہا ہے

مولوی ذکاء اللہ زبان اور برجستگی کے لحاظ سے آزاد کا مقابلہ نہیں
کر سکتے، لیکن تاریخ نویسی کے اعتبار سے جسقدر غور اور تامل کے بعد صحیح نتائج پر پہنچنے

کی، مولوی صاحب نے کوشش کی ہے۔ آزاد نے زیادہ تر دلچسپ بنانے میں وقت صرف کیا ہے۔

مولانا شبلی اس دور کے مصنفین میں زیادہ تر مورخ ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے ان اسلامی معلومات کو جو عربی کی ناواقفیت کی بدولت ہماری دسترس سے باہر تھیں اپنی زبان میں نہایت عمدگی کے ساتھ جلوہ آرا کیا ہے۔ خلفائے راشدین، ائمہ معصومین اور اولیائے کرام سے جنکے حالات زندگی نہ جاننا ہم مسلمانوں کے لیے باعث ننگ و شرم تھا بڑی تحقیق و تدقیق اور محنت و تلاش کے بعد ہم کو واقف بنا دیا ہے۔ اور ان کا مایۂ عمر اُن کی آخری کتاب سیرت النبی ہے۔ یہ فرض انھوں نے نہایت خوش سلیقگی سے ادا کیا ہے اور اردو بولنے والے مسلمانوں پر جواب تک ایک بار گراں چلا آتا تھا۔ انھوں نے اپنی قادر الکلامی اور علمیت سے کام لیکر ہم سب مسلمانوں کو اس سے سبکدوش کر دیا ہے۔

لیکن جس ملک میں ہم رہتے ہیں اور جس کے گزشتہ کارناموں کو جاننا بھی ہمارا فرض ہے، اُس کی طرف مولوی ذکاء اللہ صاحب ہی نے توجہ فرمائی اردو زبان کے لحاظ سے مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان اُن اقوام کے لیے جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہیں دلچسپ اور ضروری ہے اور مولوی شبلی کی تصانیف محض مسلمانوں کے لیے مفید اور دلکش ہو سکتی ہیں۔ اردو زبان میں جو کمی مکمل تاریخ ہندوستان کے نہ ہونے سے تھی، وہ ہرگز المامون، الفاروق سیرت النعمان اور دیگر کتب کے نہ ہونے سے نہ تھی۔ پس اس بارہ میں مولوی ذکاء اللہ کی قلم فرسائی زیادہ قابل شکریہ اور لائق تحسین ہے۔

فن تاریخ میں جو استدلال کا طریقہ مولانا شبلی کا ہے وہ ہرگز مولوی ذکاء اللہ کا

نہیں ہے۔ مولانا شبلی، آزاد کی طرح الفاظ کی بھول بھلیاں میں نہیں پڑتے۔ اُن کے الفاظ بجائے خود مؤثر اور زوردار ہوتے ہیں، وہ ان کو تشبیہات و استعارات سے دلچسپ نہیں بناتے۔ مولوی ذکاء اللہ الفاظ کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں جو اسقوقت قلم سے نکل گیا، وہی غالباً کتاب کے طبع ہونے تک قائم رہا۔ دلائل پیش کرتے ہیں لیکن نہ اس طرح کہ پڑھنے والے کے دلنشین ہو جائیں۔ البتہ خفیف اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں آزاد اپنی عبارت کی عمدگی سے پڑھنے والے کے دماغ کو معطل کر دیتا ہے اور ایک ناول اور قصہ کی طرح اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے، تاوقتیکہ پڑھنے والا واقف حالات و واقعات نہو، بہت کم آزاد سے اختلاف کرتا ہے۔

مولوی صاحب کی زندگی سے ایک عمدہ سبق مجکو یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ میرے بزرگ دوست خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے مولوی ذکاء اللہ کی نسبت فرمایا تھا کہ مولوی صاحب صرف دو گھنٹے روزانہ صبح کو لکھا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ لیکن آندھی آئے یا مینہ برسے آپ کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا، شاید ان کی متعدد اور ضخیم کتابوں سے یہ خیال کیا جائے کہ وہ رات دن لکھنے ہی میں مصروف رہتے ہوں گے۔ ہرگز ایسا نہیں تھا۔ یہ پابندی وقت کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔ ہم لوگ استقلال اور وقت کی پابندی کے کچھ زیادہ قائل نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں صفات کے عمدہ نتائج کو دیکھ کر تعجب کرتے ہیں۔

اب ہم چند مضامین اور کچھ اقتباسات مولوی ذکاء اللہ صاحب کی تصنیفات سے لیکر ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

ادب

ادب کے معنی، اس ریاضت محمودہ اور کوشش و سعی کے ہیں، جس سے کسب

فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعل محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں۔

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا کہ بے ادب اسے دیکھ کر با ادب ہو جائیں جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے، وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے جیسے آہوے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے وہ اور آہوؤں کو پکڑ لاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے اس کا فکر استاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے۔ تو لالہ و گل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو، نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں، وہ خردمندوں کے نزدیک نبرد و سلاح ہے اگر تمھاری داڑھی کووں کے پروں کی سی سیاہ ہو تو بڈھوں کی بگلا کی سی سفید داڑھی کی ہنسی نہ اڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گل عذار ہو تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اسے نہ چڑاؤ۔ کیونکہ کوئی بدصورت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سرخ و سفید تھا، ایک زنگی پر ہنسا۔ تو زنگی نے جواب دیا کہ "میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لیے زیب ہے اور تیرا ایک نقطہ میرے لیے ایک عیب ہے"۔

تجھے چاہیے کہ جو تیرا عیب بیں ہو، تو اس کا ہنر دیکھ۔ جو تجھے زہر دے، تو اس کو نبات دے، جو تجھے مارے، تو اسے آب حیات پلا تاکہ تیری عقل سلامت پسند ہو اور تیرے نام کا خطبہ اخلاق میں بآواز بلند پڑھا جائے۔ خدا سے توفیق ادب کی دعا مانگ، کیونکہ ادب کے بغیر لطف رب سے آدمی محروم رہتا ہے۔ بے ادب اپنے ہی لیے برا نہیں ہوتا، بلکہ اوروں کے لیے بھی برا نمونہ بنتا ہے۔ ادب انسان کو معصوم بناتا ہے، گستاخی اور بے باکی عمول کا

ہجوم رکھتی ہے"

حیا

حیا بھی طرح طرح کی ہوتی ہے اور بے حیائی بھی ہر قسم کی۔ سب سے زیادہ سخت بے حیائی اپنی محبت میں اندھا ہونا ہے جس میں اکثر انسان مبتلا ہیں۔ ایک شخص جو سرشت انسانی سے بڑا ماہر ہے وہ یہ کہتا ہے کہ "آدمی اپنے سے سب کے بعد محبت کرے" مگر دنیا میں بہت سے آدمی ایسے دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے اپنے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ان صفات کا یقین کرتے ہیں جو درحقیقت ان میں نہیں ہوتیں اور اپنی ذات کی قدر و منزلت و قیمت میں مبالغہ کرتے ہیں۔ یہی سخت عیب ہے جس سے انسان، جو اپنے سے آپ دھوکا کھاتا ہے اور ذلت اٹھاتا ہے خلق کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے۔ جب آدمی خود ستائی کرتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دکھاتا چاہتا ہے، جس سے معلوم ہو کہ وہ کوئی بڑی قابلیت و قدر و منزلت کا آدمی ہے تو ضرور اس کی ہنسی ہوتی ہے۔ ہم کو چاہیے کہ جب کوئی دوسرا شخص ہماری تعریف کرے، تو اس کو حیا و شرم کے ساتھ قبول کریں۔ ظاہر اور باطن دونوں میں فروتنی اور عجز و انکسار اختیار کرنا چاہیے۔ جب آدمی اپنی نیک صفات کو جو حقیقت میں اس کے اندر ہیں، نمود کے ساتھ دکھائے گا تو شیخی کرکری ہو جائیگی

غرور کرنا بڑی بے حیائی ہے، مغرور بڑا بے حیا ہوتا ہے۔ مغرور اپنی نخوت کے زور سے مصیبتوں کا مقابلہ عبث کرتا ہے۔ وہ اپنے دُگنے زور سے اپنے سرکش دل کے ٹکڑے کرتا ہے۔ نرم پودا ہوا کے جھونکوں کے آگے سر جھکاتا ہے اور اس کے تمام زور کو اپنے سے دور کر دیتا ہے اور خود قائم رہتا ہے، ایسے ہی فروتن، متواضع، منکسر اپنے عجز و انکسار سے بلاؤں کو سر پر

سے ٹال دیتا ہے،

سفلے، کم ظرف، ناشائستہ اپنی اصلی لیاقتوں کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں سچے، مہذب اور شائستہ اپنے عجز و ناتوانی کو ظاہر کیا کرتے ہیں۔ علم میں جو لوگ تھوڑی لیاقت رکھتے ہیں، وہی اپنے عالم ہونے کے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر حقیقت میں جو عالم، علم دستگاہ اور حقیقت آگاہ ہوتے ہیں، وہ اپنے آگے بہ نسبت پیچھے کے زیادہ دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے میں یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ ہم کیا جانتے ہیں بلکہ یہ کہ کیا نہیں جانتے۔ جتنا ان علم بڑھتا ہے، اتنا ہی اپنی جہالت کے علم سے ان کی حیا زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سمندر کے تیراک ہوتے ہیں، ایک عمق کے بعد دوسرا عمق ان کے آگے ہوتا ہے، اس کی تھاہ کبھی انکو نہیں ملتی۔ یہ کم علم ندی نالوں کے تیراک ہوتے ہیں کہ جلدی سے تھاہ کو پا کے خوش ہو جاتے ہیں اور اس پر گھمنڈ اور فخر کرتے ہیں۔ عالموں کی نظروں کے رو برو پہاڑ پر پہاڑ اور ایک ہمالہ پر دوسرا ہمالہ آتا جاتا ہے جس سے ان کا منظر فراخ ہوتا جاتا ہے۔ جتنا یہ منظر وسیع ہوتا ہے، اتنی ہی ان کو حیا اپنی کوتاہ نظری کی بڑھتی جاتی ہے۔

محنت

ہر بشر کے پیچھے سب حالتوں میں محنت کرنے کا فرض لگا ہوا ہے، خواہ وہ کسی جماعت کا ہو۔ جو شریف، شرافت نسبی اور شرافت حقیقی تعلیم و تہذیب کے سبب سے رکھتا ہے، وہ اپنے دل سے اس امر کو اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے کہ بہبود عوام اور رفاہ انام میں سعی کرکے محنت میں اپنا حصہ لوں۔ اس کو ہرگز یہ گوارائے خاطر نہیں ہوتا کہ میں اوروں کی محنت سے کھاؤں، پیوں۔ میں فراغت سے رہوں اور اس کا معاوضہ خود محنت کرکے اپنی سوسائٹی کو

نہ دوں۔ عالی خیال نیک کردار اس تصور سے بھاگتا ہے کہ یونہیں بیٹھا رہے اور دعوتیں اڑایا کرے۔ اور اس کا معاوضہ کچھ نہ دے۔ نکتاپن اور سستی نہ کوئی عزت ہے، نہ کوئی منفعت ہے۔ اس سے فرومایہ اور کمینہ طبائع راضی ہو جاویں۔ مگر عالی ہمت تو ایسی حالت کو ذلت سمجھتے ہیں، اور حقیقی عزت اور عظمت سے اسے بعید جانتے ہیں۔

ایک دانشمند، بلند خرد، جو خود جد وجہد میں مجتہد تھا، وہ اپنے بیٹے کو جو مدرسہ میں پڑھتا تھا، یہ پند سود مند ارقام فرماتا ہے کہ "اے میرے پیارے بیٹے! تیرے دل پر اس بات کا نقش شدت سے زور دیکر نہیں جاسکتا کہ امیر، شریف، غریب، فقیر کی شرط زندگی محنت ہے۔ غریب کسان، روٹی اپنی پیشانی کی عرق ریزی سے کماتا ہے اور امیر اپنے شکار کی جستجو میں سعی کر کے اپنی سستی کو کھوتا ہے۔ جیسے گیہوں کے کھیت میں بغیر ہل چلائے کاشتکار کو کچھ پیداوار ہاتھ نہیں لگتا۔ ایسے ہی مزرعۂ دل میں تخم علم، بغیر محنت کے بارآور نہیں ہوتا مگر ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ ایسے اتفاقات اور واقعات پیش آسکتے ہیں کہ ایک کسان کھیت بوئے اور وہ اس کی پیداوار سے محروم رہے اور کوئی دوسرا آدمی اس سے متمتع ہو۔ مگر علم میں یہ نہیں ہو سکتا کہ آتش زدگی یا وقوع حادثات سے کوئی شخص اپنے مطالعۂ علمی کی ریاضت کے ثمر سے محروم ہو جائے اور یہ ثمر دوسرے کو مل جائے۔ اس کے تحصیل علم کی تکمیل اور توسیع خاص اسی کی ذاتی منفعت کے لیے ہے اسی واسطے میرے پیارے بچے! محنت کر اور وقت کو اچھی طرح کام میں لا"

لڑکپن میں ہمارے قوی ہلکے ہوتے ہیں اور دل ملائم۔ اس میں علم خوب جڑ پکڑ سکتا ہے۔ آدمی کی بھی عمریں مثل فصلوں کے ہوتی ہیں کہ اگر ایک

فصل کی کاشت میں غفلت کیجیے تو دوسری فصل میں حاصل کچھ نہیں ہوتا پس
اگر ہم اپنی طفلی اور جوانی جو خریف وربیع کی فصلیں ہیں، ضائع کر دیں گے
تو بڑھاپا ہمارا کہ کھر ساکا موسم ہے نہایت خوار اور ذلیل ہوگا۔
اگرچہ مضامین مذکورۂ بالا خشک زبان میں ادا کیے گئے ہیں لیکن خیالات
بلند اور اعلیٰ ہیں۔

(از سوانح عمری حضرت علیا کوئن وکٹوریہ)

نئی گورنمنٹ اور نامور ممبروں کے نام

ملکۂ معظمہ کی اورنگ آرائی کے سبب سے ضرور ہوا کہ ایک نئی پارلیمنٹ
مرتب ہو۔ اسی میں دونوں پارٹی (فریق) **وگ و ٹوری** میں آپس میں
پھوٹ پڑ رہی تھی۔ ایک دوسرے پر رشک و حسد کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر
گھاتیں لگاتے تھے اور داؤں پیچ کھیلتے تھے۔ جب ایک مطلوب پر دو طالب
لڑتے اور ٹکراتے ہیں تو شرارت کے شرارے نمودار ہوتے ہیں پس دونوں فریق
سے شرارتیں ظاہر ہوتی تھیں نتیجہ یہ تھا کہ دونوں فریق کی حالتوں میں تبدیل
و تغیر نہیں ہوتا تھا **ٹوری** کو خفیف سا یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ اس کا نام بدل کے
کنسرویٹیو ہو گیا۔ اس دفعہ پارلیمنٹ میں ایسے ارباب کمال جمع ہوئے کہ پہلے
کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کے نام نامی یہ ہیں جو ہمیشہ یاد رکھنے چاہییں۔

مسٹر گروٹ۔ تاریخ یونان کے مصنف، جو لندن کی طرف سے منتخب ہوئے

لارڈ لٹن۔ جو اس زمانہ کے سب سے زیادہ سرفراز **ریڈیکل** تھے یہ فرقہ
دونوں فرقوں **وگ و ٹوری** سے مخالف ہے)

مسٹر ڈزرائیلی۔ جو بڑے اولوالعزم، جلیل القدر، تیز فہم تھے۔ اگرچہ جلد

نہ مرجاتے تو بڑے بڑے کام اُن سے انجام پاتے۔

سر ولیم مور ورتھ۔ یہ اس مدرسے کے عمدہ نمونے تھے جن کا نام پچھلے زمانہ میں فلسفیانہ ریڈیکل ہوا۔

مسٹر رو بوک۔ اسی مدرسے کے ممتاز ممبر تھے مگر وہ پارلیمنٹ کی ممبری سے خارج ہو گئے۔

مسٹر گلیڈسٹن۔ پانچ برس سے پارلیمنٹ کے ممبر تھے جن کی لیاقت و قابلیت کا پیچھے ایک عالم میں شہرہ ہوا۔

لارڈ کارسل۔ ایک نوجوان، صلح طلب، عالم و ذی فن تھے۔ تفریح طبع کے لیے کچھ پولیٹکس بھی سیکھ لیا۔

لارڈ جان رسل۔ وہ پچھلے زمانہ میں **کامنس ہوس** کے پیشوا ہوئے

لارڈ پامرسٹن۔ وزیر سکرٹری تھے۔ ان میں جو لیاقت عظیم تھی اس کا ظہور ابتک نہیں ہوا تھا۔ وہ بیس برس سے ملازم تھے۔ مگر ان کی لیاقت کی شہرت نہ ہوئی تھی۔ بعد ازاں ان کی لیاقتوں اور قابلیتوں کی وہ شہرتیں اور عزتیں ہوئیں کہ اُن پر تعجب ہوتا ہے ان کے دلی دوست پہلے سے واقف نہ تھے کہ اُن میں ملک اور پارلیمنٹ پر حکومت کرنے کی لیاقت و قابلیت ہے۔

سر رابرٹ پیل۔ کنسرویٹو فرقہ کا ہادی و رہنما اور پارلیمنٹ کا زبردست اور بیٹر تھا۔

اوکونیل شیل۔ یہ دونوں آئرش فرقہ کے نائب تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۱۸۳۳ء کی پارلیمنٹ میں **مسٹر میکالے** اور **لارڈ ڈربک** پارلیمنٹ کے ممبر نہ تھے یہ کتنا صحیح ہے کہ چالیس برس کے عرصے میں **کوب ڈین** اور **برائٹ** کے سوائے جو بڑے اسپیکر تھے

کسی ممبر نے پارلیمنٹ کی تحریات کی فصاحت کو نہیں بڑھایا۔ چار برس کے بعد کوپ ڈین پارلیمنٹ کا ممبر مقرر ہوا تھا"

اقتباس مذکورہ بالا سے تاریخی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ زبان میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔

(از تاریخ ہندوستان جلد ہفتم)

سلطان خُرّم کا حال ولادت سے جلوس تک

سلخ ربیع الاول سنہ مطابق سنہ ۳۶ جلوس اکبری دارالسلطنت لاہور میں سلطان خرم پیدا ہوا (ٹوڈ صاحب نے اس نام کی نسبت یہ لکھا ہے کہ غالباً وہ اصل میں کورم تھا جسکے معنے کچھوے کے ہیں جو اس کی رجپوتنی ماں کی قوم کا نام تھا۔ یہ قیاس اس سبب سے درست نہیں معلوم ہوتا کہ مسلمانوں میں بیٹے کے نام میں، ماں کی قوم کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ باپ دادا، نام رکھا کرتے ہیں) چھٹی کے دن شہنشاہ اکبر اپنے بیٹے جہانگیر کے گھر میں رونق افروز ہوا اور اس نے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس نونہال کو اپنی فرزندی میں پرورش کروں۔ یہ کہکر پوتے کو اپنے گھر میں لایا اور اپنی سب سے پہلی بیوی خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال مرزا کو اُسے سپرد کیا اور زبان مبارک سے فرمایا کہ تمھارے بطن سے کوئی میرے فرزند نہیں ہے۔ اس دلبند سعادتمند کو اپنا اور میرا فرزند خیال کرو اور اسے پالو پوسو۔ اس دادی نے **سلطان خُرّم** کو بچپنے سے ایام تمیز تک تربیت کیا۔ اس پوتے نے بھی دادا کو اس کے نفس بازپسیں تک نہ چھوڑا۔

ہم نے بیان کیا ہے کہ خسرو کی مخالفت کے سبب جو دارالخلافۃ آگرہ کے

قلعہ میں ہنگامہ برپا ہوا تھا اور خان اعظم و راجہ مان سنگھ نے جہانگیر سے جو قلعہ سے
باہر تھا منازعت کر رکھی تھی، جہانگیر نے شاہزادہ کی ماں کو بلا بھیجا اور کہلا بھیجا کہ ایسے
وقت میں وہاں تیرا رہنا مناسب نہیں ہے، جلد چلے آؤ۔ مگر دادا کی عنایت اس پوتے
کے حال پر ایسی تھی کہ اُسنے والدہ کو رخصت کیا اور کہا کہ جب تک دادا کے دم میں
دم ہے، میرا سر اسکے قدم پر لگا ہے۔

جب جہانگیر باپ کے پاس آیا تو وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کے اپنے دولت خانہ میں
لے گیا۔ اب تک **سلطان خرم** دادا کی خدمت میں تھا۔ اور اب باپ
کے پاس رہنے لگا۔ اکثر وہ کہا کرتا تھا کہ مجھپر تین بادشاہوں کے بڑے حقوق ہیں
اول صاحبقران گیتی ستان **تیمور** کا جسنے ممالک جہان کو تسخیر کیا، خصوصاً
ہندوستان کو اور اپنی اولاد کے لیے قانون ملک گیری بنایا۔ دوم حضرت **بابر**
بادشاہ کا کہ ولایت سے ہندوستان میں آن کر ضرب شمشیر سے اس کو مسخر کیا
سوم حضرت **اکبر** بادشاہ کا، جسکی فرماں روائی کے عہد میں فتنہ کا خار کٹا اور
امن اور آرام کا باغ لگا، اور دشوار کشا قلعے فتح ہوئے، اور گردن کشوں نے
غاشیۂ اطاعت کندھے پر رکھا۔

رانا امر سنگھ سے لڑائی کرنے کے لیے سلطان خرم کا جانا

نہ حضرت **بابر**، نہ حضرت **ہمایوں**، نہ حضرت **اکبر** کے مطیع عہدوں میں **رانا** پورا مطیع ہوا نہ اسکے ساتھ جنگ و پیکار ختم ہوئی۔ اس لیے
سب سے اول **جہانگیر** نے اسکے پورا کرنے کا ارادہ کیا اور ۲ شعبان ۱۰۲۲ھ
کو **اجمیر** میں جہانگیر دوارا دول سے آیا۔ اول **رانا** کو ہر راہ سے رو براہ لائے
دوم بعد اس کام کے تمام ہونے کے کشور دکن کی فتح کو جائے۔

ہندوستان میں **رانا** اصالت نژاد و قدامت خاندان نسبت ولایت

وکثرت خیل وحشم میں امتیاز رکھتا ہے۔ وہ بدستور جہانگیر کا مطیع نہیں ہوا۔ وہ اپنے
عہد قدیم کے طریقہ پر چلتا تھا اور لوازم بندگی کو بجا نہ لاتا تھا۔ کبھی اس نے اپنے ولیعہد
تک کو بادشاہ کی خدمت میں نہ بھیجا تھا۔ حضرت اکبر بادشاہ نے پنجاہ سال
سلطنت کی مگر وہ رانا پرتاب کو فرماں بردار نہ بنا سکے۔ اس نے جہانگیر
کو راجہ مان سنگھ اور امیروں کے ساتھ رانا کی ولایت تسخیر کرنے کے لیے بھیجا
جب رانا پر بادشاہ کے لشکر کے انبوہ شکوہ سے اور سپاہ کی سخت کوشی سے
عرصہ تنگ اور کام دشوار ہوتا تو وہ کوہسار کی تنگناؤں اور دشوار گزار مقامات
میں چلا جاتا۔ پھر بادشاہی لشکر کے ہاتھ نہ آتا۔ غرض حسب مدعا مقصود نہ حاصل ہوا۔

جہانگیر نے اول ہی جلوس میں اس کام کے سرانجام میں نہایت مرتبہ
اہتمام کیا۔ اول مہم یہی اختیار کی اور لشکر گراں سلطان پرویز کی سرکردگی
میں روانہ کیا۔ مگر اس کار دشوار کا سرانجام دینا اس کی قدرت و اقتدار سے باہر تھا
سلطان خسرو کے فساد کے سبب سے اس نے معاودت کی۔

پھر مہابت خاں کو لشکر گراں کے ساتھ روانہ کیا۔ پھر ایک مدت
کے بعد عبداللہ خاں نے اس ملک میں ترکتازی کی۔ کچھ دنوں راجہ باسو
نے بھی رانا کی سرزمین میں سر مارا۔ ان سب نے اس مہم کو ادھورا چھوڑا کسی نے
پورا نہیں کیا۔ ٹوڈ صاحب کا یہاں پر یہ لکھنا کہ امر سنگھ نے جہانگیر کی
سپاہ کو شکست دی، صحیح نہیں ہے۔

۱۴۔ ذی قعدہ ۱۰۲۲ھ کو سلطان خرم کو رانا کی ولایت کی تسخیر کے
لیے رخصت کیا۔ اور ہزار سوار کا اضافہ کر کے دوازدہ ہزاری اور شش ہزار
سوار دو اسپہ و سہ اسپہ کے منصب پر پہونچایا۔ راجہ سورج سنگھ
سیف خاں بارہہ، تربیت خاں۔ نوازش خاں

کشن سنگھ۔ رتن ہاڈہ، رانا شنکر، ابوالفتح دکنی، صلابت خاں بارہ، سورج مل ولد راجہ باسو، مرزا بدیع الزماں ولد شاہرخ مرزا۔ راجہ بکرماجیت بھدوریہ، میر حسام الدین انجو اور ایک اور جماعت امراء و منصب داراسکے ساتھ کیے۔ اور بہت راجہ و امراء کمکی مقرر کیے

سلطان خرم اس لشکر کے ساتھ، اس سرزمین کے دامن کوہ میں آیا۔ یہاں پانچ شیر شکار کیے۔ قصبہ مانڈل میں کہ سرحد ولایت رانا تھا وہ فروکش ہوا۔ سلطان پرویز۔ اور مہابت خاں جو اس ولایت کی تسخیر کے لیے آئے تھے، وہ اس حد سے آگے نہیں بڑھے۔

پھر اودے پور سے بارہ کوس پر مرزا خرم کی منزل ہوئی۔ یہاں سے پانچ ہزار سوار بسرکردگی محمد تقی بخشی کے جس کا آخر کو خطاب شاہ قلی خاں ہوا، روانہ کیے کہ وہ کوہستان میں آگے جاکر وہاں کے آدمیوں کو چپاتت و تاراج اور اسیر و قتل کریں۔ اور خود یہ ارادہ کیا کہ کل لشکر کے ساتھ پیچھے سے اس کوہستان میں جائے۔

اودے پور میں سلطان خرم کا آنا

راجہ سورج سنگھ نے جو اس ملک کی ہیبت سے اور اہل ملک کی حقیقت سے واقف تھا، اُسنے شاہزادہ سے عرض کیا کہ کل لشکر کا یکبارگی اس کوہستان میں جانا مناسب نہیں۔ غنیم کو خبر ہوگی تو وہ اس کو غنیمت جانے گا اور سب طرف سے کوہوں اور گریووں کی راہ روک لے گا۔ اس صورت میں اہل اردو و بازار کی آمد و شد بند ہوگی اور رسد و آذوقہ کا پہنچانا دشوار ہوگا حضور یہیں توقف فرمائیں اور افواج کو دشمنوں کے دفع کے لیے روانہ فرمائیں

شاہزادہ نے اس صلاح کو مانا نہیں اور وہ کوہستان میں داخل ہو کر اودے پور سے باہر، چوگان کے میدان میں خیمہ زن ہوا۔

اودے پور

رانا سنگا جو حضرت بابر سے لڑا تھا، اس کے بیٹے اودے سنگھ نے اودے پور آباد کیا تھا، اودے سنگھ کے بیٹے رانا پرتاپ سنگھ کا امر سنگھ بیٹا تھا جس سے شاہزادہ لڑنے آیا تھا۔ اودے پور اس وضع سے آباد کیا گیا تھا کہ سمت مشرق میں ایک کوہچہ تھا۔ اس پر بعض منار بنائے اور اس پہاڑ کی سمت شمال میں ایک تالاب تھا جس کا نام تالاب پچھولہ مشہور تھا، اس پر نشیمن بنائے یہ آب گیر بہت دلپذیر اور عدیم النظیر ہے، بہت چوڑا، چکلا، گہرا ہے۔ بڑی پرفضا اور خوش جا ہے۔ اس کے جنوب میں ایک میدان گاہ ہے، نہایت وسیع۔ اس کے گرداگرد دیوار سنگین کھنچی ہوئی ہے۔ وہ چوگان بازی کے واسطے بنایا گیا ہے اودے پور سے تین کوس پر ایک اور تالاب اودے ساگر ہے، جس کا نام اسی رانا کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کو تین طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے اور چوتھی طرف میں اودے سنگھ نے ایک دیوار مضبوط و بلند و لمبی و چوڑی بنائی ہے۔ آبشار ہائے غریب نظارہ فریب گرتے ہیں، جن سے دہشت و حیرت ہوتی ہے اودے پور کی عمارتیں کوہ پر اور تال کے درمیان واقع ہیں۔ وہ ہندوؤں کے روش کی اور اس ملک کے معماروں کے ہندسہ کے موافق بنائی گئی ہیں۔ وہ سلطان خرم کو پسند نہ آئیں عبداللہ خاں اس موضع میں پہلے آیا تھا۔ اس کے لشکر کی حرکات سے اکثر عمارات خراب ہو گئیں تھیں۔ ناچار پرانی بنیادوں پر بہت جلد نئی عمارتیں بنائی گئیں۔

پہاڑ کے اوپر میدان میں شاہزادہ کے حکم سے چابک دست معماروں نے
نشیمن خاطر زیب، دل کشا، جو تال پر مشرف تھے بنائے اور امرائے عظام و بندہ ہائے
معتبر نے بقدر نسبت تقرب دولتخانہ کے نواحی میں بڑی بڑی عمارتیں بنائیں
جب لشکر کی قرارگاہ اودے پور قرار پائی تو یہاں سے سرحد تک چھ تھانے
شہزادہ نے مقرر کیے تاکہ غلہ کی رسد بے مزاحمت ہو اور سب کا آنا جانا آسان ہو

تھانہ دار مقرر ہونا اور لشکر شاہی کا ملک رانا کا تاخت و تاراج کرنا

ماندل میں جمال خاں، برگی اور کپاس میں دوست بیگ و خواجہ محسن اور انولہ میں سید حاجی اور متھار میں عزت خاں اور دیوگڑھ میں میر حسام الدین انجو
اور کوئل دھنیاری میں سید شہاب الدین تھانہ دار مقرر ہوئے
محمد تقی جو مقام لوہی سے پانچہزار سوار لیکر راجپوتوں کے منازل و معابد
کی تخریب کے لیے رخصت ہوا تھا، وہ موضع چھپن میں آیا۔ اس ولایت میں
۵۶ محال اور ہر محال کے ماتحت ۵۶ قریے ہیں اور اسی سبب سے اس کا
نام چھپن ہی مشہور ہے۔ اسنے یہاں آتے ہی مکانوں کا اکھیڑنا شروع کیا
اور سپاہ کو ہر طرح کی دست اندازی کی اجازت دی کہ جس سے جو کچھ اپنی
قدرت و طاقت سے ہو سکے وہ کرے۔ ان سپاہیوں نے قتل و قید کرنا اور
بڑے بڑے پرانے بتخانوں کو ڈھانا اور غارت و تاراج کرنا شروع کیا
بت کدوں کی حمایت میں برہمنوں اور راجپوتوں نے بڑی مردانگی دکھائی
اور جوہر (جیوہر) کیے۔ رانا کے بیٹے بھیم نے جو تنومندی و دلاوری میں
مشہور تھا محمد تقی کی فوج پر شبخون مارنے کی اجازت رانا سے پائی
اور وہ لشکر شاہی سے برد برد ہوا محمد تقی نے اس کا ایسا مقابلہ کیا کہ اپنے

لشکر پر کوئی صدمہ نہ آنے دیا اور اس کو محفوظ رکھا خان اعظم مرزا کوکہ سلطان خرم کی خدمت میں آیا اور ایسی خوشنا ادائیں دکھائیں کہ اسکو کچھ دنوں سلطان خرم نے نظربند رکھا اور پھر جہانگیر پاس بھیجدیا جہانگیر نے مہابت خاں کو شہزادہ کی خدمت میں روانہ کیا۔

شہزادہ نے لشکر کے چار حصے کیے کہ وہ اس سرزمین میں ترکتازی کریں اور رانا کو پکڑیں۔ ایک فوج کا سپہ سالار عبداللہ خاں بہادر فیروز جنگ کو اور دوسری فوج کا سپہ آرا سیف خاں بارہ دبیرم بیگ بخشی کو اور تیسری فوج کا لشکر آرا دلاور خاں کاکر و کشن سنگھ کو اور چوتھی فوج کا سردار محمد تقی کو بنایا۔ فوجوں کے مارے رانا کوہساروں میں چھپتا پھرتا اور یہ لشکر ترکتازی کرتے پھرتے تھے اور قتل و قید و غارت و تخریب کرتے تھے۔ عبداللہ خاں نے ایک تنومند فیل، عالم گمان اور پانچ اور نامی ہاتھی رانا کے گرفتار کر لیے دلاور خاں کاکر نے بھی پانچ ہاتھی رانا کے پکڑ لیے اور بہت سے غنائم ہاتھ لگے جب جادوں رائے نے سترہ ہاتھی اور فتحنامہ جہانگیر کو پیش کیا تو اس نے اس فتح کو اور فتوحات کا مقدمہ جانکر سلطان خرم تحسین کر دوام صوبہ مالوہ کی آمدنی سے انعام دیئے۔ مرزا شکر اللہ مرکو میر معصوم کی جگہ بھیجدیا۔

رانا کا حال تنگ ہونا

رانا کا حال ایسا تنگ کیا کہ وہ ایک لحظہ کسی مقام میں آرام نہیں کر سکتا تھا۔ سورج مل، اسکے بیٹے کے ساتھ اہل و عیال اسکے جابجا پڑے کھچے پہنچے تھے۔ خود تھوڑے آدمیوں کے ساتھ سرگرداں تھا۔ اور برسات کے موسم کا انتظار کرتا تھا کہ وہ راہوں اور گزرگاہوں کو پانی سے گھیر لے اور مجھے دشمنوں کی

آگ سے بچا دے۔

سلطان خرم نے کوہستان کی تنگناؤں میں تھانے بٹھا دیے تھے کہ جہاں رانا کی خبر پائیں وہاں فوراً اسکے پکڑنے کو لشکر روانہ ہو محمد شاہ کو کلتاش کے بتخانوں کی تخریب اور راجپوتوں کی تادیب کے لیے روانہ کیا اُس نے جاتے ہی تاراج شروع کی اور بہت آدمیوں کو مارا اور قید کیا راے سندر داس، سروہی کی طرف گیا۔ وہاں رانا کے اہل و عیال کا نشان اس کو بتایا تھا۔ مگر اُسکے پہنچنے سے پہلے چترمان رانا اہل و عیال کو دوسری جگہ لے گیا تھا۔ اس سرزمین میں راے سندر داس نے قتل و غارت اور اسیر کرنے اور منازل ہنود کے خراب کرنے میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی۔ بتخانوں پر راجپوت بڑے دلیرانہ لڑے اور آخر کو جوہر کر کے مع اہل و عیال مرے۔ اس راے نے بادشاہ کے حقوق کا پاس کیا اور اپنے آئین و کیش کا کچھ خیال نہیں کیا۔ بتوں کو جلایا اور بتخانوں کو ڈھایا۔

بدلہا چناں مہر او خانہ ساخت — کہ ہندو بہ تخریب بتخانہ تاخت

اس حسن خدمات کے جلدو میں راے سندر داس کو راے رایان کا خطاب ملا اور رفتہ رفتہ اُس کا درجہ ایسا بڑھا کہ راجہ بکرماجیت کا خطاب مرحمت ہوا جس سے بڑھ کر راجاؤں کے واسطے کوئی اور خطاب نہیں ہے۔

رانا کا سلطان خرم کی ملازمت میں آنا اور بعض اور مطالب

رانا معاملہ فہمی اور کاروانی سے عواقب امور و دوربینی سے بالکل بے نصیب نہ تھا اور اپنے کام کی بداندیشی اور روزگار کی بہبود سے فی الجملہ بہرہ رکھتا تھا اس نے ان دونوں میں اپنے معاملہ میں غور کی اور مشاہدہ کیا کہ بادشاہ سے مخالفت کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوا

نصیب ہوا اس وقت میں میرا حال، میرے حوصلے سے تنگ ہوا۔ جو کچھ گزرا سو گزرا، اس سے قطع نظر کرکے اسنے ملاحظہ کیا کہ مال و منال تلف ہوا، ملک پر زوال آیا، ناموس معرض خطر میں آیا۔ راحت و آرام حرام ہوا۔ وہ ننگ ناموس کے مٹ جانے کو بہت مکروہ جانتا تھا، بہ ناچاری، اضطرار و اضطراب کے ساتھ امان مانگنا، اپنے اوپر واجب جانا اور اس خاندان کو بڑا فخر یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے کسی بادشاہ کی اطاعت میں سر نہیں جھکاتا تھا۔ بلکہ اپنے ولیعہد کو بھی کسی عالی شان بادشاہ کی خدمت میں نہیں بھیجتا تھا۔ اسنے ان سب باتوں سے قطع نظر کی اور دیکھا کہ ان دنوں میں آباد ملک ویران ہوا، معمور خزانہ خالی ہوا، سپاہ کشتہ و اسیر ہوئی، خویشوں نے مع منتسبوں کے اپنا سر پکڑا، تمام متعلقین اور پرانے نوکروں نے برسوں کا تعلق توڑا، رعیت پراگندہ و متفرق ہوئی۔ غرض اُسنے اس نازک وقت میں یہی مصلحت دیکھی کہ امان طلب کرے۔ اُسنے ایک مکتوب **راے رایان** کو لکھا جس سے سابقہ معرفت رکھتا تھا اور امان طلب کی اور تمام اوامر و نواہی بادشاہی کے ماننے کو کہا اور منظور کیا اور اپنے جانشین بیٹے **کرن** کو **سلطان خرم** کی خدمت میں بھیجنے کا وعدہ کیا ......،

سجدہ کا موقوف ہونا

جب شاہ جہاں نے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو اس کو مراسم ملت مصطفوی و شریعت محمدی کا جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا ایسا پاس و لحاظ تھا کہ اول حکم اُسنے یہ دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا، معبود حقیقی سزاوار ہے۔ اب آیندہ کوئی دوسرے کے لیے اپنی پیشانی کو خاک مذلت پر نہ رکھے۔ یعنی **اکبری** عہد میں بادشاہ کو جو سجدہ کرنے کا دستور تھا وہ موقوف کیا **مہابت خاں**، خانخانان نے

معروض کیا کہ جہان آفریں نے نظامِ عالم کے لیے اپنے بندوں کو مرتبۂ نوازش و بزرگ داشت میں متفاوت پیدا کیا ہے۔ ایک کو اوج عزت و رفعت عنایت کیا اور مرتبۂ والا خداوندگاری اور پایۂ بلند فرماں گزاری پہ پہنچایا اور مسند کامگاری و بختیاری پر متمکن کیا اور دوسرے کو حکم پذیری و فرماں برداری کے لیے پیدا کیا اور ہر ایک کو استعداد کار کے اندازہ اور حالت روزگار کے موافق اسکے امور ضروریہ کے اہتمام میں مدد معاون بنایا۔ ایسے ہی مراتب تعظیم و تفاوت کو لوازم انتظام اور مراسم قوام عالم بنایا۔ اگر حضرت کو پرہیزگاری اور احکام الٰہی کی اطاعت کے سبب سے سجدہ ناپسند ہے تو اس کی جگہ زمین بوس مقرر کیا جائے جس سے مخدوم، خادم میں اور رئیس مرؤس میں اور سلطان و رعیت میں، استقامت امور جمہور کے لیے امتیاز ہو۔ بادشاہ دین پناہ نے اس کی ملتمس کو منظور کیا اور یہ قرار دیا کہ دونو ہاتھ زمین پر لٹکا کے، پشت دست پر بوسہ دیں۔ اس کا نام زمین بوس رکھا گیا مگر اس میں بھی سجدہ کے ساتھ مشابہت ہوتی تھی، اس کو بھی موقوف کر کے تسلیم چہارم مقرر کی جس کا نام آگے آئے گا۔ اور سادات کو کہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں اور فضلاء صلاح آثار اور درویشان پرہیزگار اور زاویہ نشینان عبادت گزار کو اس زمین بوس سے معاف کیا اور یہ مقرر کیا کہ جس وقت بادشاہ سے ملاقات ہو تو سلام علیکم کریں اور جب رخصت ہوں تو فاتحہ پڑھیں،

موزنمانہ انداز ہے۔ زبان بھی کسی قدر شاندار ہے لیکن کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔

وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات

(انگریزوں کے عہد سلطنت کی تاریخ جلد اول)

شاید کوئی اور دوسرا مدبر و منتظم ملکی ایسا گزرا ہو کہ جس کی تفضیح اور ہجو
اس مبالغہ سے اور تعریف اس شد و مد سے ہوئی ہو اور اس کی ساری زندگی
کے افعال اور اعمال کی تحقیقات ایسی شہادت تحریری سے ہوئی ہو۔ مگر اس کی
نسبت لکھنے والے طرفدار اور متعصب تھے۔ اگر نظر انصاف سے دیکھیے تو
اس میں یہ بھلائیاں اور برائیاں معلوم ہوں گی جو ہم نیچے لکھتے ہیں۔ اس کی ذکا
اور فراست و ذہانت کے سب دوست دشمن قائل ہیں۔ کوئی اس میں شبہ نہیں
کرتا کہ وہ بیدار مغز اور ہوشیار دل ایسا تھا کہ امور خطیر اور معاملات عظیم کے
انصرام اور سرانجام کرنے کی اس میں قابلیت اور لیاقت تھی۔ برسوں تک
اتنے ایک سلطنت بزرگ اور سلطنت عظیم کا نظم و نسق کیا۔ سوائے ذہین اور
قابل ہونے کے وہ محنت شعار اور جفاکش پہلے درجے کا تھا۔ کاہلی اس سے
کوسوں دور رہتی تھی اس کے جانشین جو ہوئے ان میں دو چار قابلیت
اور لیاقت میں تو ہم پلہ ہوئے۔ مگر محنت و مشقت و کارگزاری میں کہیں اس سے
ہلکے تھے۔ یہی پہلا عالی دماغ تھا جس نے یہ سوچا کہ انگریزی گورنمنٹ سب سے
علیحدہ رہ کر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے لیے ضرور ہے کہ وہ اور ہندوستانی
رئیسوں سے آمیزش اور سازش کرے۔ یہی باب فتح و نصرت کی کنجی ہے یہی
وہ روشن عقل تھا کہ اسی شاہراہ پر انگریزی گورنمنٹ کو رستہ دکھایا جس پر چلنے
سے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچی، گو یہ خیالات اس وقت انگلستان میں عام پسند
نہ تھے۔ مگر میری بھلی طرح سے تجربہ ہو کر آخرکار رفتہ رفتہ صحیح ثابت ہوگئے۔

اس نے انگریزی صوبوں کے حسن انتظام میں اپنی عقل و ذہن کو بہت خرچ کیا۔ انقلابوں کے طوفان نے سارے ملک میں اندھیر مچا رکھا تھا کسی سلطنت کا چراغ روشن نہ رکھا تھا۔ شمع افسردہ کی طرح سب میں دھواں نکل رہا تھا۔ مالی اور دیوانی عدالتوں کا بہت برا حال تھا۔ وہ نام کی عدالتیں تھیں حقیقت میں ان کے طفیل وہ ظلم و ستم ہوتے تھے کہ قلم لکھ نہیں سکتا اگر زمیندار تھا تو دادے مالگزاری کے لیے سر اس کا شکنجہ بنایا جاتا تھا اگر ساہوکار تھا تو وہ شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ غرض سارے زمانے کی جان تنگ تھی۔ اسنے ان سب عدالتوں کی اصلاح کی۔ گو ان کو اس نے درجہ کمال پر نہیں پہنچایا اور نہ ان کو اچھا بنایا مگر وہ ایک بنیاد ان کی ایسی ڈال گیا کہ پھر اس پر لوروں کو ردّے لگا کر عمارت بنانی آسان ہو گئی۔ کوئی حکومت کا کارخانہ ایسا نہ تھا کہ جس کی طرف اسنے توجہ نہ کی ہو اور ان میں بہت سی باتوں کا موجد نہ ہو۔

اسنے اپنی سرکار کی ہوا خواہی اور خیراندیشی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر اس میں اسنے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا، تو اس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا اچھا برا نہیں سوچا از راہ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا۔ اہل انگلستان نے اس کو بے سروسامانی سمجھا۔ اس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا کہ وہ عدالت اور انصاف کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا اور مروت و فتوت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا۔ "گر ضرورت بود روا باشد" پر عمل تھا۔ وہ خود رائی کے سبب بر خود غلط اتنا تھا کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا ہر کام اس کا ایک راز سربستہ اور سِر پوشیدہ تھا۔ کسی کام کی اصل و حقیقت

کھلنے ہی نہیں دیتا تھا، گو اسکے ظاہر ہو جانے سے نقصان نہ ہو۔ وجہ اس کی
یہ تھی کہ وہ ہر کام کو بڑے سیچ پاچ سے کرتا تھا۔ غرض اسمیں جو خوبیاں تھیں وہ تحسین کے
قابل تھیں اور جو بُرائیاں تھیں وہ نفرین کے لائق۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ رعایا پروری
سپاہ کی دلداری، لوگوں کو اپنا کر لینا، رفاہیت عباد اور معموری بلاد کا خیال یہ
خوبیاں اس میں ایسی تھیں کہ وہ ایک طوطی خوشرنگ کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں مگر
اپنی سرکار کی نمک شناسی کے سبب سے اس کی گنجینہ آمائی، دولت افزائی ایسی ایک
بلی اس میں تھی کہ وہ اس طوطی خوشرنگ کو نوچے کھاتی تھی مگر اس بلی کے بھنبوڑنے
کے لیے اس کے پاس ایک کتا بھی موجود تھا، جو اس کی خود پرستی و خود رائی تھی
غرض یہ فضائل اور رذائل اس میں کام کر رہے تھے جو ایک بڑے بند مکان میں
طوطی اور بلی اور کتا کام کریں۔ ہیسٹنگز صاحب کی سب سے زیادہ تعریف اس
بات میں تھی کہ اسنے سارے کارخانوں اور کاموں کے لیے خود ہی مقدمات کو
ترتیب دیا اور اس بات کو سرانجام کیا۔ جب وہ ولایت سے ہندوستان میں آیا
تو طفل مکتب تھا۔ نوکری ملی تو تجارت کے کارخانے میں کبھی اسکو اہل علم و منتظمان
ملکی کی صحبت بھی میسر آئی۔ جتنے اسکے یہاں جلیس و انیس تھے ان میں کوئی اس سے
زیادہ صاحب لیاقت نہ تھا۔ کہ اس کی لیاقت کو بڑھاتا۔ بلکہ اسکو خود استاد
بن کر اور سب کو لیاقت کا سبق پڑھانا پڑا۔ وہ سب کا رہنما تھا۔ اور اس کا رہنما
فقط اس کی عقل و دانش کا نور تھا۔

وارن ہیسٹنگز کے طرز عمل پر خوب رائے ظاہر فرمائی ہے۔ مولوی صاحب نے
یہاں میانہ روی اختیار کی ہے۔ نہ افراط سے کام لیا ہے۔ نہ تفریط سے۔ نہ اس کی
تعریف میں مبالغہ کو دخل دیا ہے اور نہ اسکی مذمت میں ورق کے ورق سیاہ کیے ہیں بلکہ
صحیح رائے اسکے حالات زندگی پڑھنے سے قائم ہوتی ہے اسی کو تحریر فرما دیا ہے اور یہی ایک مورخ کی خوبی ہے

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی

آبائو اجداد مولوی سید علی بلگرام کے ایک نہایت شریف خاندان سے تھے ان کے آبائو اجداد شہر واسط سے جو عراق عرب میں بغداد و بصرہ کے درمیان واقع ہے چھٹی صدی میں ہندوستان میں آئے اور اودھ میں مقیم ہوئے۔ انکے جد امجد مولوی سید کرامت حسین خاں بہادر والیسرائے کے دربار میں شاہ اودھ کی طرف سے قائم مقام تھے۔ بعد الحاق ان کے والد اور چچا دونوں انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ اور معتبر خدمات پر سرفراز رہے۔

باپ اور چچا ان کے چچا سید عظم الدین حسن خاں لارڈ ولیم بنٹنگ صاحب (اے۔ ڈی۔ سی۔) اور اورینٹیل انٹرپریٹر (ترجمان السنۂ شرقیہ) بعد میں سندھ کے پولیٹکل ایجنٹ مقرر ہوئے اور دریاے سندھ کی نگرانی بھی انھیں تحویل کی گئی۔ یہ ایسی باوقعت اور اہم خدمت تھی کہ سوائے انگریز کے کسی دوسرے کو ملنی محال تھی۔ لیکن چونکہ امیران سندھ اپنے ہاں انگریز کا آنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔ دوبار بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے بہار میں ڈپٹی کلکٹر اور افسر بندوبست بھی رہے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب جو ہندوستانیوں کے پہلے طبقہ کو ملا اس میں یہ بھی شامل تھے۔ غدر کے زمانہ میں انھوں نے آرہ ہوس کے بچانے میں کنور سنگھ کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور مشہور آرہ گاریسن ہوس کے سورما سمجھے جاتے ہیں۔

مولوی صاحب کے والد زین الدین خان بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری اور ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدہ پر مامور رہے اور سنہ ۱۸

ﷺ یہ حالات مولوی عبدالحق صاحب کے مضمون مطبوعہ الناظر سے ماخوذ ہیں۔ - تنہا

سے ۱۸۷۶ء تک اپنی خدمات کے فرائض کو حسن خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اور پنشن پانے کے بعد ریاست حیدرآباد میں کمشنری انعام کی خدمت پر تقرر ہوا مولوی صاحب کے چچا اور والد مشرقی علوم والسنہ کے عالم اور فاضل تھے اور بعدازاں انھوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں جس کو وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا تعلیم پائی۔

پیدائش اور تعلیم

مولوی سید علی اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء میں تولد ہوئے۔ آٹھ برس کے سن سے چودہ برس تک علوم عربیہ حاصل کیے۔ ان کا حافظہ بڑا غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وہ پتھر کی لکیر تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں عربی فارسی تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۸۶۶ء میں انگریزی مدرسہ میں داخل ہوئے یہاں بھی انھوں نے خوب ترقی کی، دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں شریک ہوئے اور ۱۸۷۲ء میں یعنی کل آٹھ سال میں پٹنہ کالج سے۔ بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔ اے۔ میں ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ کالج کے مدرس اور پروفیسر مرحوم کی ذہانت، قابلیت اور حافظے کے قائل تھے۔ اس کے بعد تین سال تک قانون ملکی کا مطالعہ کیا اور سال بھر بعد سٹیٹوسول سروس میں کامیاب ہوئے اور کل صوبہ بہار میں نمبر اول رہے۔ بعدازاں طامسن اسکالرشپ پاکر رڑکی انجنیرنگ کالج میں داخل ہوئے۔ ابھی پورے چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ حیدرآباد دکن کے نامور مدبر اور عالی دماغ وزیر نواب مختارالملک سرسالار جنگ بہادر اول نے جنکی قدردانی اور جوہرشناسی مشہور آفاق ہے انھیں حیدرآباد میں طلب کر کے اپنے ملازمین اسٹاف میں داخل کیا اور انھوں نے بجائے تین سال کے دو سال میں

ایسوشی ایٹ کا امتحان بدرجۂ اعلیٰ پاس کیا اور علم طبقات الارض میں (مرچی سن) تمغہ پایا۔ علاوہ اسکے کیمیا، طبیعیات، میخانیک، نقشہ کشی، معدنیات، علم الحیات وغیرہ علوم میں دستگاہ وافر حاصل کی۔ پروفیسروں نے ان کی لیاقت و ذہانت کی بہت تعریف کی ہے اور اعلیٰ درجہ کے صداقت نامے دیے ہیں۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے بزمانہ قیام انگلستان ایسے ماہرین فن اور علماے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو آسمان فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ مثلاً پروفیسر ہکسلے، پروفیسر جڈ، پروفیسر گتھری، پروفیسر ٹنڈل وغیرہ جو ہر ایک اپنے فن میں یکتا تھا۔ اس سے قبل انھوں نے ۱۸۷۹ء میں لندن یونیورسٹی کا امتحان میٹری کولیشن بدرجۂ اعلیٰ پاس کیا تھا اور اس امتحان میں اُن کی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں۔

سفر یورپ اور ملازمت حیدرآباد

تکمیل تعلیم کے بعد انھوں نے فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا، اور اٹالین زبانوں اور علوم کی تحصیل کے لیے کچھ مدت اٹلی میں قیام کیا اور اس طرح علوم مغربی و مشرقی سے بہرہ ور ہوکر حیدرآباد واپس آئے جہاں سرکار عالی نے انھیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا۔ کچھ عرصہ کے لیے وہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور ہوم سکرٹری بھی رہے۔

کیا کیا زبانیں جانتے تھے

مولوی صاحب مختلف السنہ و علوم کے فاضل تھے اور لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی زبانیں خوب جانتے تھے۔

مولوی صاحب پہلے مسلمان تھے جو بار ہا مدراس یونیورسٹی کے امتحان

ایم۔اے۔ کے سنسکرت کے ممتحن مقرر ہوئے۔ اور وید وں اور ویدک علم ادب میں امتحان کے پرچے مرتب کیے۔ کئی پنڈتوں سے یہ سنا گیا ہے کہ ان کا تلفظ ایسا صحیح اور عمدہ تھا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے سے وید پڑھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑا پنڈت پڑھ رہا ہے۔ وہ جرمنی فرانسیسی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ نہایت روانی کے ساتھ بلاتکلف پڑھتے چلے جاتے تھے۔

امتحان بی ایل پاس کیا

مولوی صاحب آخر عمر تک (باستثنائے بعض عارضی تقررات کے) معتمد تعمیرات و ریلوے و معدنیات رہے۔ سر آسماں جاہ بہادر کی وزارت میں بعض انقلابات سے بد دل ہوکر انھوں نے امتحان وکالت کی تیاری اسوقت کی جبکہ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی۔ایل میں صرف چار مہینے باقی رہ گئے تھے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس امتحان میں تمام یونیورسٹی میں اول رہے اور طلائی تمغہ، یونیورسٹی لا اسکالرشپ اور رچی انعام کتب حاصل کیا۔ اس سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں کسی مسلمان طالب علم کو قانونی امتحان میں یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ امتحان انھوں نے نومبر ۱۸۹۱ء میں پاس کیا۔ اس سے مولوی سید علی کے خداداد حافظہ اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ ہند نے انھیں شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا اور بلاشبہ وہ اسکے مستحق تھے۔

قیام انگلستان

۱۹۰۱ء میں بعض پولٹیکل وجوہ سے ایک پنشن قرار وظیفہ (ماہانہ) لیکر خدمت سے علیحدہ ہوگئے اور انگلستان میں جاکر مقیم ہوئے ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے لکچرار مقرر کیے گئے اسی سال انڈیا آفس میں عربی فارسی کے قلمی نسخوں کی فہرست تیار کرنے پر مامور ہوئے۔ یہ بہت بڑا ذخیرہ ہے جس کی تعداد چھ ہزار سے کم نہیں اسکی فہرست کا

ترتیب دینا معمولی کام نہ تھا۔ بلکہ ایک بڑا اور اہم کام خیال کیا گیا تھا انڈیا آفس لائبریری کا یہ حصہ "قلمی نسخہ ہائے دہلی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دہلی کا شاہی کتب خانہ تھا جو غدر کے بعد لندن بھیجدیا گیا۔

خطہ بلگرام مردم خیز ہے شاہجہاں نے پورب کو شیراز کہا تھا۔ لیکن پورب میں بلگرام کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ عجیب مردم خیز خطہ ہے۔ اسی قصبہ سے سید مرتضےٰ صاحب تاج العروس، علامہ سید عبد الجلیل و مولانا سید غلام علی واسطی آزاد وغیرہم جیسے فاضل پیدا ہوئے اور اس آخری دور میں شمس العلماء مولوی سید علی اور انکے بڑے بھائی مولوی سید حسین نواب عماد الملک بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ کا شمار بھی انھیں باکمال علما میں ہو سکتا ہے۔
حقیقتًا بلگرام کے خطہ کو مردم خیز ہونے کا فخر ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ ایک خط میں مرزا غالب نے بھی بلگرام کے ایک بچے کی باتیں سنکر اپنے کسی دوست کو لکھا تھا کہ وہ خاکِ پاکِ بلگرام! وہاں کے جس شخص کو دیکھا باکمال پایا۔

تالیفات و تصنیفات مولوی سید علی بلا شبہ مختلف علوم والسنہ کے عالم تھے لیکن جب انکے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے علم کے مقابلہ میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ طبعًا جفاکشی اور علمی کام کی طرف کم راغب تھے۔ دوسرے دکن کی آب و ہوا اور وہاں کی سازشیں ایسی ہیں کہ آدمی کرنا بھی چاہے تو کچھ نہ کر سکے۔ اُن کا کام زیادہ تر بلکہ کل کا کل ترجمہ ہی تک رہا لیکن اس زمانہ میں ناقص اور فضول تصنیف و تالیف کی نسبت غیر زبانوں کی عمدہ تصانیف کا ترجمہ بسا غنیمت اور قابل قدر ہے بلکہ بہت ضروری ہے۔

مولوی صاحب کی تالیفات و تراجم حسب ذیل ہیں۔

۱- اصول قانون متعلق بہ طب۔ یہ کتاب علاوہ اطبا و وکلا اور حکام عدالت کے عام ناظرین کے لیے بھی بہت دلچسپ ہے (ڈاکٹر ہیر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے) اس کتاب میں انسانی فطرت کے تاریک پہلو کو پڑھ کر بڑی عبرت حاصل ہوتی ہے۔ بہ زمانہ وزارت سر آسماں جاہ مرحوم سرکار نے مترجم کو پانچ ہزار روپیہ بطور صلہ عنایت فرمائے اس کتاب میں ایک امر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ علمی اصطلاحات کا ترجمہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔

۲- رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ۔ اس میں مولوی صاحب نے مشہور و معروف کتاب کلیلہ و دمنہ کے متعلق بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور اس امر کے پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں یہ کتاب کہاں کی ہے، پھر کہاں کہاں گئی اور کس کس زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور کیا کیا تغیرات عمل میں آئے مولوی صاحب کی یہ مختصر تالیف بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے اسے آپ نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں پڑھا تھا وہ خود فرماتے تھے کہ بہ زمانہ قیام لندن ایک علمی سوسائٹی میں مسلمانوں کے تمدن و علم و ادب کا ذکر تھا، ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق اپنی اپنی رائے دے رہا تھا اس میں مولوی صاحب نے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے تمام آثار اور ان کے کارنامے دنیا سے نابود بھی ہو جائیں اور دو کتابیں کلیلہ و دمنہ اور الف لیلہ باقی رہ جائیں تو ان کے کارہائے نمایاں کے لیے کافی ہیں۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ کلیلہ و دمنہ کی طرح ایک رسالہ الف لیلہ پر بھی لکھیں اور اس کے لیے مواد مہیا کیا بھر کتابیں جمع کی تھیں مگر نہ لکھ سکے۔

۳- فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ۔

۴- غارہائے الورا کا گائڈ۔

۵۔ حیدرآباد کے اقتصادی و طبقات ارضی معدنیات۔

۶۔ تمدن عرب۔ موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔ درحقیقت یہ کتاب عربی و اسلامی تمدن پر بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔

۷۔ تمدن ہند۔ یہ کتاب بھی موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں ہندوؤں کے زمانہ کا تمدن نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

۸۔ مولوی صاحب نے موسیو سدیو کی کتاب تمدن عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اردو میں کیا تھا لیکن جب انھوں نے یہ سنا کہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو گیا ہے تو اس کو طبع نہیں کرایا۔ حالانکہ اگر یہ ترجمہ شایع ہو جاتا تو بہت مفید ہوتا اسلیے کہ عربی میں کامل کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا بلکہ صرف اسکا خلاصہ شایع کیا گیا ہے۔

الحقائق و سررشتہ علوم و فنون

مولوی صاحب نے حیدرآباد سے ایک عربی سہ ماہی رسالہ **الحقائق** نامی ۱۸۸۹ء میں جاری کیا تھا جسکے چیف ایڈیٹر وہ خود تھے۔ اس رسالہ میں اچھے اچھے مضمون لکھے گئے۔ لکھنے والوں میں نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی علامہ مولوی سید علی شوستری، ڈاکٹر لائٹنر، مولوی سید کرامت حسین[1] صاحب جیسے

---

[1] مولوی سید کرامت حسین یکم جولائی ۱۸۵۲ء کو بمقام جھانسی پیدا ہوئے آپ کے والد سید سراج حسین صاحب قصبہ کنتور ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے مولوی خاندان کے سید اور مذہباً شیعہ تھے۔ سید صاحب ابھی سات ہی برس کے تھے کہ مادر مشفق نے داعی اجل کو لبیک کہا اور سید صاحب اپنے والد بزرگوار کی بے پروائیوں اور کم توجہی کے باوجود پندرہ سال کی عمر تک پہنچ ہی گئے۔ عمر کا یہ حصہ زیادہ تر لہو و لعب اور انتہائی شرارت میں بسر ہوا

فاضل اور عالم لوگ تھے لیکن افسوس ہے کہ استقلال کے ساتھ کام نہ ہوا

بقیہ صفحہ ماقبل۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر معلموں کے ذریعہ اور کچھ مکاتب میں ہوئی
۱۸۶۵ء میں اپنے باپ سے انگریزی بھی شروع کی۔ مگر اسی سال ان کا انتقال ہو جانے کی
وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ان کے والد ریاست چرکھاری میں بسلسلۂ
روزگار رہتے تھے۔ باپ کی موت نے طبیعت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ پہلا اثر یہ ہوا
کہ علم کا شوق ہو گیا۔ اور آخرکار اس شوق نے اس درجہ اور مرتبہ پر پہنچایا کہ مولانا کے علم
و فضل، کمال و فنون و اوصاف کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، قانون،
منطق، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، نجوم، جفر، طب، ڈاکٹری، کیمیا، فارسی، سریانی،
عبرانی، فرانسیسی، لاطینی، جرمنی، انگریزی وغیرہ کے ماہر تھے، کسیقدر ترکی بھی جانتے
تھے۔ علم سیاست کو خوب سمجھتے تھے۔ ہزارہا شعر عربی، فارسی، اردو، انگریزی کے یاد تھے
شہسوار تھے۔ گھوڑے کو خوب پہچانتے تھے اور نہایت اچھا علاج کرتے تھے۔ تیر، نیزہ، تلوار
بندوق خوب لگاتے تھے۔ تیراک بھی اچھے تھے۔ لیزم خوب ہلاتے تھے۔ بنوٹ اور پانک
خوب جانتے تھے۔ علی مدد اور رستم خانی خوب پھینکتے تھے۔ بلبل کو خوب پالتے، خوب پہچانتے
اور خوب علاج کرتے تھے۔ فن طباخی اور رکابداری میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ابتدائے
عمر میں اپنے چچا کے ساتھ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ علوم کی تحصیل و تکمیل میں آپ نے
بہت سی سختیاں برداشت کیں۔ مہینوں دال اور روٹی کے سوا اور کچھ نہ کھایا۔ سال بھر
سے زیادہ ایک صندوق پر سوئے جس پر پاؤں نہ پھیلتے تھے۔ والد کے ترکہ میں سے مبلغ
تین ہزار روپیہ آپ کو ملا تھا جو ایک شخص نے تجارت میں لگا کر صہ ماہوار نفع دینے
کے اقرار سے لیا اور پھر خورد برد کر دیا۔ آپ نے مطلقانہ طور پر لکھنؤ میں قیام کر کے
تحصیل علم کی۔ اور علوم مشرقی سے فراغت پا کر تلاش معاش چرکھاری پہنچے اور
چند روز کے بعد چھاؤنی نیا گاؤں میں راجکمار کالج کے ہیڈ مولوی بمشاہرہ صہ ماہوار مقرر ہو گئے

اور رسالہ کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ بلگرامی صاحب نے نواب سر وقار الامرا بہادر

بقیہ صفحہ ما قبل اسی ملازمت کے زمانہ میں آپ نے انگریزی شروع کی اور کافی استعداد بہم پہنچالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولٹیکل ایجنٹ نے ان کی قابلیت وغیرہ کا اندازہ کر کے اپنا میر منشی بنالیا اس عہدہ پر پہنچکر سید صاحب نے اپنی دیانت اور قابلیت کا سکہ اچھی طرح صاحب ایجنٹ کے دل پر بٹھادیا۔ اسی اثنا میں ریاست **باونی** کی سپرنٹنڈنٹی خالی ہوئی۔ اور مارچ سنہ ۱۸۸۱ء میں سید صاحب وہاں کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوگئے۔ سپرنٹنڈنٹی ریاست کے زمانہ میں سید صاحب کو عملی طور پر اپنے جوہر دکھلانے کا موقع ملا اور فرائض منصبی کو اس خوبصورتی ایمانداری، آزادی سے انجام دیا کہ سنہ ۱۸۸۳ء میں جب **باونی** کا چارج ولیعہد ریاست کو ملا تو صاحب ایجنٹ گورنر جنرل بہادر سنٹرل انڈیا نے گورنمنٹ آف انڈیا کی منظوری سے ریاست نرسنگہ گڈھ میں انکو دیوان مقرر کرایا۔ یہاں ان کی خدمات سے راجہ پرتاپ سنگھ بہادر فرمانروائے وقت بہت خوش رہے اور سنہ ۱۸۸۶ء میں جب راجہ صاحب نے انگلستان کا سفر کیا تو سید صاحب کو بھی ہمراہ لے گئے اور واپسی کے وقت بیرسٹری کی تعلیم کے لیے سید صاحب کو وہیں چھوڑ آئے۔ علاوہ قانونی تعلیم کے، سید صاحب نے وہیں جرمنی زبان حاصل کی اور جب کامیاب ہوکر واپس آئے تو ریاست **اورچھہ** میں مدار المہام ہوگئے۔ مگر چند روز بعد وہاں سے قطع تعلق کرکے نومبر سنہ ۱۸۹۰ء میں بیرسٹری شروع کی۔ الہ آباد ہائیکورٹ میں سید محمود جج تھے ان سے میل جول بڑھا اور سنہ ۱۸۹۱ء میں ان کی تحریک سے علی گڑھ کالج میں قانون کے پروفیسر ہوگئے اور سنہ ۱۸۹۶ء تک اپنے فرائض انجام دینے کے بعد، اس عہدہ کے لیے بی اے کی شرط ہو جانے کی وجہ سے کنارہ کش ہو گئے۔ چندے میور سنٹرل کالج الہ آباد میں لا لیکچرر رہے۔ پھر تمام تر توجہ بیرسٹری کی طرف منعطف کردی۔ چونکہ تعلیم نسواں کے دل سے حامی تھے اسلیے کراسویٹ گرل اسکول کے سکرٹری ہوگئے اور اپنے فرائض نہایت مستعدی سے انجام دیئے۔ سلسلہ تصنیفات بھی جاری رکھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں آپ الہ آباد ہائیکورٹ

مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدردان امیر تھے ایک سررشتہ علوم و فنون قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے۔ ڈاکٹر سید علی اس سررشتہ کے نگراں مقرر ہوئے

بقیہ صفحہ ما قبل کی ججی کے اعلیٰ عہدہ پر سرفراز ہوئے؛ اور ۱۹۱۲ء تک بڑی قابلیت سے اپنے اہم فرائض انجام دیتے رہے۔ ججی سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے لکھنؤ میں مستقل اقامت اختیار فرمائی اور بیرسٹری کی پریکٹس قریب بند کر کے تمام وقت قومی خدمت میں صرف کرنے لگے۔ ایک انجمن ''النساء'' بھی آپ کی تحریک سے قائم ہوئی تھی لیکن آپ کا تمام تر وقت مسلم گرلز اسکول لکھنؤ کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ آپ نے تمام عمر میں جس قدر روپیہ کمایا تھا وہ سب مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے دیدیا اور اس کا نام ''سرمایۂ کرامت'' رکھا۔ اس عطیہ کی مقدار دو لاکھ ہے اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اپنے لیے سید صاحب نے کچھ بھی نہیں رکھا، بلکہ اس اعلیٰ ترین ایثار و فیاضی کے بعد عسرت سے بسر کرنے لگے تو اس عطیہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے تعلیم نسواں سے ان کو شغف تھا اور یہ شغف ایسا نتیجہ خیز ہوا کہ مسلمان عورتیں اگر صوبہ جات متحدہ میں تعلیم یافتہ پائی جاتی ہیں یا آئندہ ان میں تعلیم عام ہوگی تو سب مولانا کرامت حسین ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہوگا۔ غرضکہ ایسی کارآمد اور قابل پیروی زندگی بسر کرنے کے بعد یکایک دل کی حرکت بند ہو جانے سے تاریخ ۱۹۔ اپریل سنہ ۱۹۱۷ء اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائے عالم جاودانی ہوئے اور تال کٹورہ کی کربلا میں اندرون احاطہ امام باڑہ مرزا کیوان جاہ دفن کیے گئے۔

افراد کا سسیہ، علم الاخلاق اور الدین والکون آپکی تصنیفات سے ہیں اور قابل مطالعہ ہیں۔

اور انکی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کے لیے کوئی مناسب شخص انھیں نہ ملا تھا لہذا انھوں نے شمس العلماء مولانا شبلی کا انتخاب کیا اور ان کا تقرر خدمت ناظم سررشتہ علوم و فنون پر ہوا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں لیکن یہ سررشتہ ٹوٹ گیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف کو اس کا قائم مقام سمجھنا چاہیے۔

کتب کے ذخیرہ کا شوق مولوی صاحب کو کتابوں کا حد درجہ شوق تھا چنانچہ ایک نہایت عمدہ کتب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں۔ یوں تو تقریباً ہر فن اور علم کی کتاب ہے لیکن خاص کر وہ تمام مطبوعات جو یورپ میں اسلامی علوم و علم ادب پر اس زمانہ میں شائع ہوئی ہیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کی ہیں اور صرف ان کتابوں ہی کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں کے وہ موقت الشیوع رسالے بھی جمع کیے ہیں جن میں اسلامی مباحث پر عمدہ عمدہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اسلامی لٹریچر کا یہ ذخیرہ بہت بیش قدر اور نادر الوجود ہے اور تمام ہندوستان میں کسی دوسری جگہ ایسا بے بہا مجموعہ موجود نہیں۔

مولوی صاحب ہمیشہ نادر الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے چنانچہ کتاب الوصایا لابو حاتم السجستانی کا قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب و امام عبدالقادر بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے تحشیے تھے کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں تھا، فرانس کے کسی عالم نے بغرض طبع طلب کرایا کیونکہ دنیا میں اس کتاب کا اور کوئی نسخہ نہیں ہے جب کتاب کتب خانہ کی الماری سے نکالی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ اسقدر بوسیدہ ہو گئی ہے

کہ فرانس پہنچتے پہنچتے آنا ہو جائے گی تو یہ رائے قرار پائی کہ اس کا فوٹو لے لیا جائے چنانچہ دس کاپیاں بذریعہ فوٹو لی گئیں۔ مولوی صاحب کے ولایت پہنچنے سے چار روز پہلے سب کاپیاں تقسیم ہو چکی تھیں۔ ان کو جب معلوم ہوا تو اس پروفیسر کے پاس پہنچے جس نے فوٹو لیا تھا اور جا کر بمنت اصرار کیا کہ ایک نسخہ مجھے بھی عنایت ہو۔ پروفیسر موصوف نے عذر کیا کہ اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں سوائے ایک کتاب کے جو میرے ذاتی کتب خانہ کے لیے ہے مگر چونکہ آپ مجھ سے زیادہ شائق معلوم ہوتے ہیں لہذا وہ نسخہ آپ کی نذر کرتا ہوں چنانچہ وہ نسخہ ابتک مولوی صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اسکی جلد بھی بہت قیمتی ہے۔

مولوی صاحب نے جمہرۃ اللغہ لابن درید جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پانسو روپیہ میں خریدی۔ ان کے ایک معزز دوست جو حیدر آباد میں ایک اعلیٰ خدمت پر تھے ان سے مستعار لائے اور کچھ عرصہ بعد کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد) میں ڈیڑھ دو ہزار کو فروخت کر دی مولوی صاحب بھول بھال گئے تھے، چار سال بعد جو ایک روز کتب خانہ میں آئے اور اس کتاب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ دیکھنے کے لیے طلب کی تو معلوم ہوا یہ نسخہ تو انھیں کا ہے اور جب اسکے فروخت کی کیفیت سُنی تو بہت رنج ہوا۔ آخر بڑی احتیاط سے اس کی ایک نقل لی اور جب برلن گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی اسے بیحد پسند آئی۔ چونکہ روپیہ کی ضرورت تھی لہذا پندرہ ہزار میں فروخت کر دی۔

تزک بابری کا کامل ترکی نسخہ ابتک دنیا میں کہیں طبع نہیں ہوا اصل ترکی نسخہ ایک سینٹ پیٹرز برگ (حال پیٹرو گراڈ) میں ہے اور دوسرا

فرانس میں لیکن دونوں ناقص ہیں۔ مولوی صاحب نے نزکی تزک کا کامل نسخہ نواب سرسالار جنگ بہادر مرحوم کے کتب خانہ میں دیکھا اور وہ اسے انگلستان جاتے وقت اپنے ساتھ لیتے گئے۔ یورپ کی علمی سوسائٹی میں جب تزک کا ذکر آیا تو مولوی صاحب نے اس قلمی نسخہ کو پیش کیا۔ بعد مقابلہ و تحقیق کے یہ ثابت ہوا کہ سوائے اس نسخے کے باقی جسقدر نسخے دنیا میں اسوقت تک معلوم ہوئے ہیں ناقص ہیں۔ چونکہ تصحیح کے لیے متعدد نسخوں کا ہونا ضروری ہے اور اس میں تاخیر بھی بہت ہے لہذا یہ قرار پایا کہ گب میموریل فنڈ کی طرف سے کل کتاب کا فوٹو لیا جاوے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ تمام کیفیت عکسی نسخے میں درج ہے چونکہ اسی زمانہ میں جاگیر نواب سرسالار جنگ مرحوم محکمہ مالگزاری کی نگرانی میں تھی، بعض حسادنے محکمۂ مالگزاری میں یہ شکایت کردی کہ مولوی سید علی ایک نایاب کتاب کتبخانہ سے لے گئے ہیں ان کو لکھا جاوے یا تو کتاب واپس کریں ورنہ اُن کے وظیفہ سے اسکی قیمت وضع کرلی جاوے۔ چنانچہ محکمۂ مالگزاری کی طرف سے یہی لکھا گیا۔ مولوی صاحب نے اس کے جواب میں اصل نسخہ اور ایک جلد اسکے عکسی نسخے کی معتمد مالگزاری کی خدمت میں بھیجدی اور لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب کا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اسے زندہ کردیا ہے۔

ناتمام علمی کارنامے مولوی صاحب کو ابن عرب شاہ مصنف تاریخ تیموری کی ایک دوسری نادر الوجود کتاب جو مصر کی تاریخ پر مشتمل تھی ولایت میں دستیاب ہوئی۔ انھوں نے اسے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں طبع کرانا شروع کیا لیکن دوران طبع میں وجع مفاصل کا مرض لاحق ہوگیا اور اسی وجہ سے وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ آپ کو اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیل علم کے لیے سہولتیں

پیدا کی جائیں۔ ایک مرتبہ آکی رائے ہوئی کہ حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون
کی ترتیب بدل دی جائے۔ موجودہ کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتاب کتب
کی حروف تہجی پر تقسیم کی گئی ہے۔ اس ترتیب میں یہ خرابی ہے کہ جب تک کوئی پوری
کتاب نہ پڑھے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فلاں مصنف کی اس میں کون کون سی کتابوں
کا ذکر ہے اور کن کن مقامات پر ہے۔ آپ نے یہ تجویز کی تھی کہ کل کتاب کے
مصنفین کو حروف تہجی پر مرتب کیا جائے اور ہر مصنف کے نام کے ذیل میں
اسکی تصانیف لکھدی جائیں کہ جب کوئی کسی مصنف کا تذکرہ دیکھنا چاہے تو اُسکے
حالات اور تصانیف ایک جگہ مل جائیں۔ چنانچہ اس کام کے انجام دینے کے
لیے ایک شخص کو مامور کیا اور تقریباً دس برس تک پندرہ روپیہ ماہانہ خرچ
کرتے رہے لیکن افسوس ہے کہ آپ میں استقلال نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام کبھی
تکمیل کو نہ پہنچا۔

اسی طرح آپ کو آگسٹس فلوجل کے مرتبہ انڈکس قرآن میں ترمیم
کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ عالم موصوف نے ایک جلد میں قرآن مجید کو اصل عربی
میں اور دوسری جلد میں اس کا قیمتی انڈکس یورپ میں شایع کیا ہے جسکے طفیل
میں قرآن پاک کی ہر سورت اور آیت آسانی سے نکل آتی ہے اور جو مصنفین
و مولفین کے لیے نہایت کارآمد و مفید ہے لیکن اس میں ہر آیت اور سورت
کے لیے صرف ہندسوں کا نشان ہے۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ بجائے ہندسوں
کے سورہ کا نام لکھدیں چنانچہ اس طریقہ پر انڈکس مرتب کرلیا گیا تھا اور ارادہ
تھا کہ بیروت میں طبع کراکر کم قیمت پر فروخت کیا جائے لیکن افسوس کہ طبع
کی نوبت نہ آئی۔

اہل علم کی قدر و منزلت آپ اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب

ایسے لوگوں میں سے کوئی ان سے ملنے جاتا تو اس سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں اور اگر اس اثناء میں کوئی بڑا آدمی آجاتا تو اس سے بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ ایک غریب صاحب علم سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے فرزند نواب ولی الدین خاں بہادر تشریف لائے ہیں۔ آپ نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نواب صاحب سے عرض کرو کہ میں ایک عالم سے گفتگو کر رہا ہوں جس کو آپ کی خاطر سے ترک نہیں کر سکتا اگر آپ کو مجھ سے ملنا ایسا ضروری ہے تو دو گھنٹے انتظار فرمائیے، اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد آپ سے ملوں گا۔

اپنے ہمعصروں کی تعریف

یوں تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن آپ اس میں بڑے فیاض تھے، آپ نہ صرف اہل علم کی قدر و منزلت کرتے تھے بلکہ انکے کام کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا حالی کی انکے دل میں بہت وقعت تھی۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ حیات جاوید چھپ چکی ہے اور مولوی عبداللہ خاں صاحب کے پاس کچھ نسخے آئے ہیں تو رات کے آٹھ بجے کتاب منگوائی اور اسی وقت مطالعہ کرنا شروع کیا اور بہت سا حصہ پڑھ ڈالا اور دوسرے دن بغیر ختم کیے نہ چھوڑی۔ ایک روز یہ واقعہ بیان کیا کہ علامہ نولڈکی کی ہشتادسالہ سالگرہ پر اسکے شاگردوں اور مداحوں نے اس کی یادگار میں مختلف علمی رسائل لکھ کر ایک کتاب کی صورت میں طبع کرلے جو ایک ایسے فاضل کی یادگار کے لیے نہایت موزوں اور عمدہ یادگار ہے۔ اسی طرح انھوں نے یہ تجویز کی

کہ ہم لوگوں کو چاہیے کہ مولانا حالی کی علمی خدمات کی شکرگزاری کی یادگار میں ایک ایک رسالہ لکھیں اور خود بھی ایک رسالہ لکھنے کا وعدہ کیا اور مولوی عبدالحق صاحب سے بھی تحریک کی اور اس کتاب کے اخراجات طبع وغیرہ کی خود ذمہ داری لی۔

جس زمانے میں **تمدن ہند** کا ترجمہ کر رہے تھے تو اول صبح کو اٹھ کر چند ورق حیات جاوید کے پڑھ لیتے تھے اسکے بعد ترجمہ شروع کرتے تھے ایک بار حیات جاوید کے پڑھنے کے بعد فرمایا کہ جو لوگ تذکیر و تانیث اور دلی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دور از کار اور فضول بحثوں اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں جب ہماری زبان میں ایسی کتاب موجود ہے جو ہادی اور راہبر کا کام دے سکتی ہے تو پھر ان لاطائل بحثوں میں پڑنا محض تضیع اوقات ہے۔ زبان دلی اور لکھنؤ کی تابع نہیں ہے بلکہ خیالات کی تابع ہے جن لوگوں کے خیالات رکیک ہیں انکی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی۔

آپ مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کو بہت پسند کرتے تھے چنانچہ **تمدن عرب** میں جا بجا آیات قرآنی کا ترجمہ اسی ترجمہ سے لیا ہے۔

ایک روز مولوی عبداللہ صاحب نے جن سے آپ کو بہت خصوصیت تھی آیت استوی علی العرش پڑھی اور کہا کہ مولوی نذیر احمد نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "عرش پر جا براجا" مرحوم پھڑک اٹھے اور کہا کہ **استوی** کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

مولوی سید احمد[۱] کی امداد آپ جب نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے ساتھ شملہ تشریف لے گئے تو مولوی سید احمد

[۱] مولوی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ آپ حافظ مولوی سید عبدالرحمن کے خلف اکبر

مؤلف فرہنگ آصفیہ نے اپنی تالیف ارمغان دہلی کے بعض اجزا پیش کیے

بقیہ صفحہ ماقبل: باپ کی طرف سے حسنی اور ماں کی جانب سے حسینی سید ہیں مولوی صاحب ۸ جنوری سنہ ۱۸۴۶ء کو بمقام دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے اور وہیں ہوش سنبھالا۔ درسی کتابیں بڑے بڑے اساتذہ سے گھر پر اور سررشتۂ تعلیم کی کتابیں مختلف سرکاری مدارس اور نارمل اسکول دہلی میں پڑھیں۔ تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے رہا۔ ایام طالب علمی میں ایک فارسی منظوم **طفلی نامہ** اور ایک انشائے **تقویت الصبیان** بقید ملازمہ اردو میں تصنیف کی چنانچہ یہ انشا اسی زمانہ (سنہ ۱۸۶۸ء) میں دہلی سے شایع ہوئی پھر سنہ ۱۸۶۹ء میں ایک رسالہ **کنز الفوائد** (یعنی مناظرۂ تقدیر و تدبیر) تصنیف کرکے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر گورنمنٹ کی طرف سے دو سو روپیہ کا انعام مرحمت ہوا اور اول مرتبہ سرکاری خرچ سے یہ کتاب چھپکر مشتہر ہوئی سنہ ۱۸۷۱ء میں ایک اور کتاب موسوم بہ **وقائع درانیہ** اردو میں تالیف فرمائی۔ گورنمنٹ نے اس کتاب پر بھی ازراہ قدردانی ڈیڑھ سو روپیہ بطور انعام مرحمت فرمایا۔

اسی زمانہ میں ڈاکٹر **فیلن** کو ایک ماہر زبان کی ضرورت ہوئی جو اس کی لغت انگریزی۔ اُردو کی تدوین میں مدد دے اور اُسنے مولوی صاحب کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ مولوی صاحب کا قیام اسی سلسلہ میں دانا پور تقریبًا سات سال تک رہا۔ اور بعد تکمیل لغت مذکور سنہ ۱۸۸۰ء میں حسب طلب مہاراجہ **الور** ان کا سفرنامہ لکھنے کے لیے چلے گئے۔ چھ مہینے میں سفرنامہ تیار کرکے تنخواہ کے علاوہ معقول انعام لے کر گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کی نائب مترجمی پر لاہور چلے آئے۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامۂ علمی **فرہنگ آصفیہ** ہے۔ اس اُردو لغت کی ابتدا آپ نے سنہ ۱۸۶۸ء میں کی تھی جو سنہ ۱۸۹۲ء میں تکمیل کو پہنچی لیکن چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ آخر نظام حیدرآباد کی دستگیری سے سنہ ۱۹۰۸ء میں بہمہ وجوہ مکمل شائع ہوئی۔

آپ نے اُن کی بہت تعریف کی اور سفارش کر کے ۵۰ وظیفہ مقرر کرا دیا

بقیہ صفحہ ماقبل فرہنگ آصفیہ کی ترتیب و تدوین میں جو انہماک مولوی صاحب کو تھا اُس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ اُن کی اکلوتی بیٹی کا جب انتقال ہوا تو آپ اپنے کام کو چند منٹ کے لیے چھوڑ کر دیکھنے گئے اور واپس آکر پھر اپنا کام شروع کر دیا ایک مرتبہ آتش زدگی سے تمام کتب خانہ اور فرہنگ آصفیہ کی جلدیں آگ کی نذر ہو گئیں۔ دوبارہ گورنمنٹ نظام کی امداد سے یہ کتاب چھپی۔ اسکے علاوہ اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں تعلیم مستورات کے متعلق ان کی تصنیف سے ہیں مثلاً انشائے ہادی النساء، قصہ راحت زمانی، اخلاق النساء، بچوں کا رکھ رکھاؤ طبعی تعلیم، لڑکیوں کا قاعدہ بطرز جدید مع طریقۂ تعلیم، علم اللسان وغیرہ جو شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۸۸۴ء میں سب سے پہلے عورتوں کی خاص زبان میں اخبار النساء انھیں کی کوشش سے جاری ہوا جو کئی برس تک دھوم دھام سے جاری رہکر بند ہو گیا

آپ نے زیادہ تر سرکاری ملازمت کی اور دہلی اور شملہ کے مدرسوں میں مدرسی کرتے رہے۔ بعد ازاں مشن لیکر گسٹ بک کمیٹی میں نظر ثانی کتب کے کام پر مامور ہوئے اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے خانصاحب کا خطاب دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن رہے۔ اُردو کی اعلیٰ قابلیت کے امتحان کے ممتحن تھے

فرہنگ آصفیہ میں ساٹھ ہزار کے قریب لغات، محاورات، مصطلحات، ضرب الامثال وغیرہ موجود ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب نے بھی از راہ قدردانی ۱۹۱۰ء میں پانچسو روپیہ کا انعام اور ہزار روپیہ کی خریداری سے مولف کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

۱۹۰۵ء میں پرنس آف ویلز کی تشریف آوری دہلی کے موقع پر ایک پر تکلف نظم خیر مقدم اور رسالہ رسوم مسلمانان پیش کیا جس کی قبولیت سے شہزادہ نے مفتخر فرمایا۔

دربار ۱۹۱۱ء کے موقع پر آپکے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ آپنے اس رعایت سے اسکا نام دربار احمد رکھا

آپ کا قلم ان تھک تھا بعض رسائل و اخبارات میں بھی آپ مضامین لکھتے رہتے تھے۔ آخر کار ۱۹۱۸ء میں انتقال فرمایا

اور انعام کے لیے خود گزارش لکھکر سرکار میں پیش کی۔ سرکار عالی سے بعد ازاں مؤلف کو گراں قدر انعامات عطا ہوئے۔ مولوی صاحب موصوف پر ایک بار کئی ہزار روپیہ کی ڈگری ہوئی جس سے وہ بہت پریشان تھے انھوں نے آپ کو اطلاع دی آپ نے کل رقم انکے پاس بھجوادی۔

مروت و اخلاق آپ بہت با مروت تھے۔ اگر کوئی شخص اُن سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اسے پوری نہ کرسکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اس شرمندگی میں سب سے مقدم اسکا خیال کرتے اور حتی الامکان اسکی مقصد برآری میں کوشش کرتے۔ یہانتک کہ کتابیں جو انھیں بہت عزیز تھیں انکے دینے میں بھی تامل نہ تھا بشرطیکہ وہ سچا قدردان ہو۔ خاصکر طالبعلموں، اور اہل علم کا بہت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا، مولوی ظفر علی خاں[1] آپ کے یہاں مدعو تھے۔ ۱۲ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی

---

[1] **ولادت اور تعلیم** مولوی ظفر علی خاں بی اے۔ آپ سنہ ۱۲۹۰ ہجری میں کوٹ میرٹھ ایک گمنام گاؤں میں جو تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں ہے پیدا ہوئے مڈل تک وزیر آباد کے مشن ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ اسی دوران میں ان کے والد مولوی سراج الدین احمد صاحب نے ان کو علی گڑھ کالج میں پڑھنے کے لیے بھیجدیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد آپ واپس چلے آئے مڈل کا امتحان وزیر آباد ہی سے پاس کیا اور انٹرنس کے امتحان میں پٹیالہ سے کامیابی حاصل کی۔

کالج کی تعلیم بعد ازاں آپ علی گڑھ کالج میں دوبارہ داخل ہوئے۔ یہاں آپ کو شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ یونین کلب کے جلسوں میں فارسی اور اردو میں کئی دفعہ نظمیں پڑھیں۔ ایک دفعہ کالج میں بہت بڑا جلسہ تھا آپ نے سرسید کی شان میں

مختلف اساتذہ کے شعر سناتے رہے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے

بقیہ صفحہ ماقبل ایک فارسی قصیدہ پڑھا جس کا ایک شعر ذیل میں درج ہے۔

ریاضِ قوم آب از اشک ہائے چشم او گیرد — فلک چشم تو کا ہے دیدہ است ایں باغبانی را

اس چھوٹی سی عمر اور طالب علمی کی زندگی میں یہ برجستہ اشعار پھر فارسی زبان میں۔ سرسید نے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ اور بہت تعریف کی۔ ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ رک گیا اور آپ ملازمت کے لیے کشمیر چلے گئے لیکن دل اچاٹ رہا اور ایک سال کے بعد پھر علی گڑھ میں چلے آئے جہاں سے بی اے کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور کل یونیورسٹی میں چھٹے یا ساتویں نمبر پر پاس ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ نواب محسن الملک بہادر حیدر آباد سے رخصت ہو کر بمبئی میں قیام فرما تھے۔ آپ انکے پرائیوٹ سکرٹری ہو گئے اور ایک سال تک ان کی خدمت میں رہے اُن کے ایماء و ارشاد سے **معرکۂ مذہب و سائنس** کا ترجمہ بھی اسی زمانہ میں کیا اور مسٹر بیلفور کے مضامین کو بھی اُردو کا لباس پہنایا۔

حیدر آباد کی ملازمت اس کے بعد آپ حیدر آباد گئے اور نواب افسر جنگ بہادر سپہ سالار افواج نظام کے حضور میں فوجی خدمات انجام دیتے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ مولوی عزیز مرزا مرحوم کی مردم شناس نگاہوں نے آپ کے جوہر قابلیت کو فوراً تاڑ لیا اور آپ اُن کی وساطت سے ہوم آفس میں مترجمی کے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ جہاں رفتہ رفتہ آپ کونسل کے مستقل رجسٹرار ہو گئے اور ساڑھے ۵۰۰ ماہوار تنخواہ ہو گئی۔ کبھی کبھی بطور قائم مقام آپ اسسٹنٹ ہوم سکرٹری کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ اس عہدہ کی تنخواہ ۰۰۰ روپیہ ماہوار تک تھی۔

آپ نے دورانِ ملازمت ہی میں کئی کتابوں کا ترجمہ کیا اور ترجمہ میں وہ نام پیدا کیا کہ آج ہندوستان میں وہ اپنے فن میں لاثانی سمجھے جاتے ہیں **سیر ظلمات**،

آپ نے اُن کی درخواست پر فوراً کامل میرد کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ

بقیہ صفحۂ ماقبل | جنگل میں منگل، فسانۂ لندن، خیابان فارس، یہ کتابیں آپ نے ترجمہ کی ہیں جو بلحاظ ترجمہ نہایت خوب ہیں۔

حیدرآباد میں ۱۹۰۲ء میں آپ نے فسانہ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ بعدازاں دکن ریویو کے نام سے دوسرا رسالہ شایع کیا جو ایک خالص علمی اور ادبی رسالہ تھا۔ آپ نے فن شعر میں نواب فصیح الملک بہادر مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام سے پنجابیت کی بو نہیں آتی۔

حیدرآباد سے واپسی | زمانہ قیام حیدرآباد ہی میں آپ نے متعدد انگریزی مضامین تحریر فرمائے۔ اور اردو اخبارات میں بھی نقاش کے نام سے نہایت شوخ اور ظریفانہ پیرایہ میں اکثر مضامین لکھے۔ آخرکار اکتوبر ۱۹۰۹ء میں آپ حیدرآباد سے ایک سازش کے الزام میں روانہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ حیدرآباد کا یہ اختصاص اب تک چلا آتا ہے کہ جن لوگوں کو ریاست بدر کیا جاتا ہے ان کو تھوڑی بہت پنشن حسن خدمت کے صلہ میں دیجاتی ہے چنانچہ آپ کو بھی ما عہ ۵۰ ماہوار ملتے ہیں۔

اخبار زمیندار کی اڈیٹری | حیدرآباد سے اپنے وطن مالوف میں آئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا اور آپ کسی ماہوار انگریزی رسالہ کے اجراء کی فکر میں تھے کہ آپ کے والد منشی سراج الدین احمد صاحب اڈیٹر اخبار زمیندار کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے تمام ارادے اور منصوبے ختم ہو گئے اور آپ نے آخر دسمبر ۱۹۱۰ء میں اخبار زمیندار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس وقت اس کی اشاعت سات سو تک رہ گئی تھی۔ قریب سوا سال کے کرم آباد ہی میں قیام رہا۔ اور اس دوران میں اردو کی خدمت کے لیے بریلی، لکھنؤ، لاہور اور دیگر مقامات پر نہایت زور شور کے لکچر دیے۔ جن سے ان کی شہرت اور ان کے اخبار کو خاصی ترقی ہوئی۔ لاہور چونکہ دارالاخبار اور ہر قسم کی سوسائٹیوں کا مرکز تھا اس لیے

جس کی قیمت ستر روپیہ ہے مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالب علم

بقیہ صفحۂ ماقبل مئی سنہ ۱۹۱۱ء میں لاہور آ گئے۔ اسوقت زمیندار کی اشاعت بارہ سو تک تھی آپ نے اسکی پالیسی میں تبدیلی کی اور عام مقاصد اخبارات کو اختیار کیا چنانچہ صرف پانچ مہینہ میں اخبار کی اشاعت دو ہزار تک پہونچ گئی۔ اسی دوران میں ٹرکی اور اٹلی میں جنگ چھڑ گئی آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھکر ۵۔ اکتوبر کو زمیندار کا روزانہ اڈیشن بھی جاری کر دیا جو آجتک کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور جسکی اشاعت چار ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔

ٹرکی کو چندہ روانہ کرنا ستمبر سنہ ۱۹۱۲ء تک یعنی صرف ایک سال کے عرصہ میں آپنے پچپن ہزار روپیہ سے زیادہ چندہ جمع کرکے ٹرکی کو روانہ کیا۔

پنجاب ریویو آپ نے روزانہ اخبار کے اجراء سے پہلے ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ بنام پنجاب ریویو بھی نکالا تھا لیکن ایک سال کے بعد یہ مفید اور نہایت عمدہ رسالہ کم فرصتی اور عدم توجہی کی نذر ہوگیا

مسئلہ خلافت و سوراج آپنے اخبار زمیندار میں ہمیشہ سخت اور زوردار مضامین لکھے سب سے پہلے مارچ سنہ ۱۹۱۲ء میں اخبار زمیندار کی دو ہزار روپے کی ضمانت ہوگئی۔ پبلک نے یہ زر ضمانت ادا کیا بعد ازاں دس ہزار روپے کی ضمانت ہوئی اور اسکو بھی پبلک نے ادا کیا الغرض کئی مرتبہ اخبار زمیندار کی ضمانت ہوئی لیکن پرچہ برابر نکلتا رہا۔ جب سنہ ۱۹۱۹ء میں **پنجاب مظالم** کی وجہ سے عموماً ہندوستانیوں کو بعض انگریزی حکام سے نفرت ہوگئی اور معاملہ روز بروز بڑھتا گیا تو آپنے بھی مسئلہ خلافت اور سوراج میں بہت حصہ لیا چنانچہ آپ پر مقدمۂ بغاوت چلایا گیا اور آپ کو قید کی سزا ہوئی اس سے پیشتر عرصہ تک نظر بند رہے اور بعد ازاں چھوڑ دیے گئے۔ اسوقت آپ کی نسبت مشہور ہو گیا تھا کہ آپ نے گورنمنٹ سے ساز کر لیا ہے لیکن آپ نے اس بات کو غلط ثابت کرنے کے لیے قید میں جانا پسند کیا اور آپ کو کئی سال کی سزا ہوئی اب رہائی پانے کے بعد زمیندار کی اڈیٹری خود اپنے ہاتھ میں لیکر قومی خدمت انجام دینی شروع کر دی ہے۔

جو خود کتابوں کا شوقین ہے اہل علم کی درخواست رد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ ۱۳۱۳ ہجری میں جب سر سید آخر بار حیدر آباد تشریف لائے اور بشیر باغ میں سرکار عالی کے مہمان ہو کر فروکش ہوئے تو چونکہ آپ کو اپنے کتب خانے کی نادر کتب کے دکھلانے کا شوق تھا، سر سید کو اپنے مکان پر لے گئے اور کتابیں دکھانا شروع کیں منجملہ دیگر کتب ایک بیش بہا کتاب ایسی تھی کہ اس میں اول سے آخر تک اسپین کی اسلامی عمارات کے نقشے اور بہت عمدہ تصویریں تھیں سر سید نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ کالج کی لائبریری میں رہے تاکہ مسلمان اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں آپ نے کہا بیشک اسی قابل ہے اور چلتے وقت وہ نسخہ سر سید کی گاڑی میں رکھ دیا۔

آپ نے رد المنطق لابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کروا کر مولوی شبلی کی نذر کی تھی۔ انگلستان پہنچکر آپ نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہے آپ وہ نسخہ بھجوا دیجیے۔ مولانا اپنی عادت کے موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سست لکھا بلکہ یہ تک تحریر فرمایا کہ چونکہ یہ کتاب آپ کے خرچ سے نقل ہوئی تھی اس لیے آپ طلب کرتے ہیں۔ آپ نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا یہ جواب دیا کہ پانسو روپیہ کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیں۔ چنانچہ اس کے بعد جب مولانا شبلی سرکار عالی کی درخواست پر دار العلوم کے نصاب تعلیم کے مرتب کرنے کے لیے حیدر آباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے مارے آپ سے ملے نہیں لیکن کتب خانے کے جلسۂ انتظامی میں اتفاق سے جب مڈبھیڑ ہو گئی تو آپ اسی خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا۔

اہل علم کی میزبانی

جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو انکی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ انکا مہمان ہو چنانچہ مولانا شبلی جب حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی محمد عزیز مرزا[1] کے مہمان ہوئے آپ کو جب دوسرے روز اطلاع ہوئی تو فوراً آپہونچے اور اپنے گھر لیگئے

[1] مولوی محمد عزیز مرزا دہلوی ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۵ء میں جب آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر نے علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج قائم فرمایا تو دس سال کے سن میں آپ طلاب اولیں کے ساتھ داخل کالج ہوئے اور بارہ سال کی محنت کے بعد انگریزی ادب اور تاریخ میں آنرز کا درجہ حاصل کر کے بی۔ اے۔ ہوئے۔ اس وقت ہندوستان میں یہ پہلے مسلمان تھے جس نے یہ اعزاز پایا۔ اردو انشا پردازی سے مرزا صاحب کو زمانہ تعلیم ہی میں بیحد ذوق تھا۔ مگر تحصیل علم کی مصروفیت پورے طور پر متوجہ ہونے کا موقع نہ دیتی تھی لیکن جب کالج چھوڑ کر مرزا صاحب ریاست حیدرآباد میں ملازم ہوگئے تو باوجود قسم وارانہ اہم مصروفیتوں کے انھوں نے اپنی لٹریری دلچسپیوں کو مزید ترقی دی اور بقول نواب وقار الملک بہادر "مرزا صاحب کو جو کامیابیاں سلطنت دکن کے کاموں میں ہوئیں، اُن میں اُن کی لٹریری قابلیت کو بہت دخل تھا!" مرزا صاحب کی ابتدائی خدمات ہی ریاست میں بہت اہم تھیں وہ **سکریٹریٹ ڈیپارٹمنٹ** میں رازداری کی خدمات پر مامور کیے گئے اور اس اعتماد کو اس درجہ انھوں نے قائم رکھا کہ بجز خاص اعلیٰ ارکین سلطنت اُنکے فرائض کی اہمیت و نزاکت کا کسی کو علم بھی نہ ہوا چنانچہ اسی حسن کارگزاری کی بدولت ۱۸۹۱ء میں اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کا عہدہ اُن کو دیا گیا۔ اور چند روز بعد **کورٹ آف وارڈس** کا کام بھی آپ سے متعلق ہوگیا۔ یہ بات خاص طور سے قابل تذکرہ ہے کہ جب اس خدمت کا **الاؤنس** تین سو روپیہ ماہوار آپ کو دیا گیا تو آپ نے نہایت عالی ظرفی سے یہ کہکر کہ میں تجویز کی

لیکن جب مولانا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اُٹھ گئے تو آپ کو بہت رنج ہوا

بقیہ صفحۂ ماقبل مال سے اپنا پیٹ بھرنا نہیں چاہتا انکار کر دیا اور کسی معاوضہ کے بغیر

کورٹ کا کام بھی پوری سرگرمی سے انجام دیا۔ ۱۸۹۵ء میں آپ فرسٹ اسسٹنٹ ہوم سکرٹری کے عہدہ پر ترقی پا گئے اور ۱۸۹۶ء میں ہوم سکرٹری بنا دیے گئے۔ یہ ایک ذمہ دارانہ اور اہم خدمت تھی جس کے باعث انتظامات ریاست کا بڑا حصہ آپ کے ہاتھ میں آگیا۔ اور مرزا صاحب کو ہر صیغہ میں اصلاحیں کرنے کا موقع ملا۔ نواب سر وقار الامرا مدار المہام انہی وجوہ سے آپ کو بہت عزیز رکھنے لگے اور جملہ کاموں میں ان کو اپنا مشیر بنا لیا۔ اس زمانہ میں مرزا صاحب نے اپنے علمی ذوق کے اثر سے بہت سے مصنفین کو فائدہ پہنچایا۔ مشہور عام کتاب **بوزالف ولیو** کا انگریزی سے اور **صباحۃ الطرب** کا ترجمہ عربی سے مرزا صاحب کی تحریک و سرپرستی میں ہوا۔ **رئین گنی** صاحب کی **جورسپروڈنس** بھی انہیں کی توجہ سے اردو میں ترجمہ کی گئی۔ اسی طرح اور بھی متعدد کتب کی تالیف و اشاعت کا سبب مرزا صاحب کی شخصیت ہوئی ۱۹۰۰ء میں ضلع بیٹر کی کلکٹری پر بھیج دیے گئے یہ کام اگرچہ آپ کے لیے بالکل نیا تھا مگر محنت اور توجہ سے بہترین طور پر اسے انجام دیا اور پرانے الجھے کام کو شبانہ روز کی مصروفیت میں طے کر ڈالا۔ انتظامی معاملات میں حسن تدبیر ایسا دکھلایا کہ بیٹر جیسے غیر متمدن ضلع میں طاعون و قحط کی بلاؤں کے نزول کے وقت بھی رعایا آپ کی شکر گزار رہی۔ آپ کی توجہ سے غربا کے لیے ایک سرائے پختہ اور معززین کے لیے ایک اقامت گاہ تیار ہوئی صنعت و حرفت کا مدرسہ کھلا۔ کلب قائم ہوا۔ کتب خانہ کی بنیاد پڑی۔ اور لوگوں میں اس درجہ ذوق تعلیم پیدا ہوا کہ بعض طلبا علیگڑھ کالج میں وہاں سے آکر داخل ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں آپ کا تبادلہ ناندیر کی کلکٹری پر ہو گیا۔ وہاں صرف ڈھائی مہینے تک رہے۔ مگر اس قلیل مدت میں بھی پرانا کام نکالنے کے علاوہ پبلک کاموں میں بہت کچھ حصہ لیا۔ کلب کی توسیع کی۔ اس میں **بلیرڈ روم** بنوایا۔ اور شہر سے اسٹیشن تک ایک عظیم الشان

اور یہ رنج اُن کے خطوط سے صاف مترشح ہوتا ہے۔

بقیہ صفحہ ماقبل بازار کی بنیاد ڈالی مگر جلد ہی اعلیٰ ترقی پر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

سنہ ۱۹۰ء میں آپ حیدرآباد ہائیکورٹ کی ججی پر ممتاز ہوئے۔ اور سال بھر تک وہاں اپنے فرائض کو قابل تعریف طور پر انجام دینے کے بعد پھر آپ ہوم سکریٹری ہو گئے۔ اور صیغۂ تعلیمات و عدالت میں بہت سی اصلاحیں کیں۔ اسی زمانہ میں علوم شرقیہ کی تعلیم کا نصاب، سرکاری طور پر مولانا شبلی سے آپ ہی نے مرتب کرایا تھا۔ کمیٹی کتب خانہ آصفیہ ایجوکیشنل بورڈ۔ کمیٹی انتظام دائرۃ المعارف۔ نظام کلب وغیرہ کے آپ پریسیڈنٹ رہے اور ہمیشہ مستعدی سے کام کیا۔ فرنچ زبان سے کتاب ابن الرشید وابن رشد اور تاریخ اسپین کا ترجمہ آپ ہی نے اُردو میں کرایا۔ آپ کا ذاتی کتب خانہ بھی کافی وسیع تھا۔ کتب بینی کبھی ناغہ نہیں ہوتی تھی۔ نظام اوقات میں بہت باقاعدہ تھے۔ نواب محسن الملک کے سفرنامہ انگلستان کا اُردو ترجمہ گلگشت فرنگ کے نام سے اس خوبصورتی سے کیا کہ اصل تصنیف کا خیال ہوتا ہے۔ اسکے بعد سیرۃ المحمود جیسی بہترین کتاب لکھی۔ مرہٹی اور سنسکرت زبان سیکھ کر کالیداس کے ڈراما وکرم اروسی کو خود اردو کا لباس پہنایا۔ بالآخر ستمبر سنہ ۱۹۰ء میں وظیفہ پر سرکار آصفیہ کی خدمت سے سبکدوش ہوئے تو علیگڑھ آکر نواب وقار الملک سکرٹری علیگڑھ کالج کے دست و بازو بنگئے۔ اور مارچ سنہ ۱۹۱ء میں مسلم لیگ کے سکرٹری منتخب ہو جانے کی وجہ سے لکھنؤ میں اقامت گزیں ہوئے مسلم لیگ کے سکرٹری کی حیثیت سے جیسی محنت شاقہ برداشت کر کے آپ نے ملک و قوم کی خدمت کی ہے اور جس ایثار و قربانی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثالیں ہمارے سیاسی طبقہ میں کم نظر آتی ہیں۔ سلسلۂ تصنیف و تالیف اس حالت میں بھی جاری رہا۔

آپ میں ہمدردی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا سیلاب حیدرآباد کے زمانہ میں آپ نے عوام کے لیے اسقدر زحمتیں برداشت کی تھیں کہ بیمار ہو گئے۔ گورنمنٹ برطانیہ

دوستوں کی امداد آپ اپنے دوستوں کو مدد دینے اور ان کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وہ کسی رکاوٹ یا مشکل کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات حیرت انگیز کام کر جاتے تھے چنانچہ منجملہ دیگر واقعات کے ہم ایک واقعہ کا یہاں ذکر کرتے ہیں۔ آپ کے والد مولوی سید زین الدین خاں صاحب کی عمر کا اکثر حصہ پٹنہ میں صرف ہوا تھا، اور مولوی خدا بخش خاں صاحب کے آپ کے والد اور آپ سے بہت تعلقات تھے ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مولوی خدا بخش خاں کسی مقدمہ میں وکیل ہو کر حیدرآباد تشریف لائے اور دیرینہ تعلقات کی وجہ سے آپ ہی کے مکان پر ٹھہرے۔ انھیں ایام میں ایکبار انھوں نے آپ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ برٹش انڈیا میں درجہ دوم کا وکیل ہوں۔ اگر آپ کی سعی سے سرکار عالی مجھے وکالت درجۂ اول کی سند عطا کر دے تو میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ آپ نے نہایت خوشی سے اس مقدور بھر کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرے ہی روز وہ میر افضل حسین صاحب میر مجلس عدالت العالیہ (چیف جسٹس ہائیکورٹ) کے یہاں پہنچے اور بہت منت

بقیہ صفحۂ ماقبل ــ سے اس خدمت خلق اللہ کے صلہ میں آپ کو اول درجہ کا تمغۂ قیصر ہند ۱۹۰۹ء میں عطا ہوا تھا۔ مسلم لیگ اور علی گڑھ کالج کے کاموں میں آپ نے جو بے نظیر انہماک دکھلایا وہ اُن کی صحت پر بھی اندر ہی اندر اثر ڈالتا رہا۔ آخر زمانہ میں آپ کی تندرستی خراب ہو چلی تھی کہ ۲۶ فروری ۱۹۱۲ء کو ۱۱ بجے دن کے وقت درد گردہ کے عارضہ سے انتقال فرما گئے۔ آپ کی تصنیفات **خیالات عزیز** (جو آپ کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اور نواب وقار الملک مرحوم کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا ہے) اور **وکرم اروسی** دونوں مشہور و معروف ہیں۔

اور لجاجت سے اظہار مطلب کیا اور کہا کہ مولوی صاحب ہمارے والد کے
دوست اور ہمارے بزرگ ہیں اگر آپ کی عنایت سے اُن کا یہ کام نکل جائے
جو کوئی بڑی بات نہیں، تو مجھپر بڑا احسان ہوگا۔ مگر میر صاحب نے کچھ ایسا غیر متوقع
اور دل شکن جواب دیا کہ اسکے بعد آپ نے مولوی خدا بخش کا ان سے تعارف
کرانا بھی پسند نہ کیا اور بغیر ملائے ساتھ واپس لے گئے۔ جب رستے میں تمام واقعہ
مولوی صاحب سے بیان کیا تو مولوی صاحب کو بے انتہا رنج اور مایوسی ہوئی
آپ نے کہا آپ دل شکستہ اور مایوس نہوں، اگر میر افضل حسین صاحب نے سند
نہیں دی تو کچھ مضائقہ نہیں، انشاء اللہ اب ہم کوشش کرینگے کہ آپ خود
میر مجلس ہو جائیں اور دوسروں کو سندیں عطا کریں۔ چنانچہ آپ نے جان توڑ کے
کوشش کی اور آخر مولوی خدا بخش خاں کو میر مجلس کرا کے رہے۔

علمی کام اور تجارت میں امداد آپ کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی علمی کام یا تجارت
کے لیے روپیہ طلب کرتا تو وہ حتی الامکان بڑی خوشی سے
اُسکی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک صحاف نے
ان سے آکر کہا کہ مجھے آپ کوئی کتاب جلد باندھنے کے لیے دیجیے۔ آپ نے ایک
کتاب دی اور کہا اگر تم عمدہ جلد باندھوگے تو ہم تمھیں اور کام دینگے۔ جب وہ
جلد باندھ کے لے گیا تو آپ نے بہت پسند فرمائی اور اُسکے کام کی تعریف کی
صحاف نے کہا سرکار یہ کیا کام ہے افسوس سامان نہیں، اگر میرے پاس
سامان ہوتا تو پھر آپ میرا کام دیکھتے آپ نے فوراً اسے دو ہزار روپیہ کا
سامان اور ضروری مشینیں منگوا دیں۔
مطبع شمسی (حیدرآباد) بھی اسی قبیل سے ہے اور آپ کے فیض کی یادگار ہے
کبھی کبھی آپ طالبعلموں کی بھی اسی طرح مدد کرتے رہتے تھے۔

مرحوم کے خیالات دربارۂ مذہب

آپ اگرچہ شیعہ خاندان سے اور شیعہ والدین کی اولاد تھے اور اسی سے شیعہ بھی سمجھے جاتے تھے لیکن تعصب سے بالکل بری تھے اور شیعہ سنی کی تفریق کو بہت بڑا خیال کرتے تھے۔ حالانکہ آپ کا کتب خانہ نہایت وسیع تھا، عجیب بات ہے کہ اس میں شیعہ مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔ چنانچہ جب آپ کتب خانہ دیکھنے کے لیے رام پور گئے تو نواب صاحب رامپور سے بھی کتب خانہ کے متعلق ذکر آیا۔

نواب رامپور سے گفتگو

نواب صاحب نے کسی قدر فخر سے فرمایا کہ "ہم نے وہ کام کیا جو ہمارے اجداد نے نہیں کیا تھا یعنی اس کتب خانہ میں سنی مذہب کی کتابیں تو جمع تھیں ہی، لیکن ہم نے مذہب شیعہ کی کتب بھی جمع کی ہیں خصوصاً **ملا محمد باقر مجلسی** کی بحار الانوار کی ۲۵ جلدیں جو حال ہی میں طہران میں طبع ہوئی ہیں ہم نے منگائی ہیں"۔ آپ نے فرمایا "شیعوں کی مذہبی کتب محض بیکار ہیں اور ہرگز قابل استدلال نہیں جب بخاری و مسلم جیسی کتابیں جنکے متعلق بے انتہا چھان بین کی گئی ہے اسقام و اغلاط سے بری نہیں ہیں تو ملا باقر کی کتاب کس شمار میں ہے"۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ "اور کچھ نہیں تو اتنا تو ضرور ہے کہ اہل بیت نبوی کے فضائل جو سنیوں نے خصوصاً **بخاری و مسلم** کے جامعین نے قلم انداز کر دیے ہیں وہ اس میں درج ہیں"۔ آپ نے کہا "یہ بھی ایک مہمل بات ہے، نبی روحانی و اخلاقی اصلاح کے لیے مبعوث ہوا تھا نہ کہ اپنے اہل بیت کے محامد بیان کرنے کے لیے۔ ایک معمولی تمیز دار شریف آدمی بھی اپنے اہل بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کو خلاف آداب سمجھتا ہے، نبی کا درجہ اس سے بہت ارفع تھا ان سے ایسی باتوں کا سرزد ہونا خلاف قیاس ہے"۔

مذہب کی نسبت خیالات

ایک روز آپ نے فرمایا کہ کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی جو پڑھا لکھا اور عالم شخص تھا میں نے پوچھا "تم حضرت عمر سے کیوں عداوت رکھتے ہو" ایرانی عالم نے جواب دیا "ہم حضرت علی کی پیروی کرتے ہیں" اس پر میں نے کہا کہ حضرت عمر اور حضرت علی میں کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی جیسا کہ آپ لوگوں کا خیال ہے تو وہ اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے کبھی نہ کرتے" ایرانی نے تعجب سے پوچھا "اس واقعہ کی تصدیق کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے" مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے فوراً تاریخ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی جو کہ شیعہ مذہب کا عالم ہے لاکر دکھائی۔ یہ کتاب یورپ میں طبع ہوئی ہے اور جس کے دیباچہ میں مصنف کے شیعہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہے۔ ایرانی عالم اس کتاب اور واقعہ کو دیکھکر تائب ہو گیا اور عہد کیا کہ آیندہ کبھی حضرت عمر کو برا نہ کہوں گا اور تعجب کیا کہ ہمارے لوگ ان باتوں کو کیوں چھپاتے ہیں۔

قیام بلدہ حیدرآباد میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا، ایک روز مولوی عبدالحی صاحب، مولوی عبداللہ خانصاحب اور ظہیرالدین فرزند مولوی بشیرالدین احمد صاحب آپ کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک بڑے شیعہ مولوی صاحب تشریف لائے۔ آپ نے عبداللہ خاں سے کہا کہ الیعقوبی کی تاریخ جلد دوم تو اندر سے لیکر آؤ۔ جب وہ کتاب لیکر آئے تو انھوں نے پوچھا کہ آپ اس میں کیا ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں آپ نے انکے ہاتھ سے کتاب لیکر ایک مقام پڑھکر سنانی شروع کی۔ یہ وہی مقام تھا جس کا اوپر ذکر ہوا اس کے بعد شیعہ عالم سے مخاطب ہوکر کہا کہ "آج کئی روز سے ہم میں اور ہماری

بیوی میں بحث ہو رہی ہے، وہ میری اس بات کو قبول نہیں کرتیں کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے ہوا اور اسقدر مہر مقرر ہوا تھا، اور ان سے ایک بیٹا مسمی زید پیدا ہوا تھا! اسپر حاضرین جلسہ میں سے ایک صاحب نے کہا کہ علماے شیعہ اس واقعہ کے منکر نہیں ہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جبر و اکراہ کا نکاح تھا۔ آپ نے نہایت تعجب سے کہا کہ "یہ خیال نہایت جاہلانہ اور ذلیل ہے، دنیا میں کوئی ایسی طاقت تھی کہ وہ فاطمہ کی لڑکی کو علی سے چھین سکے یا اس سے زبردستی نکاح کرے؟" آخر مولوی صاحب خفیف سے ہو کے رہ گئے اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ خلفاے اربعہ کے مناقشات اور خانگی جھگڑوں کے متعلق آپ کی کیا راے ہے آپ نے فرمایا کہ خلفاے اربعہ میں کوئی ذاتی عداوت یا دشمنی تو تھی نہیں، اگر تھی تو اتنی جتنی ہم میں اور مولوی عزیز مرزا صاحب۔ مثلاً اگر کوئی جگہ خالی ہو اور اسکے لیے مولوی عزیز مرزا بھی کوشش کریں اور ہم بھی تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم دونوں میں دشمنی یا عناد ہے اگر اس مقام یا موجودہ ملازمت سے قطع تعلق کرنے کے بعد دوسری جگہ چلے جائیں تو ہم لوگوں میں کوئی دشمنی نہ ہو گی، اور اپنے حق کے لیے کوشش کرنا کوئی دشمنی کی بات نہیں ہے۔

شیعہ سنی کے جھگڑے کے متعلق انکی یہ راے تھی کہ یہ پولٹیکل جھگڑا ہے انکے پاس ایک عالم جرمن کی کتاب بھی تھی جس میں اسنے اسپر خوب بحث کی ہے آپ کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کردیں۔ لیکن افسوس کہ یہ خیال عمل میں نہ آیا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ایک معزز ممبر نے انھیں لکھا کہ میرا ارادہ ہے

کہ آپ کا نام اب کی سالانہ جلسہ کی صدارت کے لیے تجویز کر دوں اور مجھے توقع ہے کہ سب ممبر اسے خوشی خوشی قبول کر لینگے۔ آپ کے انتخاب کے لیے تین بڑے وجوہ ہیں۔ اول آپ شیعہ ہیں، دوسرے عالم ہیں، تیسرے صاحب مال و جاہ ہیں آپ نے جواب میں لکھا کہ جو وجوہ آپ نے میرے انتخاب کے لیے لکھے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اس لیے کہ آپ کا فرمانا ہے کہ میں عالم ہوں یہ غلط ہے، میری حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میں مالدار ہوں یہ بھی صحیح نہیں، البتہ اتنا ہے کہ فراغت سے کھا پی لیتا ہوں۔ تیسرے یہ کہ میں شیعہ ہوں۔ یہ صحیح ہے لیکن میں اسنا عشری کا شیعہ ہوں اس سے آگے بڑھنے کی میں نے ذرا بھی کوشش نہیں کی ہے۔ علاوہ اسکے میں اس قسم کی کانفرنسوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جبکہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے اور اسی لیے میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا پریسیڈنٹ ہونا بھی پسند نہیں کرتا"

لطیفہ ایک روز شمس العلماء مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعوں کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے کیوں عداوت ہے۔ حالانکہ انھوں نے شیعوں کے رد وغیرہ میں کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ آپ نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے اور بہت سے اسباب ہیں۔ اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی ان سے دشمنی ہوتی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیونکر۔ فرمایا کہ آدھی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادر کی نذر و نیاز کرتی ہے اور اٹھتے بیٹھتے ان کا نام لیتی ہے اگر یہ شخص نہ ہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے۔ اگر اسی طرح آپ کی آدھی سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں"

مذکورۂ بالا واقعات سے آپ کے مذہبی خیالات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے

زیادہ تصریح کی حاجت نہیں۔ آپ صحیح بخاری کے بڑے مداح اور قدردان تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہدایہ کے بھی وہ بہت ثناخواں تھے اور جس قدر مختلف نسخے انکے پاس بکنے آتے وہ خوشی خوشی انھیں خریدتے تھے حالانکہ متعدد نسخے موجود تھے۔

غیرت وحمیت قومی اگرچہ آپ تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت وحمیت قومی ان میں ضرور تھی اور اسلام وپیغمبر اسلام پر دل سے یقین کرتے تھے مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ قیام انگلستان میں وہ اکثر ہندوستانی اور دیگر بلاد عثمانی کے طلبہ اور مقیم اصحاب کی دعوتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کنگ ایڈورڈ ہفتم کے باڈی گارڈ کو دعوت دینے کا خیال کیا اور بذریعہ ٹیلیفون ان سے دریافت کیا۔ اُنکے افسر نے نہایت خوشی کے ساتھ دعوت قبول کی اور کہا کہ یہ تو ہمارے لیے بڑی عزت وفخر کی بات ہے کہ عالم سید نے ہماری دعوت کی ہے۔ دعوت کے دو گھنٹے پہلے اس افسر نے ٹیلیفون کے ذریعہ سے پوچھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مولوی صاحب کو جو ہمارے ساتھ ہیں لیتے آئیں کیونکہ ہم لوگ جاہل ہیں آپ سے کیا باتیں کرینگے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ ایک نہیں بلکہ جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لاسکتے ہیں۔ ہندوستان کے ان مسلمانوں سے تعارف پیدا کرانے کے لیے ترکی اور ایرانی قونصلوں کو بھی دعوت دی اور اس بے تکلفی کی وجہ سے کسی انگریز کو دعوت میں نہ بلایا۔ شام کے وقت جب سب لوگ کھانے کی میز پر آئے تو باڈی گارڈ والوں کے مولوی صاحب نے جو غالبًا پنجابی تھے کہا کہ کھانے سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ کے پاس گوشت کہاں سے آیا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ اس سے آپ کا کیا مقصد ہے مولوی صاحب

نے کہا لندن میں کہیں حلال گوشت نہیں ملتا سب حرام ہوتا ہے اسلیے میں نے
یہ عہد کیا ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے ذبح نہ کروں گا کبھی گوشت نہ کھاؤں گا۔
آپ نے غصے سے تلخ لہجے میں جواب دیا کہ افسوس آپ جاہل ہیں اور دین اسلام
سے بالکل بے خبر اور نا واقف ہیں ایک مسلمان کے دستر خوان پر آپ کو اس قسم کے
فاسد خیالات و شبہات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیا آپ کو لا تجسسو کا قول
یاد نہیں ہے؟ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ حضرت عمر جب غیر قوموں کے ساتھ
معاہدہ کرتے تھے تو منجملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ جو مسلمان وہاں
وارد ہو اسکی تین دن تک دعوت کریں۔ کیا ان مسلمان مسافروں کے لیے مسلمان
ذبح کرتے تھے یا مسلمان باورچی ہوتے تھے؟ کیا آپ کو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے
کہ جب تک کسی شے کے حرام ہونے کا علم نہو اسے حلال سمجھنا چاہیے"۔ چونکہ یہ
گفتگو آپ نے کسی قدر تلخ اور درشت لہجے میں کی تھی اور سوائے ہندوستانیوں
کے دوسرے اسے سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے باقی لوگ حیرت سے آپ کا منھ
تک رہے تھے۔ آخر ترکی قونصل نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ آپ نے سارا قصہ
دہرایا اور کہا کہ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کا نمونہ ہے اس سے آپ ان کی اخلاقی
حالت کا اندازہ کر لیجیے۔ یہاں یوروپینوں نے اول ہی میرا دم ناک میں کر رکھا
ہے کوئی پوچھتا ہے "تمہارے مذہب میں پردہ کیوں ہے؟ کوئی کہتا ہے" تمہارے
پیغمبر نے تعدد زوجات کی اجازت کیوں دی ہے؟ کوئی سوال کرتا ہے" تمہارے
نبی نے عورتوں کے مارنے کا کیوں حکم دیا ہے؟ ان اعتراضات اور سوالات
کا جواب دیتے دیتے ہم تنگ آ گئے ہیں اور پھر جب یہ مولوی صاحب اور انکے
ہم خیال یہاں کی سوسائٹی میں رہکر اس قسم کی رکیک باتیں کرتے ہیں تو مسلمانوں
کے متعلق غیر قوموں کے خیالات کیا ہوں گے۔ ایسے شخص کے دہریلے خیالات کا

اثر تمام قوم اور ملک پر پڑتا ہے۔ ترکی قونصل نے کہا اگر واقعی ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے تو نہایت قابل افسوس ہے۔ جب اہل فوج کو یہ معلوم ہوا کہ اُن کے مولوی صاحب نے سید صاحب کی دل آزاری کی ہے اور انھیں رنج پہنچایا ہے تو ان سب نے بالاتفاق مولوی صاحب سے یہ کہا کہ وہ سید صاحب کے قدموں پر گریں اور معافی مانگیں ورنہ ہم اپنی جماعت سے خارج کر دینگے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اٹھ کر معافی مانگی اور آپ نے خندہ پیشانی سے معاف کر دیا اور جب رخصت ہونے لگے تو مولوی صاحب کے گلے لگایا اور الٹی معافی مانگی اور سو روپیہ کا چک انکی نذر کیا اور یہ نصیحت کی کہ ایسے شخصی اور ذاتی خیالات سے ملک و قوم بدنام ہوتے ہیں۔ آیندہ کبھی کسی سوسائٹی میں ایسی گفتگو نہ فرمائیے گا ورنہ تمام ہندوستان کے مسلمان غیر قوموں کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے۔

بعض امور پر اُن کی ذاتی رائے

آپ ہندوستان کے مروجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ نیز ان لوگوں کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدد ازدواجات کے حامی تھے۔ پارسی قوم کی نسبت آپ کا خیال تھا کہ یہ قوم پچاس سال میں فنا ہو جائے گی کیونکہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں۔

مزاح

آپ کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں جبکہ وہ تمدن ہند کا ترجمہ کر رہے تھے انھوں نے اپنے ایک دوست کو وہ باب سنانا شروع کیا جس میں ڈراوڑی قوم کا (جو ہندوستان کی ایک وحشی قوم تھی) ذکر تھا۔ جب آپ پڑھنا ختم کر چکے تو اس دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ قوم اب بھی باقی ہے؟ اتفاق سے اسوقت ایک مولوی صاحب جو آپ سے ملنے

سے کے لیے آئے تھے پاس ہی بیٹھے تھے۔ آپ نے اشارہ سے بتایا کہ یہ حضرت اُسی قوم کی یادگار ہیں۔

مولوی محمد سورتی نے جو عربی زبان کے مستند عالم اور قدیم کتب کے شوقین ہیں آپ سے ایک کتاب بغرض نقل مستعار طلب کی، کتاب بھی نادر، آپ کو دینے میں تامل تھا مگر مروت کے مارے صاف صاف انکار بھی نہ کر سکتے تھے۔ کتاب نکال کر لائے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیدی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بے شک نہایت عمدہ ہے مگر اس کی جلد سُوئر کے چمڑے کی ہے مولوی صاحب نے یہ سنتے ہی فوراً لاحول ولاقوۃ کہہ کر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔

ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے مجاوروں نے موٹی اسامی سمجھ کر آگھیرا، آپ نے جب یہ دیکھا تو کہا بھئی مجھے کیوں گھیرتے ہو میں تو وہابی ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ سب چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

آپ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور انکے آداب و تکلفات کو مہمل سمجھتے تھے وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حب جاہ و مال میں منہمک رہتی ہے اور اسے صرف روپیہ کمانا اور اس کا صرف کرنا آتا ہے اور باقی کسی دوسری بات کی پروا نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

آخر عمر کا کارنامہ

زندگی کے آخر زمانہ میں آپ کو بعض وجوہ سے حیدرآباد دکن کا قیام ترک کرنا پڑا جسکا ان کو بہت رنج ہوا لیکن جب وہاں سے آکر پھر دہلی میں قیام کیا (جہاں انھوں نے ایک بڑا مکان اپنے رہنے کے لیے خرید لیا تھا) اور پھر وہاں سے مدرستہ العلوم مسلمانان علیگڑھ میں آنے جانے لگے اور قوم کی خدمت میں وقت صرف ہونے لگا تو اسوقت آنکھیں کھلیں

اور معلوم ہوا کہ کام کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ اس سے پہلے عمر عزیز بے کار بکھیڑوں اور تفریح میں گزاری، زندگی کا لطف اب آئے گا تھوڑے ہی عرصہ بعد یونیورسٹی کا مسئلہ چھڑ گیا جس میں انھوں نے بڑے شوق اور جوش سے کام شروع کیا اور یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب بھی انھیں کے تفویض ہوئی جس کے لیے وہ خاص طور پر موزوں تھے اس میں انھوں نے بڑی محنت کی اور قابل قدر کام کیا۔ افسوس ہے کہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت وہ زندہ نہ تھے ورنہ وہ وائس چانسلرشپ کے قابل تھے اور ان کے زیر اہتمام یونیورسٹی کہیں سے کہیں جا پہنچتی آخر وہ وقت جو اگرچہ معین نہیں ہے مگر کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتا آگیا اور بے وقت اجل سر پر آن پہنچی اور دفعتہً ہردوئی میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے بتاریخ ۲۰ مئی سنہ ۱۹۱۱ء انتقال ہو گیا۔ اور قوم کا ایک برگزیدہ فرد اٹھ گیا۔

حبّ دولت وجاہ اور بعض خصائل

مولوی صاحب علاوہ عالم و فاضل ہونے کے متعدد زبانوں کے ماہر تھے اور افسوس کہ اب قوم میں کوئی شخص ان کا جانشین نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ پر حبّ دولت وجاہ غالب تھی لیکن جب روپیہ ان کے پاس آتا تو اس کے دینے میں بھی وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک اور چلتے پرزے ہوتے یا اشاعت شہرت میں مدد دیتے تھے۔ آپ علما اور طالب علموں کی قدر کرتے تھے اور خواہ ان کی دنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہوں ان سے بڑی مروت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کی صحبت سے خوش ہوتے تھے۔ اکثر ان کے ہاں علمی تذکرے اور چرچے رہتے تھے ان کی مہمان نوازی دیکھ کر عربوں کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی

ہندا ور غیر ممالک کے سیاح اور علماء کے لیے ان کا عالیشان مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ حق میزبانی ادا کرتے تھے۔ جب دیکھیے اُنکے مکان پر کوئی نہ کوئی ہندی، انگریز، فرانسیسی، جاپانی، امریکن، ترکی یا مصری سیاح یا عالم نظر آتا تھا، دوسروں کی بھلائی اور مقصد برآری کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بے کسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے۔ نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دستگیری کرنا فرض ہے چنانچہ ایک زمانے میں محکمہ تعمیرات و معدنیات اور ریلوے میں سب کے سب یوروپین، یوریشین اور دیسی عیسائی تھے مسلمان اکا دکا نظر آتے تھے لیکن جب آپ کا تقرر اس عہدے پر ہوا تو مسلمان رفتہ رفتہ داخل ہونے شروع ہوئے اور اب معاملہ بالکل برعکس ہے۔ آپ کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی چنانچہ جب وہ حیدرآباد سے وظیفہ لیکر انگلستان گئے تو وہ بھی انکے شریک سفر تھیں۔ جس زمانہ میں مولانا شبلی، آپ کے ہاں مہمان تھے تو ایک روز فرمانے لگے کہ میں اس کا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ الٹا میں آپکا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی، مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے، آپ کو معلوم ہے کہ میری ایک بیوی ہے اور پھر بھی میں اسے نو مہینے چھوڑ کر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ آپ میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ آپ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حُبِّ جاہ میں بعض ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو انکی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں خفا ہو جانے کے بعد پھر ملتے تو بالکل صاف ہو جاتے تھے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ ان میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔ آپ اگر اپنے فضل و کمال

سے کام لیتے تو بہت بڑے آدمی ہوتے اور اگر مولوی ذکاء اللہ صاحب کی طرح صرف دو گھنٹے روزانہ بلاناغہ تصنیف و تالیف کتب کی نذر کر دیتے تو آپ کی کتابیں بھی تعداد میں مولوی ذکاء اللہ صاحب سے کم نہ رہتیں اور بلحاظ اہمیت تو یقیناً بہت بالا ہوتیں۔ مولوی صاحب کے بڑے بڑے ارادے تھے لیکن افسوس کہ بہت سی کتابیں ناتمام رہ گئیں جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ترجمہ پر رائے ترجمہ نہایت صاف اور شستہ زبان میں کیا گیا ہے اگر ہم مولوی صاحب کی دونوں مشہور کتابوں کو بلالحاظ اس امر کے کہ یہ ترجمہ ہیں یا اصل پڑھیں تو ہرگز یہ خیال نہ پیدا ہوگا کہ یہ ترجمہ ہیں اور نہ کوئی سبب ایسا واقع ہوگا جس سے مطالعہ کی گاڑی میں روڑا اٹکے اور کتابوں کے ترجمہ ہونے کا خیال ہو۔ بلکہ لطف یہ ہے کہ باوجود اس امر کے جاننے کے کہ یہ کتابیں فرانسیسی زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں اکثر دوران مطالعہ میں مولوی صاحب کے مصنف ہونے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ مولوی صاحب نے کس قدر تبحر علمی سے کام لیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہرگز یہ کتابیں ترجمہ نہیں معلوم ہوتیں اور یہی خوبیِ ترجمہ سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

آپ کی تحریر کا انداز صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ مواقع کے مناسب عمدہ اور موزوں الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے مطلب کی خوبی دلنشیں ہو جاتی ہے بے شک بعض عربی الفاظ ثقیل بھی آ جاتے ہیں لیکن بعض لمبے جملوں کو ایک لفظ میں بیان کرنا عربی تراکیب ہی سے ممکن تھا اس لیے اسے اختیار کیا گیا۔

اگرچہ ہماری زبان میں آپ کی حیثیت تالیف و تصنیف سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ محض ترجمہ سے ہوئی ہے لیکن آپ کے تراجم تصنیف اور تالیف کے ہم پلہ

ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا ذکر خیر مصنفین کے زمرہ میں کرنا لازمی اور ضروری تھا
اب آپ کی کتابوں سے مختصر اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے۔

(از تمدن عرب)

عربوں کی علمی تحقیقات کے طریقے

کتب خانہ، علمی تحقیقات کے کارخانے اور آلات، تعلیم و تحقیق کے لازمی وسائل ہیں۔ لیکن یہ محض وسائل ہی ہیں اور ان کا بکار آمد ہونا محض ان کے طریقۂ استعمال پر موقوف ہے۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کا دماغ، دوسروں کے علوم و فنون سے بھرا ہوا ہو، مگر اس میں خود تحقیق یا اختراع کا مادہ ہی نہ ہو، اور وہ شاگردی کی حالت سے استادی کی حالت کو پہنچ ہی نہ سکے۔ ان ایجادوں اور اختراعوں سے جن کا ذکر آگے آئے گا، معلوم ہوگا کہ عربوں نے اس علم سے جو انھوں نے دوسروں سے اخذ کیا کس قدر کام لیا۔ یہاں ہم محض ان اصول کا بیان کرینگے جن پر انھوں نے اپنی علمی تحقیق کا مدار رکھا۔

یونانیوں کی شاگردی کرنے اور ان کی تصنیفات کو پڑھنے کے بعد انہیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ تجربہ اور مشاہدہ کو عمدہ سے عمدہ کتاب پر ترجیح ہے۔ اگرچہ یہ قول اسوقت ایک قضیہ مسلّمہ ہے لیکن پہلے ایسا نہ تھا۔ زمانہ متوسط کے علماء نے ایک ہزار برس کی محنت میں اس مسئلہ کو سمجھا۔ تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کے مقابل میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا عموماً **بیکن** کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس وقت تسلیم کرنا چاہیے کہ اس کے موجد عرب تھے کل محققین یورپ علی الخصوص ہمبولڈ جنھوں نے عربی تصنیفات کو دیکھا ہے اب اس امر کے قائل ہیں **ہمبولڈ** اس لکھنے کے بعد کہ علمی ترقی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے

کہ انسان خود اپنے ارادہ سے یعنی نہ ریعہ تجربہ حوادث طبیعیہ کو پیدا کرسکے بطور تمثیل لکھتا ہے عربوں نے یہ درجہ جس سے متقدمین بالکل ناواقف تھے حاصل کرلیا"

موسیو سدی یو لکھتے ہیں "دارالعلوم بغداد کی تعلیم میں بہت بڑی بات یہ ہے کہ اس کی طرز استدلال بالکل علمی اصول پر مبنی تھی یعنی معلوم کے ذریعے سے غیر معلوم کو دریافت کرنا۔ حوادث کا درست مشاہدہ کرکے ان معلومات کے ذریعہ سے علل کو نکالنا۔ ان ہی قضایا کو ماننا جو تجربہ سے ثابت ہوچکے ہوں یہ ان اساتذہ کے اصول تحقیق تھے۔ نویں صدی عیسوی کے عربوں کو یہ پرنتائج طریقہ معلوم تھا جو سالہاسال دراز کے بعد ہمارے حال کے محققین کے ہاتوں میں بڑی بڑی انکشافات اور ایجادوں کا آلہ بن گیا"

عربوں کا طریقہ تحقیق، تجربہ و مشاہدہ تھا۔ برخلاف اس کے زمانہ متوسط کے یورپ کا طریقہ اساتذہ کے کلام کو پڑھنا اور ان ہی کی رایوں کو بار بار بیان کرنا تھا۔ ان دونوں میں بہت ہی اصولی فرق ہے اور بلا اس فرق کو مد نظر رکھے ہوئے ہم عربوں کی علمی تحقیقات کی پوری قدر نہیں کرسکتے۔

پس عربوں ہی نے علمی تحقیقات میں تجربہ کو داخل کیا۔ اور ایک زمانۂ دراز تک صرف عرب ہی تھے۔ جو اس طریقہ کی قدر جانتے تھے **موسیو ڈیلامبر** اپنی **تاریخ ہیئت** میں لکھتے ہیں کہ "اگر یونانیوں میں بہ مشکل دو یا تین اجرام سماوی کے مشاہدہ کرنے والے تھے تو عربوں میں برخلاف اسکے بہ کثرت ایسے لوگ موجود تھے۔ یونانیوں میں **علم کیمیا** کا تجربہ کرنے والا کوئی نہ تھا، برخلاف اسکے عربوں میں سیکڑوں تھے"

تجربہ کے طریقہ نے ان کی تحقیقات میں ایک صحت اور جدت پیدا کردی تھی جو ان اشخاص کی تحقیقات میں نہیں پائی جاتی جو حوادث کو کتابوں

ہی میں دیکھتے ہیں۔ البتہ ایک ہی علم یعنی علم فلسفہ میں جس میں تجربہ ممکن نہ تھا وہ محض مقلد رہے۔ تجربہ کے ذریعے سے جس کو انھوں نے جاری کیا تھا وہ بہت بڑے انکشافات اور اختراعات کرنے والے تھے اور جو بیان اُن کی علمی تحقیقات کا ہم نے اس کتاب میں درج کیا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے تین یا چار صدیوں میں اس سے بہت زیادہ انکشافات کیے جو محققین یونان اس سے کہیں زیادہ مدت میں کرنے پائے تھے، وہ یونان کا علمی ذخیرہ جس کو شرقیوں نے عربوں سے پہلے پایا تھا لیکن مدت سے کھو چکے تھے۔ اُسے عربوں نے بالکل بدل کر اپنے اخلاف کو پہنچایا۔

عربوں نے محض انکشافات ہی کے ذریعے سے علم کو ترقی نہیں دی بلکہ انھوں نے اپنے دارالعلوموں اور تصنیفوں کے ذریعے سے اس کی اشاعت بھی کی۔ اس خاص امر میں جو فائدہ یورپ کو ان سے ہوا وہ فی الواقع غیر متناہی ہے۔ ہماری کتاب کے اس باب میں جہاں عربوں کے علمی اثر کا ذکر ہے معلوم ہوگا کہ چند صدیوں تک اقوام عیسائی کے استاد صرف عرب ہی تھے اور محض ان ہی کے ذریعے سے انھیں یونان و روم کے علوم قدیمہ حاصل ہوئے۔ وہ زمانہ بہت ہی قریب کا ہے جب سے عربی کتابوں کے ترجمے ہمارے دارالعلوموں کی نصاب تعلیمی سے خارج ہو گئے ہیں"

عربوں کے علمی و ادبی معلومات کے ماخذ

جس وقت عربوں نے اپنی فتوحات شروع کیں دو پرانے تمدن یعنی تمدن ایران اور تمدن حکومت مشرقی کے چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ اس نئی دنیا سے جس میں پیروان اسلام نے قدم رکھا وہ نہایت ہی متاثر ہوئے اور

بہت جلد اس دنیا کے علوم و فنون و ادب کو اسی مستعدی کے ساتھ تحقیق کرنے لگے، جس مستعدی سے انھوں نے ملک کو فتح کیا تھا خلفائے اسلام نے حکومت کو مستحکم کرنے کے بعد ہی کل بڑے بڑے شہروں میں تعلیم و تربیت کے مرکز قائم کیے اور کل ایسے علماء کو جو مشہور تصانیف علی الخصوص تصانیف یونان کا ترجمہ کر سکتے تھے جمع کیا۔

خاص اسباب کی وجہ سے ان علماء کا جمع ہو جانا آسان ہو گیا تھا ایک مدت دراز سے یونان و روم کے علوم و فنون، ایران و شام میں پھیل گئے تھے۔ جس وقت نسطوری پادری حکومت مشرقی سے نکالے گئے تو انھوں نے عراق عرب میں مقام اڈیسا پر ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ذریعہ سے علوم یونانی کی اشاعت ایشیا میں ہونے لگی۔ جب زینو ایساری نے اڈیسا کو غارت کیا، اس وقت ان علماء کو ملوک ساسانیہ نے اپنے دربار میں بلا لیا۔ اور اس کے بعد ہی جب جسٹینین نے ایتھنس اور اسکندریہ کے مدارس کو بند کر دیا، یہاں کے اساتذہ نے کتب یونانی کو جن میں ارسطو اور جالینوس اور ڈیاس کریڈس کی تصنیفات شامل تھیں سریانی اور کلدی وغیرہ مشرقی زبانوں میں جو اس وقت بہت مروج تھیں ترجمہ کیا۔

جب عربوں نے ایران و شام پر قبضہ کیا تو انھیں وہاں ان علوم یونان کے ذخیرہ کا ایک حصہ ملا۔ عربوں نے ان سریانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرایا اور جن تصنیفات کا ترجمہ اس وقت تک نہیں ہوا تھا وہ بھی بہت جلد عربی زبان میں آگئیں اور علوم و ادب کی تحصیل نہایت مستعدی سے شروع ہو گئی۔

عربوں نے بہت دنوں تراجم پر اکتفا نہ کی۔ اکثر نے اُن میں سے تصنیفات قدیمہ علمی بالخصوص یونانی تصنیفات کا اصلی زبان میں پڑھنا اسی طرح سیکھا جیسے انھوں نے کئی صدی بعد اندلس میں زبان لاطینی اور قسطلی سیکھی۔ اسکوریل کے کتب خانہ میں اس وقت عربی یونانی، عربی لاطینی اور عربی اسپینی لغات موجود ہیں جن کے مؤلف مسلمان تھے اس ابتدائی زمانہ تعلیم میں جسے اس وقت سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو طالب العلم مدارس میں علوم زمانہ ماضیہ کی تحصیل میں صرف کرتا ہے۔ ہر ایک عرب کی تعلیم ان ہی علوم یونانی ولاطینی کی تحصیل پر مبنی تھی پس عربوں کے پہلے استاد یونانی تھے۔ لیکن خود ان کی طبائع میں اس قدر جدت خیال اور تحصیل علم کا ولولہ تھا کہ انھوں نے بہت دنوں اس محض شاگردی کی حالت پر جو یورپ کے لیے ازمنہ متوسطہ میں کافی سمجھی گئی تھی قناعت نہ کی اور وہ اس محدود دائرہ مقامات سے بہت جلد باہر نکل آئے۔

عربوں نے جو ستعدی تحصیل علم میں ظاہر کی وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے۔ اس خاص امر میں بہت سی اقوام اُن کے برابر ہوئی ہیں لیکن بمشکل کوئی ان سے بازی لے جا سکی۔ جب وہ کسی شہر کو لیتے تو ان کا پہلا کام وہاں مسجد اور مدرسہ بنانا ہوا کرتا۔ بڑے شہروں میں ان کے مدارس ہمیشہ بکثرت ہوتے تھے۔ **بنجمن ڈی تو دیل** جو ۱۱۷۳ء میں مرا ہے بیان کرتا ہے کہ اُسنے اسکندریہ میں بیس مدرسے دیکھے۔

علاوہ عام مدارس تعلیمی کے **بغداد، قاہرہ، طلیطلہ قرطبہ** وغیرہ بڑے شہروں میں دارالعلوم تھے جن میں علمی تحقیقات کے کارخانے، رصدخانے، عظیم الشان کتب خانے، غرض کل مصالحہ

علمی تحقیقات کا موجود تھا صرف اندلس میں ستر عام کتب خانے تھے۔
مورخین عرب کے اقوال کے بموجب الحاکم ثانی کے کتبخانہ میں جو قرطبہ میں تھا چھ لاکھ جلدیں تھیں جن میں سے چالیس جلدوں میں صرف فہرست کتب تھی۔ اس کے متعلق کسی نے بہت درست کہا ہے کہ چار سو برس بعد چارلس عاقل نے فرانس کے شاہی کتب خانہ کی بنیاد ڈالی تو وہ نو سو جلدوں سے زیادہ نہ جمع کر سکا اور ان میں سے کتب مذہبی کی ایک پوری الماری بھی نہ تھی۔

ترجمہ نہایت خوب ہے۔ اصل کا گمان ہوتا ہے۔

(از تمدن ہند)

تمدن کے ابتدائی مدارج

(سواحل ملابار کے باشندے نائر وغیرہ)

تمدن کے ابتدائی مدارج ہند کی مختلف اقوام میں اسوقت وہ نظامات اور تمدنی مدارج موجود ہیں، جن کو متمدن اقوام مدت سے قطع کر کے اپنی موجودہ حالت پر پہنچی ہیں۔ اس برعظم کی اقوام پر نظر ڈالنے سے ہمیں وہ کل مدارج ملتے ہیں، جو ہمارے آباؤ اجداد طے کر چکے ہیں۔

نائر ملابار کے نائروں میں بعض ایسی رسمیں موجود ہیں جو یورپ سے بالکل مفقود ہو گئیں اور جن کا پتہ صرف ہماری کتابوں میں رہ گیا ہے مثلاً ان میں خاندان کا دارومدار ماں پر ہے۔ جو یورپ میں بھی ابتدائی زمانہ تاریخی میں تھا۔

امیت تاریخی تحقیقات سے جن کا ذکر ہم نے اپنی دوسری تصنیف میں کیا ہے، اس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ جب انسان اپنی وحشی حالت سے نکل کر تمدن کے میدان میں آیا، تو اس ابتدائی حالت معاشرت میں کسی ایک قوم کی کل عورتیں، کل مردوں کی مالک ہوا کرتی تھیں، اور بچے جو ان سے پیدا ہوتے، وہ بھی کل قوم کی ملک تھے اسکے بعد امیت یعنی مادری خاندان کی بنا پڑی جس کی رو سے بچے ماں کی ملک ٹھہرائے گئے، اور ماں کی جائداد کے وارث قرار دیے گئے۔ یہ اس عام ملکیت کے مقابل میں ایک بہت بڑی ترقی تھی، کیونکہ شخصی ملکیت عمومی ملکیت سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

نائروں کی حکومت ایک فرانسیسی فرانسوا پیرار سترھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ملابار آیا تھا اور اس نے جو کچھ بیان نائروں کا لکھا ہے، وہ کم و بیش اس وقت تک ان کی حالت سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ نائر ایک بہادر اور جنگ جو قوم ہے، اور ان میں اسی قسم کا مردانہ اخلاق ہے، جیسا یورپ میں ازمنہ متوسطہ میں تھا، یہ بالکل نڈر اور غیرت مند قوم ہے انھیں اپنی عزت کا بے انتہا خیال ہے، اور ان میں عورتوں کی حرمت اعلیٰ درجہ کی ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں نائروں کی ایک بڑی حکومت تھی اور یہ متمول قوم تھی پیرار لکھتا ہے کہ کیا لیکٹ کا زاموران ہندوستان کے بڑے حکمرانوں میں سے ہے، اور اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ نائروں کی فوج ہے۔

نائروں کے اوصاف جسمانی لحاظ سے نائر ایک حسین قوم ہیں

ان کا قد بلند، جسم سڈول، ہاتھ پیر خوبصورت، اور رنگ صاف ہے۔ نائر کے لفظ کے معنی مالک کے ہیں، اور یہ فی الواقع ساحل ملابار کے امرا اور حاکم قوم ہیں۔ برہمنوں نے صرف تھوڑے دنوں ان پر حکومت کی اور انھوں نے بہت جلد اپنے کو آزاد کر لیا۔ اس وقت برہمنوں کی مذہبی حکومت بھی نائروں پر بہت کم ہے۔ ملابار کے برہمن آریہ نہیں ہیں اور نہ شمال کے آریہ برہمنوں کی برابر سمجھے جاتے ہیں۔ خود نائر جو اپنے کو کھتری کہتے ہیں، ہندوؤں کے نزدیک شودر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی نائر اپنی ہمسایہ اقوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمسایہ تیر کی قوم ہے، جو اصل میں نائروں سے زیادہ خالص ہیں، اور ان کا رنگ بھی زیادہ صاف ہے۔ علاوہ ان کے موپلوں (موپلا) کی قوم ہے جو عرب ملاحوں کی اولاد اور مسلمان ہیں۔ یہ نہایت بہادر ہیں اور اکثر نائروں سے لڑتے رہتے ہیں۔

خاندان خاندان کی بنیاد کا امیت پر ہونا ایک ایسی رسم ہے جو اعلیٰ متمدن اقوام سے بالکل مفقود ہو گئی ہے، اور اب بہت ہی کم اقوام میں باقی ہے۔ ہند میں یہ رسم آسام کے کاسیاؤں میں جن کا ذکر ہو چکا اور ملابار کے نائروں میں پائی جاتی ہے۔ وحشی اقوام میں شادی کوئی چیز نہیں بلکہ قوم کی کل عورتیں کل مردوں کی ملک ہیں۔ امیت کی رسم اس سے ایک درجہ اوپر ہے اور اس میں ایک عورت کے متعدد شوہر ہوتے ہیں، اور خاندان کی مالک عورت ہوتی ہے۔

شادی نائروں میں شادی کثرت البعول کی قسم کی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادی کی رسمیں اس وقت قرار دی گئیں

جب برہمن ان پر غالب ہو چکے تھے۔ شروع میں تو ایک عورت کا ایک ہی شوہر ہوتا ہے، لیکن شادی کی مدت محدود ہوتی ہے۔ شوہر اپنی بی بی کے گلے میں ایک ہار ڈال دیتا ہے، اور جب تک عورت اس ہار کو پہنے رہے شادی قائم رہتی ہے، تھوڑے دنوں کے بعد پہلا شوہر کچھ دیکر رخصت کر دیا جاتا ہے، اور دوسرے اشخاص اس کی جگہ لیتے ہیں۔ یعنی عورت تمام قوم کی ملک نہیں ہوتی، بلکہ صرف چند اشخاص کی، لیکن اس شرط سے کہ وہ خود ان کو انتخاب کرے، اور ان سے بچے، اور ان کی تعداد دس بارہ شخص سے زیادہ نہ ہو نائر عورت جو اپنے بھائیوں کے ہمراہ رہتی ہے، پہلی شادی ہونے کے بعد ہی اپنے مختلف شوہروں کو یکے بعد دیگرے بلا کر گھر میں رکھتی ہے، اور جو شوہر برسر کار ہوتا ہے، وہ اپنا جھرہ بطور علامت کے دروازہ پر گاڑ دیتا ہے۔ ایسی شادی سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ اپنی ماں کے نام سے کہلاتے ہیں، کیونکہ باپ ان کا نا معلوم ہوتا ہے۔

خاندان کی حکومت نائروں میں خاندان کی حکومت پوری طرح عورت کے ہاتھ میں ہے، اور وہ اس کام میں اپنی بڑی بیٹی سے مدد لیتی ہے۔ جو مرد ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں، اس کے بھائی اور بیٹے ہیں۔ بچوں کو جو اپنی ماں اور اس کے بھائیوں میں پلتے ہیں، ماموں کے ساتھ ویسی ہی محبت ہو جاتی ہے جیسی دوسری اقوام میں اولاد کو باپ کے ساتھ ہوتی ہے۔ بھائی بہنوں میں بھی ہمیشہ ساتھ رہنے کی وجہ سے بڑی محبت ہو جاتی ہے، جو ہرگز زن و شو میں نہیں ہو سکتی، کیونکہ شوہر اپنی بی بی کے ساتھ کبھی زیادہ دنوں نہیں رہ سکتا۔ آسانی سے سمجھ میں آئے گا کہ اس انتظام کی رو سے خاندان میں اول درجہ عورت کا ہے، اور اس کے بعد

اسکے بھائیوں کا۔ شوہر کا درجہ نہایت کم ہے، کیونکہ اس کا تعلق عارضی اور چند روزہ ہوتا ہے۔ عورت ہمیشہ اسی مرد کو انتخاب کرتی ہے جو مضبوط اور حسین ہو۔ اس کو پورا حق اس بات کا ہے کہ جس کو چاہے اپنا شوہر بنالے بشرطیکہ وہ شخص نیچی ذات کا نہو، کیونکہ ایسی صورت میں اس کی عزت میں فرق آتا ہے۔ یہ ہنگامی شوہر زیادہ تر برہمن ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان کی ذات اعلیٰ ہے۔ یہ گھر گھر پھرتے ہیں اور اپنی قیمتی نسل کو نذر کرکے قوم کا درجہ بلند کر دیتے ہیں۔

مردوں کی آزادی

نائروں میں مردوں کو ویسی ہی آزادی ہے جیسی عورتوں کو، یعنی جس طرح عورتیں کثیرۃ البعول ہیں ویسے ہی مرد کثیر الازواج ہوتے ہیں۔ البتہ جو اشخاص مفلس ہیں، وہ زیادہ بیبیاں نہیں رکھ سکتے، بلکہ کئی بھائی یا کئی اشخاص مل کر ایک عورت کے شوہر بن جاتے ہیں۔

کثرت البعول کی رسم

کثرت البعول کی رسم ہندوستان کے دوسرے خطوں میں بھی پائی جاتی ہے اقصائے شمال کی طرف تبت میں اور اقصائے جنوب کی طرف مدورا میں یہ رسم موجود ہے کثرت البعول کی رسم جو ہمیں اس قدر نفرت انگیز معلوم ہوتی ہے، فی الواقع نہایت قدیم رسم ہے، اور مہابھارت میں پانچوں پانڈو جو آپس میں بھائی ہیں ایک ہی عورت سے جس کا نام دروپدی ہے اور جس کی آنکھیں کنو[illegible] ہیں شادی کرتے ہیں۔

ارث

جب کوئی نائر مرتا ہے، تو اس کی اولاد وارث نہیں ہوتی، بلکہ اس کی بہن کی اولاد، مادری جائداد لڑکی اور اس کی لڑکی کو پہنچتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ٹراونکور کے راج میں ہوا کرتا تھا۔ بھائی اپنی ماں کی نگرانی میں جائداد کا انتظام کر سکتے ہیں لیکن قانوناً انھیں اس میں کوئی ملکیت کا حق نہیں ہوتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتہیتی خاندان نائروں کی جبلی اور خاص حالت سے خاص مناسبت رکھتا ہے کیونکہ اس ملک میں قدیم سے جاری ہے۔ اگرچہ مسلمان اور عیسائی اس ساحل پر سالہائے دراز سے بسے ہوئے ہیں، ان کا کوئی اثر اس رسم پر نہیں پڑا ہے۔

تمدن ہند کا ترجمہ بھی خوب کیا گیا ہے مستغنی عن التعریف ہے۔

شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی[1]

ولادت وحسب ونسب آپ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۲ھ مطابق ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء بروز سہ شنبہ پیدا ہوئے۔ مقام ولادت موضع ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور ہے۔ لیکن وہ یہاں بہت کم رہے ہیں کیونکہ انکے والد مولوی سعادت علی صاحب خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے بجنور چلے آئے تھے اور اکثر وہیں رہا کرتے تھے۔ مولوی سعادت علی صاحب شاہ عبدالغفور اعظم پوری کی اولاد میں تھے۔ یہ بزرگ شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے مرید تھے اور اعظم پور مضافات بجنور میں سے ہے۔ اور یہ مرید بھی بقول شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی صاحب کرامات و مقامات تھے۔ اور ادھر مولانا کے ننہیالی سلسلہ میں بھی مسند قضا پر عزت شاہی تکیے سے لگی بیٹھی تھی۔ الحاصل مولانا شیخ صدیقی تھے

سکونت بجنور مولانا ایک جگہ خود کہتے ہیں "بجنور میرا مولد نہیں۔ وطن

---

[1] یہ حالات حیات النذیر سے ماخوذ ہیں۔ تنہا۔

اقامت نہیں بلکہ وطن اصلی ہے" چار برس کی عمر میں بجنور آئے۔ بچپنے میں کدازجسم تھے۔

بچپن کی شرارت

ہوشیار اور ہونہار لڑکوں کی طرح بچپنے میں نہایت چلبلے تھے انھوں نے کبھی ایک جگہ بیٹھکر ایک نشست میں پوری حجامت نہیں بنوائی۔ آدھی بنوائی اور بھاگے۔ دوبارہ سہ بارہ گرفتار ہوکر آتے تھے تو وہ آدھی پوری ہوتی تھی اور اسی وجہ سے جابجا چوٹیں بھی لگا لیا کرتے تھے جس کے نشان آخر عمر تک موجود رہے۔ بے وضو نماز کا پڑھنا گویا ایک معمولی بات تھی اکثر ایسا ہوا ہوگا (بقول جامع حیات النذیر) کہ سحری اور افطار کے لالچ میں روزے رکھتے ہوں گے اور کچھ عجب نہیں کہ پوشیدہ طور پر توڑ بھی ہوں۔

ابتدائی تعلیم

قرآن مجید باپ سے پڑھا۔ کچھ عرصہ تک مکتب میں تعلیم پائی۔ زاں بعد وہاں سے اٹھا کر انکے باپ نے بینا بازار۔ پنج رقعہ سہ نثر ظہوری خود پڑھائیں۔ فارسی کے ساتھ عربی بھی شروع کرادی تھی چنانچہ نو برس کی عمر تک برابر اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔

مولوی نصر اللہ خاں سے فیض علمی

پھر باپ نے مولوی نصر اللہ خاں صاحب کے فیض تربیت میں داخل کیا جو ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن عالم تھے۔ ۵ برس تک ان سے تعلیم پائی اور نحو عربی میں شرح ملا تک اور منطق میں تہذیب اور میر قطبی اور فلسفے میں میبذی تک پڑھا۔

دلّی کا داخلہ اور تعلیم

اسکے بعد دلّی فارغ التحصیل ہونے کے لیے باپ لیکر آئے مولوی عبدالخالق صاحب اورنگ آبادی مسجد میں درس دیتے تھے۔ مولانا انکے شاگرد ہوگئے۔ اُن کی پوتی سے پھر مولانا کی شادی ہوئی۔

دہلی کالج اور وہاں کی تعلیم

مکتب یا مسجد کی تعلیم سے مولانا دل برداشتہ تھے ایک روز اتفاق سے دہلی کالج کی طرف جا نکلے۔ اور پرنسپل کے اس وعدہ پر کہ وہ للعہ ماہوار وظیفہ دیگا مولانا کالج میں داخل ہوگئے۔ جنوری سنہ ۱۸۴۶ء میں جب کالج کھلا مولانا کا نام درج رجسٹر ہوا جماعت دوم سے جماعت اول تک چوبیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ بتدریج پایا جب مولانا کی عمر چودہ سال کی تھی تو باپ کا انتقال ہوگیا۔ تاریخ اور ریاضی سے مولانا کو نفرت تھی۔ مولوی ذکاء اللہ اُنکے ہم سبق تھے۔

مولانا کا نکاح اور نکاح ثانی

مولانا کا نکاح مولوی عبدالقادر صاحب کی بیٹی کے ساتھ مفتی صدرالدین خاں صاحب مرحوم نے پڑھا تھا۔ گیارہ ہزار کا مہر بندھا تھا۔ مولانا نے اپنی وفات سے بیس سال قبل اپنی والدہ کے اصرار پر اپنے کنبے کی ایک عورت سے عقد کرلیا تھا لیکن اس سے برس دو برس بھی نہ بنی اور آخر طلاق دیدی۔

غیرت وحمیت

شادی کے بعد بھی سسرال کے عمدہ کھانے نہیں کھاتے تھے صرف دال اور چپاتی کھاکر پیٹ بھر لیتے تھے اور تین روپیہ ماہوار کھانے کا دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولوی عبدالقادر صاحب نے (جو مولانا کے خسر تھے) کسی سے کہا کہ نذیر احمد سے کہدینا کہ وہ عید کے لیے صاف کپڑے بنوالے ورنہ میں اور بچوں کے ساتھ اسکو اپنے ہمراہ عیدگاہ نہ لیجاؤں گا۔ مولانا نے جواب میں کہلا بھیجا کہ "میں سرے سے عید کی نماز ہی نہ پڑھوں گا" سارے رمضان کبھی مولوی عبدالقادر صاحب کے افطار میں شریک نہیں ہوے

ضلع گجرات میں ملازمت

آخر سنہ ۱۸۵۳ء میں کامل آٹھ برس کالج کی تعلیم پاکر ملازمت کے درپے ہوے اور کنجاہ ضلع گجرات

میں بمشاہرہ للعہ ماہوار مدرس ہو گئے۔ دو برس کے اندر ہی اس ملازمت کو ترک کر کے بعہدۂ ڈپٹی انسپکٹری مدارس کانپور آئے۔ وہاں فلر صاحب انسپکٹر مدارس سے کچھ بگاڑ ہو گیا اور مولانا استعفیٰ دیکر دہلی روانہ ہو گئے۔

غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ

یہاں پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء ہو گیا۔ اور اس زمانہ دار و گیر میں مولانا اور انکے خاندان نے بہت صعوبتیں اُٹھائیں۔ ابتدائے غدر میں مولانا نے اتفاقیہ طور پر ایک میم کی جان بھی بچائی تھی۔

ڈپٹی انسپکٹری الہ آباد

غدر فرو ہونے کے بعد مولانا ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد مقرر کیے گئے۔ اور یہاں اتفاقیہ انگریزی زبان سیکھی لاہور کے کسی لکچر میں خود مولانا فرماتے ہیں "میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں۔ والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دیندار صاف کہدیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں" الغرض مولانا نے الہ آباد میں منشی عبداللہ خاں صاحب امین عدالت سے انگریزی پڑھنی شروع کی اور رفتہ رفتہ نہایت عمدہ لیاقت پیدا کرلی۔

ترجمہ قانون انکم ٹکس

میرزا ناصر علی خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر ذو القدر کی سفارش سے مولانا کو قانون انکم ٹکس کے ترجمہ کی خدمت گورنمنٹ سے ملی اور انھوں نے اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا۔ لیکن ترجمہ ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ بابو شیو پرشاد انسپکٹر مدارس بھی بسفارش سے ترجمہ میں شریک ہو گئے اور شریک کیا ہو گئے بلکہ انکم ٹکس ایکٹ کا ترجمہ مولانا سے چھین لیا اور ان سے محرری کا کام لینے لگے۔ یہ امر مولانا کو ناگوار گذرا لیکن کیا کرتے البتہ بابو شیو پرشاد کو

دق ضرور کیا۔ انھوں نے شروع میں مولانا سے کہہ دیا تھا کہ جو میں بولتا جاؤں لکھتے جاؤ تم ترجمے میں دخل نہ دو۔ مولانا سے ترجمہ لکھواتے لکھواتے انھوں نے پوچھا "لکھ چکے" مولانا نے یہ الفاظ بھی ترجمے میں لکھ دیے پڑھوا کر سنا تو بہت بگڑے اور کہا کہ یہ دخل گستاخی ہے مولانا نے یہ الفاظ بھی لکھ دیے۔ غرض مولانا نے بھی بابو صاحب کو ناک چنے چبوا کر چھوڑا۔ بہر حال انکم ٹیکس کا ترجمہ اس طرح ختم ہوا کہ آدھے سے زیادہ مولانا نے کیا اور آدھے میں مولانا اور بابو صاحب دونوں شریک ہو گئے

ترجمہ تعزیرات ہند اور اس کا صلہ

بعد ازاں منشی عظمت اللہ اور مولوی کریم بخش کی شرکت میں مولانا کو تعزیرات ہند کے ترجمہ کا کام سپرد ہوا بقول مولانا "اب خدا کو منظور ہوا کہ یہ ذرہ بے مقدار روشناس آفتاب ہو یعنی لفٹننٹ گورنر نذیر احمد کا نوٹس لیں" تعزیرات ہند کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا گیا اور اس کے صلہ میں مولانا اول کانپور کی تحصیلداری پر مامور ہوئے اور بعد میں ضابطہ فوجداری کا ترجمہ ختم کرنے پر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے دو برس تحصیلدار رہے اور سنہ ۱۸۶۳ء سے ڈپٹی کلکٹری پر تعینات ہوئے۔

مرآۃ العروس

اسی زمانہ میں مرآۃ العروس تصنیف کی۔ اس کے صلہ میں گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک گھڑی انعام دی۔

سمٰوات

اس کے بعد ایک انگریزی ہیئت کی کتاب کا ترجمہ میری لیوپن صاحب کی سفارش پر سمٰوات کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ اصلاح و درستی کے لیے بذریعہ ریذیڈنٹ حیدرآباد امیر کبیر کے پاس بھیجا گیا جو ہیئت دانی میں مشہور تھے اس ترجمہ کی خوبی اسی سے ظاہر ہوتی ہے کہ حیدرآباد کے علم دوست اور قدر شناس امراء کے دل پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ سر سالار جنگ نے ریاست حیدرآباد کے ایک اہم کام کے لیے منتخب فرمایا۔

حیدرآباد دکن کی ملازمت

اول مولوی سید حسین صاحب بلگرامی نے فاضل مترجم کو لکھا کہ سر سالار جنگ آپ کو بلانا چاہتے ہیں، پھر نواب محسن الملک مرحوم کا ایک خط آیا اور بعد ازاں سر سید مرحوم کی معرفت منجانب سرکار نظام اس مضمون کا خط پہنچا کہ "بالفعل ساڑھے آٹھ سو اور بعد کو ایک ہزار پچیس روپے ماہوار گورنمنٹ برطانیہ کے سکے سے ملے گا" مولانا اپنی بیوی اور بیٹے سے مشورہ کرنے کے بعد یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو اعظم گڑھ سے جہاں وہ ڈپٹی کلکٹر تھے رخصت لیکر دہلی آئے اور ۲۷۔ اپریل کو حیدرآباد پہنچکر نواب محسن الملک بہادر کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔

مولانا حیدرآباد میں مستقل طور پر ریاست کے ملازم ہونے کے بعد اپنے حسن عمل کے صلہ میں برابر ترقی کرتے گئے یہانتک کہ آخر ان کو سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملنے لگی اور بورڈ آف ریونیو کے ممبر ہوگئے۔ محنت و جاں فشانی ان کا شیوہ تھا اور عزت و قدر افزائی سر سالار کا آئین۔ یہ سب کچھ تھا مگر یہاں آکر عرصے تک یہ اپنے علمی مشاغل جاری نہ رکھ سکے جس کا ان کو افسوس رہا کرتا تھا لیکن حسن اتفاق دیکھیے کہ سر سالار جنگ کو خیال ہوا کہ نظام (سابق) کی تعلیم کے لیے ان کے شایان شان ایک نصاب مرتب کیا جائے۔ یہ کام ان کے سپرد ہوا اور انھیں پھر علمی مشغلہ مل گیا جب وہ نصاب مرتب ہوگیا تو اہل نظر نے دیکھا اور پسند کیا۔ مگر کتاب ہیئت کے ترجمہ کی طرح یہ بھی مطبوع نہیں ہوا اور بعض مصلحتوں کی وجہ سے خاص رکھا گیا۔ اس نصاب کی ترتیب میں مولانا نے کیا کچھ کوشش و کاوش نہ کی ہوگی مگر افسوس وہ نگاہوں سے پوشیدہ رہا ورنہ مولانا کی اعلیٰ قابلیت کا اظہار اس سے بھی ہوجاتا اور دیگر والیان ریاست بھی اس سے مستفیض ہوتے۔

مولانا کا حافظ قرآن ہونا

مولانا نے اپنے زمانۂ ملازمت حیدرآباد میں حفظ قرآن کا اس وقت خیال کیا جبکہ ان کی عمر اس کے متقاضی نہ تھی لیکن ہمت مرداں مدد خدا صرف چھ سات مہینے کے عرصہ میں کل کلام پاک حفظ کر لیا۔

لائق علی خاں کی شاگردی

حیدرآباد میں مولانا کو جس قدر زیادہ دن گزرتے گئے اسی قدر ان کی توقیر و عزت میں اضافہ ہوتا گیا اور انکی علمی قابلیت کا اعتراف زیادہ ہوتا گیا خصوصاً سر سالار جنگ ان کے بہت ہی مداح ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنے فرزند لائق علی خاں کو جو بعد میں سر سالار جنگ ثانی ہوئے ان کی شاگردی میں دیدیا۔ اور وہ خود ان کے گھر آکر پڑھنے لگے۔ راجہ سر کشن پرشاد ان کے ہمجولی تھے یہ بھی ساتھ آتے اور دونوں باادب بیٹھ کر مولانا سے پڑھا کرتے۔ عرصے تک یہی وتیرہ رہا یہاں تک کہ لائق علی خاں جوان ہو گئے اور سر سالار جنگ اول کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد لائق علی خاں سر سالار جنگ ثانی کے خطاب سے مخاطب ہوئے اور باپ کے جانشین اور ریاست حیدرآباد کے وزیر ہو گئے۔ مولانا کی پہلے ہی کچھ کم قدر و منزلت نہ تھی مگر اب ان کو خیال ہوا کہ سعادت مند شاگرد وزیر ہوا ہے۔ اقبال کا ستارہ اور چمکے گا۔ یہ خبر نہ تھی کہ عروج کی انتہا ہو چکی ہے۔ وقت زوال قریب آ گیا ہے اور یہ شدنی امر شاگرد ہی کے ہاتھ سے انجام کو پہنچے گا۔

مولانا حیدرآباد سے پنشن لیکر دہلی آتے ہیں

نئے سر سالار جنگ نوجوان تھے اور حوالی و حواشی ان کے مزاج میں در خور رکھتے تھے مولانا جانتے تھے مگر کچھ نہ کہتے تھے جب ملتے

محکومانہ انداز سے ملتے اور جو کچھ کہنا سننا ہوتا کہہ سن کر چلے آتے اور کبھی زیادہ نہ بیٹھتے۔ جو لوگ سر سالار جنگ ثانی کے مزاج میں دخیل تھے وہ مولانا کی طرف سے صاف نہ تھے۔ کھٹکتے رہتے تھے کہ مبادا استادی کے پردے میں ہاتھ صاف کر جائیں۔ خود مولانا فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کو یہ اندیشہ تھا اور مجھے حاشا اس کا خیال بھی نہ تھا۔ مگر خدا کی مرضی پوری ہو کر رہتی ہے۔ ایک دن سر سالار جنگ کے پاس گئے اور صحبت طویل ہو گئی۔ جب شاگرد کی طرف سے زیادہ بے تکلفی ہوئی تو بعض کلمات نصیحت ان کی زبان سے بھی نکل گئے لیکن غضب یہ ہوا کہ حریفوں کے کان میں اس کی بھنک پڑ گئی۔ اور انھوں نے کان بھرنے شروع کر دیے۔ سر سالار جنگ کا رخ بدلا اور مولانا نے بھی یہی مصلحت دیکھی کہ پنشن لیکر حیدر آباد چھوڑ دیں چنانچہ ایسا ہی کیا اور دہلی چلے آئے

تالیف و تصنیف میں سرگرمی اور قومی کاموں میں دلچسپی

اس وقت سے پہلے پہلے مولانا صرف تحریر کے دھنی تھے اور لوگوں نے انکے قلم کی جولانیاں دیکھی تھیں۔ زبان گویا کے جوہر ابھی نہ کھلے تھے۔ مگر اب دہلی آجانے کے بعد جہاں ایک طرف مولانا نے تالیف و تصنیف کے پرانے مشغلے کو چمکایا اور بڑھایا۔ دوسری طرف اس خداداد طلاقت لسانی اور زور تقریر سے جس کی شاید اُن کو بھی اب تک خبر نہ تھی بڑے بڑے پبلک جلسوں کو گرمانا شروع کر دیا۔ اور پہلے ہی دن سے وہ دھاک بندھی کہ زبان زبان سے نذیر احمد۔ نذیر احمد مچا جانے لگا

مولانا کا دستور تھا کہ جب کبھی کسی بڑے جلسہ میں کسی خاص موضوع پر لکچر دینا ہوتا تو اسے پہلے سے قلم بند کر لیتے۔ معلوم نہیں کہ وہ ابتدا میں اسکے پابند رہتے تھے یا نہیں۔ لیکن آخر میں جن لوگوں نے انھیں تقریر کرتے سُنا

اور اُن کے وہ قلم بند لکچر دیکھے جو بعض اوقات قبل از تقریر چھپ جایا کرتے تھے تو یہی دیکھا کہ وہ اس تحریر کے ہرگز پابند نہ ہوتے تھے۔ رو کی طرح جدھر چاہتے تھے نکل جاتے تھے۔ وقت تمام ہو جاتا تھا اور وہ مشکل سے چھوٹے ہوئے پائنٹ پر آسکتے تھے۔ طبیعت کی آمد اور زبان کی روانی کسی حصہ بحث پر نہ جمنے دیتی تھی اُن کو اکثر یہ شکایت رہتی کہ وقت کافی نہ دیا گیا اور سامعین حافظے میں ڈھونڈتے رہ جاتے کہ فاضل لکچرار نے موضوع کے متعلق کیا کیا کہا۔ مگر کچھ پتہ نہ چلتا تھا باایں ہمہ اُن کی تقریر ایسی پر زور اور شاندار، دلکش و دلچسپ ہوتی تھی کہ لوگ اُن کے وقت کا پہلے سے انتظار کیا کرتے تھے اور تقریر کے وقت ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔ فطرت نے اُن کو کلہ جبڑا خطابت کے لائق دیا تھا۔ آواز نہایت بلند اور گونج دار تھی۔ عام مقرروں کی طرح وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے نہ تھے۔ صرف بلند آواز سے گویا ہوتے۔ اور وہی ہزاروں کے مجمع میں گونج جاتی۔ آواز میں اُن کی ایک رعب تھا کبھی مجلس بے قابو نہ ہونے پاتی۔ اگر وہ ذرا بھی ابتری کی جھلک پا جاتے دفعۃً گرج پڑتے اور مناسب موقع وہ شیریں ادائی یا تلخ نوائی اختیار کرتے کہ یہاں سے وہاں تک سناٹا چھا جاتا۔ جذبات کا گرمانا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ تقریر میں خود ہنستے اور بھرے مجمع کو ہنسا دیتے۔ خود روتے اور سب کو رُلا دیتے۔ اسی تاثیر بیان کی وجہ سے جن جلسوں میں چندہ ہونے والا ہوتا چندہ کی وصولی ان کی تقریر کے بعد عمل میں لائی جاتی۔ وہ اکثر اپنی ذات سے چندہ شروع کرتے اور پھر ایک ایک کی جیب جھاڑ لیتے اُن کے مزاج میں ظرافت بہت زیادہ تھی اور اگر تلخ گوئی پر آجاتے تو بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پبلک ان کڑوے گھونٹوں کو بھی دوا سمجھ کر پیتی رہی۔ مگر جب ایک آدھ دفعہ نہ پیے گئے تو مولانا شاید اپنی خیر اندیشی کو پیش نظر رکھ کر جھنجلا گئے۔ اور ایسے ملول ہوئے

کہ پبلک اور قومی زندگی کو خیرباد کہہ بیٹھے۔ اور مرنے سے پانچ چھ برس قبل کسی جلسہ میں شریک نہ ہوتے تھے۔ پھر بھی تقریبًا سترہ اٹھارہ برس اپنی زبان سے پبلک کی خدمت کی متعدد نیک تحریکیں ان کی زبان کی آبیاری سے سرسبز ہوئیں اور لاکھوں روپیہ کا چندہ ان کی زبان کی جنبش سے جمع ہو کر نیک کاموں میں لگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی اس قسم کی خدمات اکثر مسلمانوں سے مخصوص رہیں لیکن وہ خدمات اگر ایک لحاظ سے قومی تھیں تو دوسرے لحاظ سے انسانی بھی تھیں۔ اس لیے اپنے پرائے سب کے نزدیک قابل ستایش ہوئیں اور ہونی چاہیے تھیں۔ مولانا شاعر اور شاعری کے مدعی نہ تھے۔ لیکن عربی، فارسی، اردو، تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا عربی فارسی کلام جو کبھی محض تفنن طبع کے طرز پر موزوں ہو جایا کرتا تھا۔ ان کی زبان اور مسودات سے آگے نہیں بڑھا لیکن اردو کی نظمیں جو عمومًا انھوں نے کسی لکچر میں پڑھنے اور سامعین کے دلوں کو برمانے اور ان کے جذبات کو گرمانے کے لیے کہیں لکچروں کا جزو بن کر شایع ہوتی رہیں۔ باوجودیکہ مرحوم نے شعر و سخن کی طرف کبھی خاص توجہ نہ کی تھی لیکن پھر بھی ان کا کلام شاعرانہ جزالت سے خالی نہ ہوتا تھا اور چونکہ وہ اپنی نظم میں کام کی باتیں کہتے اور حقائق کی تصویر کھینچتے تھے سننے والے ان کے کلام سے متاثر ہوتے تھے اور جس کے کلام کو یہ بات نصیب ہو جائے وہ فی الجملہ شاعر ہے اگرچہ وہ اپنے آپ کو شاعر نہ کہتا ہو۔

تصنیفات پر عام رائے

مولانا نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں مدرسی اور ڈپٹی انسپکٹری کے زمانے سے تالیف و تصنیف بہ سرگرمی شروع کر دی تھی۔ جو باستثناء حیدرآباد تمام زمانۂ ملازمت میں برابر جاری رہی۔ دہلی آنے کے بعد یہ سرگرمی اور بھی زیادہ ہو گئی۔ مذہبی اور مذہبی

رنگ کی تالیفات وتراجم کے انبار سے قطع نظر کرنے پر بھی انکی عام اخلاقی علمی تصانیف کچھ کم نہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس صنف میں بالخصوص نہایت خوش تصنیف اور خوش نصیب مصنف تھے۔ خوش تصنیف اس لیے کہ ان کی یہ کتابیں مقبول ہوئیں۔ سب لوگوں نے ان سے یکساں فائدہ اٹھایا۔ قوم و مذہب کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ مسلمانوں کے حسب حال تو یہ کتابیں لکھی ہی گئیں تھیں لیکن ہندو مسلمان عیسائی غرض ہندوستان کی سب قوموں نے ان سے استفادہ حاصل کیا۔ بعض کتابیں انگریزی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ وہ خوش نصیب مصنف تھے اس لیے کہ انکے جیتے جی اُن کی کتابیں مقبول ہوگئیں۔ زندگی میں قبولیت کا درجہ بہت کم مصنفین کو حاصل ہوتا ہے۔ انھیں اپنی تصنیف سے نہ صرف شہرت وعزت حاصل ہوئی بلکہ دولت بھی۔ انھیں اکثر کتابوں کی تصنیف وتالیف کے صلے میں گورنمنٹ سے بیش قرار انعام ملے۔ ۱۹۰۳ء کے دربار تاجپوشی کے متعلق جو انگریزی میں کتاب لکھی گئی تھی اس کا ترجمہ بھی گورنمنٹ نے ان سے کرایا۔

ان کی تالیف اور ترجمے کا سلسلہ تقریباً موت کے وقت تک جاری رہا اگرچہ کچھ دنوں سے آنکھیں کمزور ہوگئی تھیں۔ نظر بہت کم آتا تھا۔ رعشہ بڑھ گیا تھا اور لکھنے سے معذور تھے۔ مگر لکھنے پڑھنے کا ایسا چسکا پڑا تھا کہ ہاتھ اور آنکھوں سے مجبور تھے تو دوسروں سے کام لیتے تھے۔ لیکن یہ عمدہ مشغلہ کبھی نہ چھوڑا۔

مولانا سے حسب ذیل تصنیفات یادگار ہیں۔

(۱) مرآۃ العروس (۲) بنات النعش (۳) توبۃ النصوح (۴) محصنات (۵) ابن الوقت (۶) الحقوق والفرائض (۷) رویائے صادقہ (۸) اجتہاد

(۹) امہات الامم (۱۰) ایامیٰ۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں بھی مولانا کی تصنیف سے ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف علوم پر مولانا نے لکھی ہیں (۱) منطق میں مبادی الحکمت (۲) ہیئت میں سموٰات (۳) قواعد میں مایغنیک فی الصرف اور صرف صغیر (۴) اخلاق میں موعظۂ حسنہ۔ منتخب الحکایات اور چند پند (۵) قواعد املا میں رسم الخط۔ علاوہ ان کتابوں کے مولانا کی تقریریں اور نظمیں ہیں جو مختلف اوقات میں ایجوکیشنل کانفرنس۔ حمایت الاسلام یا دوسرے جلسوں کے موقعوں پر پڑھی گئی ہیں۔

اندازِ تحریر ان کی تحریر کا انداز خاص تھا۔ الفاظ کی شوکت، عبارت کی متانت، طرزِ ادا کی بلاغت اُن کے قلم کی خاص اور مابہ الامتیاز صفت تھی۔ بعض اعتراض کے پیرایے میں شاکی رہے کہ مولانا مغلق الفاظ لکھتے ہیں اور غیر مانوس لغت لاتے ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح بھی تھا لیکن اسکے انداز سے زبان کو وسعت ہوئی۔ بہت سے نئے الفاظ جو مقبولِ عام ہو گئے اُن کی بدولت زبان میں داخل ہوئے۔ اس لیے ان کا یہ انداز قابلِ ستائش ہے نہ لائقِ ملامت۔ ایسے ہی مصنفوں کی بدولت زبان میں وسعت باقی رہے نہ لکیر کے فقیروں سے۔ ان کا اسلوبِ بیان بھی نرالا تھا۔ محاورے کو وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ مگر عام اسلوب کی شاہراہ پر چلنا ان کو پسند تھا جہاں عام طرزِ ادا ابتذال پاتے خود اکثر رفعت و متانت اختیار کرتے۔ اگر کسی باب میں عام روش ثقاہت و متانت کے دوش بدوش ہوتی اور اس کا بدلنا دشوار ہوتا تو خود بلندی سے پستی کی طرف آجاتے۔ متانت و رزانت چھوڑ کر بکی اختیار کر لیتے مگر عام پامال رستہ پر نہ چلتے۔ اگرچہ پیرانہ سالی کی وجہ سے دماغ زیادہ غور و فکر کا متحمل نہ رہا تھا لیکن اسوقت کی بھی بعض بعض

تحریریں استعجاب کی نگاہوں سے دیکھی جانے لگیں تھیں۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی تصنیفات میں بعض بعض موقع پر محاورات کا استعمال برمحل نہیں ہے۔ اور وہ محاورہ کی خاطر موقع اور محل کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ مولانا جیسے ادیب اور انشاپرداز میں یہ نقص نہایت قابل افسوس ہے

مولانا کی سب سے پہلی کتاب "چند پند سودمند" شائع ہوئی جو اپنی تحریر کے لحاظ سے ایک معمولی کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اسکے مصنف کو تصنیف کا شوق ہے اور زبان کے کثیر الفاظ پر عبور و استحضار رکھتا ہے اور بس۔ مگر جس قلم سے یہ کتاب نکلی تھی آگے بڑھکر وہی اعجاز نگار ہو گیا اور اسی سے **مرآۃ العروس، توبۃ النصوح، بنات النعش، ابن الوقت** جیسی بلند پایہ کتابیں نکلیں۔ جنھوں نے مصنف کو آسمان شہرت کا تارا بنا کر چمکایا اور اس کے نام کو چار چاند لگا دیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر آدمی کچھ بھی طبیعت اور سلیقہ رکھتا ہو تو کرتے کرتے بہت کچھ ہو جاتا ہے

ایک خوبی مولانا کی بعض عام تصانیف میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے علمی مسائل کے ساتھ بہت سے مغربی خیالات اور اہل یورپ کی بعض اخلاقی خوبیاں نہایت عمدگی کے ساتھ اردو لٹریچر میں جذب کیں۔ اور جو انگریزی پڑھی تھی اس سے اس طرح متمتع ہوے۔ اس طریق پر مشرق و مغرب کو باہم قریب کرنے کی جو کم و بیش مشکور کوشش ان کی طرف سے عمل میں آئی وہ بھی کسی طرح نظرانداز نہ ہونی چاہیے بلکہ دوسروں کو اس سے سبق آموز ہونا مناسب ہے

علمی خطابات

مولانا کو شمس العلماء کا خطاب ۱۸۹۷ء میں ملا تھا اور اڈنبرا یونیورسٹی نے ان کو ایل۔ ایل۔ ڈی کا خطاب ۱۹۰۲ء میں عطا کیا تھا۔ مولانا سات سمندر پار کی ایک یونیورسٹی سے

علمی خطاب کا اعزاز پا چکے تھے مگر ہندوستان کی یونیورسٹیوں پر چراغ تلے اندھیرا
کی مثال صادق آرہی تھی کہ آخر پنجاب یونیورسٹی میں ایک حق گو۔ دوست
نواز آواز بلند ہوئی اور مولانا مرنے سے دو ڈھائی سال قبل ۱۹۳۰ء میں
پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈی۔ او۔ ایل بنائے گئے۔

مولانا کے خصائل وعادات

مولانا علم دوست تھے۔ اگرچہ تمام عمر پڑھنے میں
گزری تھی۔ مگر اس پیرانہ سالی میں بھی پڑھنے سے طبیعت
سیر نہیں ہوئی تھی۔ ان کا مطالعہ برابر جاری رہتا تھا
اور نئی نئی باتوں کے حصول کا شوق مرنے سے کوئی تین چار برس پہلے ایک
پنڈت جی سے سنسکرت شروع کی تھی مگر جب آنکھوں نے جواب دے دیا تو
مجبور ہو گئے ابتدا سے کفایت شعار تھے۔ اسی کی بدولت وہ دولت مند ہوئے
عمر کے ساتھ ان کی جزرسی بڑھتی گئی پیسے پیسے پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اسی لیے
لوگ آخر میں کنجوس کہنے لگے تھے لیکن درحقیقت یہ بات نہ تھی حساب جو جو بخشش
سو سو، ان کا اصول تھا۔ انھوں نے قومی کاموں میں ہزاروں روپیہ دیا۔
جن کو مدد کا مستحق سمجھا ان کی مدد کی اور فراخ حوصلگی سے مدد کی۔ چونکہ ان کا
بہت سا روپیہ مارا گیا تھا اور آخر میں وہ محتاط ہو گئے تھے لوگ سمجھتے تھے
کہ زر پرست ہو گئے ہیں۔ وہ سادہ مزاج تھے۔ ہمیشہ سادگی سے رہے اور سادہ
لباس پہنا۔ حتی کہ حیدرآباد میں بھی جہاں نمائش و طمطراق لازمۂ شرافت و لیاقت
ہے۔ یہ سادگی میں بسر کرتے اور اسی میں معزز و محترم رہے سچ ہے لباس سے
کوئی آدمی نہیں بن جاتا۔ ان کے مزاج میں ظرافت و متانت دونوں تھیں
لیکن بعض اوقات دونوں حد سے بڑھ جاتی تھیں۔ ان کے شناسا بہت تھے
لیکن جہاں تک سنا گیا ہے وہ کثیر الاحباب نہ تھے۔ دوستوں کی انکی نگاہوں میں

قدر تھی۔ مگر طبیعت نازک اور ذرا ذرا زود رنج تھی اور جلدی صاف نہ ہوتے تھے اسی نازک مزاجی کی وجہ سے انھوں نے پبلک لائف کو خیرباد کہا اور اسی کی بدولت بعض گوناگوں وجوہات کی بنا پر وہ اہل وطن سے برگشتہ ہوئے اور اہل وطن نے اُن کی طرف سے سرد مہری اختیار کر لی تھی۔ مولانا بڑے محنتی اور جفاکش تھے۔ اسی عادت کی بدولت مولانا نے ترجمہ قرآن صرف ڈھائی برس میں مکمل کر لیا اور رات دن اور صبح و شام بلکہ ہمہ وقت مولانا کو اسی کی دُھن لگی رہی۔ راست بازی مولانا کے خمیر میں داخل تھی اور ہمیشہ دیانت داری سے زندگی بسر کی کبھی رشوت نہیں لی۔ مولانا کے مزاج میں تعصب نام کو نہ تھا چنانچہ ان کا مقولہ ہے "مذہب ایک معاملہ ہے خدا اور بندے کے درمیان کسی دوسرے کو کیا حق ہے کہ اس میں دست اندازی کرے"۔ مولانا کو یتیموں کے ساتھ بہت ہمدردی تھی۔ سیاسی امور میں انھیں بہت دخل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پولٹیکل شاہراہ پر کبھی نہیں چلے بلکہ حکومت برطانیہ کی وفاداری کا جھنڈا ہمیشہ ہاتھ میں لیے رہے مزاج میں غصہ زیادہ تھا اور نوکروں کو اکثر زدوکوب کر دیتے تھے مادۂ انتقام اور حبِ جاہ زیادہ رکھتے تھے۔

آخری حالات

انتقال سے کوئی ۳ ماہ پیشتر گھر سے نکلنا مطلقاً چھوڑ دیا تھا مزاج میں چڑچڑاپن اور غصہ زیادہ ہو گیا تھا۔ دنیا کو فی الواقع ترک کر دیا تھا۔ کسی سے ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ کئی کئی وقت کھانا نہ کھاتے تھے۔ گو جانتے تھے کہ موت قریب ہے لیکن پھر بھی معاملات کے سلجھانے اور سمیٹنے کی کوشش نہ کی۔ نہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو دخل دیا۔ وصیت زبانی یا تحریری کسی قسم کی نہیں کی۔ نہ اپنی جائداد تقسیم کی۔

آخری ناتمام تصنیف

مرحوم کے زیر تصنیف "مطالب القرآن" نامی

ایک بسوط کتاب تھی۔ قرآن شریف کے تمام مضامین بابوابہ انھوں نے
چھپوا لیے تھے اور ہر ہر مضمون پر اپنی طرف سے ایک جامع اور بسیط مضمون
لکھتے چلے جاتے تھے اور جتنا لکھتے تھے اتنا ہی چھپ بھی جاتا تھا چنانچہ ربع کتاب
چھپ کر تیار ہو گئی تھی افسوس سہ ربع نہ تصنیف ہوئی اور نہ چھپنے کی نوبت آئی

تجارتی کاروبار

مولانا کو طبعاً تجارت کا بہت شوق تھا۔ وہ تجارتی کاروبار
میں بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ وہ ہر شخص کی نسبت
جو اُن سے قرض طلب کرے یا ان کے ساتھ کسی تجارت میں شریک ہو اچھا
خیال رکھتے تھے اور بے تکلف اعتبار کر لیتے تھے۔ اس عادت کے سبب
انھوں نے بارہا ہزاروں روپے کا نقصان اٹھایا۔ یار لوگوں نے شروع شروع
میں فرضی نفع کی طمع دلائی۔ آگے چل کر اصل سرمایہ بھی غارت کیا۔ مانا کہ مرحوم
ایک بڑے ذی علم و تجربہ کار شخص تھے لیکن ضرور نہیں ہے کہ ہر ذی علم ایک بڑا
تاجر بھی ہو۔ یہ فن ہی دوسرا ہے۔ غرض اس طرح لاکھوں روپیہ برباد کیا۔ بعض
لوگ ان کے ایسے منہ چڑھے تھے اور اس درجہ ان پر اعتماد تھا کہ ان کے مقابلہ
میں اپنا بیٹا بھی ہیچ تھا۔ غیروں پر اعتماد اور بھروسا اس درجہ بڑھا ہوا تھا
کہ خود کبھی کسی کاروبار یا حساب کو دیکھتے ہی نہ تھے جس نے کہہ دیا آمنا و صدقنا
اگر کسی نے سچی ہمدردی یا دلی خیر خواہی سے کچھ مخالفت کی تو اسے جھڑک دیا
جائداد اور املاک کا یہ حال تھا کہ کبھی انھوں نے کسی جائداد کو دیکھا بھی نہیں کہ
کدھر ہے کیسی ہے کیا کرایہ آتا ہے مرمت میں کیا صرف ہوا۔ جو کارپردازوں
نے کہہ دیا پتھر کی لکیر ہو گیا۔ الغرض ان کا روپیہ اگر نوچا کھسوٹا نہ جاتا تو دس لاکھ
کا سرمایہ ہونے میں کوئی شک نہ تھا کیونکہ ڈھائی لاکھ روپیہ تو صرف اُن کی
پنشن ہی کا ہوا مگر جس طرح ان کی دولت کو گھونسیں لگ گئی تھیں اور دیمک

چاٹ رہی تھی اگر ان کے پاس خزانہ قارون کبھی ہوتا تو خالی ہو جاتا۔ بنک کا تمام بھرم تھا وہاں صرف پچاس ہزار روپیہ نکلا۔ اس کے علاوہ کل جائداد ساکر کے ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہو گی جو مولانا نے چھوڑی۔

لطائف و ظرائف مولانا میں اخلاقی جرائت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ وہ اپنے اظہار خیال میں بیحد بیباک تھے۔ مخاطب کے اعلیٰ رتبہ اور امارت کا ان پر اثر نہیں ہوتا تھا چنانچہ جس وقت سر سالار جنگ ثانی شملے سے لوٹتے وقت علی گڑھ تشریف لے جا رہے تھے تو مولانا حسب الطلب غازی آباد اسٹیشن پر جا کر ملے۔ اسپیشل پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور سر سالار جنگ مع اسٹاف ڈائننگ روم میں خاصہ تناول فرما رہے تھے اطلاع ہوئی تو سعًا بلا لیا۔ مولوی[1] بشیر الدین احمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ اول تو زری

[1] مولوی بشیر الدین احمد صاحب مولانا کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ۴۔ اگست ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار سے عربی اور انگریزی کی تعلیم سات برس کی عمر سے سولہ برس کی عمر تک پائی۔ بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی میں داخل ہو گئے اور تین برس تک اس اسکول میں تعلیم پائی۔ انٹرنس کے درجہ تک پڑھے۔ عربی کے امتحان میں تمام پنجاب میں اول رہے۔ ریاست حیدر آباد میں ڈیڑھ سو روپیہ کی ملازمت اختیار کی اور اپنی لیاقت اور ایمانداری سے ایک ہزار روپیہ کی تنخواہ تک پہنچے اور تین سو روپیہ بھتا مزید برآں ملتا تھا۔ ۳۵ سال تک اس ریاست میں مختلف خدمات پر مقرر رہے۔ اور ۵۵ سال کی عمر ختم کرنے پر پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے۔ آپ کو حیدرآباد سے واپس آئے ہوئے آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ آپ کا قیام اپنے وطن دہلی میں ہے حالت ملازمت میں نہایت دیانت اور امانت سے کام کیا۔ آخری عہدہ کلکٹری ضلع تھا۔ مشغلہ تصنیف و تالیف کا ہمیشہ سے رہا۔ متعدد مفید اور مبسوط کتابیں تحریر کی ہیں

سر سالار جنگ نے مولانا کو اپنے پاس بٹھایا اور حکم دیا کہ دو پلیٹیں اور لاؤ۔ وہ مولانا کے سامنے رکھی گئیں لیکن مولانا نے عذر کیا اور معافی چاہی عصر تک کرسی پر مولانا بیٹھے رہے۔ سر سالار جنگ نے مزاج پرسی کے بعد پوچھا "آپ کو پنشن ماہ بماہ پہنچتی ہے"

مولانا "جی ہاں ملے چلی جاتی ہے۔ مگر جس مہینے کی مل جاتی ہے اسی کو میں اپنی سمجھتا ہوں۔ آئندہ مہینے کی امید نہیں رکھتا"

سر سالار جنگ "آپ ناحق حیدرآباد سے چلے آئے۔ آپ نے بہت جلدی کی اب بھی چلے آئیے۔ باوا جان (سر سالار جنگ اول) کی لائف آپ سے بہتر کون لکھے گا"

مولانا "نمک خوار سرکار ہوں مگر میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اب جس حال میں ہوں وہی میرے لیے مناسب ہے۔ ایک مرتبہ حیدرآباد جا کر تو پنشن نکالا گیا اب دوسری مرتبہ جاؤں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پنشن بھی کھو آؤں" سالار جنگ اس جواب پر متبسم ہوئے اور اسکے متعلق پھر کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

بقیہ صفحہ ماقبل آپ کا میلان طبع آثار قدیمہ اور تاریخ کی طرف بہت ہے۔ آپ کی تصانیف کو گورنمنٹ نے بھی پسند کیا اور انعامات دیے۔ آپ حالت ملازمت میں بے لوث اور بے لاگ رہے۔ جو آدمی اس مزاج کا ہوتا ہے وہ سخت گیر بھی ہوتا ہی مزاج میں کسی قدر عجلت اور تھوڑا سا غصہ ہے کسی بات پر جلد بھڑک جاتے ہیں مگر صاف گو ہیں کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے اور دل میں کینہ نہیں۔ جو دل میں ہے وہ زبان پر ہے۔ بعض وقت صاف گوئی کی وجہ سے نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ اپنے باپ کی طرح اب آخر عمر میں شعر و شاعری سے بھی شوق ہو گیا ہے نظمیں خوب کہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ فالج کے مرض میں آپ کا انتقال اواسط ۱۹۲۶ء میں ہو گیا۔

مولانا کی اخلاقی جرأت حسب ذیل واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

جب مولانا پنشن لیکر دہلی میں خانہ نشین ہوئے تو دہلی کے حکام اُن کے حالات اور رتبے سے واقف نہ تھے۔ اتفاق سے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ ڈپٹی کمشنر دہلی نے اُس جلسہ میں روسائے شہر کو بلایا۔ ایک معمولی فہرست سب کے نام کی تھی۔ مولانا کا نام بھی اس میں کسی جگہ تھا۔ مولانا کو ایسی دعوت ناگوار ہوئی چنانچہ فہرست کے حاشیہ پر لکھدیا کہ "اگر یہ سرکاری طلبی ہے تو سمن یا وارنٹ آنا چاہیے۔ دوستانہ بلاوا ہے تو چٹھی آنی چاہیے اور یہ دو صورتیں نہیں ہیں تو آنا نہ آنا میری مرضی پر منحصر ہے۔ تو میں نہیں آسکتا" ڈپٹی کمشنر نے یہ ریمارک کو دیکھکر نوٹس لیا اور تحصیلدار سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ تحصیلدار نے کہا کہ فلاں صاحب ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا جب ایسا تھا تو تم نے مجھ سے کیوں نہ کہا کہ میں چٹھی لکھتا۔ اور پھر فوراً انکی چٹھی کے ذریعہ سے مولانا کو بلایا اور زبانی معذرت کی

ایک مرتبہ دہلی کانفرنس کے موقع پر لارڈ کچنر کمانڈر انچیف افواج ہند تھوڑی دیر کے لیے شریک جلسہ ہوئے۔ مولانا لکچر دے رہے تھے اور لارڈ موصوف اسی دوران میں چند منٹ بیٹھنے کے بعد کچھ تقریر کرکے خاموش ہوگئے۔ لوگوں نے بہت کچھ تحسین و آفرین کی۔ اس کے بعد وہ تشریف لے چلے۔ ابھی اسٹیج سے نہیں اُترے تھے کہ مولانا نے برملا اور بلا تامل فرمایا۔ جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل کان زهوقا۔ اہل کانفرنس یہ سنکر ہنس پڑے سُنا ہے کہ لارڈ کچنر عربی جانتے تھے سمجھ گئے ہونگے کہ مولانا نے کیا خوب چوٹ کی ہے۔

اسی کانفرنس کے پریسیڈنٹ ہز ہائی نس سر آغا خاں تھے جس وقت مولانا کی تقریر ہو رہی تھی ہز ہائی نس آئے اور کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے

ملہ آیا حق اور گیا باطل تحقیق کہ باطل جانے والا تھا۔

باوجودیکہ پنڈال بہت بڑا تھا اور ہزارہا مسلمان زرق برق لباس میں نظر آتے تھے
ان میں ہر قسم کے خوبصورت اور صاحب وجاہت تھے لیکن ہز ہائی نس کے
آتے ہی سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ سب سے پہلے نواب محسن الملک بہادر
کے ذریعے سے ہز ہائی نس اور مولانا میں تعارف ہوا۔ مولانا کے ہاتھ میں
جو لکچر تھا وہ انھوں نے میز پر رکھ دیا اور بڑی متانت کے ساتھ ہز ہائی نس سے
مخاطب ہو کر فرمایا۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام   بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اس برجستہ اور فی البدیہہ گوئی پر نہ صرف حاضرین خوش ہوئے بلکہ سر
آغا خان بھی منھ پر رومال رکھ کر بہت دیر تک مسکراتے رہے اور حضار جلسہ نے
تو مولانا سے اس شعر کو چیز دے دے کر کئی مرتبہ پڑھوایا۔

ایک بار دلی میں فتویٰ نکلا تھا کہ اجمیر اور کچھوچھا اور تونسہ شریف کہنا
درست بھی ہے یا نہیں۔ ایک شخص نے مولانا سے یہ مسئلہ پوچھا۔ مولانا نے
جواب میں کہا کہ اگر مزاج شریف کہنے میں شرعاً مضائقہ ہو سکتا ہو تو بیشک
اجمیر شریف میں بھی تامل ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے بعض مرید مولانا کے پاس آئے اور کہنے لگے
کہ مرزا قادیانی کی صداقت کی ایک دلیل یہ ہے کہ سارا پنجاب ان کا قائل ہے
مولانا نے کہا پنجاب کے لوگوں کی سند نہیں۔ اُن کی ڈھل مل یقینی کا تو یہ حال
ہے کہ اگر میں چھ مہینے وہاں پھروں اور دعویٰ بھی کوئی معمولی نہ کروں بلکہ دعویٰ
خدائی تو اسی چھ مہینے کے عرصہ میں آپ کو پچاس ہزار بندے دکھا سکتا ہوں۔

نواب محسن الملک بہادر عربی کے کچھ بہت بڑے عالم نہ تھے اور مولانا
اور نواب صاحب میں بہت بے تکلفی تھی۔ ایک روز حیدرآباد میں مولویت کا

ذکر چل پڑا کسی نے اسی جلسہ میں "مولوی مہدی علی" کہا یہ سنکر مولانا بولے "اگر مہدی علی (نواب محسن الملک) مولوی ہیں تو یہ جو سامنے کھڑا ہے یہ بھی مولوی چاندخاں ہے (چاندخاں مولانا کا ایک قدیم ملازم تھا۔ اس کی داڑھی بہت لمبی تھی اور صوم و صلوٰۃ کا بہت پابند تھا)

حیدرآباد میں ایک ریونیو بورڈ بنام مجلس مالگزاری قائم ہوا تھا۔ اس بورڈ کے تین ممبر تھے۔ مولوی دلیل الدین خاں منشی اکرام اللہ خاں اور مولانا مولوی دلیل الدین صاحب کو جوع البقر کا عارضہ تھا منشی اکرام اللہ خاں شوقین مزاج تھے۔ مولانا کی جز ورسی اور کفایت شعاری مشہور تھی۔ ایک دفعہ سرسالار جنگ نے اراکین بورڈ کا حال دریافت کیا تو مولانا نے فرمایا کہ ہم ارکان ثلثہ کلوا واشربوا ولا تسرفوا کے مصداق ہیں۔

مولانا کے انداز تحریر پر ہم پیشتر اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اُن کی بعض کتابوں سے مختصر عبارتیں نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو مولانا کی تحریر کے متعلق خود بھی ایک رائے قائم کرنے کا موقع ملے۔ مولانا کے یہاں محاورات بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن برجستہ۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں پڑھنے والے کے ذہن نشین کر دیتے ہیں۔

مولانا نے امہات الامہ ایک سو چھپن صفحات کی ایک کتاب لکھی ہے اس میں منجملہ دیگر عنوانات مثل اسلامی تکثیر ازدواج پر مخالفین کا اعتراض اور اعتراض کا جواب۔ ایک عنوان "اشاعت اسلام کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام خواہشیں مغلوب تھیں۔ اس کا چند تاریخی واقعات سے ثبوت" بھی قائم کیا ہے۔ ہم اسکو بجنسہ یہاں

سلہ کھاؤ پیو لیکن بیجا صرف نہ کرو۔

نقل کرتے ہیں۔ اس کتاب کے متعلق اسلامی حلقوں میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں اور آخرکار اس کتاب کو بعض مولویان اسلام نے جلا کر خاک سیاہ کر ڈالا۔ اور اس کی اشاعت بند کر دی۔ مولانا کو اس کے صلہ میں مسلمانوں کی طرف سے **تکفیر** کے فتوے کا معزز تمغہ عنایت ہوا جو مولانا سے قبل امام غزالی آمدی۔ رازی۔ ابن رشد۔ شہرستانی۔ ابن تیمیہ اور ہمارے زمانہ میں سرسید کو مل چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لب ولہجہ اور وہ انداز بیان جو اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے۔ ہرگز ایک مسلمان کے منہ کو زیب نہیں دیتا چہ جائے کہ مولانا جیسے فاضل اجل کو اور بعض مقامات پر تو **بقول جامع حیات النذیر** جو مولانا کی مدح سرائی میں نثر کی قصیدہ نگاری کی خدمت کو اپنے اوپر لازم کئے ہوئے ہے " مصنف کا قلم سرپٹ جاتے جاتے پھسل گیا ہے مثلاً آنحضرت کے اولاد ذکور زندہ نہ رہنے پر مصنف نے جن الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے یا اسی طرح جو دل شکن مثالیں حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ کے معاملات میں دی گئی ہیں وہ ضرور ایسے فقرے ہیں جنکو دیکھنے کی تاب نہیں ہو سکتی۔ راقم نے خود ایک مرتبہ مولف سے دریافت کیا کہ یہ فقرے اور آپ کے قلم سے! کہنے لگے کہ " بیشک شوخی ہو گئی ہے" خیر یہ ان کا خیال ہے۔ مگر ہم تو اس کو گستاخی کہیں گے" اور ہم اسکو سعدی کی زبان میں " گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی" کہیں گے۔ بلاشبہ مولانا سے جو کچھ شکایت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ مسلمان تھے ورنہ ایک غیر مسلم کیسے ہی الفاظ میں اور کیسے ہی انداز میں کچھ لکھے اس سے شکایت نہیں ہو سکتی۔

اشاعت اسلام کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام خواہشیں مغلوب تھیں اس کا چند تاریخی واقعات سے ثبوت

دواعی نکاح جو ہم نے اوپر گنوائے ہیں پیغمبر صاحب میں اشاعت اسلام کا ایک داعیہ خاص بھی تھا تمام دواعی پر غالب، وہ دین توحید لیکر آئے تمام ادیان مروجہ کے خلاف، اور ایسے لوگوں میں جن کو ملاطفت چھو نہیں گئی تھی۔ وہ چھوٹتے کے ساتھ گالی گلوچ اور مار کٹائی پر اتر پڑے۔ صبر و تحمل کی بھی ایک حد ہوتی ہے مگر کچھ نہ کیا۔ ایک طرف خدا کہتا ہے [1] يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ اور اسی پر بس نہیں دوسری جگہ فرماتا ہے [2] وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ دوسری طرف جو ہے خون کا پیاسا ہے اور اگر [3] وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اور [4] وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ کی تقویت اور حمایت اور حفاظت نہ ہوتی تو رسالت کی بیل ایک گھڑی بھی منڈھے چڑھنے والی نہ تھی۔ مگر صداقت کے

---

[1] اے پیغمبر جو (احکام) تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئے ہیں بلا کم و کاست لوگوں کو پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھا جائیگا کہ) تم نے خدا کا (کوئی) پیغام (بھی لوگوں کو) نہیں پہنچایا۔ [2] اور اگر (پیغمبر زبردستی) کوئی بات ہمارے سر چپکتا تو ہم نے (دشمنوں کی طرح) اس کا دہنا ہاتھ پکڑ کر اس کی گردن اڑا دی ہوتی اور تم میں سے کوئی بھی ہم کو اس سے روک نہ سکتا [3] اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھنے کا [4] اور (اے پیغمبر تم مخالفوں کی ایذاؤں پر) صبر کرو اور خدا کی توفیق کے بدون تو تم صبر کر ہی نہیں سکتے اور ان (مخالفوں کے حال) پر افسوس نہ کرو اور یہ لوگ جو (تمہاری مخالفت میں) تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہو

بھروسے پر پیغمبر صاحب تیرہ برس دشمنوں کے نرغے میں چھاتی پر پڑے مونگ دلوایا کیے۔ یہاں تک کہ آخر کو پائے ثبات جگہ سے اکھڑ گئے اور بھاگ کر مدینے جا پناہ لی۔ الٰہی کیسے دل ہیں کہ یہ سب کچھ سن سمجھ کر بھی اسلام پر نہیں پسیجتے۔ لوگ بی بیاں کرنے میں جو اعتراض مدنظر رکھتے ہوں ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے اور ہمارا دل کیا گواہی دیتا ہے ہر ایک منصف کا دل گواہی دے گا کہ پیغمبر صاحب نے جو بی بی کی اسلام کا مفاد مدنظر رکھ کر کی کیسی نفسانی خواہش اور کیسا حسن وجمال اور کیسی دولت۔ اُن کو اسلام کے آگے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ ہم اس کی ضرورت تو سمجھتے نہیں کہ مناکحت کو خلاف شان پیغمبری سمجھ کر پیغمبر صاحب میں فقدان قوت کے قائل ہوں۔ ایسا سمجھنا اُن کے کمال انسانیت کو بٹا لگاتا ہے۔ پس سچی اور سیدھی بات یہ ہے کہ پیغمبر صاحب کی مناکحت میں اس قوت کو بھی دخل ضرور تھا۔ مگر اسلام کی دھن کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں، بشری اغراض مغلوب تھیں۔ ہر نکاح میں اوّل اور اقدم اسلام اور اسلام کی رو کمن میں دوسری اغراض۔ اور یہی وجہ تکثیر ازواج کی بھی ہوئی کہ دامادی کے دباؤ سے سارے سسرالی قبیلے کو جھکنا پڑتا ہے اور اسی کی اسلام کی اشاعت کے لیے بڑی ضرورت تھی یہاں تک کہ جب اسلام کو خدا نے غلبہ دیا اور اعوان وانصار کے بہم پہنچانے کی ضرورت نہ رہی تو لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ [1] سے تکثیر کو روک دیا۔ غرض ہم تو پیغمبر صاحب کے نکاحوں میں کسی طرح کی اخلاقی برائی پاتے نہیں یہ بات کہ اشاعت اسلام کے آگے پیغمبر صاحب کی تمام بشری خواہشیں مغلوب تھیں۔ اس کے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں

---

[1] (اے پیغمبر اس وقت کے) بعد سے دوسری عورتیں تم کو درست نہیں۔

ازاں جملہ یہ کہ پیغمبری سے پہلے سے پیغمبر صاحب بالطبع بت پرستی سے نفور تھے اور اپنی قوم، اپنے اہل وطن بلکہ تمام لوگوں کو مبتلائے گمراہی دیکھ کر بہت ہی بے چین رہتے تھے۔ ان کو اس فکر میں کھانا، پینا، سونا، ملنا جلنا کوئی چیز بھی بھلی نہیں معلوم ہوتی تھی، بس یہ اُنکے اخلاق کا اصل الاصول ہے۔ غلبۂ اسلام کے ساتھ اس فکر کی شان تو بدلی مگر مرتے دم تک رہے اسی فکر میں منہمک۔

غم رہا[۱] جب تک کہ دم میں دم رہا　　　غم کے جلنے کا بہت ماتم رہا

ہم اس درد کا ٹھیک اندازہ کر نہیں سکتے، جوان کو ابنائے جنس کا تھا پیغمبری کے قریب وہ بالکل عزلت پسند ہو گئے تھے۔ اکیلے غار حرا میں بیٹھے خدا کا دھیان کرتے بلکہ ایک مرتبہ مایوسی کی حالت میں پہاڑ پر سے گر کر اپنی جان تک گنوا دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اسی حالت پر قیاس کر لو کہ جس شخص کے ایسے خیالات ہوں، اس کو نفسانی خواہشیں کہاں تک گدگدا سکتی ہیں۔ عرب جیسے گرم ملک کے رہنے والے جہاں مرد اور عورت دونوں سویرے بالغ ہو جاتے ہیں۔ اول درجے کے شریف النسب، جوان، خوش رو، نیک نام، بہمہ صفت موصوف۔ یہ تو اگر جھوٹوں طلب کرتے، ملکے کے بڑے سے بڑے رئیس سچوں اپنی بیٹیاں ان سے بیاہ دیتے۔ مگر ان کو اپنے مذہبی استغراق میں ایسی باتوں کا خیال ہی نہ تھا۔ پیغمبر صاحب تو یتیم پیدا ہوئے تھے۔ شروع سے دادا عبد المطلب کی کنار عاطفت میں پرورش پائی

---

[۱] کاش مولانا مصرعۂ ثانی کو بدلکر میر صاحب کے شعر کو بدمزہ نہ فرماتے اور صرف مصرعۂ اولیٰ ہی پر اکتفا کرتے انکے اظہار خیال کے لیے وہی کافی تھا۔ میر تقی میر کا اصل شعر یہ ہے۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا　　　دل کے جانے کا نہایت غم رہا۔ تمنا

اُن کے انتقال کے بعد چچا ابو طالب کفالت کرتے رہے۔ قریش خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے تمام قبائل عرب کے رئیس تھے اور قبیلۂ قریش کے رئیس کا بڑا عن کا بر پیغمبر صاحب کے آبا و اجداد تو باوجود سخت مذہبی لغت اور برخاش کے پہلے عبد المطلب اور عبد المطلب کے بعد ابو طالب کی حمایت کی وجہ سے پیغمبر صاحب دشمنوں کی دست درازی سے بہت کچھ محفوظ تھے مگر وہ لوگ اس ٹوہ میں تھے کہ کسی ڈھب سے دادا اور چچا ان سے دستبردار ہوجائیں تو چٹکی بجاتے میں اس آئے دن کے جھگڑے کا تیا پانچا کردیں یہ دل میں ٹھان رودار قریش جمع ہوکر ابو طالب پاس گئے اور ان سے جاکر کہا کہ آپ کو تو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ آپ کے بھتیجے نے ہم سب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان کو ایک نئے دین کا خبط اچھلا ہے۔ سربازار اور گلی کوچوں میں ہمارے مذہب کی توہین بزرگوں کی تحمیق کرتا پھرتا ہے ہم آپ کے لحاظ سے لہو کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ آپ اس کو ہمارے سامنے بلاکر پوچھیے تو سہی کہ آخر یہ چاہتا کیا ہے۔ اگر ریاست کی ہوس ہے تو ہم سب اس بھرے مجمع میں اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کیے لیتے ہیں، اگر دولت درکار ہے تو جتنا کہے چندہ جمع کر دیں کہ یہ امیر الامراء ہو جائے اگر خوبصورت عورت چاہیے تو قریش کی عورتیں حسن میں شہرۂ آفاق ہیں جس کو پسند کرے اُس کو اس سے بیاہ دیں۔ اور اگر اس کا دل الٹ گیا ہو تو طبیب سے بیلنے سے اس کا علاج کرائیں۔ اور اگر کسی صورت سے نہ منے نہ ہو تو آپ اپنے دین آبائی کی خاطر ہم سب کی خاطر اس پر سے اپنا ہاتھ اُٹھالیں، پھر ہم اس سے سمجھ لیں گے یا یہ ہی نہ ہوگا یا ہم ہی نہ ہونگے

ابو طالب نے پیغمبر صاحب کو سب کے روبرو بلاکر کہا کہ سنتے ہو بیٹا ! یہ

یہ تمہاری قوم کے بھلے بھلے آدمی تم سے ایک معقول درخواست کرتے ہیں
تم سوچ سمجھ کر ان کو جواب دو۔ پیغمبر صاحب نے چچا کے اس کہنے سے
ایسا خیال کیا کہ شاید چچا مجکو جواب دیتے ہیں۔ یہ سمجھ کر ان کو اپنی بیکسی پر
رونا آیا مگر کہا تو یہ کہا کہ یہ لوگ مجکو کیا لالچ دکھاتے ہیں۔ اگر چاند سورج
کو بھی میری گود میں لا بٹھائیں، میں اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں
یہ حکایت ہم نے اس غرض سے بیان کی کہ اگر پیغمبر صاحب کو بی بی کی
خواہش ہوتی تو اس سے بہتر اور کون موقع ہو سکتا تھا۔ مگر ان کو اس سے
بحث ہی نہ تھی۔ ان کا پہلا نکاح ام المومنین خدیجۃ الکبری سے ہوا۔ انکی
خواستگاری سے نہیں بلکہ خدیجۃ الکبرے نے خود پیام دیا۔ نکاح کے
وقت پیغمبر صاحب کی عمر ۲۵ برس کی تھی اور خدیجۃ الکبرے کی چالیس
کی۔ علاوہ بریں خدیجہ پیغمبر صاحب کی پہلی بی بی تھیں اور پیغمبر صاحب
خدیجہ کے تیسرے شوہر۔ ان کے پہلے شوہر **ابوہالہ** اور دوسرے
عتیق ان کو بیوہ چھوڑ کر مر گئے تھے۔ اس حکایت سے کام کی کئی باتیں
مستنبط ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ نفسانی خواہش پیغمبر صاحب
کو خدیجہ سے نکاح کرنے کی محرک نہیں ہوئی ورنہ وہ اپنے سے پندرہ
برس بڑی بیوہ صاحب اولاد کو نہ کرتے بلکہ خدیجہ میں چند در چند خصوصیتیں
تھیں سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ان کے مذہبی خیالات تھے
ان کے تفصیلی حالات پیغمبر صاحب کی دوسری بی بیوں کی طرح ان ہی
کے بیان خاص میں لکھیں گے۔ تو جب عنفوان شباب میں پیغمبر صاحب
نے نفسانی خواہش کی پروا نہ کی، بعد کے نکاحوں میں جب کہ یوماً فیوماً
عمر و باِنحطاط تھی اور اسلامی ترددات روز بروز زیادہ، کیونکر کر سکتے تھے

پیغمبر صاحب کے مزاج میں حیا کی بھی افراط بدرجۂ غایت تھی۔ اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ اور اس کی وجہ سے وہ کثیر نار وا پر قادر ہی نہ تھے۔ ایک دفعہ کا مذکور ہے کہ کعبہ آتش اتفاقی سے جل کر مسمار ہو گیا تھا۔ قریش نے جمع ہو کر ازسرنو اس کو بنانا شروع کیا تو ہر شخص کار ثواب سمجھ کر اس کی تعمیر میں جو جس سے بن پڑتا تھا خدمت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مال مسالا کندھوں پر ڈھو ڈھو کر پہنچا رہے تھے۔ ان میں پیغمبر صاحب کے چچا عباس بھی تھے۔ لڑنے میں پیغمبر صاحب بھی آنکلے اور لگے کندھے پر پتھر ڈھونے۔ اسوقت پیغمبر صاحب کی عمر ۱۳ برس کی رہی ہو گی اور عرب میں اتنی عمر کے لڑکے ستر عورت بہت کم کیا کرتے تھے۔ عباس نے جوان کو کندھے پر پتھر لاتے دیکھا، ان کا تہمد گنڈلی بنا کندھے پر رکھ دیا کہ اس پر پتھر رکھو نہیں کندھا چھل جائے گا۔ تہمد کا کھولنا تھا کہ یہ مارے حیا کے غش کھا کر گر پڑے۔ تہمد بدستور باندھ دیا۔ تب ان کو ہوش آیا پھر آخر عمر تک یہی حال رہا کہ عورتیں بیعت کرنے آتیں تو ان کو دور ہی سے کہدیتے کہ جاؤ تمھاری بیعت ہو گئی غرض کسی اجنبی عورت کا ہاتھ تک نہیں چھوا۔ ہم نے اباک پیغمبر صاحب کی تکثیر ازواج کے متعلق جو کچھ لکھا پیغمبر صاحب کی طرف سے لکھا کہ ان کی مناکحت میں غرض اولیں، پاسداری اسلام ہوتی تھی اور اگر علی سبیل التنزل غرض ثانوی کے طور پر اس میں شائبۂ خواہش نفسانی کا بھی ہو تو چونکہ خواہش نفسانی فطری اور خداداد اور بقائے نوع انسان کا سبب ظاہر ہے اور اسی وجہ سے کوئی فرد بشر اس سے بری نہیں تو پیغمبر صاحب میں اس خواہش کے ہونے سے ان کی شان پیغمبری میں کسی طرح کا منقصت اور فتور نہیں آتا۔ بلکہ اس خواہش کا فقدان، نقصان بشریت ہے اور پیغمبری کی

۱؎ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر نکاح سے تو زن و شو دو دو شخصوں کے حقوق متعلق ہوتے ہیں۔ تو ہم کو امہات المومنین کے لحاظ سے بھی پیغمبر صاحب کے نکاحوں پر نظر کرنی چاہیے کہ کہیں یہاں پانی نہ مرتا ہو۔ تو عرب کے رسم و رواج نے تو عورتوں کے تمام حقوق پامال کر دیے تھے کہ عورت مرد سے کسی حق کا مطالبہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اسلام نے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ[51] سے اور تکثیر ازدواج کی صورت میں عدل کی شرط سے عورتوں کو حقدار ٹھیرایا۔ دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر صاحب اپنی ازواج میں کہاں تک شرط عدل کا ایفاء کرتے تھے۔ سو سیر کی تمام کتابیں بالاجماع گواہی دیتی ہیں کہ پیغمبر صاحب نے امہات المومنین میں بالمساوات دن تقسیم کر رکھے تھے، جس دن جس کی باری ہوتی اسی کے یہاں شب باش ہوتے۔ سفر میں کسی کو ساتھ لے جانا ہوتا تو قرعہ ڈال لیتے۔ غرض سفر میں حضر میں کسی حالت میں مساوات کے قاعدے کا نقض نہیں کیا۔ جس دن مرض الموت میں علیل ہوئے، زینب بی بی کی باری تھی۔ اس خیال سے کہ ام المومنین عائشہ کے گھر میں تیمارداری اچھی طرح ہو گی اور ان کے والد ابوبکر جو پیغمبر صاحب کے مشیر خاص تھے، بیٹی کے گھر بے تکلف آمد و شد کر سکیں گے، سب بی بیوں کی اجازت سے عائشہ کے گھر بیماری کے دن کاٹنے چلے گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امہات المومنین کو عام بی بیوں پر قیاس کرنا بھی ٹھیک نہیں يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ[52] بے شک پیغمبر صاحب کی بی بیاں پیغمبر تو نہ تھیں اور کبھی کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔ مگر مردوں میں جو شرف پیغمبر صاحب کو حاصل تھا

[51] جیسے مردوں کا حق) عورتوں پر ہے ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا (حق مردوں پر)

[52] پیغمبر کی بی بیو! تم کچھ عام عورتوں کی طرح تو ہو نہیں۔

عورتوں میں شرف ہم بستری پیغمبر کو بھی اسی کے لگ بھگ سمجھو اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ دنیا کی نظروں میں وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ کیا کچھ تھوڑا شرف ہے جس طرح پیغمبر صاحب اسلام کے آگے کسی دنیاوی خواہش کی چنداں پروا نہیں کرتے تھے یہی کل حال امہات المومنین کا تھا کہ پیغمبر صاحب کی ہم بستری کے آگے اُن کی سب خواہشیں مغلوب تھیں۔ عورتوں کو نان و نفقہ کی بڑی طمع ہوتی ہے تو امہات المومنین سب کی سب خوشی دلی کے ساتھ فقر و فاقے میں بسر کرتی تھیں پیغمبر صاحب نے صاف لفظوں میں ان سب سے کہہ دیا تھا۔ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا روایت ہے کہ یہ آیۃ نازل ہوئی تو پیغمبر صاحب نے عائشہ کی نوعمری کی وجہ سے اُن سے کہا تھا کہ دو ٹوک جواب دینے سے پہلے تم اپنے باپ سے رائے لے لینا۔ عائشہ نے سنتے ہی کہا کہ باپ سے صلاح لینے کی کچھ ضرورت نہیں میں خدا، رسول اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں اسی سے سمجھ لو کہ امہات المومنین پیغمبر صاحب کی زوجیت کی کس قدر عظمت کرتی تھیں۔ ام المومنین سودہ عمر سے اتری ہوئی تھیں۔ ان کو یہ خیال ہوا

۱ے پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہوتی ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔

۲ے اور پیغمبر کی بی بیاں (ادب و تعظیم میں) ان کی مائیں ہیں۔

۳ے اگر تم دنیا کی زندگی اور اسکے ساز و سامان کی طلبگار ہو تو آؤ میں تمہیں (کچھ) دے دلا کر خوش اسلوبی سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم خدا اور اسکے رسول اور آخرت کے گھر کی خواہاں ہو تو تم میں سے جو نیکوکار ہیں اُن کے لیے خدا نے (بڑے) بڑے اجر تیار کر رکھے ہیں۔

کہ کہیں پیغمبر صاحب مجکو نہ چھوڑ دیں۔ انھوں نے خوشی راضی سے عائشہ کو اپنی باری دیدی اور پیغمبر صاحب سے کہا کہ مجکو اسی قدر بس کرتا ہے کہ میں قیامت میں آپ کی بی بی کہکر پکاری جاؤں۔

ہم کوئی ضرورت اس بات کی نہیں دیکھتے کہ پیغمبری کے تقدس کے لحاظ سے پیغمبر صاحب کے نکاحوں کو دنیوی اغراض خسیسہ کے لوث سے بالکل پاک اور بری ثابت کریں۔ ہم پیغمبر صاحب کو تمام لوازم ضعف بشریت کے ساتھ بشر لمانتے ہیں اور وہ خود اس کے معترف تھے۔ ہاں جو بات تفتیش حالات سے ہم کو ثابت ہوئی وہ یہ ہے کہ پیغمبر صاحب اور امہات المومنین فریقین کو نکاح میں مذہبی غرض زیادہ مقصود تھی پیغمبر صاحب کو اسلام کی تقویت اور امہات المومنین کو شرف ہم بستری پیغمبر۔ دنیاوی اعتبار سے بھی کوئی عزت اس عزت کو پاسکتی ہے کہ پیغمبر صاحب کی بی بیاں ادب اور تعظیم کی رو سے تمام امت کی مائیں قرار پائیں کسی اور عورت کو بھی یہ رتبہ حاصل ہے۔ عورتیں بالطبع کھانا، پینا، خوش حال گھر ڈھونڈا کرتی ہیں سو پیغمبر صاحب کو تو خوش حالی ساری عمر نصیب ہی نہیں ہوئی اور ہوتی کہاں سے، باپ کو تو آنکھ کھول کر دیکھا تک نہیں۔ دادا نے یتیم پوتے کو پالا تو خیر ان کے وقت میں خدا نے ننگا بھوکا نہیں رکھا۔ دادا کے مرے پیچھے چچا ابو طالب نے دست گیری کی تو وہ قرضدار اور کثیر العیال تھے ام المومنین خدیجہ کے تعلق سے پیغمبر صاحب کی خوش حالی کا آغاز سمجھو تو مذہبی مخالفت کی وجہ سے قریش نے ان کو اور ان کے طرفداروں کو شعب ابی طالب میں نظر بند کر دیا۔ برادری سے خارج۔ کھانا۔ پان موقوف۔ لین دین بند۔ میل جول متروک۔ تو ایسی حالت میں خیالی

خوش حالی کیا کام دے سکتی تھی۔ ہجرت کے بعد سے خیال ہو سکتا ہے
کہ مدینے میں مع یدول سے فتوحات ہونے لگی ہوگی۔ تو فتوحات کا حال
یہ ہے کہ زکوۃ اور صدقات کو پیغمبر صاحب نے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ
تمام بنی ہاشم پر حرام کر رکھا تھا۔ اور ان لوگوں کے مال کا میل اور انکے
لینے کو ذلیل بے غیرتی فرماتے تھے۔ ہاں غنیمت کی ایک قسم تھی جس سے
خوش حالی کی توقع کی جا سکتی تھی تو عرب کا دستور تھا کہ لڑائی میں جو لوٹ
کا مال ہاتھ آتا اس کا چوتھائی فریق غالب کے سردار کا حق ہوتا او تین چوتھائی
لشکر کا۔ پیغمبر صاحب نے چوتھائی کو گھٹا کر پانچواں کر دیا اور پانچواں بھی ایک
ہزار وصد بیار۔ واعلموا انما غنمتم من شئی فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ
والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل۔ ایک دفعہ کا مذکور ہے کہ حضرت علیؑ کو
معلوم ہوا کہ پیغمبر صاحب کے پاس غنیمت میں کچھ لونڈیاں آئی ہیں آپ
نے حضرت فاطمہ زہرا کو جا خبر دی کہ تم شکایت کیا کرتی ہو کہ چکی پیستے
پیستے میرے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں اور گھر کے کام کاج سے مجکو اتنی
فرصت نہیں ملتی کہ بچوں کی خبر لوں۔ لیسے میں جا کر اپنے والد صاحب سے
ایک لونڈی مانگ لاؤ۔ حضرت فاطمہ گئیں اور ان کو پیغمبر صاحب کی
عادت معلوم تھی کہ وہ مہاجر مسلمانوں کی تکلیف کے آگے اپنی اور اپنے
قرابت مندوں کی تکلیف کی پروا نہیں کرتے تھے ہچکچاتی ہوئی پیغمبر صاحب
پاس تشریف لے گئیں۔ اتفاق سے اس وقت پیغمبر صاحب گھر تشریف
نہیں رکھتے تھے انھوں نے ام المومنین بی بی عائشہ سے اپنا قصہ بیان کیا

۵ے اور (مسلمانو) جان رکھو کہ جو چیز تم (لڑائی میں) لوٹ کر لاؤ اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا
اور (رسول کے) قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا۔

اور چلتے وقت کہتی گئیں کہ پیغمبر صاحب کو میرا آنا اور یہ واقعہ یاد دلا دینا
پیغمبر صاحب تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے بی بی فاطمۃ الزہرا
کے آنے اور آنے کی ضرورت بیان کی پیغمبر صاحب بی بی فاطمہ کے
گھر تشریف لے گئے اور اس وقت یہ دونوں میاں بی بی سونے ہی
کو تھے۔ انھوں نے پیغمبر صاحب کی آہٹ پائی تو لگے کھڑے ہونے
پیغمبر صاحب نے فرمایا بیٹا لیٹے رہو چنانچہ آپ بی بی فاطمہ رض اور
حضرت علی کرم اللہ وجہہ دونوں کے بیچ میں جا بیٹھے اور لگے فرمانے کہ تم نے
جس چیز کی مجھ سے درخواست کی ہے، میں اس سے بہتر ایک چیز تمہیں
بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب تم دونوں میاں بی بی سونے کے لیے بچھونے
پر آیا کرو تو ۳۳ دفعہ سبحان اللہ اور ۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴ دفعہ
اللہ اکبر کہہ لیا کرو۔ یہ عمل تمھارے لیے خادم سے بہت بہتر ہے۔ تو یہ
نہیں کہ پیغمبر صاحب کو خوش حال ہونے کے موقع نہ تھے۔ موقع تو بہتیرے
تھے مگر وہ آپ خوش حال زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنے خاندان
بھر کے حق میں خدا سے دعا کرتے تھے۔ اللّٰھم اجعل رزق آل محمد کفافا۔[۱]
پیغمبر صاحب کی بڑی خوش حالی اگر اس کو خوش حالی سمجھا جائے یہ تھی
کہ خیبر بے لڑے بھڑے فتح ہو گیا تھا، وہاں کا خراج دستور کے مطابق
بلا شرکت غیرے خاص پیغمبر صاحب کا حق تھا۔ خیبر سے موٹا جھوٹا اناج
از قسم جو وغیرہ برس کے برس آتا وہ امہات المومنین میں علی السویہ
تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اس میں تنگی سے گزر اوقات ہوتی تھی۔ تنگی پر مزید
تنگی یہ تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ تنگی کی شکایت کرے۔ ایک دفعہ تنگی کے زور سے

[۱] خداوندا محمد کے اہل و عیال کو اتنی روزی دے جس سے وہ سرکش اور مرتکب گناہ نہ ہوں۔

تنگ، اگر امہات المومنین نے پیغمبر صاحب سے فریاد کی تو پیغمبر صاحب
روٹھ کر سب کے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ وہی مثل ہوئی کہ نماز
معاف کرانے گئے روزے گلے پڑے۔ پیغمبر صاحب کو روٹھا دیکھکر
ابوبکر نے عائشہ کی اور عمر نے حفصہ کے باپ ہونے کی حیثیت سے
خوب خوب گوشمالی کی اور تنگی پر گزر کی صورت یہ تھی کہ کسی نے عائشہ
سے پوچھا تو انھوں نے کہا کیا چھاننا پھٹکنا جیسے جو آٹے پسے بھوسی
پھونک مار کر اڑا دی، آٹا گوندا پکایا کھا لیا۔ یہ روٹی ہوتی تھی اور سالن
نعم الادام الخل[۱] ان لوگوں کی غالب غذا کھجوریں کھائیں اور پانی سے اتار لیں
یہ تھی پیغمبر صاحب کی زندگی، ان وقتوں میں جب وہ قریب قریب تمام
جزیرۂ عرب کے بادشاہ تھے۔ اس زہد اور اس ایثار پر بھی اگر وہ سچے
پیغمبر نہ تھے تو پیغمبری باتیں ہی باتیں ہیں پیغمبر صاحب کے حالات
عسرت و تنگی کو دور، دوست دشمن سب کو معلوم تھے۔ اس پر بھی
امہات المومنین نے کیوں پیغمبر صاحب کی زوجیت میں آنا اور رہنا
قبول کیا اس کی وجہ شرف ہم بستری کے سوائے اور تو کچھ سمجھ میں
آتی نہیں اور آ سکتی بھی نہیں۔ سوکنوں کی باہمی کٹا چھنی معمولی اور ضروری
بات ہے اور کٹا چھنی ہوتی ہے تو اغراض خسیسۂ دنیوی کی وجہ سے
اور چونکہ امہات المومنین کے حالات میں اس طرح کی بیہودگیوں کا کہیں
ذکر تک نہیں، یہ بھی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ امہات المومنین کو
مذہبی شرف کے آگے دنیوی مبتذل اور چھوٹی اغراض پر نظر ہی نہ تھی
ورنہ خانہ داری کے ہمہ وقت کے رگڑے جھگڑے پیغمبر صاحب کو

[۱] عمدہ سالن سرکا ہے۔

اس قدر پریشان کیے رہتے کہ وہ مقصد اہم اشاعت اسلام کی طرف توجہ کرنے کی مطلق فرصت نہ پاتے"

مولانا نے ایک ناول **محصنات** کے نام سے لکھا ہے جو بالفاظ دیگر **فسانۂ مبتلا** ہے۔ اس میں دو بیویاں کرنے کی خرابی کو ایک دلچسپ قصے کے پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ یہ کتاب **۱۸۸۵ء** میں شایع ہوئی تھی۔ زبان نہایت بامزہ ہے۔ جو حال لکھا ہے پورا نقشہ کھینچ دیا ہے جس شخص کی زبان سے بات کی ہے اسکے حسب حال الفاظ بھی بہم پہنچا دیے ہیں۔ مبتلا جو اس ناول کا ہیرو ہے آوارگی اختیار کر چکا ہے اور ایک بازاری عورت کو اپنے نکاح میں لاکر ماما کے بھیس میں اپنے گھر بھیجا ہے تاکہ غیرت بیگم پر (جو اس کی اصلی اور پہلی بیوی ہے) یہ راز ظاہر نہو۔ وہ عورت جسکا نام ہریالی ہے بطور خادمہ گھر کا کام کاج کرتی ہے۔ اب باقی داستان خود مولانا کے الفاظ میں سنیے۔

معلوم نہیں **مبتلا** کو کب تک **ہریالی** کا اس نمط پر رکھنا منظور تھا کہ ایک دن گھر میں باہر سے یہ اطلاع پہنچی کہ ایک بوڑھی عورت نوکری کی جستجو میں آئی ہے اگر حکم ہوا تو بھیج دیں۔ انتظام خادماؤں کا تو سب **ہریالی** کے ہاتھ میں تھا **غیرت بیگم** نے **ہریالی** سے پوچھوایا **ہریالی** کسی کوٹھری میں خدا جانے کس کام میں مصروف تھی۔ اس نے وہیں سے کہا کیا مضائقہ۔ غرض وہ عورت اندر آکر سیدھی **غیرت بیگم** کے پاس جا بیٹھی اور لگی کہنے کہ میں تو **ہریالی بیگم** پاس آئی ہوں جن کو تمہارے میاں نکاح پڑھوا کر نکال لائے ہیں۔ مدت سے میں ان کے یہاں اوپر کے کام پر نوکر تھی، بیگم کو تو نکلے ہوئے تین مہینے ہونے آئے ہیں۔ ان کی خالہ کے پاس رہی آج آٹھواں دن ہے کہ وہ بھی لکھنؤ

سدھاریں۔ میں نے کہا چلوں اگر بیگم پھر رکھ لیں تو میں ان کے مزاج سے واقف ہوں وہ مجکو جانتی پہچانتی ہیں۔ آن جان جگہ تابعداری کرنی کیا ضرور۔ کیا وہ اس گھر میں نہیں ہیں غیرت بیگم نے ہاتھ سے اشارہ کرکے بتایا کہ تم جن کے پاس آئی ہو وہ سامنے والی کوٹھری میں ہیں۔ وہ عورت اُٹھ کر کوٹھری کی طرف چلی، دروازے تک پہنچی تھی کہ اتنے میں غیرت بیگم بے خود ہو کر بگولے کی طرح اٹھی اور وہ عورت ہریالی سے بات بھی نہیں کرنے پائی تھی کہ اسے پہنچکر بیچاری بڑھیا کو اوندھے منھ ہریالی پر ڈھکیل دیا اور کہا کہ تمنے دیکھا یہ ہریالی نہیں، گھر والی ہے۔ یہ بی بی ہے، یہ میری سوکن ہے، میں رانڈ ہوں یہ سہاگن ہے، میں لونڈی ہوں یہ بیگم ہے، میں چڑیل ہوں یہ حور ہے، یہ میاں کی لاڈو ہے۔ یہ میاں کی چہیتی ہے، یہ میاں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔ یہ کہتی جاتی تھی اور اسکے ساتھ ہزارہا گالیاں اور سیکڑوں کوسنے اور دو ہتڑ تھا کہ باری باری سے اس شامت کی ماری بڑھیا اور ہریالی پر اور اپنے آپ پر بھی اسی زور سے پڑ رہا تھا کہ گویا مزدور سڑک کوٹ رہے ہیں۔

اس کے بعد سید ناظر و حاضر جو غیرت بیگم کے بھائی ہیں آن موجود ہوتے ہیں۔ ادھر مبتلا بھی کہیں سے آن پہنچتا ہے۔ غیرت بیگم کے بھی خوب چوٹ آئی ہے اور ہریالی اور بڑھیا بھی خوب پٹی ہیں، سب کی دوا دارو ہو رہی ہے چند دنوں کے بعد جب سب اچھے ہو جاتے ہیں تو غیرت بیگم اور اسکے دونوں بھائی الگ مشورہ کرتے ہیں کہ کیا ہونا چاہیے اُدھر مبتلا سخت پریشان اور گھبرایا ہوا ہے کہ دیکھیے اب کیا آفت آتی ہے۔ سید حاضر جو سمجھدار ہے اور بات کے انجام کو سوچتا ہے مبتلا سے

ملاقات کرتا ہے اور اس طرح گفتگو شروع کرتا ہے۔

سید حاضر" مبتلا بھائی یہ نیا رشتہ تمہارے ساتھ کیا ہوا کہ وہ پرانا رشتہ بھی اس کے پیچھے گیا گزرا ہوا۔ دیہات کا کمبخت کیا بُرا دستور ہے کہ ہم تو بہن کے گھر پر بلا ضرورت آ نہیں سکتے۔ اب تمہاری ہی طرف سے ملاقات ہو تو ہو۔ سید نگر تو بھلا تم کیوں آنے لگے۔ شہر میں بھی تم کہیں نظر نہیں آتے۔ آج آٹھواں دن ہے کہ میں بلاناغہ دونوں وقت یہاں آتا ہوں تم کو چار بار دیکھا بھی مگر تمہارا رُخ نہ پایا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے کہا لاؤ میں ہی پیش قدمی کر کے تم سے ملوں۔

مبتلا" کیا کہوں میں تو ندامت کی وجہ سے نہیں مل سکا" (اس کے بعد دو تین اور سوال و جواب ہوتے ہیں پھر حاضر یوں گفتگو شروع کرتا ہے)

حاضر" دوسرا نکاح تو تم کر چکے اب اس کی نسبت یہ کہنا کہ تم نے جلدی کی یا بے جا کیا فضول ہے بلکہ ایک اعتبار سے تو میں کہتا ہوں کہ تم نے بجا کیا۔ مناسب کیا، خوب کیا اور ضرور کرنا چاہیے تھا تمہارا طرز زندگی **دین** کے، **شرافت** کے، **بھلمنساہت** کے، **عقل** کے، سب کے خلاف تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم نے اس سے توبہ کی۔ خدا کرے کہ تمہاری توبہ پہاڑ کی طرح مستحکم ہو، بھاری بھرکم ہو، مضبوط ہو، اٹل ہو، مگر مجھ کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ایک لگدڑ کو تو تم اٹھا نہ سکے جوڑی تم سے کیونکر بلائی جائے گی تمہاری وہی مثل ہے کہ تنور سے بچنے کے لیے بھاڑ میں گرے۔ دو بی بیوں کا رکھنا جمع بین النقیضین کچھ آسان کام نہیں۔ تم نے تو ایسی ہنڈیا پکائی ہے کہ یہ واقعہ جو پیش آیا اس کا پہلا اُبال ہے۔ جب گھر جنگ کی نوبت

آئے گی تو اصلی مزہ معلوم ہوگا یقین جانو کہ میں کچھ بہن کی پاسداری سے نہیں کہتا بلکہ حقیقت نفس الامری بیان کرتا ہوں کہ تم نے غیرت کی قدر و قیمت کو مطلق نہیں پہچانا۔ غیرت بیگم خدانخواستہ (برا مت ماننا) تمہاری اس بی بی کی طرح گری پڑی بازاری عورت نہیں، وہ ایسے جتھے اور ایسے گروہ اور ایسی برادری اور ایسے خاندان کی بیٹی ہے کہ جہاں اس کا پسینہ گرے آج سیدنگر میں کم سے کم دو سو آدمی ایسے نکلیں گے جو اپنا خون بہانے کو موجود ہو جائیں گے۔ عورتوں کے معاملے عزت اور آبرو اور ناموس کے معاملے ہیں۔ مال کی تو کیا حقیقت ہے۔ عزت کے آگے شرفاء خاصکر دیہات کے، خاصکر سادات، خاصکر سادات سیدنگر، جان کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ یاد کرو کتنی منت، کس قدر خوشامد کیسی آرزو سے ماموں اور ممانی (خدا ان دونوں کو جنت نصیب کرے) غیرت بیگم کو بیاہ کر لائے آج کو وہ دونوں یا ان میں سے ایک بھی زندہ ہوتے تو کیا تمہاری مجال تھی کہ تم غیرت بیگم پر سوکن لاؤ اور اسی کی گود میں بٹھاؤ۔ پھر بندۂ خدا تم کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ماں باپ اس کے نہیں، ساس سسرے اس کے نہیں، دنیا میں وارث کہو، سرپرست کہو، شوہر کہو ایک تم سو تم نے جلا جلا کر اس کا یہ حال تو کر دیا کہ سیدنگر کی نسبت اب تہائی بھی باقی نہیں رہی اور اس پر بھی تم کو صبر نہ آیا سوکن کو لا بٹھایا۔ عورت ہو تو جانو باعقل ہو تو پہچانو سوکن کا کیسا داغ ہوتا ہے بیوگی سے بڑھ کر، میاں نکھٹو، اپاہج ہو، بدمزاج ہو، روٹی کھانے کو اولاد جی بہلانے کو نہ ہو سب مصیبتیں جھیلی جا سکتی ہیں اور نہیں جھیلی جا سکتی تو سوکن کی۔ دنیا کے اور جلاپے جلاپے ہیں اور سوکن کا جلاپا سلگاپا ...."

مولانا کا دوسرا ناول **ابن الوقت** ۱۸۸۸ء میں تصنیف ہو کر شائع ہوا۔ اس کتاب میں انگریزی وضع، لباس اور طرز تمدن جو ہندوستانی اختیار کر لیتے ہیں اس کو ہندوستانیوں کے لیے مضر اور تکلیف دہ ثابت کیا ہے **الحقوق والفرائض** میں مولانا نے صاف صاف یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ میرا ذاتی واقعہ ہے اور **ابن الوقت** خود مولانا تھے لیکن ایک مرتبہ آنریبل سید محمود نے مولانا سے شکایت کی تھی کہ **ابن الوقت** آپ نے میرے والد پر لکھی ہے۔ خلاف توقع۔ مولانا نے جواب دیا کہ انگریزی وضع کے مقلدوں کو ملاحی گالیاں دی ہیں جو چاہے گالیاں اپنے اوپر لے۔

مولانا کتاب مذکور کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ محاورات کی بھرمار ہر جگہ ہے۔ لیجیے سُنیے۔

آج کل کا سا زمانہ ہوتا تو کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی۔ **ابن الوقت** کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی، جبکہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا۔ یہ تو ہماری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں کہ ریل میں بضرورت کوئی بھلا مانس چڑھ بیٹھا تو جان پہچان والوں سے چہرا چھپاتا۔ ایک دوست کہیں بار ہر بندوبست میں نوکر تھے اور جانچ پڑتال کے لیے انھیں کھیت پھرنا پڑتا تھا۔ ہندوستانی جوتی اس رٹ میں کیا ٹھہرتی۔ ناچار انگریزی بوٹ پہننے لگے تھے۔ مگر دو چار دن کے لیے دہلی آتے تو گھر میں سے کبھی کے پڑے ہوئے پھٹے پرانے لیترے ڈھونڈ کر پاؤں میں اٹکا لیتے۔ تب کہیں گھر سے باہر نکلتے۔"

توبۃ النصوح۔ اعظم گڑھ کے زمانہ ڈپٹی کلکٹری میں تصنیف کی گئی تھی۔ مولانا

کی یہ کتاب اُن کی بہترین تصنیف ہے۔ اگر مولانا صرف توبۃ النصوح اور ترجمۃ القرآن یادگار چھوڑتے تو مولانا کو اس وقت بھی مصنفین کی صفِ اوّل میں جگہ دی جاتی۔ اور اس کتاب کا بھی سب سے عمدہ حصّہ نصوح کا خواب ہے چنانچہ ملاحظہ ہو۔

آنکھ کا بند ہونا تھا کہ نصوح ایک دوسری دنیا میں تھا۔ جو خیالات ابھی تھوڑی دیر ہوئی اس کے پیش نظر تھے، سب اسکے دماغ میں بھرے ہوئے تھے۔ اب متخیلہ نے اُن کو اگلے پچھلے تصورات سے گڈ مڈ کرکے ایک نئے پیرایے میں لا سامنے کھڑا کیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑی عمدہ اور عالیشان عمارت ہے اور چونکہ نصوح خود کبھی ڈپٹی مجسٹریٹ حاکم فوجداری رہ چکا تھا تو اس کو یہ تصور بندھا کہ یہ گویا ہائی کورٹ کی کچہری ہے۔ لیکن حاکم کچہری کچھ اس طرح کا رعب داب ہے کہ باوجودیکہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا اجتماع ہے مگر ہر شخص سکوت کے عالم میں ایسا دم بخود بیٹھا ہے کہ گویا کسی کے منھ میں زبان نہیں اور جو کوئی بضرورت بولتا اور بات بھی کرتا ہے تو اس قدر آہستہ کہ کانوں کان خبر نہ ہو۔ اتنی بڑی تو کچہری ہے مگر مختار اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے۔ کچہری کے عملے اس طرح کے کھرے اور اپنے حاکم سے اتنا ڈرتے ہیں کہ کسی اہل معاملہ اور مقدمے والے کو اپنے پاس تک آنے کے روادار نہیں۔ غرض کیا مجال کہ کوئی اپنے بارے میں ناجائز پیروی کرکے یا روپے پیسے کا لالچ دکھا کر یا سعی سفارش بہم پہنچا کر کار برآری کر سکے۔ اگرچہ انصاف اور معاملہ فہمی اور ہمہ دانی کی وجہ سے حاکم کی ہیبت، ادنی اعلیٰ سب پر چھائی ہوئی ہے مگر جتنے مجرم ہیں کیا خفیف، کیا سنگین کوئی اُن کے رحم سے ناامید نہیں۔ اختیارات اُسکے

اُس قدر وہ صحیح ہیں کہ نہ اُس کے فیصلے کی اپیل ہے نہ اُس کے حکم کا مرافعہ
کام کرنے کا ایسا ڈھنگ ہے کہ کام روز کا روز صاف ہوتا ہے کتنے ہی مقدمے
پیشی میں کیوں نہ ہوں، ممکن نہیں کہ تاریخ مقررہ پر فیصل نہ ہو جائیں۔ پھر
یہ نہیں کہ کسی مقدمے کو رواداری اور سرسری طور پر تجویز کر کے ٹال دیا
جائے۔ نہیں جو حکم صادر کیا جاتا ہے۔ ہر عذر کو رفع، ہر حجت کو قطع
بلکہ خود مجرم کو قائل معقول کر کے اور گنہگار کے مُنہ سے اُس کی خطا
تسلیم کرانے کے بعد۔ غرض جو تجویز ہے موجہ، جو فیصلہ ہے مدلل، جو
رائے ہے حتمی و اذعانی، جو حکم ہے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی۔ گواہوں
کے باب میں ایسی احتیاط ملحوظ ہے کہ صرف عادل، ثقہ اور راست گو
کی گواہی لی جاتی ہے اور وہ بھی ایسے کہ واقف احوال، چشم دید
بلکہ مجرم کے رفیق اور ہم نشین کہ اس کے رازدار اور معین و مددگار ہوں۔ پھر
کیا دیکھتا ہے کہ ہر مجرم کو فرداً فرداً قرار داد جرم کی ایک نقل دے دی گئی ہے
کہ وہ اُس کو پڑھ رہا ہے اور جتنے الزام اس پر لگائے گئے ہیں سب کو
سمجھتا اور اپنے بچاؤ کے وجوہات کو سوچتا ہے۔ کچہری کا خیال [illegible]
کو حوالات کی طرف نے گیا تو دیکھا ہر شخص ایک علیحدہ جگہ میں نظربند ہے
جیسا جرم ہے مناسب حالت حوالات میں سختی یا سہولت کے ساتھ
رکھا گیا ہے۔ حوالات کے برابر جیل خانہ ہے مگر بہت ہی بڑا [illegible]
محنت کڑی، مشقت سخت۔ جو اس میں گرفتار ہیں سولی کے مستحق اور
پھانسی کے خواستگار ہیں۔ نصوح یہ مقام ہولناک دیکھتے ہی الٹے
پاؤں پھرا۔ باہر آیا تو پھر حوالاتیوں اور نئے مجرموں میں تھا۔ ان
لوگوں میں ہزاروں آدمی تو اجنبی تھے لیکن جا بجا شہر و محلے کے آدمی

زن اُترتے تھے مگر وہ جو منہ پھیکے تھے۔ نصوح کو یہ سب سامان دیکھ کر اسی
خواب کی حالت میں ایک حیرت تھی کہ الٰہی یہ کونسا شہر ہے۔ کس کی
کچہری ہے۔ یہ اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ ان بیچاروں
نے کیا جرم کیا ہے کہ ماخوذ ہیں اور یہ کیسے مرے تھے کہ میں ان کو یہاں
جواب دہی میں دیکھتا ہوں۔ اسی حیرت میں لوگوں کو دیکھتا بھالتا
چلا جاتا تھا کہ دور سے اس کو اپنے والد بزرگوار حوالاتیوں میں بیٹھے نظر
پڑے۔ پہلے تو سمجھا کہ نظر غلطی کرتی ہے مگر غور کیا تو پہچانا کہ نہیں واقع
میں وہی ہیں۔ دوڑ کر قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا یا حضرت ہم سب آپ کی
مفارقت میں تباہ ہیں۔ آپ یہاں کہاں۔ باپ۔ میں اپنے گناہوں کی
جواب دہی میں ماخوذ ہوں۔ یہ تمام جو تم دیکھتے ہو دارالجزا ہے اور
خداوند تبارک و تعالیٰ عز شانہ اس محکمہ کا حاکم۔ بیٹا۔ یا حضرت آپ تو
بڑے متقی پرہیزگار خدا پرست نیکوکار تھے۔ آپ پر اور گناہوں کا
الزام۔ باپ۔ گناہ بھی ایک دو نہیں، سیکڑوں ہزاروں۔ دیکھو
یہ میرا نامہ اعمال کیسی رسوائی اور فضیحت سے بھرا ہوا ہے اور میں
اس کو دیکھ دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ کیا جواب دوں گا اور کونسی
وجہ اپنی براءت کی پیش کروں گا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو نصوح نے ہر شخص
کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اس کو دنیا کے خیالات کے مطابق فرد قرارداد
جرم سمجھا تھا۔ باپ کا نامہ اعمال دیکھا تو تھرّا اٹھا۔ شرک اور کفر اور
نافرمانی، ناشکری اور بغاوت اور بے ایمانی، کبر و نخوت، دروغ و
غیبت، طمع و حسد، مردم آزاری، نفاق و ریا، حب دنیا، کوئی
الزام نہ تھا کہ اس میں نہ ہو۔ چونکہ نصوح کے دماغ میں خیالات

دنیوی گو بچ رہے تھے تھا باپ کے نامۂ اعمال میں تعزیرات ہند کا
دفعہ اور ضمن ڈھونڈنے، سو تعزیرات ہند کے دفعات کی عوض قرآن
کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا متعجب ہو کر باپ سے پوچھا
کہ یا حضرت پھر کیا آپ ان تمام جرموں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ باپ
سب کا۔ بیٹا۔ جناب وہ کون لوگ ہیں جو آپ کی مخالفت پر آمادہ
ہیں۔ باپ۔ اول تو دو شخص کراماً کاتبین ایں بلا کے ہیں کہ میرا کوئی
فعل اُن سے مخفی نہیں جتنی باتیں کہتے ہیں سچ کی۔ اور کہتے کیا ہیں میرا
روزنامچۂ عمری لکھتے گئے ہیں اب جو میں اسکو دیکھتا ہوں حرف بحرف
صحیح اور درست پاتا ہوں۔ دوسرے یہی میرے اعضا ہاتھ پاؤں۔
کان وغیرہ کوئی میرے کہنے کا نہیں۔ سب کے سب مجھ سے منحرف
سب کے سب مجھ سے برگشتہ۔ میری مخالفت پر آمادہ۔ میری تذلیل
پر کمربستہ ہو رہے ہیں۔ بیٹا۔ آخر آپ کچھ اس کی وجہ بھی سمجھتے ہیں
باپ۔ میں ان کو غلطی سے اعوان و انصار بھیدی رازدار سمجھتا تھا مگر
واقع میں یہ سب جاسوس ایزدی تھے انھوں نے وہ سلوک میرے
ساتھ کیے کہ شمہ لگا نہیں رکھا۔ بیٹا۔ پھر آپ کا کیا حال ہے۔ باپ
جب سے دنیا کو چھوڑا قبر کے حوالات میں ہوں، تنہائی سے جی گھبراتا
ہے، انجام کار معلوم نہیں، شبانہ روز اسی اندیشے میں پڑا گھلتا ہوں
حوالات میں مجھکو اس قدر ایذا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا مگر صبح و شام
ہر روز آتے جاتے جیل خانے کے پاس سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ دوزخ
وہی ہے وہاں کی تکلیفات دیکھ کر اور سن کر ہوش اُڑے جاتے ہیں
اور غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ اے کاش ہمیشہ کے واسطے اسی حوالات

میں رہنے کا حکم ہو جاتا۔ بیٹیا۔ پھر ہنوز آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا۔ باپ خدا نہ کرے کہ پیش ہو۔ جو دن حوالات میں گزرتا ہے غنیمت ہے اول اول جب میں حوالات میں آیا تو اعمال نامہ مجکو حوالے کر دیا گیا۔ بس اسی کو دیکھتا اور انجام کار سے ڈرا کرتا ہوں۔ نجات کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ بیٹیا۔ بھلا کسی طرح ہم لوگ آپ کی اس مصیبت میں کام آسکتے ہیں۔ باپ۔ اگر میرے لیے عاجزی اور خلوص کے ساتھ دعا کرو تو کیا عجب ہے کہ مفید ہو۔ ابھی میرے ہملسے میں ایک شخص کی رہائی ہوئی ہے، اس پر بھی بہت سے الزامات تھے۔ مگر جہاں اللہ تعالےٰ میں کامل درجے کا انصاف ہے، رحم بھی پرلے ہی سرے کا ہے، اس شخص کے پس ماندوں نے اس کے واسطے بہت زار نالی کی تو پرسوں یا اترسوں اس کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ تیرے افعال جیسے تھے وہ اب تجھپر مخفی نہیں رہے مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے واسطے ہمارے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ تیرے ہی زن و فرزند ہیں ہم کو تیری یہی ایک بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ تونے اپنے خاندان میں نیکی اور دینداری کا بیج بویا جا ہم سے نے تیری خطا معاف کی۔ بیٹیا! سچ کہنا تم لوگوں نے بھی کبھی میرے حق میں دعائے خیر کی ہے۔ بیٹیا۔ جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا اور اب تک اس شدومد کے ساتھ ہوتا ہے کہ گویا آپ نے ابھی انتقال فرمایا ہے اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے، آپ کی عنایتیں، آپ کی شفقتیں جب تک جیں گے یاد کرینگے رسم دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے لوگ شاید میرے منہ پر خوش آمد سے کہتے ہوں مگر کہتے تھے کہ اس مہنگے سمے

میں باپ کا کہنا اچھا کیا دعا کے بارے میں غلط بات کیونکر عرض کروں
اہتمام نہیں ہوا۔ آپ کے بعد ترکہ و میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے
کہ آج تک نہیں سلجھے۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند
تھے کیا اعمال و افعال کچھ بھی کام نہ آئے۔ باپ۔ کیوں نہیں یہ انھیں
اعمال کا طفیل ہے کہ تم مجھکو اس حالت میں دیکھتے ہو ورنہ بہتیرے مجھ سے
بھی زیادہ تکلیف میں ہیں حوالات میں جیل خانے کی سی ایذا ہے۔ مگر یہاں
اعمال میں خلوص نیت شرط ہے۔ میں نے اپنے اعمال کو آ کر دیکھا تو اکثر جیسے
جھوٹے موتی، کھوٹے روپے۔ نمازیں بے حضور قلب اکارت گئیں
اور روزے چونکہ پابندی رسم کے طور پر رکھنے کا اتفاق ہوتا تھا خالی فاقے
کے شمار میں درآئے۔ بیٹا۔ پھر اس دربار میں کچھ سعی سفارش کا دخل نہیں
باپ۔ استغفر اللہ کوئی کسی کی بات تو پوچھتا ہی نہیں، نفسی نفسی
پڑی ہے، ہر شخص اپنی بلا میں مبتلا اور اپنی مصیبت میں گرفتار ہے
دوسرے کی نجات تو کوئی کیا کرائے گا پہلے آپ تو سرخرو ہو لے
بیٹا۔ کیوں جناب معاذ اللہ یہ شرک و کفر کا الزام آپ پر کیا ہم لوگ
تو خیر، سارا شہر آپ کے اتقا کا معتقد تھا کیا آپ خدا کے قائل نہ تھے
باپ۔ قائل تو تھا۔ دل سے معتقد نہ تھا۔ بیٹا۔ جناب آپ کے تمام
اعمال ظاہر سے مستنبط ہوتا تھا۔ کہ آپ کو خدائے کریم کے ساتھ بڑی
راسخ عقیدت ہے۔ باپ۔ وہ تمام عقیدت معلوم ہوا کہ اوپری دل
سے تھی۔ جب اول اول میرا اظہار لیا گیا تو پہلا سوال مجھ سے یہی پوچھا
گیا کہ تیرا رب کون ہے، چونکہ مرتے وقت مجھکو ایمان کی تلقین کی گئی تھی
میں نے جواب دیا کہ اللہ وحدہ لا شریک لہٗ۔ تب اس پر جرح کیا گیا

کہ بھلا جب تو نوکری سے برخاست ہو کر گھر آیا اور مدت تک خانہ نشین
رہا اور جو کچھ کما کر لایا تھا سب صرف ہو گیا اور نان شبینہ کو محتاج ہو کر
نوکری کی جستجو میں ادھر اُدھر پھرتا اور مضطر ہو ہو کر ہم سے دعائیں مانگتا
تھا مگر ہم تیرا صبر و استقلال آزمانے کے لیے تیرے مدعا کو حیز التوا میں
ڈالے ہوئے تھے اور ایک انگریز حاکم ضلع نے کہ وہ بھی مثل تیرے ہمارا
بندہ تھا، ہمارے ایما سے تیری پرورش کا وعدہ کیا مگر ہم نے تجھ پر اپنے
ایما کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور تو یہی سمجھا کہ وہ تیری ہی کوشش کا نتیجہ
تھا، سچ بتا کہ تجھکو اس انگریز کے وعدہ زبانی کا زیادہ آسرا تھا یا ہمارے
تحریری تمسک ؏ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا کا۔ اگر تو ہم کو
سمیم قلب سے حاضر و ناظر سمیع و بصیر و قادر جانتا تھا تو گناہ پر تجھکو
کیونکر جسارت ہوتی تھی تو بھول کر کبھی بھاڑ میں تو نہیں کودا، کبھی کھولتے
پانی میں تو تو نے ہاتھ نہیں ڈالا کبھی جلتی ہوئی آگ کو تو نے مٹھی میں
نہیں لیا مگر تو گناہوں کا نہایت بے باکی سے مرتکب ہوتا تھا ضرور ہے
کہ یا تو تجھکو ہمارے فرمانے کا یقین نہ تھا کہ گناہ کی سزا آتش دوزخ ہے
یا اگر یقین تھا تو تو اس کو دنیا کی آگ سے کمتر سمجھتا تھا۔ دنیا میں جو کچھ رفاہ
جو کچھ عیش و آرام ہم نے تجھکو بے استحقاق صرف اپنی مہربانی سے عطا کیا تھا
کیا تو نے اسکو ہمیشہ اپنی حسن تدبیر کی طرف منسوب نہیں کیا جو تکلیف
تجھکو دنیا میں پہنچی اگرچہ تو اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار اکرتا تھا
مگر کیا تو اس کا الزام ہماری ذات مستجمع الصفات پر نہیں لگاتا تھا
اے احسان فراموش ہزاروں لاکھوں احسان ہیں نے تجھ پر کیے

؏ جتنے جاندار زمین میں ہیں اللہ سب کی روزی کا ذمہ دار ہے۔

اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ بھلا منہ سے اقرار تو کرتا اے ناشکرے بے شمار نعمتیں میں نے تجکو عطا فرمائیں مگر تجھ پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ کبھی زبان پر تو لاتا۔ جتنا میں نے تیرے ساتھ سلوک کیا، اتنا ہی تو میری مخالفت پر کمربستہ رہا۔ جتنی میں تیری رعایت کرتا رہا اسی قدر تو گستاخ اور شیرہ ہوتا گیا۔ اس حیات بے ثبات پر تجھ کو اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ تو اپنے تئیں ہماری خدائی سے باہر سے چلا تھا۔ اس چند روزہ زندگی پہ تو بیقدر مغرور تھا کہ دائرۂ عبودیت سے اپنے تئیں خارج کرنا چاہتا تھا ہم نے تجکو نیست سے ہست کیا اور خلعت انسانیت سے سرفراز بنایا، جو تجکو درکار تھا سو دیا جس کا تو حاجتمند تھا سب مہیا کیا، ہر حال میں تیرے حافظ، ہر کیفیت میں تیرے نگہبان رہے کیا اسواسطے کہ تو کبھی بھولکر بھی ہماری طرف توجہ نہ کرے اور ہمیشہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہم سے جدا رکھے۔ جب تو ایک مضغۂ گوشت تھا ضعیف ولایعقل نادان و جاہل، ضعیف اتنا کہ نقل و حرکت پر قادر نہیں، نادان ایسا کہ خویش و بیگانے کا امتیاز نہیں، ہم نے تجکو دودھ پلوا پلوا کر توانا کیا اور اپنے بندے جو تجھ پر ہر طرح کا شرف رکھتے تھے یعنی تیرے ماں باپ تیری خدمت گزاری کو مقرر کیے اور ان کے دلوں میں تیری محبت ڈال دی کہ انھوں نے ہمارے حکم سے تجھ کو پالا پوسا اور تو روز بروز چونچال اور خوش حال ہوتا گیا۔ پھر ہم نے عقل کو تیرا اصلاح کار بنایا کہ تو اس کی مدد سے اپنی آسایش جائز کے واسطے ہر طرح کا سامان بہم پہنچاے۔ دنیا کے چرند، پرند، حیوانات، نباتات جمادات سب کو تیرا مطیع فرمان بنا دیا کہ تو ان پر حکمرانی کرے اور ان میں

منحرف رہے کیا اس لیے کہ تو بھاگ کر کبھی کبھی ہماری طرف رُخ نہ کرے
اور سدا ہم سے بھاگا بھاگا پھرے۔ تیری زندگی محض ایک ہستی
بے بود تھی دو لمحے تجھ کو تنفس کے لیے ہوا نہ ملتی تو تیرا دم نکل جاتا۔
ایک رات دن بے آب و دانہ تجکو جینا دشوار ہوتا، منوں ہوا تو
سونگھ گیا اور کبھی نہ سوچا کہ ہمارے طفیل سے، غلہ انبار کے انبار
ٹھونس گیا اور کبھی نہ سمجھا کہ ہماری بدولت۔ زندگی بھر کتنی کنوئیں تو نے
خالی کیے ہونگے مگر کبھی دھیان نہ کیا کہ ہمارے صدقے ہیں۔ اور ایک
پانی اور ہوا اور غلہ و غذا کیا، ضرورت کی کل چیزیں تو کہاں سے لاتا
اور کہاں سے بہم پہنچاتا تھا۔ ہمارے توشہ خانہ عام سے۔ مگر اسپر تیری
ہیکڑی یہ تھی کہ گویا ہم تیرے قرضدار ہیں یا ہم پر کچھ تیرا ادھار آرہا ہے
تو کھاتا تھا اور مکرتا تھا، لیتا تھا اور بھول بھول جاتا تھا۔ دنیا کی
باتوں میں تو تیری عقل بڑی رسا تھی مگر تو جان بوجھ کر ہمارے ہی
ساتھ تجاہل کرتا تھا۔ منھ پر آنکھیں تھیں اور اندھا۔ ایک چھوڑ دو دو کان
تھے اور بہرا۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، جنگل، دریا،
میدان، انواع و اقسام کے درخت، پھل پھول کھانے کو الوانِ نعمت
پہننے کو رنگا رنگ خلعت، جواہر بیش بہا، نقرہ و طلا، دنیا بھر کا سامان
ہم نے تیرے واسطے مہیا کیا اور ایک تیرے دم کے لیے اس قدر لوازمہ
بہم پہنچایا، ہم کو یہاں تک تیری خاطر عزیز اور تو ہم سے منحرف، ہمکو بقدر
تیری بزرگ داشت ملحوظ اور تو ہم سے برگشتہ۔ ہم چاہتے تو ایک ادنی سی
چیونٹی تیرے ہلاک کرنے کو کافی تھی، ہم حفاظت نہ کرتے تو خود تیرے
جسم میں فساد کا مادہ ایسا تھا کہ ایک ذرا سا روگ تیرے فنا کردینے کو

بہت تھا مگر ہم تجھ سے دوستی کرتے تھے اور تو ہم سے عداوت۔ ہم عنایت کرتے تھے اور تو بغاوت۔ کیا یہی تھا بدلہ جو تو نے ہم کو دیا۔ کیا یہی تھا صلہ جو تجھ سے ہم کو ملا۔ ہم نے تجکو دنیا میں بھیجتے وقت کیا تاکید کی تھی کہ دیکھ روح ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت ہی عزیز ہے ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے یہ میری عمدہ امانت اور نفیس ودیعت ہے، دیکھ اس کی احتیاط کما ینبغی اور حفاظت کما حقہ کیجیو، جیسا اجلا شفاف، براق، روشن یہاں سے لیے جاتا ہے ایسا ہی دیکھ لوں گا۔ آج تو اے روسیاہ! اس کو لایا ہے۔ پوتھ سے بدتر اور ٹھیکری سے کمتر بنا کر نجس، ناپاک، تیرہ، بے آب، بدرونق، خراب، ہم نے تو تجھ سے چلتے چلتے کہدیا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہیو جیسے سرائے میں مسافر تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر سویا کہ قبر میں آکر جاگا تھا تو مسافر اور بن بیٹھا مقیم، تھا تو سیاح اور ہو گیا متوطن، کیا تو تمام عمر دنیا میں مال نہیں جمع کرتا رہا اور کیا تو نے پکی پکی عمارتیں اس خیال سے نہیں بنوائیں کہ مدتوں ان میں رہے گا۔ مسافر کا یہی کام ہے سیاح کا یہی شیوہ ہے، تو تو جانتا تھا کہ تجکو یہاں لوٹ کر آنا ہے، پھر مرنے کے نام سے تجکو موت کیوں آتی تھی اور چلنے کی خبر سنکر تو مچلتا کیوں تھا۔ اول تو تجھ کو ہماری عبادت کا اتفاق ہی نہیں ہوا لیکن جب کبھی تو لوگوں کی شرم حضور یا دکھاوے یا اتباع رسم کی وجہ سے مصروف عبادت ہوا بھی تو کس طرح کہ دل کہیں تھا اور تو کہیں، کوئی نماز بھی تیری سجدۂ سہو سے خالی تھی۔ دنیا کی برسوں کی بھولی، بسری باتیں تجھ کو نماز میں یاد آتی تھیں اور نماز تو کیا پڑھتا تھا گھاس کاٹتا تھا۔ نہ تعدیل ارکان ٹھیک

نہ تو سر درست، نہ معدہ صحیح[1]۔ برس بھر تو دوزخ شکم کو اناپ شناپ بھرتا رہتا تھا، برسویں دن صرف ایک مہینے کے روزے رکھنے کا ہم نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ تجھ کو ہماری نعمتوں کی قدر ہو، تجھ کو اپنے ابنائے جنس پر جو مبتلائے مصیبت ہیں رحم آئے اور تیری صحت بدنی کو بھی نفع پہنچے، تیرے مزاج میں فروتنی اور انکسار کی صفت محمود کہ پیدا ہو اور ہم کو بہت بھائی ہے پیدا ہو لیکن یوں دنیا کے کام دھندے میں تو تو دن بھر بے آب و دانہ مصروف رہا، نہ شکوہ نہ گلہ، تازہ دم، ہشاش بشاش، پھر کھانا کھا بیٹھنے کو موجود، مگر روزہ چونکہ ہمارے حکم سے تھا، دن میں سیکڑوں مرتبہ تو پیاس کی شکایت اور جو آیا اس سے ضعف و ناتوانی کی حکایت العطش اور الجوع[2] یہی تیرے دو وظیفے تھے۔ روزہ افطار کیا اور تو بدحواس ہو کر چارپائی پر ایسا گرا کہ گویا جان نہیں، باوجودیکہ تو دو دو دن کا کھانا ایک ہی رات میں کھا لیتا تھا، پھر بھی اس تصور سے کہ کل پھر روزہ رکھنا ہے، تیری جوع البقر کو کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ تو عید کا اس طرح منتظر رہتا تھا جیسے کوئی قیدی، تاریخ رہائی کا۔ تیرا بس چلتا تو ۲۹ کیا ۱۹ کی عید کرتا، کیا ایسے ہی روزوں کے ثواب کا تو امیدوار اور اجر کا متوقع ہے۔ میں نے تجھ کو انسان بنا کر بھیجا تا کہ مصیبت زدوں کی ہمدردی کرے مگر تو نے ایسی تن آسانی اختیار کی کہ راحت پہنچانا تو درکنار، دوسروں کو تکلیف دے کر بھی اپنی آسایش حاصل کرنے میں تجھ کو باک نہ تھا۔ تیرے ہمسایے میں ہمارے بندے رات کو فاقے سے سو رہتے تھے اور تجھ کو سوء ہضم کے علاج سے ان کی پرداخت کی پروا نہ تھی۔ تیرے پڑوس میں ایسے

[1] کھڑا ہونا [2] بیٹھنا [3] پیاس [4] بھوک۔

لوگ بھی تھے کہ جاڑے کی لمبی راتیں آگ تاپ تاپ کر سحر کرتے اور تو دوہرے دوہرے لحاف اور بھاری بھاری توشکوں میں چین سے پاؤں پھیلا کر سوتا، نعمت، مال و دولت جو ہم نے تجھکو عطا کی تھی تو نے تکلفات لایعنی اور نمود و نمائش کی غیر ضروری چیزوں میں بہت کچھ تلف کی اور جو لوگ اس کے سخت حاجت مند تھے ترستے کے ترستے رہ گئے، تیری سب خیانتیں مجھ کو معلوم ہیں، تو نے زندگی کا نام خدا رکھ چھوڑا تھا جب تک سعی و تدبیر سے تجھ کو کاربرآری کی امید ہوتی تھی، تجھ کو ہرگز پروا نہیں ہوتی تھی کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور انتظام دنیا میں اس کو بھی کچھ دخل ہے، مگر ہاں جب تو عاجز اور درماندہ ہوتا تھا، تب تو خدا کو یاد کرتا تھا، اگر ہماری خدائی اور سلطنت تیری فرمانبرداری کی محتاج ہوتی تو تو نے اسکے اٹھا دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ تو نے ہمارے فرمان واجب الاذعان کی بے حرمتی اور احکام لازم الاحترام کی بے توقیری کی اور تو نے اپنا برا نمونہ دکھا کر میرے دوسرے بندوں یعنی اپنے فرزندوں کو بھی گمراہ کیا ہر روز تو لوگوں کو مرتے دیکھتا اور سنتا تھا، کیا تجھکو نہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ ایک دن تو بھی مرے گا۔ خود تیری حالت میں کتنے کتنے انقلاب واقع ہوئے، لڑکے سے جوان ہوا، جوان سے بڈھا ناتوان، بال تیرے سفید ہوئے، دانت تیرے ٹوٹے، کمر تیری جھکی، قوتوں میں تیری فتور آیا غرض ہم نے تجھ کو سوتا دیکھ کر بہتیرا جھنجھوڑا، بہتیرے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے، کئی بار اٹھا اٹھا کر بٹھا بٹھا دیا مگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوتے تھے کہ تو نے نہ ہی کروٹ نہ لی ؎

تمامی عمر تو غفلت میں سویا ۔۔۔ ہمارا کیا گیا کچھ اپنا کھویا

سخت گیری خود ہماری عادت نہیں اور سخت گیری ہم کریں بھی تو کس پر؟ اپنے بندوں پر؟ جن کا مارنا اور جلانا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے۔ مگر جب بندہ بندہ ہو اور ہم کو اپنا مالک سمجھے نہ غرنا مشخص کہ ہم تو دیں نون اور وہ کہے کہ آنکھیں پھوٹیں۔ ہم سے زیادہ بھی کوئی درگزر کرنے والا ہوگا کہ ایک معذرت پر عمر بھر کے گناہوں کو ہم نے قاطبۃً بھلا بھلا دیا ہے۔ لیکن تو یہ واستغفار، ندامت و حسرت کا اظہار بھی تو کوئی کرے، ہماری رحمت حیلہ جو، ہماری رافت بہانہ طلب کتنی کتنی بار جوش میں آئی مگر ہم نے اس کو صرف کرنے کا موقع نہ پایا۔ اگر بندہ ہمارے ساتھ نسبت عبودیت صحیح رکھتا تو ہم اس کی لاکھ برائیوں پر خاک ڈالتے۔ ہم کو تو بڑی شکایت یہی ہے کہ اس نے ہم کو معبود ہی نہ گردانا عالم اسباب میں رہ کر اسباب پرست ہو گیا پھر ہم جو دیکھتے ہیں تو ہمارے احکام بھی کچھ سخت نہ تھے۔ کھانے کو ہم نے نہیں روکا، سونے کو ہم نے منع نہیں کیا۔ تمتعات دنیوی سے ہم نے باز نہیں رکھا پھر جو تو نے اُن کی بجا آوری نہ کی تو سوائے تیری بدنفسی کے اور تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اے شخص نجات جس کا تو اب نہایت آرزومندی کے ساتھ خواہاں ہے، اے کاش زندگی میں تجھ کو اس کی اتنی ہی پروا ہوتی جیسے اڑد پر سفیدی۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے نقصان اور ذرا ذرا سے زیان تجھ کو مضطر اور بے چین کر دیا کرتے تھے اگرچہ کیا دنیا اور کیا دنیا کا خسارہ، کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا لیکن تباہیِ دین کی تجھ کو خبر تک بھی تو نہیں ہوئی۔ اے کاش تجھ کو نماز کے قضا ہونے کا اتنا ہی رنج ہوتا جتنا ایک مٹی کے پرانے آبخورے کے ٹوٹ جانے کا ہوتا تھا

ہم جانتے ہیں کہ اب تجھکو بہت ہی بڑی ندامت ہے لیکن اس ندامت کا کچھ حاصل نہیں، اس واسطے کہ یہ دار الجزا ہے، دار العمل نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ تو ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا لیکن حجت تمام کرنے کی نظر سے ہم تجھکو مہلت دیتے ہیں، جا اپنے نامۂ اعمال کو دیکھ اور اچھی طرح سوچ سمجھکر کوئی بات ہم سے بیان کر بشرطیکہ معقول اور قابل قبول ہو"

یہ اقتباس انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن چند محاورے اور الفاظ برمحل استعمال نہیں کیے گئے مثلاً کراماً کاتبین کے لیے شخص کا لفظ غلط ہے فرشتے ہونا چاہیے یا ایک موقع پر "نامشخص کہہم تو دیں نون اور وہ کہے کہ آنکھیں پھوٹیں"، خدا تعالیٰ کی زبان سے ایسے الفاظ جاری ہونا موقع اور محل کے لحاظ سے بالکل نامناسب ہیں، یا "کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا" کسقدر سوقیانہ محاورہ ہے۔

مولانا کا سب سے بڑا کام ترجمۃ القرآن ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عبد القادر صاحب کا ترجمۃ القرآن سو برس سے زائد عرصہ تک بلاد ہندوستان میں مقبول و معروف رہا ہے اور شاہ صاحب اس فن کے امام ہیں اور بعض بعض عربی الفاظ کا ٹھیٹ ہندی میں ایسا عمدہ ترجمہ کیا ہے کہ جسکا جواب نہیں۔ جو صنعت عربی لفظ میں تھی وہ ہندی لفظ میں بھی باقی رہی ہے لیکن آج کل اس زبان کا سمجھنا ہمارے لیے دشوار ہے۔ زمانہ کے تغیر و تبدل نے زبان کی حالت کچھ سے کچھ کر دی ہے لہذا ضرورت تھی کہ قرآن پاک کا ترجمہ آج کل کی بامحاورہ اور فصیح اردو میں کیا جائے۔ چنانچہ مولانا نے ترجمہ کیا اور خوب کیا زبان کی فصاحت اور سلاست کے علاوہ اصل عربی کا زور اور شان جہانتک ممکن تھا مولانا نے

قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا کی یہ خدمت نہ صرف دینی خدمت ہے بلکہ اردو ادب کی بھی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک آیت اور اس کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ ناظرین اس سے خود قیاس کرلیں کہ کس قدر پاکیزہ ترجمہ ہے۔

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ہٰذَا ؕ قَالُوْا شَہِدْنَا عَلٰۤی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْہُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَشَہِدُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِہِمْ اَنَّہُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ ۝ (ولو اننا پارہ ۸ رکوع ۲)

ترجمہ۔ (پھر ہم جنات اور بنی آدم دونوں سے مخاطب ہوکر پوچھینگے کہ) اے گروہ جن و انس کیا تمھارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے کہ تم سے ہمارے احکام بیان کریں اور تمھارے اس روز (قیامت) کے پیش آنے سے تم کو ڈرائیں۔ وہ عرض کریں گے ہم اپنے اوپر آپ ہی گواہی دیتے ہیں (یعنے اپنے گناہ کا اقرار کرتے ہیں) اور (واقع میں) دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا اور (اب انھوں نے آپ ہی) اپنے اوپر گواہی دی (یعنی اقرار کیا) کہ بے شک وہ کافر تھے۔

ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب۔

اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمھارے پاس پیغمبر تمھیں میں سے، بیان کرتے تھے اوپر تمھارے نشانیاں میری، اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات اس دن تمھارے کی سے۔ یہ کہا انھوں نے گواہی دی ہم نے اوپر جانوں اپنی کے اور فریب دیا تھا ان کو زندگانی دنیا کی نے اور گواہی دی انھوں نے اوپر جانوں اپنی کے یہ کہ وہ تھے کافر

ترجمہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب۔

اے جماعت جنّوں اور انسان کی! کیا تم کو نہیں پہنچے تھے رسول تمہارے اندر کے سُناتے تم کو میرے حکم اور ڈراتے اس دن کے سامنے آنے سے۔ بولے ہم نے مانے اپنے گناہ۔ اور ان کو بہکایا دنیا کی زندگانی نے اور قائل ہوئے اپنے گناہ پر کہ وہ تھے منکر۔

الحقوق والفرائض مولانا نے ایک کتاب الحقوق والفرائض بھی لکھی ہے۔ جامع حیات النذیر نے اس کا مقابلہ شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور و مستند کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے کیا ہے اور وہ مولانا کو فاضل اور شاہ صاحب کو مفضول ٹھہراتے ہیں لیکن مولانا شبلی نے جو حیات النذیر پر ریویو کیا ہے اُسکے آخری حصّہ میں حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں۔

"مجکو اس کتاب کے متعلق اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ مصنف نے مولانا اور شاہ ولی اللہ صاحب کا مقابلہ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ شاہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ لیکر مولوی نذیر احمد صاحب کی کتاب حقوق و فرائض سے موازنہ کیا ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کے ترجمے سے قرآن مجید کے محاسن کا اندازہ کرے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ ترجمے کی بدتر سے بدتر مثال ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ اس درجے کی کتاب ہے کہ مولانا نذیر احمد مرحوم کے لیے یہ فخر بس کرتا ہے کہ وہ اسکے دقائق اور محاسن کو بخوبی سمجھ سکتے تھے"

مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب علم الکلام میں فرماتے ہیں کہ "ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انھیں کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہیں رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس باز پسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔ شاہ صاحب نے علم کلام کے عنوان سے کوئی تصنیف نہیں کی اور اس بنا پر ان کو متکلمین کے زمرے میں شمار کرنا بظاہر موزوں نہیں لیکن ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس میں انھوں نے شریعت کے حقائق اور اسرار بیان کیے ہیں، درحقیقت علم کلام کی روح و رواں ہے۔ علم کلام درحقیقت اس علم کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت یہ ثابت کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ مذہب دو چیزوں سے مرکب ہے عقائد و احکام۔ شاہ صاحب کے زمانے تک جس قدر تصنیفات لکھی جا چکی تھیں صرف پہلے حصے کے متعلق تھیں۔ دوسرے حصے کو کسی نے مس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں، جس نے اس موضوع پر کتاب لکھی"۔

حیات النذیر پر ریویو کرتے ہوئے مولانا حالی نے بھی متذکرہ بالا قول کی تائید کی ہے اور مؤلف حیات النذیر نے جو اس قول کو تعجب سے دیکھا ہے اس پر لکھا ہے کہ "اس ریویو میں اتنی گنجائش نہیں ہو کہ شمس العلما (یعنی مولانا شبلی) کی رائے کی تائید دلائل کے ساتھ کی جائے لہٰذا یہاں ہم خواجہ حافظ کے مشہور شعر پر اکتفا کرتے ہیں۔

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست ۔۔۔ سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست"

الحاصل مولانا نذیر احمد کی کتاب الحقوق والفرائض بجائے خود کیسی ہی عمدہ کتاب کیوں نہ ہو لیکن اس کا مقابلہ حجۃ اللہ البالغہ سے کرنا مرزا صائب کے اس شعر کے مصداق ہوگا۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

اس قدر لکھنے کے بعد اب ہم مولانا نذیر احمد سے یہ مصرع پڑھتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

شمس العلما مولوی خواجہ الطاف حسین حالی

سنہ ۱۹۰۱ء میں نواب عماد الملک بلگرامی کی فرمایش پر خواجہ حالی نے اپنے کچھ حالات نہایت مختصر طور پر قلمبند کر کے انھیں بھیجے تھے اور ان کی نقل بطور یادداشت اپنے مستعملہ دیوان کے شروع کے خالی صفحات پر کر لی تھی۔ اب تک جو کچھ اور جہاں کہیں ان کے حالات شائع ہوئے ہیں وہ سب اسی ماخذ سے لیے گئے ہیں۔ اس لیے ہم بطور تبرک مولانا حالی کی وہ تحریر بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ اگر ہمیں کچھ اور کہنا ہوگا تو ہم اس کا اظہار بریکٹ کے ذریعہ سے کر دینگے۔ سرخیاں ہم نے قائم کی ہیں، اصل عبارت میں نہیں ہیں۔ تمنا

ولادت اور خاندان میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو

سلہ یہ حالات مولانا کے خود نوشتہ حالات سے لیے گئے ہیں اور کچھ متفرق طور پر کسوفِ شمسین اور دیگر رسالوں سے فراہم کیے گئے ہیں۔ تمنا

شاہجہاں آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے
واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک
شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور
تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا
شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ "پیر ہرات" کی اولاد میں
سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام
معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے
جنکا سلسلۂ نسب ۲۸ واسطہ سے حضرت ابوایوب انصاری تک اور
۱۸ واسطہ سے شیخ الاسلام تک اور دس واسطہ سے ملک محمود شاہ
انکو ملقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس
اور کرمان و عراق عجم کا فرمانروا تھا پہنچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین
اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت
عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علما و شعرا و دیگر اہل کمال کا
حد سے زیادہ قدردان تھا۔ اس لیئے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ
ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے
خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا چنانچہ سلطان
غیاث الدین نے انکو عمدہ اور پرحاصل دیہات پرگنہ پانی پت
میں اور معتدبہ اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش کے
اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے
ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور
تولیت مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطاب

عیدین اُن سے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جواب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے۔ وہ انھیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہداپورہ کے نام سے مشہور ہے بیٹی تھیں۔

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں سے بہت سے لوگوں نے اول سلطنت مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہان اودھ کی سرکار میں نہایت درجہ کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی ملک و مددِ معاش پر قانع رہے جو سلاطین اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً اُن کو عطا ہوتی رہی۔ میرے آبا و اجداد نے جہاں تک معلوم ہے ظاہرا کوئی خدمت دلّی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکری سررشتہ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور میرے والد (خواجہ ایزد بخش) نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لیئے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی، بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انھوں نے اول مجکو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے

ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہو گیا۔ انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لیکر آئے تھے، ان سے صرف و نحو پڑھی

تاہل مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلۂ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا، اسوقت میری عمر سترہ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔

دلّی کا قیام اور کسب علم میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلّی چلا گیا۔ اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں۔ اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں، میں نے نشو ونما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاصکر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اسکی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اسقدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ برخلاف اسکے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء مجہلے کہتے تھے۔ دلی پہنچکر جس مدرسہ میں مجکو شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلباء کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض

جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرا تھا۔ ڈیڑھ برس دلّی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ اُن لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔

میں نے دلّی میں شرح مسلم ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار ناچار مجھکو دلّی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلّی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

ملازمت اور ہنگامۂ غدر

۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی، صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزارے۔

اکتساب علم کا مشغلہ

اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ، اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا۔ اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاصکر علم ادب کی کتابیں

شرح اور لغات کی رو سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی
کی اصلاح یا مشورہ کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی
اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جسقدر اوپر ذکر کیا گیا۔

مرزا غالب کی شاگردی

جس زمانہ میں میرا دلّی جانا ہوا تھا مرزا اسد اللہ **خاں غالب** مرحوم کی خدمت میں اکثر
جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر اُن کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار
جو سمجھ میں نہ آتے تھے، اُن کے معنے اُن سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے
انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ اُن کی عادت تھی
کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو
ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا
کہ اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال
ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اُس زمانہ میں ایک
دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری
کی حالت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے
نکلنے پر مجبور کیا حسنِ اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں
نواب مصطفےٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے
جو فارسی میں **حسرتی** اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا
اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہو گئی۔ اور آٹھ سات برس تک بطور
مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ
کے فارسی اور اُردو کے شاعر تھے اسکی بہ نسبت اُن کا مذاق شاعری بمراتب

بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام **مومن خاں** کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ **مرزا غالب** سے وہ مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پُرانا شعر سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور اُن کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اسی زمانہ میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی اپنا کلام **مرزا غالب** کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے **شیفتہ** اور **غالب** دونوں متنفر تھے نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز **انیس** کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے **انیس** کے مرثیہ کا یہ پہلا مصرع پڑھا "آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے" اور کہا کہ **انیس** نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا۔

(چنانچہ مرزا غالب اور نواب شیفتہ سے استفادۂ شاعری کی نسبت جو مولانا کا خیال ہے وہ اُن کے اس شعر سے ہویدا ہے۔

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں　　غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا)

پنجاب گورنمنٹ بکڈپو کی ملازمت نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجکو مل گئی جس میں سب مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے، اُن کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاصکر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی لاہور ہی میں **کرنل ہالرائیڈ** ڈائرکٹر آف **پبلک انسٹرکشن** پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین **آزاد** نے اپنے پُرانے ارادہ کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں میں نے اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک **برسات** پر دوسری **امید** پر تیسری **رحم وانصاف** پر اور چوتھی **حب وطن** پر لکھیں (چار برس تک بک ڈپو میں رہکر لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی پر بدل کر آنا ہوا اور اسی زمانہ میں لاہور کے چیفس کالج میں بھی آٹھ ماہ تک اتالیق رہے مگر چونکہ یہ اسامی اُن کے مذاق کے موافق نہ تھی اس لیے پھر اپنی جگہ واپس آگئے)

تصنیفات نظم کے سوا نثر اُردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۶ء میں ایک کتاب **تریاق مسموم** ایک **پنڈت کریم الدین** کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہموطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا لکھی تھی۔ جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شایع کردیا تھا

اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دیدیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں اُسکو یونیورسٹی نے چھاپ کر شایع کردیا تھا مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجکو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی، جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چارسو روپے کا انعام دلوایا تھا اور جو اوده اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور انکی نظم و نثر پر ریویو لکھکر شایع کیا جسکا نام حیات سعدی ہے اور جسکے دس بارہ اڈیشن اسسے پہلے شایع ہوچکے ہیں پھر شاعری پر ایک مبسوط اسئے مضمون لکھکر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شایع کیا اسکے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جسمیں اُنکی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز اُن کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے یادگار غالب کے نام سے لکھکر شایع کی اور اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ حیات جاوید جو تقریبًا ہزار صفحہ کی کتاب ہے لکھی جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شایع ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرامر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں اسکے علاوہ تیس تیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق، علیگڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل

میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے، جو ہنوز شائع نہیں ہوئی جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے اس وقت سے اُن کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے سنہ ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریا کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شایع ہو چکی ہے۔

سنہ ۱۳۰۵ ہجری میں جبکہ میں اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس تھا، نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم، مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لیے سرسید احمد خان مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علیگڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغۂ امداد مصنفین ایک ایک وظیفہ تعدادی پچھتر روپیہ ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور سنہ ۱۳۰۹ھ میں جبکہ سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ، حیدر آباد گیا تھا اس وظیفہ میں پچیس روپیہ ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپیہ سکہ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجکو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے"

اینگلو عربک اسکول کی مدرسی کے زمانہ میں سرسید مرحوم نے اُن کو ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی چنانچہ انھوں نے سنہ ۱۸۷۹ء میں مدوجزر اسلام لکھا جو مسدس حالی

کے نام سے مشہور ہے۔ اُسکے دیباچۂ نثر سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔

"قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے، اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں، تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے، رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پانوں میں پڑی ہے، جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے، امرا جو قوم کو کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت کچھ دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے اور لکھ رہے ہیں، مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لیے ابھی تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس سے ہوگا مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر دو طرح کے خیالات گزرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے خیال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے"

یہ وہ زمانہ ہے جب لوگ سرسید کی پالیسی پر کھلم کھلا مخالفت کا اظہار کر رہے تھے اور اُن کے قول و فعل پر علانیہ طعن و تشنیع اور نکتہ چینیاں کی جاتی تھیں مولانا حالی نے اسی پُر آشوب وقت میں اس جوان مرد اور شیر دل ناصح مشفق (سرسید) کا کہنا پورا کیا۔ پرانی شاعری سے بچ کر ایک مسدس کی

بنیاد ڈالی اور اپنا فرض پورا کر دکھایا۔ یہ لاجواب نظم نہایت دلچسپ اور مؤثر ہے اور مسلمانوں کو غفلت سے بیدار کرنے میں ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئی۔ اگر مولانا کچھ نہ لکھتے اور اُن کی زندگی کا سرمایہ صرف یہ مسدس ہی شمار کیا جاتا تو بھی وہ ایک بڑے شاعر، ایک سچے قوم کے خادم اور خادمان قوم کی صفِ اول میں بیٹھنے کے قابل تھے۔

اعتدال و انصاف پسندی

مولانا کے شمائل و خصائل کا باب نہایت وسیع ہے اور حق یہ ہے کہ انکے اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل ہے وہ انسان تھے لیکن فرشتہ صفت وہ فرشتے تھے لیکن انسانی خصائص کے ساتھ۔ اُن کی خدمت بابرکت میں حاضر ہونے سے قلب کی عجب کیفیت ہوتی تھی۔ وہ سکون اور اطمینان خاطر میسر ہوتا تھا جو اولیائے کرام کی صحبت میں لوگوں کو حاصل ہوا ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال و انصاف پسندی تھی۔ وہ اپنے خلاف، اپنے اعزہ کے خلاف، اپنے دوستوں کے خلاف فتوے دے سکتے تھے لیکن انصاف اور اعتدال کو ہاتھ سے نہیں دے سکتے تھے۔

اندازاً بیس سال کی عمر میں غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیر تعلیم تھے۔ اس زمانہ میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خاں بہادر کی تائید میں تھا۔ اُنکے اُستاد نے پڑھکر بہت ناراضی کا اظہار کیا یہاں تک کہ اس کو چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا۔ لیکن استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ رسالہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر ایک وہابی مولوی کی تائید تھی اس لیے چاک کر دیا گیا۔ مولانا کے اعتدال و انصاف کی یہ سب سے

پہلی مثال ہے۔

عام خصائل بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے اور جو لوگ مولانا سے واقف ہیں وہ اس کی پوری تائید کریں گے کہ مولانا یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی برائی اُن کی زبان سے نہیں سُنی گئی ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے، مذہبًا نہایت بے تعصب تھے۔ ان کے والدین شیعہ تھے اور مرحوم کو یتیم چھوڑ کر والد ماجد انتقال کر گئے تھے۔ بچپن میں مذہب اہل سُنت میں تعلیم پائی لیکن اگر وہ شیعوں کی طرح تعلیم پاتے تو بھی ایسے ہی اعلیٰ خیال اور بے تعصب اور خیر خواہ اسلام شیعہ ہوتے۔ چونکہ آپ کے بڑے بھائی جنھوں نے آپ کی پرورش مثل اپنے بچوں کے کی تھی سُنّی ہو گئے تھے اور آپ کی تعلیم بھی سنّی طریقے پر ہوئی اسلیے آپ سنّی المذہب رہے۔ آپ بلند خیال، بے نفس، محب اہل بیت اور صوفی منش سنّی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو وہ نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریقۂ نماز کے علاوہ اور کسی طرح اس اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقے کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے عمومًا پسری اولاد سنی ہیں اور دختری اولاد شیعہ اُن کے پاس بیٹھنے اور باتیں سُننے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ مرحوم کا انتقال دو دن کے کرب کے بعد قرآن شریف اور ادعیہ سنتے سُنتے یکایک ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو ہو گیا۔

قرآن شریف میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى

یعنی عدل یا میانہ روی اختیار کرو، یہ بات تقوے سے قریب تر ہے۔ یہی عدل و میانہ روی مولانا کی خاص صفت تھی۔ اسکے ساتھ ساتھ رحم و مروت کی صفات بھی تھیں۔ پانی پت بلکہ اس تمام علاقے کو فخر ہو سکتا ہے کہ ایسا انسان کامل اس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجے کا اعتدال تھا عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی اور نیک آدمیوں کی قدر دانی میں اُن کی مثال ضرور ملے گی۔ مگر نہایت کم آخر زمانے میں جبکہ دماغ بے کار ہو گیا تھا اور لوگ اپنی عادات کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول و زخمی ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہے۔ انتقال کے وقت خدمتگار اُنکو الگ روتے تھے کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا۔ اور یہی حالت رشتہ داروں و اہل شہر کی تھی علیٰ ہذا قوم میں بھی کچھ کم افسوس نہیں ہوا۔

مولانا[1] کے استغنا اور سچی قناعت کی ایک بین مثال یہ ہے کہ مولانا جب

---

[1] مولانا سے مرحوم کے حلم و کرم کا ہر شخص پر وجد انگیز اثر ہوتا تھا اور ادنےٰ سے ادنےٰ درجے کے لوگ بھی جسقدر جلد ان کی خدمت میں بے تکلف ہو جاتے اور انھیں اپنا محرم راز بنا لیتے اس کی مثال میں یہ لطیفہ نقل کیا جاتا ہے جو سید ہاشمی فرید آبادی نے علیگڑھ میگزین سنہ ۱۹۲۱ء میں چھپوایا تھا۔ مولانا حالی اس زمانے میں بغرض تبدیل آب و ہوا فرید آباد گئے تھے جب کہ ذیل کا واقعہ پیش آیا۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب کا ناواقف نوکر خط بنانے کے لیے ایسے نائی کو لے آیا جو اگرچہ خاندانی حجام اور موروثی کسوت سے بھی آراستہ تھا لیکن حقیقت میں ایک نشہ باز

عربک اسکول دہلی میں ملازم تھے، اس زمانہ میں سرآسمان جاہ حیدرآباد
کے مدارالمہام تھے اور اُن کی مدارالمہامی کے زمانہ میں نواب وقارالملک
کادوردورہ تھا چنانچہ نواب وقارالملک بہادر کی تحریک سے نواب
سرآسمان جاہ بہادر نے ریاست سے سو روپے ماہوار کا وظیفہ مولانا حالی
کے لیے مقرر کردیا۔ باوجودیکہ مولانا کو جائداد نہیں ملی اور حالی سکے کے
سو روپے جو انگریزی سکے کے اسی روپے ماہوار کے قریب ہوتے ہیں
کوئی بڑی رقم نہ تھی لیکن انھوں نے اپنی گزراوقات کے لیے حالی سکے کے
سو روپے ماہوار کافی سمجھ کر عربک اسکول کی ملازمت سے استعفا دیدیا۔
سرسالار جنگ اول مدارالمہام حیدرآباد دکن کی فیاضی اور مردم شناسی
کے ساتھ قدرافزائیاں مشہور عالم ہیں۔ سرسید کا اُن پر پورا اثر تھا اور جب
کسی کی نسبت سرسید سفارش کرتے اسی کو حیدرآباد میں عمدہ جگہ مل جاتی تھی

بقیہ صفحہ ماقبل آوارہ مزاج سا آدمی تھا۔ خط بنا تے بنا تے کہنے لگا "اجی میاں تو ایسا
ایک کام تو آپ ہمارا بھی کردیجیے" اور کام یہ بتایا کہ "حضور، میرا ایک عورت پر
دل آگیا ہے مگر اُسکے بھائی بندوں نے بہکا دیا، شادی نہیں کرتی .... حضور
کوئی ایسا تعویذ لکھ دیں کہ .... اپنے آپ میری خوشامد کرتی پھرے ...."
مولوی صاحب کو بہت ہنسی آئی مگر ضبط کیا اور نام پتہ وغیرہ دریافت کرکے
فرمایا کہ "گھبراؤ نہیں تمہارے لیے ہم کوئی تدبیر کرینگے" پھر جب محلے کے ذی وجاہت
لوگ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مرحوم نے بہت شدومد سے
چھٹو نائی کی سفارش کی اور جب تک انھیں یہ یقین نہ دلایا گیا کہ اس کے ساتھ
شادی کرنا بیچاری عورت کو مصیبت میں پھنسانا ہے، وہ چھٹو کی وکالت
کرتے رہے۔

اگر مولانا حالی بھولوں بھی اشارہ کرتے تو یقیناً انھیں حیدرآباد میں اعلیٰ درجے کا عہدہ مل جاتا لیکن اُن کی غیور طبیعت نے اسے جائز نہ سمجھا کہ وہ اپنے لیے خود اس قسم کی کوئی تحریک کرتے علی گڑھ کالج میں فارسی کی پروفیسری ملنا بھی کوئی دشوار امر نہ تھا لیکن انھوں نے اس کو بھی پسند نہ کیا کہ وہ اُسکے لیے کوشش کرتے بلکہ اپنی ذات کو قوم کے لیے زیادہ مفید بنانے کی غرض سے آزاد رہ کر قومی خدمت کو زیادہ مناسب سمجھا۔

تصانیف پر ایک مولانا کی تصانیف کا جہاں تک پتہ چلا ہے چھپی ہوئی کتابوں میں سب سے پہلے ایک خاص ضخیم کتاب تریاق مسموم مذہبی مناظرے میں ہے جس میں پادری عماد الدین کی کتاب ہدایت المسلمین کا جواب نہایت شاق لیکن متانت سے دیا گیا ہے افسوس ہے کہ یہ کتاب مفقود ہے۔ غالباً مولانا نے ۱۸۶۸ء سے پہلے تصنیف کی تھی۔ مولانا کا ایک رسالہ پادری عماد الدین کی تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے اس سے تین چار برس بعد کی تصنیف ہے اور غالباً مولوی غلام الحسنین صاحب کے کتب خانے میں اس کی کاپی موجود ہے، اور کہیں نہیں ملتا اس میں پادریوں کی فلسفی اور غیر متعصب یورپین اصحاب کی رائے کا مقابلہ آنحضرت صلعم کے متعلق نہایت خوبی سے کیا گیا ہے لاہور کے زمانہ قیام میں مولانا نے ایک کتاب مجالس النساء عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرائے میں لکھی تھی۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے عبارت نہایت سلیس ہے اور مہذب اور شریف عورتوں کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ مابعد کی تصانیف جنھوں نے ہندوستان بلکہ ایشیا کے ادب اور اعلیٰ اور پاک طرز تحریر کے لحاظ سے انقلاب عظیم پیدا کیا مشہور انام ہیں۔ اور مولانا ہی کو یہ فخر حاصل تھا

کہ اُن کی زندگی میں مسدس حالی کا ترجمہ پشتو اور سندھی میں،
مناجات بیوہ کا ترجمہ علاوہ دس زبانوں کے اعلیٰ سنسکرت میں
رباعیات حالی کا ترجمہ انگریزی میں اہل زبان نے کیا ہے سوانح عمری
حکیم ناصر خسرو علوی لجنی، اعلیٰ درجہ کی فارسی سوانح عمری ہے جسکے ساتھ
حکیم موصوف کا سفرنامہ بھی ہے۔ اندازاً ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی حیات
سعدی جس نے جدید قسم کی سوانح عمری کی بنیاد مشرق کے ادب میں ڈالی
اندازاً ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ مقدمہ شعر و شاعری مع دیوان حالی
۱۸۹۳ء میں شایع ہوا۔ بلحاظ نقادی، شاعری اور اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات
شاعرانہ کے یہ کہنا بڑا مبالغہ ہے کہ خود ہی اپنی نظیر ہے۔ بعض جدید غزلیں سطحی
نظر والوں کو خشک معلوم ہوتی ہیں مگر اعلیٰ فلسفے اور اخلاق سے مملو ہیں [illegible]
اس سے بہتر نہیں دکھا سکتا۔ ایڈیشن رقعات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
مع نمونہ نثر فارسی مولانا مرحوم۔ اپنے مرحوم دوست اور محسن کی یادگار کے
طور پر چھپوایا ہے۔ اس کو مولانا کی تصنیف میں شمار نہ کرنا چاہیے مگر مولانا کے
کاموں اور محنتوں میں اس کا شمار ضرور ہے یادگار غالب، نہایت دلچسپ
اعلیٰ درجہ کی مفصل تنقیدی سوانح عمری ان کے استاد شعر نواب اسد اللہ خاں
غالب کی ہے اور مشہور کتاب ہے جو ۱۸۹۷ء میں شایع ہوئی شکوۂ ہند
مشہور ترکیب بند ۱۸۸۷ء میں شایع ہوا۔ مثنوی مناجات بیوہ، یہ شکوۂ ہند
اور یادگار غالب کے درمیانی زمانہ میں شایع ہوئی اور بلحاظ قوت، درد
اور خالص ہندی نظم کے مولانا کی بہترین تصانیف میں ہے حیات جاوید
سرسید احمد خاں کی نہایت اعلیٰ درجہ کی سوانح عمری ہے جسکے پڑھنے سے
اکثر مباحث اور مطالب جو مسلمانوں کی تمدنی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی

معاملات سے متعلق ہیں حل ہوتے ہیں نثر نہایت پختہ اور عالی ہے مجموعہ نظم حالی مولانا حالی کی متفرق نظموں کا مجموعہ چھپوایا گیا تھا جسکی تعداد شاید اب بڑھ گئی ہے مضامین حالی مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم نے مولانا کے نثر مضامین اخباروں اور تہذیب الاخلاق سے لیکر ۱۸۹۳ء

سلہ مولوی سید وحید الدین صاحب سلیم اس وقت حیدرآباد کی عثمانی یونیورسٹی میں اردو ادبیات کے پروفیسر ہیں۔ وطن مالوف پانی پت ہے۔ خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ عربی کے تمام درسی علوم پڑھے ہیں۔ فارسی ادب کی انتہائی کتابیں پڑھی ہیں اور پڑھائی ہیں۔ آپ کے عربی کے استاد مولوی فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر عربی اورنٹیل کالج لاہور تھے جن سے آپ نے عربی ادب کی تعلیم پائی تھی۔ دوسرے عربی کے استاد شمس العلما مولانا عبداللہ ٹونکی تھے جن سے فقہ حدیث اور منطق و فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ انگریزی نہیں پڑھی مگر علوم جدیدہ میں وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ شاعری سے بچپن سے طبیعت کو لگاؤ تھا چودہ برس کی عمر میں ایک فارسی قصیدہ ایک سو ایک اشعار کا عرفی کی زمین میں لکھا تھا جو حضرت مولانا سید غوث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی مدح میں تھا اسی وقت سے شہرت کی بنیاد پڑی۔ لاہور میں عربی اور فارسی زبان میں بہت اشعار لکھے مگر اس خیال سے کہ غیر زبانوں کا کلام زندہ نہیں رہتا اس مشغلہ کو ترک کر دیا۔ اور صرف اردو میں شاعری اختیار کی۔ اول غزلیں لکھیں اور اسی قدیم طریقہ پر جس پر کہ اب تک ہندوستان کے شعرا چل رہے ہیں۔ لیکن پھر قومیات کی طرف مائل ہوئے اور قومی نظمیں لکھنی شروع کیں حیدرآباد یونیورسٹی سے تعلق شروع ہونے سے پیشتر آپ تعلیم کا کام بہاولپور کے کالج اور رامپور کے ہائی اسکول میں بھی انجام دے چکے تھے۔ سرسید کی وفات سے چند سال پہلے آپ ان کے لٹریری اسسٹنٹ مقرر ہوئے اور تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں مدد دیتے رہے اسی زمانہ سے آپ نے نثر لکھنی شروع کی۔ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ منتھلی اور علی گڑھ گزٹ

کے قریب تین چار سو صفحات پر چھپوائے تھے اب غالباً نہیں ملتے

بقیہ صفحہ ماقبل میں آپ کے مضامین چھپتے رہے۔ سرسید کی وفات کے بعد رسالہ معارف علی گڑھ سے نکالا۔ اس رسالہ کا معیار ایسا اعلیٰ تھا کہ اس کی گونج دنیائے ادب میں آجتک باقی ہے۔ اس رسالہ کی ادارت میں کچھ دنوں آپ کے ساتھ نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں مرحوم رئیس دتاولی شریک رہے۔ بعد ازاں آپ تنہا ہی اسکو چلاتے رہے نواب محسن الملک مرحوم جب مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے سکریٹری ہوئے تو اس زمانے میں آپ پھر علی گڑھ گزٹ کے اڈیٹر مقرر ہوئے اور ابتدائے زمانہ نواب وقار الملک مرحوم تک اس خدمت کو نہایت عمدگی سے انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد آپ لکھنؤ کے مسلم گزٹ کی اڈیٹری پر تشریف لے گئے جو دہلی دربار کے بعد نکالا گیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جبکہ مسلمانوں نے اپنی سیاسی پالیسی تبدیل کردی تھی۔ اس اخبار کے طرز بیان اور مضامین کو آجتک لوگ نہیں بھولے۔ کانپور مسجد کے جھگڑے میں آپ نے مجبوراً اس اخبار سے قطع تعلق کر لیا اور زمیندار لاہور کے چیف اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس کا پریس ضبط ہونے پر آپ اپنے وطن چلے آئے پھر کسی اخبار کی اڈیٹری کے لیے باہر نہیں گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے پہلے دارالترجمہ کا محکمہ قائم کیا گیا تھا تاکہ وہ یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے درسی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے کرے مگر اصطلاحات کے ترجمہ میں دقت پیش آئی مختلف مترجموں کی رائے مختلف تھی۔ چونکہ مولوی صاحب اس مضمون پر برسوں غور کر چکے تھے اس لیے آپ اس کام میں مدد دینے کے لیے بلائے گئے۔ آپ نے یہاں بیٹھ کر ایک معرکۃ الآرا کتاب اس مسئلہ پر لکھی جس کا نام **وضع اصطلاحات** ہے اس میں آپ نے اردو زبان کی قدرتی ساخت اور اس میں الفاظ سازی کے قدیم طریقوں کو مفصل بیان کرکے وضع اصطلاحات کے اصول معہ مثالوں کے سمجھائے ہیں۔ اس کتاب نے اصطلاحوں کے وضع کرنے کی مشکل حل کردی۔ اس کے سوا اور کوئی مستقل کتاب مولوی صاحب نے

مجموعہ نظم فارسی (ضمیمہ کلیات اُردو) آخر عمر میں مولانا کی خواہش تھی کہ

بقیہ صفحہ ماقبل کسی مضمون پر نہیں لکھی۔

شاعری میں جو کچھ کلام آپ نے حیدر آباد پہونچنے سے پہلے کیا وہ تقریباً سب ضائع ہو گیا۔ البتہ کچھ نظمیں معارف، مسلم گزٹ اور زمیندار میں موجود ہیں مگر وہ فرضی نام سے چھاپی گئی ہیں۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب ہمیشہ سے اپنے تئیں شاعر مشہور کرنے سے گریز کرتے رہتے ہیں۔ حیدر آباد میں ایک ماہوار مشاعرہ ہوتا ہے جس میں کہنہ مشق شاعر جمع ہوتے ہیں۔ دوستوں کے اصرار سے اُس میں جانے لگے اور انھیں کے کہنے سے اپنا کچھ جمع کرنے لگے۔ اسی وقت سے آپ کا کلام ملک کے رسالوں اور اخباروں میں شایع ہونا شروع ہوا۔ مگر اب بھی آپ اپنے کلام کا مجموعہ شایع کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے غزلوں میں آپ وہ تمام عیوب مدت ہوئی ترک کر چکے ہیں جو قدیم اُردو شاعری میں ہیں اور جن کی اصلاح پر مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں زور دیا ہے۔ آپ نے غزل کے دائرہ کو وسیع کر دیا ہے۔ ہر قسم کے مضامین جن کا تعلق واردات قلب سے ہے اس میں درج کرتے ہیں۔ تصوف اور فلسفہ کا عنصر زیادہ ہے مگر سب کچھ استعاروں کے پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔ یہ استعارے اکثر نئے ہوتے ہیں اور نہایت خوشنما۔ انداز بیان اور خیالات میں جب تک کوئی جدت نہ ہو آپ اکثر شعر کو پسند نہیں کرتے۔ غزلوں کے علاوہ مستقل نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں سے بہت سی طبع زاد ہیں اور بہت سی انگریزی شعرا کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ مگر لفظی ترجمہ آپ کسی نظم کا نہیں کرتے۔ شاعر کے کلام کی روح کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اسکو اپنے لفظوں میں ادا کرتے ہیں اور یہی بہترین طریقہ غیر زبانوں کی نظموں کو اپنی زبان میں ڈھالنے کا ہے۔

نثر میں آپ سرسید کے اسکول کے پیرو ہیں جن اخباروں اور رسالوں کا نام لیا گیا ان میں مولوی صاحب کے بہت سے مضامین درج ہیں۔ اگر اُن کا انتخاب کیا جائے

اپنی اردو کلیات مرتب کر کے چھپوائیں۔ افسوس ہے کہ بیماری نے کام مکمل نہ ہونے دیا لیکن اس قدر کامیابی ہوئی کہ زبانِ ہوئے کے چند روز قبل ہی مولانا کا فارسی اور عربی مجموعہ پریس میں جا چکا تھا مکتوباتِ حالی دو جلدوں میں ان کے صاحبزادہ خواجہ سجاد حسین صاحب نے ۱۹۲۵ء میں ترتیب دیکر چھپوائے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب جو مشہور مقدمہ نگار ہیں ان مکتوبات کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ خطوں کے اس مجموعے میں جو اب چھپ کر شائع ہوا ہے زیادہ تر خط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں روزمرہ کی معمولی باتیں آئے دن کے آلام و افکار۔ اپنی اور دوسروں کی بیماری اور مصیبت کا ذکر ہے۔ مگر ان میں بھی ایک بات پائی جاتی ہے۔ علاوہ ان کے بہت سے خط احباب اور ہم عصروں کے نام ایسے بھی ہیں جن میں ان کے دلی خیالات اور ان محاسن کا پتہ لگتا ہے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے"

بقیہ صفحہ ما قبل تو وہ اردو ادب میں ماسٹر پیس (شہپارہ) کا علم رکھتے ہیں۔ آپ موٹے عربی الفاظ سامعین کو مرعوب کرنے کے لیے اپنی عبارت میں نہیں لاتے۔ نہ ارادتاً مصنوعی ترکیبیں تراش کر اپنی عبارت کو اُن سے مزین کرنا پسند کرتے ہیں جیسا کہ آجکل کے بعض اردو انشا پردازوں کا طریقہ ہے۔ آپ ہر مضمون کو سادگی اور روانی سے لکھتے جاتے ہیں۔ جہاں خیال خود زور کرتا ہے وہاں بے تکلف نہایت فصیح اور پرجوش الفاظ بے ساختہ قلم سے نکلنے لگتے ہیں جس میں تصنع اور آورد کو مطلق دخل نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر عبارت خود بخود ولولہ انگیز اور موثر ہو جاتی ہے۔ خدا کرے کہ آپ عرصہ تک زندہ رہیں۔ اور ادب اردو کی خدمت بجا لاتے رہیں۔

آمین ثم آمین

"ان خطوں سے مولانا کی بعض عادتوں اور خصلتوں کا بھی پتہ چلتا ہے اور جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ انھیں پڑھ کر بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کس قدر ہمدردی اور شفقت تھی۔ جب اپنے کسی عزیز یا دوست کو دیکھتے تھے کہ اس سے کچھ لغزشیں ہوگئی ہیں یا کسی معاملہ میں ضرورت سے زیادہ سخت ہے تو وہ اس قدر نرمی اور محبت سے سمجھاتے تھے یا اُس کا پیرایہ ایسا اختیار کرتے تھے کہ سننے والے کو کبھی بُرا نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ اُن کے کہنے کا اثر ہوتا تھا"

"مولانا کے مزاج میں مزاح بھی تھا مگر بہت لطیف۔ چنانچہ ان خطوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے"

آگے چل کر مولوی عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہے، جو خیال جس طرح اسکے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کے بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ کہ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے"[1]

مولانا کی نثر | مولانا حالی کی نثر میں یہ خصوصیت ہے کہ معنی اور

[1] یہ رائے خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم کی ہے۔

الفاظ بالکل برابر برابر ہیں۔ کلام میں کہیں اہمال یا اشکال نہیں بعض جگہ لفظ البتہ مشکل ہیں۔ اس زمانہ میں تنقید اور رائے کے لیے اس سے بہتر طریقۂ ادا نہیں ہو سکتا۔ سلاست کلام میں سرسید کا درجہ مولانا حالی سے بہت زیادہ ہے۔ بامحاورہ اور دلچسپ عبارت لکھنے میں پروفیسر آزاد یقینی بالا ہیں۔ مگر جو فلسفی عمق حالی میں ہے آزاد میں اس کا پتہ نہیں۔ اور لٹریچر کے جن رموز پر حالی پہنچے ہیں سرسید وہاں تک نہیں پہنچ سکے مولانا حالی کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دل ایک ایسا شفاف اور پاک دریا ہے جو نہایت صفائی سے بہ رہا ہے جس میں کدورت وغبار بالکل نہیں ہے اور جن کے کلام سے ہر قسم کے ادبی اور اخلاقی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں مگر کسی قسم کی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی"

مولوی عبدالحق صاحب بی اے تحریر فرماتے ہیں:۔

"اُن کے (مولانا حالی کے) کلام نے اردو شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور یہ اسی کا طفیل ہے کہ آج اُردو شاعری کا قدم ترقی کی طرف نظر آتا ہے اور اسی طرح اُن کی متین اور بچی تلی نثر اور تنقید نے اُردو ادب میں ایسا بے بہا اضافہ کیا ہے کہ جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق کرتا ہے یہ چیزیں ہمارے دل میں ان کا ادب واحترام پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف اُن کی سیرت ہے، اُن کے پاکیزہ اخلاق و اطوار، اُن کی دلسوزی اور ہمدردی کا دلوں پر اثر پڑتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑے جادو بیان یا خوش تقریر نہ تھے مگر ان کی باتوں میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ لوگوں کے دل خود بخود ان کی طرف کھچ جاتے تھے۔ وہ کبھی کسی کی مذمت یا برائی سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی نرمی اور خوش اسلوبی سے روکتے رہتے تھے۔ یہاں تک

کہ جن لوگوں نے اُن پر سخت اور بیجا تنقیدیں کیں اُن کو بھی انھوں نے سراہا اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا اور کوئی ایسی چیز لکھتا جس میں ذرا بھی خوبی کا پہلو ہوتا تو اس کی دل افزائی فرماتے اور خوش ہو کر تعریف کرتے تھے ہمدردی کا یہ حال تھا کہ دوسرے کا درد دیکھ کر خود تڑپنے لگتے تھے باوجود ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر ہونے کے مزاج میں بیحد انکسار اور فروتنی تھی"

مولانا کی نثر کے متعلق ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولانا کی نثر میں سادگی اور سلاست بیحد پائی جاتی ہے لیکن اسی کے ساتھ اُن کی زبان میں لوچ بھی ہے جس کی وجہ سے ناظرین متاثر ہوتے ہیں۔ وہ جس مضمون کو ادا کرتے ہیں، نہایت سادہ عبارت میں تحریر کرتے ہیں لیکن اُن کے خیالات کا تسلسل اور اُن کی زبان کی پختگی خود بخود دل میں اثر کرتی رہتی ہے۔ تصنع اور آورد کا نام نہیں۔ وہ بعض مصنفین کی طرح سوچ سوچ کر عمدہ الفاظ جمع نہیں کرتے بلکہ بے تکلف جو لفظ دل سے نکلتا ہے اسے زبان سے ادا کرتے ہیں اور حوالۂ قلم کرتے جاتے ہیں۔ اُن کی تصنیفات میں آمد کا رنگ نمایاں ہے اور اعلیٰ شاعر ہونے کی وجہ سے الفاظ میں تناسب اور موزونیت خود بخود پیدا ہو گئی ہے یہانتک کہ ان کے کسی لفظ کو بدل کر دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں رکھ سکتے۔ چونکہ مولانا حالی کو مرزا غالب اور شیفتہ جیسے سخن شناس اور سخنوروں کی صحبت میسر آتی تھی اس لیے آپکی زبان خاص دلّی کی ٹکسالی زبان ہے اور اُن کی نثر بھی بجائے خود ایک سند کا کام دیتی ہے۔

اُن کی جملہ تصنیفات میں ایک لفظ بھی محاورے کے خلاف غلط یا استعمال نہیں کیا گیا

حالانکہ اس دور کے بعض مصنفین کی کتابوں میں یہ نقص پایا جاتا ہے۔ البتہ اُن کی تحریرات میں وہ شگفتگی اور دلآویزی نہیں ہے۔ جو آزاد اور شبلی کی تصنیفات میں ہے۔ انگریزی زبان کے لحاظ سے ہم آزاد کو اپنی زبان کا لارڈ میکالے اور حالی کو لارڈ مارلے کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میکالے کا طرز اب متروک و مفقود ہے اور مارلے کا انداز بیان دلکش و مقبول ہے۔ مولانا شبلی میں اگر واقعات تاریخ کو اپنے مفید مطلب توڑ مروڑ کرنے کی عادت نہ ہوتی اور غلط نتائج استنباط کرنے کا چسکا نہ ہوتا تو غالباً اُن کی کتابیں بے حد مقبول ہوتیں اور مستند مانی جاتیں لیکن شاید یہ شگفتگی اور رنگینی اُن کی کتابوں کو نصیب نہ ہوتی۔

مولانا کی نظم مولانا کی نظم کے متعلق رائے دینا ہمارے نقطۂ نگاہ سے یہاں ضروری نہیں ہے۔ تاہم اتنا کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا شمار درا صل جس طبقے میں ہے وہ شاعروں سے بہت بالا ہے یعنی حکما و معلمین اخلاق اور مصلحین اقوام میں۔ صرف ایک شاعر سے اُن کو مثال دے سکتے ہیں یعنی سعدی علیہ الرحمہ سے لیکن سعدی کے کلام میں جہاں فطرت انسانی کی واقفیت بہت زیادہ ہے وہاں یہ عیب بھی ہے کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔ اور وہ ایسی باتیں ہیں جو عورتوں اور بچوں کو نہیں پڑھائی جاسکتیں۔ مولانا حالی کے ہاں یہ بات نہیں۔ سعدی ایک کامل شخص ہیں مگر وہ انسان کو کامل بنانا چاہتے تھے۔ حالی کامل شخص ہیں مگر وہ قوم کو کامل بنانا چاہتے تھے۔ جب درسیات میں حالی کا کلام پڑھایا جانے لگے گا اس وقت اس کے فوائد معلوم ہونگے۔

اپنے ہمعصروں میں رتبۂ امتیاز مولانا حالی کو اپنے ہمعصروں میں یقیناً یہ

درجۂ امتیاز حاصل ہے کہ وہ جس درجہ کے باکمال نثر نگار تھے، اسی درجہ کے
شاعر بے مثال تھے۔ نظم و نثر دونوں میدانوں میں اعلیٰ درجہ کے یکّہ تاز و
شہسوار تھے۔

نثر حسن و جمال کی صورت   نظم غنج و دلال کی صورت

ان کے ہم عصر صرف نثر کے مرد میدان تھے اور اگر کسی نے کچھ نظم لکھی بھی ہے
تو وہ حالی کے درجے کو نہیں پہنچتی۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تیسرے دور کے
مصنفین میں سے حقیقتاً ہر ایک اپنے رنگ میں منفرد ہے اور اس میں کمال
کا درجہ رکھتا ہے، اس لیے ان میں سے کسی ایک کو قطعیت کے ساتھ دوسرے
پر ترجیح دینا ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ تاہم بعض خصوصیات کے لحاظ سے
ایک کو دوسرے پر علانیہ تفوق حاصل ہے مثلاً موجودہ سلیس اور عام فہم طرز
تحریر کو علمی تصانیف میں رواج دینے کا فخر سرسید کو حاصل ہے۔ سوانح عمریاں
لکھنے کی بنیاد حالی کے ہاتوں پڑی اور فن تنقید کا رواج ہماری زبان میں
ہوا۔ انگریزی زبان کی مناسبت سے اردو میں ایک خالص انشا پردازانہ
طرز ادا کی ایجاد کا سہرا آزاد کے سر ہے۔ دقیق علمی مباحث اور تاریخی واقعات
کے بیان میں شگفتگی اور دل آویزی پیدا کر دینا شبلی کا کام ہے۔

شمس العلماء کا خطاب

مولانا حالی کو سنہ ۱۹۰۴ء میں برٹش گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب عنایت کیا جس کے وہ ہر طرح اہل تھے۔ اگرچہ
ان کے ہم عصر مصنفین کو ان سے بہت پہلے یہ خطاب مل چکا تھا لیکن مولانا سے
مرحوم و مغفور میں جاہ طلبی کا مادہ نہ تھا اور نہ اپنے لیے کسی امر کی بھی کوشش
کرنا پسند کرتے تھے اس لیے بلا رغبت و خواہش مولانا حالی کو گورنمنٹ نے
یہ خطاب دیکر اپنی قدر دانی کا ثبوت دیا۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی پریسیڈنٹی

سنہ ۱۹۰۷ء کے اجلاس آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کراچی کے آپ پریسیڈنٹ منتخب کیے گئے اور مسلمانوں کے اختیار میں جو اس وقت سب سے زیادہ قومی عزت کی جگہ تھی وہ مولانا حالی کی خدمت میں پیش کر کے انھوں نے اپنی احسان مندی اور علم دوستی کا ثبوت دیا۔

راقم سے مولانا حالی کا برتاؤ

راقم ہمیشہ مولانا حالی کے تعارف کو اپنی عزت اور خوش قسمتی سے تعبیر کرتا رہا ہے سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۱ء میں خاکسار کو خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم کے ذریعہ سے میرٹھ میں مولانا حالی کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ بعد ازاں سنہ ۱۹۰۴ء میں جب مولانا حالی دوبارہ میرٹھ تشریف لے گئے تو زیادہ بہتر طور پر شناسائی ہوئی۔ اس زمانہ کے بعد سے مولانائے مرحوم مجھ سے بالکل مربیانہ اور بزرگانہ برتاؤ کرتے رہے۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء میں مولانا کی یہ بندہ پروری اور کرم فرمائی ہوئی کہ پانی پت سے غازی آباد تشریف لا کر نیاز مند کی تقریب شادی میں شرکت فرمائی۔ حالانکہ پیرانہ سری اور ضعف کی وجہ سے مولانائے مرحوم اس قابل نہ تھے جو اس قدر تکلیف گوارا فرماتے لیکن بندہ کے حال پر یہ اُن کی خاص الخاص عنایت تھی جو عزت افزائی کا باعث ہوئی۔ اس بارہ میں یہ احقر نہایت خوش نصیب تھا کہ روشن خیال طبقہ میں مولانا حالی، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم، خان بہادر سید محمد حسین شوق متولی وقف منصبیہ اور طبقۂ علماء میں شیخ الہند حضرت مولانا مولوی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی حضرت شاہ عبدالرحیم مرحوم رائے پوری اور دیگر علمائے دیوبند شریک ہو کے اور راقم کو ممنون منت فرمایا۔

ذیل میں مولانا حالی کی تصنیفات سے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔
مولانا حالی نے ایک کتاب مجالس النساء تحریر فرمائی ہے جسکے دو حصے ہیں
پہلے حصے میں سے جو ۱۸۷۴ء میں طبع ہو کر شایع ہوا حسب ذیل اقتباس کیا جاتا ہے
یہ ابتدائی زمانہ کی کتاب ہے لیکن عورتوں کی زبان اور اُنکے اظہار خیالات کے
پیرایہ کو اس عمدگی سے ہو بہو دکھلایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی مسلمان شریف
عورتوں کی گفتگو کا نقشہ کھینچدیا ہے۔

مجلس

آتوجی کے ساتھ محمودہ بیگم اور اُس کی ماں اور مریم زمانی بیگم کی گفتگو

(۱) آتوجی آداب برخوردار بوڑھ سہاگن بیگم یہ تمھارے
ساتھ اور کون ہیں ہیں آتوجی آپ نہیں جانتیں میری بھتیلی ہیں۔
اے کون ہیں مریم زمانی حضرت بندگی بھلا بیٹا، بہت سی عمر
میاں جیئے بچے جئیں۔ بوا تم کہاں ہو جی میں ابھی آکے اتری ہوں
آؤ بیوی بیٹھ جاؤ۔ کہو مزاج تو اچھا ہے حضرت خدا کا شکر ہے
بچے اچھے ہیں سب آپ کو دعا دیتے ہیں مرزا پاس سے
خط پتر آتا ہے جی ہاں دسویں پندرھویں آتا رہتا ہے احمد مرزا
کو مکتب میں بٹھا دیا جی مکتب میں بیٹھے تو اسے بہت دن ہوے
بوا اللہ رکھو اب اس کی کیا عمر ہو گی جی اسے چاند دیکھے آٹھواں برس
لگے گا۔ بھلا ہوا خدا کرے تمھاری کوکھ ٹھنڈی رہے تمھیں اپنے
بچہ کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں ؛ اب تو اللہ رکھو فارسی اُردو کے حرف
خاصی طرح اٹھانے لگا ہوگا آتوجی خدا خدا کرو ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے
فارسی اُردو تو درکنار رہی ابھی تو اسنے قاعدہ بغدادی بھی ختم نہیں کیا۔

بُوا کیا سبب   حضرت آپ جانتی ہیں لڑکا پڑھانا ایسا ہی ہوتا ہو
ہاں بی سچ کہتی ہو   بیگم تم نے کیا کیا پڑھا ہے۔   حضرت
کچھ پڑھا ہو تو بتاؤں   ہے ہے لوگو اشراف زادیوں نے کیا
لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا، کیسی ان گھروں پر جہالت چھا گئی۔ کیسا اُلٹا زمانہ آگیا۔
محمودہ بیگم ذرا سوچنے کی بات ہے، ہمارے ملک کے ہندو مسلمان جو اشراف
کہلاتے ہیں سب کے ہاں قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ بیٹی کو کچھ پڑھائیں یا
نہ پڑھائیں پر بیٹے کو ضرور پڑھواتے ہیں۔ کیا غریب اور کیا امیر، ہر شخص اپنی
بساط کے موافق بیٹے کی تعلیم میں ضرور کوشش کرتا ہے، پر میں نہیں جانتی
اس ملک کی برکت کہاں اڑ گئی۔ جب دیکھا یہی دیکھا کہ سو میں سے دو چار
بچے جو ایسے ہی صاحب نصیب اور ہونہار ہوئے وہ تو لکھ پڑھ کر کسی قابل
ہو گئے اور باقی وہی کو دن کے کودن رہے۔ ہاں اب اب کر کے سرکاری
مدرسوں میں پڑھنا لکھنا بے شک زیادہ ہو گیا ہے پر آدمیت سی چیز وہاں بھی
جی جم آتی ہے۔ کوئی یہ دیکھنے والا نہیں کہ ان بچوں کو ایک سا لکھنا پڑھنا کیوں
نہیں آتا۔ ان کی عادتیں کیوں نہیں مستور نہیں اُن کو آدمیت کیوں نہیں
آتی۔ بہت کسی نے پوچھا تو یہ کہدیا میاں اپنی اپنی قسمت ہے جس کے نصیب
اچھے ہوئے وہ کچھ نے نکلا جو بدنصیب ہوا وہ رہ گیا۔ اے صاحب بی کون
کمبخت ہوگا جو یہ نہ جانتا ہوگا۔ تم ایک دفعہ کہتے ہو ہم سو بار کہتے ہیں کہ
دنیا میں سارا ظہور نصیبوں ہی کا ہے۔ پر اتنا تو سمجھو کہ جو آدمی نصیبوں ہی پر
بیٹھا رہے اور کام کو کام کے طور پر نہ کرے وہ اپنی مراد کو کیا خاک پہنچے گا
ہم تو جب جانیں کہ پیاس میں کوئی پانی نہ پیے اور اس کی پیاس آپ ہی آپ
جاتی رہے یا بھوک میں کوئی کھانا نہ کھائے اور اُسکا پیٹ خود بخود بھر جائے

کیوں بی بی میں سچ کہتی ہوں یا جھوٹ حضرت وہ کون احمق ہوگا جو ان باتوں کو جھوٹ کہدے گا بھلا صاحب پھر وہ کیا بات ہے جو یہاں کے بچوں پر آدمیت کا پرچھاواں نہیں پڑنے دیتی۔ بڑی بیگم یہ جو میں نے کہا تم نے بھی سُنا۔ آتو جی میں سب سن رہی ہوں۔ بڑا انھاری سمجھ میں بھی آتا ہے یہ کیا بھید ہے آتو جی میں تو پھر بھی کہوں گی کہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ دوسرے یہ بھی بات ہے کہ سارے بچے ایک سے نہیں ہوتے۔ کوئی غیرت والا ہے جو ایک ذراسی گھرکی کو ساری عمر نہیں بھولتا کوئی ایسا بے غیرت ہوتا ہے کہ جتنا مارو جتنا کوٹو وہ دن بدن چکنا گھڑا ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی کا ذہن اچھا ہے کسی کا بُرا ہے۔ کوئی شوخ ہے کوئی غریب ہے۔ کوئی کھلنڈرا ہے کوئی محنتی ہے۔ غرض خدا تعالے نے جیسی طرح طرح کی مخلوق بنائی ہے ویسے ہی طرح طرح کے نصیب وہ اپنے ساتھ لائے ہیں اس میں کسی کا کچھ اجارا نہیں۔

بوا یہ تو مانا پر مجھے ذرا اس بات کا جواب دو کہ یہ بختاوری اسی ملک کی ہے یا سارے زمانہ کا یہی حال ہے۔ وہ بھی تو ہمارے ہی بھائی ہیں جنکے ملک میں مرد سے لیکے عورت تک اور بچے سے لیکے بوڑھے تک کوئی پڑھنے لکھنے سے خالی نہیں جسے دیکھو کتاب کا کیڑا ہے دیکھو علم کا پتلا کیا اُن کے ہاں سب ایک ہی سی قسمت لیکے اترے ہیں۔ کیا اُن کے بچے کند ذہن یا شوخ یا کھلنڈرے ہوتے ہی نہیں۔ اے بوا خدا خدا کرو ذرا سمجھ کے بات کہو۔ تم اپنے جی میں کہو گی تو سہی کہ بڑھاپے میں عورت کی عقل جاتی رہی ہے پر مجھ سے جو پوچھو تو ہے یوں کہ خدا بیٹیوں کا بدلا لیتا ہے۔ ماں باپ نے یہ سمجھا تھا کہ بیٹیوں کی کمائی ہیں تو ہمارا ساجھا ہے

اور بیٹیوں سے ہمکو کچھ لینا نہیں۔ آؤ جہاں تک ہو سکے بیٹوں کو پڑھائیں جو
کل کو ہمارے بھی کام آئے۔ خدا کو یہ بات ناپسند آئی، اُسنے بیٹوں کو بیٹیوں
سے بھی بدتر کر دیا۔ وہ تو عورت ہو کے ان پڑھ رہی تھیں یہ مرد ہو کے
جاہل رہے۔

آتو جی تم نے تو یہ میرے دل کی سی بات کہی۔ صاحب میں تو اپنے
خدا سے عہد کرتی ہوں جو میرے پوتا پوتی جیے اور میرے جیتے جی اس قابل
ہوئے تو خیر لڑکے کو چاہے اسکے ماں باپ پڑھائیں چاہیں نہ پڑھائیں پر
لڑکی کو جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں ان پڑھ نہیں رکھنے کی۔"

اگرچہ سیرت لکھنے میں مولانا حالی اردو میں موجد کا درجہ رکھتے ہیں
لیکن حق یہ ہے کہ اب تک مقلدین میں کوئی اُن سے سبقت لیجانا
کیا معنی اُن کے درجے تک بھی نہیں پہنچا۔ اگرچہ بہت سی سوانح عمریاں
اُردو میں لکھی گئی ہیں مگر فن سیرت کے لحاظ سے کم و بیش ناقص ہیں ان میں
زیادہ تر پہلوے مدح اختیار کیا گیا ہے اور تنقید کو دخل نہیں دیا۔ مبالغہ سے
بھی اکثر جگہ کام لیا گیا ہے اور تصویر کے دونوں رُخ دکھلانے میں کوتاہی کی گئی ہے
مولانا حالی کی کتابوں میں شیخ سعدی، مرزا غالب اور سرسید احمد خاں اس دنیا میں
چلتے پھرتے، باتیں کرتے اور انسانی زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں اور دل
کی طرح آسمان پر فرشتوں کی سی خصلت اختیار کرتے نہیں دکھائی دیتے اور
یہی اس فن کا کمال ہے۔

شیخ کی تعلیم کا حال

(از حیات سعدی)

"اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو

بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقوے کی ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا مگر اس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُسکے قرب وجوار میں علماء اور مشائخ اور فصحا و بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور ان سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطہ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے بزرگوں سے سُنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا انکی شہرت اور ذکر خیر سُننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود انکی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے تحصیل علم کا شوق اسکو دامنگیر ہوا۔ اگرچہ دار العلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا۔ علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ مدرسہ عضدیہ جو کہ عضد الدولہ دیلمی نے قایم کیا تھا اور اُسکے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے لیکن اس وقت ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہل شیراز کو ایکدم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل رحم دل بامروت اور فیاض بادشاہ تھا مگر اسکی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کی حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا اس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پاکر اطراف وجوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اس کی تباہی اور بربادی میں کوئی

دقیقہ باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے جنہوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اسنے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے۔

دلم از صحبت شیراز بکلی بگرفت ۔۔۔ وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثیست صحیح ۔۔۔ نتواں مرد بسختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھسے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں سختی سے مرا نہیں جاتا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے بلاد اسلام میں جابجا کھلے ہوئے تھے، جہاں دور دور سے طالب علم آ آکر علم تحصیل کرتے تھے ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ اور بغداد میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور معمور تھے۔ انکے سوا شام[1]، عراق اور مصر وغیرہ جگہ جگہ مدرسے جاری تھے لیکن سب سے زیادہ

---

[1] ان میں سے مدرسۂ ناصریہ ملک ناصر صلاح الدین کا بنایا ہوا قرس میں اور مدرسہ رواحیہ واحد کے پوتے زکی ابو القاسم ہبۃ اللہ کا اور نیز مدرسہ ست الشام، خاتون بنت ایوب خواہر صلاح الدین کا اور دار الحدیث ملک عادل بن ایوب کا دمشق میں اور مستنصریہ خلیفہ مستنصر باللہ کا بغداد میں اور صاحبیہ زکی صفی الدین کا قاہرہ میں اور نوریہ، نور الدین ارسلان شاہ، صاحب موصل کا موصل میں بہت مشہور تھے انکے سوا جیسا کہ تاریخ ابن خلکان سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے مدرسے جیسا مدرسہ تقفیہ۔ قاہریہ۔ عزیزیہ۔ عزیہ۔ نبیہ نفیسہ علائیہ وغیرہ وغیرہ بیت المقدس، موصل، بغداد، دمشق اور اسکندریہ وغیرہ میں موجود تھے (حالی)

شہرت نظامیہ بغداد نے حاصل کی تھی جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے
۴۵۹ھ ہجری میں بنوایا تھا۔ ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسہ سے
تعلیم پاکر نکلے ہیں جنکی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مدرسہ
اس قدر نامور تھا کہ جو علماء یہاں سے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے،
پھر اُن کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہتا تھا۔ امام ابوحامد
غزالی، شیخ عراق عبدالقاہر سہروردی، استاد الائمہ ابوحامد عماد الدین حنبلی
اور اور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔
شیخ کو اس مدرسہ میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی
ہو گی کہ اس کا ہموطن شیخ ابواسحاق شیرازی جسکا علم و فضل شہرۂ آفاق تھا
مدت تک اس مدرسہ کا متولی رہا تھا جس وقت نظام الملک نے بغداد
میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اول یہاں کا متولی شیخ ابواسحاق
کو مقرر کیا تھا اور اس سبب سے اہل شیراز کو اس مدرسہ سے ایک خاص نسبت
اور لگاؤ تھا۔

الغرض شیخ نے مدرسۂ نظامیہ میں جاکر تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ
بوستاں میں اُسنے تصریح کی ہے وہاں سے اسکے لیے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا
بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا ان میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور
شخص علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی ہے جسکا لقب جمال الدین ہے
یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ بے شمار کتابیں اسکی تصنیفات
سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسنے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے
حدیث لکھی ہے، اُن کا تراشہ میرے حجرہ میں ہے۔ مرنے کے بعد جب مجھکو
نہلائیں تو غسل کے لیے اُس تراشہ سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اسکی وصیت کے

موافق عمل کیا گیا اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بیچ رہا۔

جس زمانہ میں شیخ بغداد میں علامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا اس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا دولت شاہ سمرقندی اور سر گور اوسلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے بیعت کی تھی اور اُن سے علم تصوف اور طریق معرفت و سلوک حاصل کیا۔ اور پہلی مرتبہ انھیں کے ساتھ بیت اللہ کے حج کو گیا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی وفات ۵۶۱ھ ہجری میں یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اس کو صحبت رہی ہے اور ایک بار سفر دریا میں وہ اُن کے ساتھ رہا ہے

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں اسکے ہم عمر اور ہمسر لوگ اُس کی خوش بیانی اور حسن تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اُسنے استاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب میں آپس میں بیٹھکر مسائل علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے۔ اُستاد یہ سُنکر شیخ پر غصہ ہوا اور یہ کہا کہ اوروں کے رشک وحسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو برا نہیں سمجھتے۔ تم دونو اپنی عاقبت خراب کرتے ہو وہ رشک وحسد سے اور تم بدگوئی وغیبت سے۔

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ برابر وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اور علامہ ابوالفرج ابن جوزی ہمیشہ اُس کو سماع سے منع کرتا تھا مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اس باب میں کسی کی

نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی لیکن علماء کی سوسائٹی آہستہ آہستہ اسکے دل میں گھر
کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں اسکو ایک بدآواز قوال سے پالا
پڑا اور بضرورت ساری رات اس مکروہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے
ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈاسا اُتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا
اور یہ دونوں چیزیں قوال کی نذر کیں۔ اصحاب مجلس کو اس حرکت سے تعجب ہوا
شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے
میرا عزیز استاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے اسکے حکم کی تعمیل نہ کی
اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے میں
آنا ہوا اور اس بزرگوار قوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے
توبہ کی۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی صحبت سے عالم
طالب علمی ہی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اُسکے دل سے اتر گئے تھے
وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ
عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا، جو اس طریقہ کو چھوڑ کر اس کوچہ میں قدم
رکھا۔ کہا درویش صرف اپنی جان بچانے میں کوشش کرتے ہیں اور علماء
یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ڈوبتوں کو بھی بچائیں۔

شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات جتائی ہے کہ اسکو کسی سرزمین کے ساتھ
عراق یا بغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے

بعد از عراق، جائے خوش نایدم ہوا ۔۔۔ ساقی بزن نوائے، زاں پردۂ عراقی

جس زمانہ میں شیخ نظامیہ **بغداد** میں پڑھتا تھا۔ اگرچہ اسوقت
حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہوچکا تھا مگر ظاہری شان و شوکت

ہارون اور **مامون** کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا، اور اسکے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لیے سنبھالا لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے امرا اور فرماں روا، بارگاہِ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصر خلافت کے آستانہ پر ایک پتھر بمنزلہ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا جسکو امرا اور اعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی، وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالاخانے کرایہ داروں سے رک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اور پھر اسی آنکھ سے اس دار الخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جسکا سایہ اقتدار یورپ اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اسکی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بیدریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوے اور وہ ظلم و ستم بھی اسکی آنکھوں کے روبرو گزرے تھے جو ہلاکو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے۔ ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک نہایت عمدہ سبق تھا

جسنے اُسکے دل میں قوم کی دلسوزی، بادشاہوں کی اصلاح، رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اسی خیال کی بدولت اُسنے اپنی تمام عمر ابنائے جنس کی نصیحت اور خیراندیشی میں صرف کی مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اسوقت لکھا ہے جب کوئی شخص اسکا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اسکا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

ترجمہ	ابیات
(۱) آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے۔	(۱) آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں
(۲) اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکلکر قیامت دنیا میں دیکھ لیجیے۔	(۲) اے محمد گر قیامت می بر آری سر ز خاک سر بر آور، ویں قیامت درمیانِ خلق بیں
(۳) محل کے نازپروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا۔	(۳) نازنینانِ حرم را، خونِ خلقِ نازنیں ز آستاں بگذشت و ما را خونِ دل از آستیں
(۴) زمانہ کی گردش اور دنیا کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیے۔ یہ بات کسی کے خیال میں کبھی نہ آتی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائیگا	(۴) زینہار از دورِ گیتی و انقلابِ روزگار در خیالِ کس نہ گشتی کانچناں گردد چنیں
(۵) جنھوں نے اس بیت الحرم کی شان و شوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر	(۵) دیدہ بر دار ایکہ دیدی شوکتِ بیت الحرم قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقاں بر زمیں

ترجمہ	ابیات
اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑتے اور زمین پر بیٹھتے تھے وہ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھیں۔	
(۶) کہ پیغمبر خدا کے بنی عم کا خون اس خاک پر بہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑتے تھے	(۶) خونِ فرزندانِ قومِ مصطفیٰ است ریختہ ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں
(۷) آیندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں چاہیئے، کیونکہ انگوٹھی پر سے جب نگین جاتا رہتا ہے تو نری کلونس رہجاتی ہے	(۷) بعد ازیں آسایش از دنیا نباید چشم داشت قیر در انگشتری ماند چو برخیزد نگیں
(۸) دجلہ کا پانی نکتر لہو ہو گیا ہے، اگر اب جاری رہے گا تو نخلستان بطحا کی خاک کو خون سے رنگین کر دے گا۔	(۸) دجلہ خوں نابست زیں پس گر نہد سر در نشیب خاکِ نخلستانِ بطحا را کند با خوں عجیں
(۹) شہیدوں کی خاک پر نوحہ کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ انکے لیے ادنیٰ نعمت فردوس بریں ہے	(۹) نوحہ لائق نیست بر خاکِ شہیداں زانکہ ہست کمتریں دولت مر ایشاں را بہشت برتریں
(۱۰) ہاں مگر رحم اور اسلام کی ہمدردی کے سبب دوست کا دل دوست کی جدائی میں کڑھتا ہے	(۱۰) لیکن از روئے مسلمانی و راہِ مرحمت مہرباں را دل بسوزد در فراقِ نازنیں
(۱۱) کل تک صبر کرو قیامت کے دن دیکھ لینا کہ قبر سے اہل قبر لہو بھرا منہ لیکر اٹھیں گے۔	(۱۱) باش تا فردا کہ بینی روز داد و رستخیز کز لحد با روئے خوں آلودہ برخیزد دفیں
(۱۲) یاد رہے دنیا پر بھروسہ کرنا اور اس سے دل لگانا نہیں چاہیئے کیونکہ آسمان کبھی دوست ہے اور کبھی دشمن۔	(۱۲) تکیہ بر دنیا نباید کرد و دل بر وے نہاد کاسماں گاہے بمہرست اے برادر گہ بکیں

۱۳۔ زور بازوے شجاعت برنتابد با اجل چوں قضا آید نماند قوت رائے رزیں	۱۳۔ شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا اور جب قضا آتی ہے تو رائے صائب کی قوت جاتی رہتی ہے
۱۴۔ تیغ ہندی برنیاید روز ہیجا از نیام شیر مردے را کہ باشد مرگ پنہاں در کمیں	۱۴۔ جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے، اسکی اصیل تلوار لڑائی کے دن میان سے باہر نہیں نکلتی۔
۱۵۔ تجربت بیفائدہ ست آنرا کہ برگردید بخت حملہ آوردن چہ سود آنرا کہ برگردید دیں	۱۵۔ جب نصیبہ پلٹ گیا، پھر اسکا امتحان کرنا بے فائدہ ہوا اور جب دین الٹ گیا پھر حملہ کرنا فضول ہے۔
۱۶۔ کرگسانند از پے مردار دنیا جنگجوے اے برادر گر خردمندی چو سیمرغاں نشیں	۱۶۔ یارو مردار دنیا کے گدھ آپس میں لڑ رہے ہیں اگر تم عقلمند ہو تو سیمرغ کی طرح الگ بیٹھو،

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا۔ اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی، نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا۔ تکبر اور غرور نے اسکے دماغ کو مختل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اسکے بیٹے ابوبکر نے اہل سنت کی حمایت اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی، جسکے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر اس نالائق خلیفہ نے اسکا کچھ تدارک نہ کیا۔ لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفرین سمجھو۔ مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اسکے بگڑنے سے نہ صرف

بنی عباس کی حکومت دنیا سے اُٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے ایکبارگی اُن میں تزلزل آگیا اور چند روز میں اُن کا اقتدار صفحۂ ہستی سے یک قلم محو ہوگیا۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمیت تھی اسکے لیے اس سے بڑھکر اور کیا مصیبت ہوسکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آب باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہوگیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابت موجود ہوتے تو ان کو ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

ہمارے بعد بہت روئے ہمکو اہل وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

خواجہ حالی پر بعض تنگ نظر معترض ہیں کہ انھوں نے سرسید کے سوانح حیات لکھنے میں صرف مداحی سے کام لیا ہے۔ ہم نے اُن کی آگاہی کے لیے دیباچہ سے اقتباسات درج کیے ہیں۔ غالبًا وہ ان کو پڑھکر ضرور صحیح نتیجہ پر پہونچ جائیں گے۔ خود مولانا فرماتے ہیں کہ دیگر اشخاص کی سوانح عمریوں میں تو ہم نے اُن کے بچھوڑوں کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن سرسید کے وقایع حیات پر نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کا اعتراض مداحی ناقابل مسموع ہے یہ ممکن ہے کہ ہم خواجہ حالی سے بعض مقامات پر اختلاف کریں۔ لیکن

اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم خواجہ مرحوم کو طرفداری کا الزام دیں۔ اُس وقت کے تمام حالات پر نظر رکھ کر سرسید کے کام کو جانچنا چاہیے نہ یہ کہ آج کل کی حالت پیش نظر رکھ کر رائے قائم کی جائے۔

حیات جاوید کی زبان پختہ اور صاف ہے اور متانت اور علمیت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

(از حیات جاوید)

دیباچہ طبع اوّل

"سرسید احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں انھیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں، جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے اگرچہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر اُن کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لیے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لیے درکار ہیں ہمارے لیے بے سود ہوں گی۔ ہمارے اسلاف میں علما و حکما و مصنفین کی بھی کچھ کمی نہیں ہے مگر وہ بھی آج ہمارے لیے قابل تقلید نمونے نہیں بن سکتے۔ ان کو خدا نے ایسے وقت میں پیدا کیا تھا جب کہا جاتا تھا کہ "علم[1] اور لوگوں کا کام ہے اور باورچی گیری اور لوگوں کا

[1] یہ ایک عربی مثل کا ترجمہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "العلم رجال و للثرید رجال" ۱۲

مگر ہمارے زمانہ میں دونوں کام ایک ہی شخص کو کرنے پڑتے ہیں۔ اُنکے
علمی مشغلوں میں کوئی فکر اور خلجان خلل انداز نہ تھا۔ وہ معاش کی طرف
سے فارغ البال تھے۔ وہ قوم کی خدمت کرتے تھے اور سلطنت اُنکی
خدمت کرتی تھی۔ لیکن ہماری حالت ایسی نہیں ہے۔ ہم کو دائیں ہاتھ
سے پیٹ کا دھندا کرنا ہے اور بائیں سے کسی دوسرے کام کا ارادہ کرنا
ہمارے عرفا و مشائخ کی پاکیزہ زندگی بھی ہم دنیاداروں کی موجودہ حالت سے
کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ وہ ہم کو اپنے اپنے قدح کی خیر منانی سکھاتی ہے
مگر ہماری خیر اب اس میں ہے کہ سب مل کر ایک دوسرے کی خیر منائیں
پس اس وقت ہمارے سلف کے کارنامے ہم کو براہ راست اسکے سوا کوئی
سبق نہیں دے سکتے کہ بزرگوں کی بڑائی پر فخر کرو اور اس شعر کے مصداق بنو۔

اِنْ افْتَخَرْتَ بِآبَاءٍ مَضَوْا سَلَفًا   قُلْنَا صَدَقْتَ وَلٰكِنْ بِئْسَ مَا وَلَدُوْا

(یعنی اگر تم کو اپنے بڑوں پر فخر ہو تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایسے ہی تھے مگر اولاد بُری چھوڑ گئے)

ہم یہ نہیں کہتے کہ سلف صالح کے حالات ہماری قوم کے لیے بالکل
فائدہ مند نہیں ہیں۔ اِن کی بائیوگرافی میں وہ تمام اصول موجود ہیں
جو قومی زندگی کے لیے بمنزلۂ ارکان و عناصر کے ہیں۔ محنت، صبر، استقلال
غیرت، دلیری، اولوالعزمی اور عالی حوصلگی سب کچھ اُن کے کارناموں میں
موجود ہے مگر جن مہمات میں اُنھوں نے ان ہتیاروں سے کام لیا تھا
ہماری مہمات ان سے بالکل جُداگانہ ہیں، جو شاید اُن کو کبھی پیش نہیں آئیں
جن آلات سے اُنھوں نے ملک فتح کیے تھے، ہم کو انھیں آلات سے
دل فتح کرنے ہیں۔ جو عزت اور آبرو انھوں نے اپنی قوم کی سلطنت میں
حاصل کی تھی وہ ہم کو غیر قوموں کی حکومت میں حاصل کرنی ہے اسکے زمانہ میں

سلطنت کے سوا کسی کو مصالح عامہ میں دخل نہ تھا اس لیے اُن کو
ملک اور قوم کی بہبودی کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے کی مطلق ضرورت
نہ تھی مگر ہمارے زمانے کا حال بالکل اس کے برخلاف ہے۔ ہمارے زمانہ
میں قوموں کی موت اور زندگی خود قوموں ہی کے ہاتھ میں ہے وہ چاہیں اپنے
تئیں بنائیں اور چاہیں بگاڑیں، چاہیں جئیں اور چاہیں مرجائیں سلطنت کا کام
صرف ان کی حیات و ممات کا رجسٹر رکھنا اور زندوں کو زندوں کے گھاٹ
اور مردوں کو مردوں کے گھاٹ اتار دینا ہے اور بس۔ ہمارے اسلاف نے
اسلام کا دور دورہ دیکھا تھا جب کہ غیر مذہب والوں کو بھی اس کا اتباع کرنا
پڑتا تھا اور اس کے خلاف کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ اس لیے ان کو دین کی حمایت
کرنے کی صرف اسی قدر ضرورت تھی جس قدر کہ صلح کے زمانہ میں فوج رکھنے کی
ضرورت ہوتی ہے مگر ہم کو وہ زمانہ ملا ہے کہ بادشاہ اور رعیت دونوں کے
مذہب پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ آزادی نے گونگوں تک کو گویا کر دیا ہے مذہب
کا بدلنا کپڑوں کے بدلنے سے بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ ادھر کرسچین سلطنت
کی مقناطیسی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے ادھر سائنس مذہب کا نقش لوگوں کے دلوں سے
مٹانا چاہتا ہے جب کہ ہماری حالت سلف کی حالت سے اس قدر بدلی ہوئی ہے تو ان کی
بائیوگرافی ہماری مشکلات پر کیا روشنی ڈال سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی ہمت سے ہماری ہمت
اور ان کی دلیری سے ہماری دلیری بڑھتی ہے مگر یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے
کہ انھوں نے اپنی ہمت اور دلیری سے کیا کام لیا تھا اور ہم کو اس سے کیا کام
لینا چاہیے۔ جس قدر تیمور[1] کا ایک چیونٹی سے شاہانہ عزم و استقلال سیکھنا

[1] تیمور نے ایک چیونٹی کو دیکھا کہ اناج کا دانہ جو اس سے سنبھل نہ سکتا تھا لے کر بار بار دیوار پر چڑھتی تھی اور پھر گر پڑتی تھی۔ اسی طرح ستر یا اسّی دفعہ چڑھی اور گری۔ آخر ایک دفعہ دیوار کی منڈیر پر جا پہنچی۔ تیمور اپنے تزک میں لکھتا ہے کہ اس دن سے میں نے کبھی کسی مشکل یا سختی میں ہمت نہیں ہاری۔ حالی

عجب معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ تیمور کی لائف سے چیونٹی کا سا عزم و استقلال سیکھا جائے پس اگرچہ زمانہ سلف کے مشاہیر بلکہ نجابیل کی بائیوگرفی بھی منفعت سے خالی نہیں لیکن اس میں ہمارے لیے کوئی ایسی صاف اور کھلی شاہراہ موجود نہیں ہے جس پر ہم آنکھیں بند کرکے اپنی دشوار گزار منزل جو آج ہم کو درپیش ہے طے کرتے چلے جائیں۔

البتہ سرسید کی لائف ہمارے لیے ایک ایسی مثال ہو جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی کٹھن منزل جو تنگنائے دنیا میں بظاہر اس کی سب سے آخری منزل ہے۔ آسانی کے ساتھ طے ہو جائے۔ اس بزرگ کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانہ کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھکر اسکے ساتھ موافقت پیدا کرو تاکہ دنیا میں آرام سے رہو اور عزت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے میں کوشش کرو تاکہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔ وہ بتاتی ہو کہ کوئی قوم محکوم ہونے کی حالت میں کیونکر قومی عزت حاصل کرسکتی ہے اور ایک شائستہ گورنمنٹ میں کیونکر اسکا رسوخ و اعتبار بڑھ سکتا ہے۔ وہ جس طرح ہم کو آزادی رائے کی تعلیم دیتی ہے اسی طرح یہ بھی سکھاتی ہو کہ ہم کیونکر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک طرف ہم کو خودداری اور سیلف رسپکٹ کی تاکید کرتی ہے اور غلامانہ خوشامد سے نفرت دلاتی ہے اور دوسری طرف حکمران قوم کا ادب اور اس کی بزرگداشت ہمارے دلوں پر نقش کرتی ہے۔ وہ ہم کو خبردار کرتی ہے کہ قومی تنزل سے قوم کے مذہب کو کیا صدمہ پہنچتا ہے اور اسکا تدارک کیونکر ہو سکتا ہے اور مذہب کے منہدم ہونے سے قوم کن آفتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس کا علاج کیا ہو وہ ہم کو اسلام کے وہ اعلیٰ اصول یاد دلاتی ہے جن کو قرون اولیٰ کے بعد

قوم نے بالکل فراموش کر دیا تھا اور جن کا مطلب یہ تھا کہ قوم اور وطن کی محبت کو جزو ایمان جانو اور قوم کی خدمت کو سرداری کا تمغہ سمجھو۔ وہ ہم کو سبق دیتی ہے کہ قوم کی حقیقی خیر خواہی اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جبتک کہ بہت سے کام اُن کی عقل اور عادات اور مرضی کے خلاف نہ کیے جائیں اور اُن کی مخالفت کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت نہ کیا جائے۔ وہ ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ اگر دنیا میں بڑا بننا چاہو تو حرص، طمع، خود غرضی، جھوٹ، آرام طلبی اور عیش و عشرت سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جاؤ۔ وہ ہم کو یقین دلاتی ہے کہ تھوڑی سی تعلیم اور بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے ایسے عظیم الشان کام انجام کر سکتی ہیں جو بڑے بڑے حکیموں اور مدبروں سے انجام نہیں ہو سکتے۔ وہ ہم کو تعصبات سے متنفر کرتی ہے، غیر قوموں کے ساتھ حسن معاشرت سکھاتی ہے، دوستوں کے ساتھ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی، خلوص اور سچائی سے ملنا بتاتی ہے وہ ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور جو کچھ کہو اس کو کر دکھاؤ۔ وہ بآواز بلند کہتی ہے کہ وقت کی قدر کرو، ڈیوٹی کا خیال رکھو، ایک لحظہ بیکار نہ رہو اور کام کرتے کرتے مر جاؤ۔"

(از دیباچہ طبع اول)

"اگرچہ ہندوستان میں، جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کامل طریقہ سے لکھی جائے، اسکی خوبیوں کے ساتھ اسکی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اسکے عالی خیالات کے ساتھ اسکی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا

حال سب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہانتک ہم کو معلوم ہوسکیں
ان کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو
کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اول تو ایسی بایوگرافی چاندی سونے
کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اس کے سوا وہ انھیں لوگوں کے
حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنھوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب
دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ
سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے ان کو سب نے بھلا جانا
کیونکہ اُن کو کسی کی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ
نہیں بھولے کیونکہ اُنھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں
اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اُس شخص
کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا
مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے علما و مفسرین کو لتاڑا
ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے کچے پھوڑوں
کو چھیڑا ہے اور اُن کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں جس کو مذہب کے
لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب
دیا ہے اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرونٹ سمجھا ہے
تو کسی نے نہایت راستباز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف
چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہو ضرور ہو کہ اُسکا سونا کسوٹی پر کسا جائے
اور اُسکا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہو جس نے مذہبی
لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہو۔ اس لیے مناسب ہو کہ سب سے پہلے
اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے

نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اسکے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لیے ضرور ہے کہ ان کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جسقدر اس کیا زیادہ کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں"

(از دیباچہ طبع اول)

ایک اور موقع پر مولانا حالی نے سرسید کا قول نقل کیا ہے جس میں خود سرسید نے اپنی سوانحعمری کا نقشہ کھینچا ہے۔

جب کبھی سرسید کے سامنے اُن کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے مگر آخر میں جیسا کہ عام طبائع انسانی کا خاصہ ہے۔ اُن کو اس بات کے دریافت کرنے کا زیادہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی اخیر[ؒ] بائیوگرافی میں کیا لکھا جا رہا ہے۔"

---

۱ کرنل گریہم اور مولوی سراج الدین احمد اڈیٹر چودھویں صدی انگریزی اور اُردو میں علی الترتیب سرسید کی زندگی کے حالات مولانا حالی کی کتاب حیات جاوید سے پیشتر لکھ چکے تھے۔ تنہا۔

(از حیاتِ جاوید)

سرسید کی ترقیات کے اسباب

"اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرزِ حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی اور اُس کے سوا تمام طاقتوں کو مضمحل کرنے والی ہے اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی اُس نے ایشیا کی کسی قوم بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی رُوح باقی نہیں چھوڑی۔ ایک بڑے حکیم کا قول ہے کہ شخصی حکومت میں صرف ایک شخص (یعنی بادشاہ) ملک کا خیر خواہ ہو سکتا ہے اور بس۔ جان اسٹوارٹ مل لکھتے ہیں کہ "اگر رعیّت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لیے کچھ نہ کر سکے تو اُس کو ملک کی کچھ پروا نہ رہے گی۔" اگرچہ ہندوستان میں سو برس سے طرزِ حکومت بدل گئی ہے جس کا مقتضا یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں ملک اور قوم کی بھلائی کا خیال اور جوش پیدا ہو، مگر جو سکوت اور انجماد ہندوستان کی قوموں میں صدہا پشت سے متوارث چلا آتا ہے اور جو اُن کے آب و گل میں خمیر ہو گیا ہے، اُس کو برٹش طرزِ حکومت جیسی کہ وہ ہندوستان میں ہے ایک صدی میں زائل نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی نظیریں سُن سُن کر جو اکثر ہندوستانیوں کے دل میں بعض اوقات ملک اور قوم کی بھلائی کا جوش دفعتاً اُٹھتا ہے کچھ زیادہ دن نہیں گذرتے کہ وہ آدے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاصکر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر

ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ یہ مذہب ہی میں طاقت ہے کہ انسان نہایت ہی سخت ریاضتوں میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے، تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کر دیتا ہے، آگ میں تپتا ہے، برف میں گلتا ہے، گھربار لٹا دیتا ہے اور ہر نا قابل برداشت تکلیف اٹھاتا ہے۔ مگر یہ بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا ہو، طرز حکومت کا تابع ہوتا ہے اس میں جتنی باتیں طرز حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ نا قابل عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی۔ اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن سے نفع یا تو نیکی کرنیوالے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلا واسطہ تمام ملک یا تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے۔ پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں آپ بھی آنکھیں بند کر کے اسی شاہراہ پر ہو لیتے ہیں۔ دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنا پڑتی ہے اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے اس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے زمانہ کی ضرورتیں اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانیِ مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور خود مذہب اس میں استقلال پیدا کرتا ہے جس کی

بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے یہیں سے
اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس نے سرسید سے تمام ملکی اور قومی خدمتیں سرانجام
کرائی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک کہ اُن کی لائف شہادت دیتی ہے
اور جس قدر کہ اُن کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے انکی
تمام ترقیات کا منبع، اُن کے کل مقاصدِ عالیہ کا محرک اور ان کی ہر منزل کا
رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی۔

اسلام کی حقیت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرشت
کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اور دار الخلافت کا اخیر دور تھا اور مسلمانوں کو آخرت
کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہیں
تھی اس لیے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً شریف
اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا
بہت زیادہ تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ۔ جو اس زمانہ میں دیندار
مسلمانوں کا ملجا و ماوی تھی، اسکے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا
اُن کے والدین خانقاہ کے مشائخ سے کمال ارادت و عقیدت رکھتے تھے
اور اس لیے سرسید بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں جانے لگے
تھے اور ایک مدت دراز تک انھوں نے وہاں کا رنگ صحبت اپنی آنکھ
سے دیکھا تھا، اُن کی والدہ کے سوا اُن کے تمام ننھیال والے جہاں
انھوں نے نشو و نما پائی، شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے معتقد تھے
پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دورہ دورہ
دیکھا تھا، گویا مذہب ہی کی آغوش میں انھوں نے پرورش پائی تھی اور
مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ علوم جدیدہ جس عمر میں مذہب سے

دل اُچاٹ کر سکتے ہیں، اس عمر میں سرسید پر اُن کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی بلکہ زیادہ تر اُن کی نے اسوقت کھلنی شروع ہوئی جب مذہب کی جڑ پتال تک پہنچ چکی تھی۔ اور جب کہ سائنس کو بجائے اسکے کہ مذہب کے ساتھ جنگ کرے اس سے صلح کرنی ضرور تھی۔

چونکہ سرسید کا تمام خاندان دولیسے خانوادوں سے عقیدت رکھتا تھا جو نہ صرف دلی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے، اس لیے ان کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں۔ چنانچہ سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانہ میں بھی جب کہ میرے مذہبی خیالات محققانہ اصول پر مبنی ہیں۔ میں اپنی والدہ کے عقائد میں ایک آدھ بات کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا" یہی عقائد ابتدا سے سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کی یہی صورت انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھی تھی۔ گویا ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا اسمٰعیل[^1] شہید کی تصنیفات نے اُن کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور انکو کسیقدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔ مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ اُن پر غالب رہا مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ انھیں سُنت و بدعت و تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف انھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو

[^1]: دیکھو سیرالمصنفین جلد اول صفحہ ۱۱۰ - تنہا

پہنچتا ہے۔ مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے اُن کی آنکھیں کھولیں اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اُن کو اسلام کی حقیقت اور اُس کے اصلی مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں اُن کو چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائیں اُن کو پکڑا اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اُٹھا دیا ہر ایک معاملے میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا اس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اس کو سر پہ رکھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے مگر مذہب نے اجازت دی، اس لیے انگریزی نوکری بے تامل اختیار کر لی مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی و ایام گزاری کے طور پر کرنی چاہیے یا نہ دل سے اسکے فرائض ادا کرنے چاہییں۔ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اُس کے فرائض نہ دل سے ادا کرنا خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے اس لیے نوکری کے فرائض نہایت ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کیئے مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اس کی خیر خواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضرور ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایۂ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن اور آزادی حاصل ہو، اُس کی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو۔ لہذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں صرف کر دی۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی، میل جول اور کھانا پینا دین حق کی پاکیزگی اور

تقدس کے موافق ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضرور ہے۔ کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور رذیل تر کسی خصلت کو نہیں بتاتا اس لیے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

واقعہ ۱۸۵۷ء نے جب ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت صدمہ پہنچایا اور اُنکے پنپنے کی بالکل امید نہ رہی، اس سے سرسید کے دل پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ ان کا ارادہ ہندوستان کے تعلقات قطع کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے کا ہو گیا اُسوقت بھی اُنھوں نے مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کودنا بہتر ہے یا اپنی جان بچا کر اور کسی گوشہ میں بیٹھکر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی ہے اور بس۔ مذہب نے اُن کو بتایا کہ بانی اسلام جس کی اطاعت اور اتباع تمام امت پر فرض ہے اور جس کی نسبت قرآن ناطق ہے کہ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" اُس نے دنیا میں آکر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیر خواہی میں بسر کی وہ گمراہ تھے اُن کو ہدایت کی، وہ وحشی تھے ان کو انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے ان میں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی، وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے اُن میں ملک گیری اور کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا، اُن کا دین اور دنیا دونوں درست کیے اُن کی خیر خواہی اور اصلاح میں سخت شدائد اور تکلیفیں اپنے نفس پر برداشت کیں

ملک کی محبت کو جزو ایمان قرار دیا اور کہا کہ "حب الوطن من الایمان"
قوم کی محبت پر تمام امت کو مجبور کیا اور فرمایا "حب العرب من الایمان"
قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت میں منحصر ٹھہرایا اور کہا کہ "سید القوم
خادمہم" اخیر دم تک امت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور امتی امتی کہتا
دنیا سے رخصت ہوا۔

سرسید نے مذہب کی یہ ہدایت سنکر تمام ارادے فسخ کر دیے اور
اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ انھوں نے دنیوی تعلقات کو جن کے
بغیر قوم کی خیر خواہی اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطع تعلق سے ہزار درجہ
بہتر سمجھا اور اپنی تمام زندگی اور طاقت اور استطاعت اور اپنے تمام
قویٰ کو نفس واپسیں تک قومی خدمت اور قومی خیر خواہی کے لیے وقف کر دیا
(از مقدمۂ شعر و شاعری)

مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور
مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے
اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے۔ اور دونوں کے
بیچ میں کہیں ایسا کھانچا باقی نہ رہ جائے کہ جب تک کچھ عبارت مقدر
نہ مانی جائے، تب تک کلام جیسا کہ چاہیے مربوط اور منتظم نہ ہو۔ مثلاً
گلزار نسیم میں کہتا ہے۔

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے — ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو — پھر دیکھ نہ سکیگا کسی کو

جو مطلب کہ صاحب مثنوی ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ "لوگ تو اس
طفل مہ جبیں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ مگر نجومیوں نے بادشاہ سے یہ کہا

کہ یہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے۔ مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اس کو دیکھ کر پھر کوئی نہ دیکھ سکے گا کیونکہ اس کو دیکھتے ہی بینائی جاتی رہے گی" ظاہر ہے کہ ان دونوں بیتوں میں جب تک کہ کوئی لفظ بڑھائے اور کوئی لفظ بدلے نہ جائیں، تب تک یہ مطلب جو ہم نے اوپر بیان کیا ان بیتوں سے سیدھی طرح نہیں نکل سکتا۔ اور پہلا مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپاں نہیں ہو سکتا یا مثلاً اسی مثنوی میں ہے:

نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو چشمک تھی نصیب اس پدر کو

مطلب یہ ہے کہ بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے۔ مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے لیے ظلمت تھا پس جب تک دوسرے مصرع کے الفاظ نہ بدلے جائیں کلام مربوط نہیں ہو سکتا۔ یا مثلاً

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

یہ دو مصرعے بھی مربوط نہیں ہیں۔ کیونکہ ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شاہ اور شخص ہے اور پدر اور شخص ہے۔ حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ پس دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیے

"بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ"

ایک اور موقع پر مولانا حالی ارقام فرماتے ہیں:۔

اس بات کا بھی خیال رکھنا ضرور ہے کہ قصہ کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو جس طرح ناممکن اور فوق العادت باتوں پر قصہ کی بنیاد رکھنی آج کل زیبا نہیں ہے اسی طرح قصہ کے ضمن میں ایسی جزئیات بیان کرنی جن کی تجربہ اور مشاہدہ تکذیب کرتا ہو ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس سے قصہ نگار کی انتہا بے سلیقگی ثابت

نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی لاعلمی اور دنیا کے حالات سے ناواقفیت اور ضروری اطلاع حاصل کرنے سے بے پروائی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً بدرمنیر میں ایک خاص موقع اور وقت کا سماں اس طرح بیان کیا ہے:-

وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں	وہ گانے کا عالم وہ حسن بتاں
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ	درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ

اخیر مصرع سے صاف یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ایک طرف دھان کھڑے تھے اور ایک طرف سرسوں پھول رہی تھی، مگر یہ بات واقع کے خلاف ہے کیونکہ دھان خریف میں ہوتے ہیں اور سرسوں ربیع میں گیہوں کے ساتھ بوئی جاتی ہے"

متذکرۂ بالا اقتباس سے **آزاد** کی رائے کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اشاروں میں **گلزار نسیم** پر اعتراض کیا ہے اور مولانا **حالی** نے صاف صاف اس کے نقائص بیان کیے ہیں۔ اسی طرح مثنوی میر حسن کو بھی **حالی** نے اعتراض سے خالی نہیں چھوڑا۔ اور **آزاد** نے صرف تعریف ہی سے کام لیا ہے۔

شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی[1]

ولادت اور خاندان مولانا شبلی ہندوستان کے پر آشوب ایام اور بحران انقلاب ۱۸۵۷ء میں صوبۂ متحدہ کے ضلع اعظم گڑھ میں بندول نام ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ قریۂ بندول قدیم شرفا کی

---

[1] یہ حالات رسالہ معارف اعظم گڑھ اور دیگر رسالوں مثل ادیب الہ آباد اور کسوٹی لکھنؤ سے لیے گئے ہیں۔ تنہا

ایک آبادی ہے جس کی نسبت خود مولانا فرماتے ہیں۔

فضلِ بندہ دل اگر تو نشناسی آدمی نیستی تو نسناسی

مولانا کا خاندان ایک ممتاز، متمول اور صاحب اعزاز خاندان تھا ابتدائی تعلیم و تربیت والدین کی زیر نگرانی اعظم گڑھ میں مولوی شکر اللہ نامی سے حاصل کی۔ اعظم گڑھ اس گاؤں کا صدر مقام تھا اور مولانا کے والد بزرگوار یہاں وکیل تھے۔ علمی شوق گھر کی تربیت کا اثر تھا۔ خاندان میں علم کا چرچا تھا اور تمام بزرگ مصروفِ علم تھے۔

تعلیم ان ایام میں فارسی زبان کی تعلیم ضروری اور لازمی تھی مولانا نے بھی تمام فارسی نصاب ابتدا کیں مکمل کیا۔ پھر عربی تعلیم شروع کی۔ خاندان کے اور بہت سے اعزہ و احباب شریک تعلیم تھے۔ غازی پور میں ایک مدرسہ چشمۂ رحمت ہے۔ یہ چشمۂ فیض وہاں سے بھی سیراب ہوا ہے۔ مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی جو اس عہد کے فاضل اجل اور مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی کے برادر اصغر تھے، وہ ان دنوں مدرسۂ غازیپور کے صدر مدرس تھے۔ مولانا شبلی نے مولانائے ممدوح سے نصاب عربی کی متوسطات سے انتہا تک تعلیم حاصل کی۔

مولانا فاروق چریاکوٹی فلسفہ، منطق، ہندسہ، ادب عربی اور ادب فارسی میں مادرِ ہند کے غالباً آخری فرزند تھے۔ انکے بعد علماء میں ان فنون کے کامل شاید ہی پیدا ہوں مولانا محمد فاروق کو اپنے شاگرد سے اسقدر انس محبت تھی کہ وہ خود اپنے کو عرین دانش کا شیر اور شاگرد کو بچۂ شیر کہتے تھے۔ استاد نے شاگرد کا سجع کہا تھا انا اسد و انت شبلی۔ آخر زمانہ میں مولانا فاروق صاحب غازیپور چھوڑ کر خود مولانا کے گھر اعظم گڑھ آگئے تھے۔

مولانائے مرحوم نے اس ذات والاصفات کے آغوش میں معقولات کی جس حد تک تعلیم پائی تھی، تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ ہونا ناممکن تھا۔ اس وقت ہندوستان کے گوشوں میں مستقل درسگاہوں کے مالک، لکھنؤ میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی، دہلی میں مولانا نذیر حسین محدث، لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری ادیب، رامپور میں مولانا عبدالحق خیرآبادی منطقی مولانا ارشاد حسین صاحب فقیہ اور سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث تھے، اور دیوبند کا مجمع العلما اب کی طرح پہلے بھی کم نہ تھا۔

مولانا عبدالحی کمسن تھے، اسلیے اس زمانہ کے کمن سال اُنکو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور یہی اثر ان کے شاگردوں میں بھی پیدا ہوتا تھا۔ مولانا نذیر حسین طریقۂ اہل حدیث کے پابند تھے۔ اس عہد میں علماے احناف کی نگاہوں میں یہ طریقہ کفر کے ہم پلہ شمار ہوتا تھا۔ مولانا فاروق صاحب غالی حنفی تھے اور آخر تک رہے۔ اور یہی اثر مولانا شبلی میں ایک مدت تک رہا۔ اس لیے ان دو درسگاہوں کو چھوڑ کر کم وبیش وہ ہر جگہ گئے دیوبند میں مولانا کے ایک عزیز (مولانا محمد عمر صاحب) تعلیم پاتے تھے۔ اُن کے بلاوے پر وہاں تشریف لے گئے۔ چند روز ٹھہرے۔ شریک تعلیم نہ ہوے اور واپس آئے۔

مولانا کے رفقائے تعلیم کا بیان ہے کہ اس عہد میں مولوی فاروق کی معقولات دانی کا شور تھا۔ مولانا شبلی جس درسگاہ میں جاتے تھے بچہ شیر کو شیر سمجھ کر ہر طرف سے طلباء، مناظرہ ومباحثہ کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ اور یہ پہلوان یکہ وتنہا ہر دنگل سے فخر وغرور کے ساتھ باہر آتا تھا۔ سہارنپور یا لاہور میں مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی سے کہ اس زمانہ میں وہ بھی برابر

کے طالب العلم تھے، جامع مسجد میں ایک منطقی بحث پر مناظرہ ہوا اور ہر فریق اپنے کو فتحیاب سمجھ کر اٹھا۔

اعظم گڑھ سے مولانا رامپور تشریف لے گئے۔ مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی کی درسگاہ میں آئے۔ لیکن مولانا فاروق کے تربیت یافتہ کو اب یہاں کیا جوہر نظر آسکتا تھا۔ چند طالب العلم مناظرہ و مباحثہ کے لیے پیٹ پڑے۔ پھر وہاں نہ گئے۔ مولوی ارشاد حسین صاحب سے فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں اور جب ذکر آتا مولانا اپنے استاد کی فقہ دانی اور تبحر دینی کی بہت مدح فرماتے تھے۔ رامپور سے ادب کی تکمیل کے لیے لاہور مولوی فیض الحسن صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ مولوی فیض الحسن صاحب اس زمانہ کے اصمعی اور ابوتمام سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے تمام دورۂ اسلامی میں قاضی عبدالمقتدر کے سوا یہی ایک فرد ہے جو عربی شاعری کا صحیح مذاق رکھتا تھا۔ اُن کی شرح حماسہ اور دیگر تصنیفات اُس کی کافی شاہد ہیں اور اب اُن کا عربی دیوان بھی چھپ گیا ہے۔

لاہور میں مولانا صرف چھ مہینے رہے حماسہ شاید یہاں شروع کی تھی وقت نہ تھا تو مولوی فیض الحسن صاحب اورینٹیل کالج سے آتے جاتے رستہ میں پڑھاتے تھے۔ لاہور سے مولانا سہارنپور مولوی احمد علی صاحب کی خدمت میں کہ محدث حنفی تھے حاضر ہوئے۔ یہاں کچھ دنوں علم حدیث کی تحصیل فرمائی۔

مولانا اپنے تمام اساتذہ میں مولوی احمد علی صاحب کے اخلاق و آداب سادگی طبع و وضع اور اتباع سلف کے بیحد معترف تھے اور ادب سے اُن کو "ہمارے مولانا" کہا کرتے تھے۔ خود مولانا کہا کرتے تھے کہ "اس زمانہ کی طالبعلمی

بہت مشکل تھی۔ بلکہ پر سفر کرتے تھے۔ پیدل ہی چلنا پڑتا تھا۔ یہ سب میں نے خوشی سے گوارا کیا تھا۔ دو دفعہ والد کی اجازت کے بغیر چپکے نکل گیا۔ یہ خاص التزام رہا (اور اسمیں میں منفرد تھا) کہ ہر فن مثلاً ادب، منطق، حدیث، اصول فقہ کے لیے انہی علماء کے پاس دور دراز کا سفر کر کے گیا۔ جو ان علوم میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے

سفر حجاز عمر ۱۹ برس کی تھی۔ سال ۱۲۶۸ھ تھا۔ ترمذی شریف زیر درس تھی کہ خاندان کے بعض اعزہ نے بغرض حج سفر حجاز کا ارادہ کیا۔ حوصلہ مند طالب العلم کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ چنانچہ اپنے استاد محدث سے اجازت لے کر **سفر حجاز** کے لیے روانہ ہو گئے۔ فریضہ حج ادا کیا **مکہ معظمہ** سے **مدینہ منورہ** حاضر ہوئے۔ ایک عالم وجد تھا جو عاشق رسول پر طاری تھا۔ اس عالم میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ فارسی زبان میں انشا فرمایا جو سراپا شوق و آرزو ہے۔

مدینہ منورہ میں بہت سے کتب خانے ہیں۔ اسوقت مولانا پر حنفیت کا رنگ غالب تھا کہ تمام ہندوستان حنفیت و وہابیت کی بے نتیجہ ہنگامہ آرائی میں مشغول تھا۔ چنانچہ وہاں پہنچکر اسی قسم کی کتابوں کی جستجو فرمائی فرماتے تھے کہ فنون حدیث کا جو سامان وہاں نظر آیا کہیں پھر نہ دیکھا۔ **ابن عبدالبر کی کتاب التمہید کو موطائے امام مالک کی شرح** ونقد ہے۔ لیکن درحقیقت وہ فنون حدیث کی دائرۃ المعارف ہے ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ مدینے کے کتب خانوں میں دیکھی تھی۔

سفر حجاز کے بعض عجیب عجیب واقعات بیان فرمایا کرتے تھے منجملہ ان کے ایک **درویش ہند** کا قصہ تھا جس کے دونوں پاؤں کا شوق

ست جھلنی ہو گئے تھے۔ سوچتے سے کانٹے نکال رہا تھا کہ مولانا جا کر کھڑے ہو گئے
اشارہ کیا کہ تم بھی نکالو۔ پھر سوز و گداز کی لے میں یہ شعر پڑھا۔

آبلے روتے ہیں خوں ہیچ بڑا ہوتا ہے کوئی کانٹا جو کف پا سے جدا ہوتا ہے

عربوں کی فیاضی طبعی اور شرافت خلق کے بھی بعض عجیب واقعات دیکھے۔

شوق علم و شاعری اس سفر سے واپس آ کر "ظاہری طلب علم" کا دور ختم کر دیا لیکن فی الواقع اب سے "حقیقی طلب علم" کا دور شروع ہو گیا۔ مولانا فطری شاعر تھے۔ اردو و فارسی میں شعر موزوں فرماتے تھے کتب بینی کی ابتدا سے عادت تھی۔ فرماتے تھے کہ اعظم گڑھ میں رہتا تھا تو ایک کتب فروش کی بازار میں دکان تھی، وہاں جا کر اردو و فارسی کے دیوان دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی گھر لے آتا تھا۔

آپ کے قیام اعظم گڑھ کے زمانہ میں لکھنو اور دیگر اطراف کے بعض معززین وہاں مقیم تھے۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ طرحیں دیجاتی تھیں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ **مولانا میر مشاعرہ** بنتے تھے۔ اس زمانہ کی بعض غزلیں مشکل سے دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ **پیام یار** اور **اودھ پنچ**[1] کا عنفوان شباب تھا

[1] اودھ پنچ کے مشہور و معروف اڈیٹر منشی سید محمد سجاد حسین مرحوم تھے جو اردو زبان کی اخباری دنیا میں وہ امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں جو الفضل للمتقدم کے نورانی لباس سے آراستہ ہے۔

قصبۂ کاکوری جو ضلع لکھنو میں شرفا کی مشہور بستی ہے آپ کا مولد ہے ۱۸۵۶ء میں آپ پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے ماموں نواب فدا حسین وکیل سابق چیف جج کی نگرانی میں بقیام شہر لکھنو حاصل کی۔ آپ کے والد منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ پنشن لینے کے بعد حیدرآباد میں جج رہے۔

آپ بڑے شوق سے اُن کے نمبر پڑھتے تھے۔ اور زبان کے مزے لیتے تھے

بقیہ صفحہ ما قبل منشی سجاد حسین کی تعلیم اگرچہ مغربی طریقہ پر انٹرنس تک ہوئی تھی اور چند روز تک ایف اے میں بھی پڑھا تھا۔ لیکن قدرتی طور پر آپ کی طبیعت میں ایک قسم کی غیر معمولی جدت تھی۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ لکھنؤ سے فیض آباد چلے گئے اور وہاں محکمہ فوج میں اُردو ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کر کے ایک سال تک رہے لیکن دلی امنگیں کسی دلچسپ شغل کی خواہشمند تھیں۔ اور قوت متخیلہ جو اصلی ظرافت کی روح رواں ہے اپنے لیے میدان تلاش کر رہی تھی۔ آخر لکھنؤ واپس آئے اور مناسبت طبع کے لحاظ سے انتخاب پیشہ پر غور کرنے لگے۔ لٹریری مذاق نے علمی زندگی بسر کرنے کی تحریک کی۔ ایک واجب الاحترام بزرگ منشی محفوظ علی ڈپٹی کلکٹر بھی یہاں ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۷۷ء میں افق اشاعت پر وہ نیر تاباں طلوع ہوا جو اودھ پنچ کے نام سے ہمیشہ دنیائے ادب میں مشہور رہے گا۔ پنڈت کشن پرشاد کول بی اے اڈیٹر ہندوستانی نے گلدستہ پنچ کے نام سے اخبار مذکور کا ایک انتخاب مرتب کرا کر دو ہزار کی تعداد میں شائع کیا ہے۔ اُسکے دیباچہ میں پنڈت برج نرائن چکبست بی اے لکھتے ہیں کہ جس وقت اودھ پنچ نے دنیا میں جنم لیا اُسوقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان میں چالیس سال کا نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ اس عرصہ میں اُردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے جن کا زمانہ کوئی خاص پولیٹکل یا سوشل مسلک نہ تھا، نہ کسی مستقل دستور العمل کے پابند تھے اودھ پنچ اور ہندوستانی پہلے دو اخبار ہیں جنہوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا .... زبان و شاعری کی اصلاح کے علاوہ اودھ پنچ ابتدا سے رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا کانگرس سے پہلے جو پولیٹکل معرکہ آرائیاں پیش آئیں ان میں اسنے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا

اودھ پنچ کی بعض طویل نظمیں آخر عمر تک یاد رہیں۔

بقیہ صفحۂ ماقبل | الحاق اودھ، انکم ٹیکس، البرٹ بل وغیرہ کے متعلق اکثر ایسے مضامین لکھے جن کا آج شائع کرنا موجودہ قوانین کی جکڑبند کو دیکھتے ہوئے مصلحت اور دوراندیشی کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ والیان ریاست کی خوشامد سے ہمیشہ دامن پاک رکھا اور ہمیشہ ان کی غفلت وعیش پسندی کا پردہ فاش کرتا رہا۔ اسکے قومی محبت کے وسیع دائرہ میں ہندو مسلمان سب ہم شکل تھے نیشنل کانگریس چونکہ قومی اتفاق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی لہذا اس پولٹیکل تحریک کا دل وجان سے مددگار تھا۔"

منشی سجاد حسین مرحوم کانگریس کے رکن تھے اور باوجود بہت سے انقلابات کے جنکے دھکے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے، منشی صاحب آخر وقت تک اپنی وضع پر قائم رہے۔ اُن کا مزاج عجیب صفات کا مجموعہ تھا۔ خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ، زندہ دلی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مصیبت و تکلیف کے زمانہ میں بھی کبھی کسی نے انکے چہرہ پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی کی شکن نہ دیکھی۔ بیماری کی حالت میں کوئی مزاج پوچھتا تو کہتے کہ زندگی کا عارضہ ہے۔ دوا علاج سے مایوس ہو چکے تھے مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ اس لیے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۱۰ء میں فالج گرا۔ چند ماہ بیمار رہکر اچھے ہوگئے۔ پھر سنہ ۱۹۱۱ء میں دوسرا حملہ اسی مرض کا ہوا اور ہمیشہ کے لیے مجبور و معذور ہوگئے اسوقت سے قوت گویائی بھی قریب قریب جاتی رہی۔ اس حالت میں بھی پرچہ جاری رہا اور چھتیس سال تک زبان و قوم کی خدمت کرکے سنہ ۱۹۱۲ء میں اودھ پنچ بند ہوگیا۔ اور اسکے دو سال بعد ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۵ء کو منشی سجاد حسین نے بھی اس دنیائے فانی کو خیرباد کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ استقلال، پابندی وضع، جرأت بیان اور راست پژوہی کا جو بہترین نمونہ منشی صاحب مرحوم نے ملک و اہلِ ملک کے سامنے اپنے اقوال و اعمال سے پیش کیا ہے، اسکی سبق آموزی حیات و ممات کی تاثیرات سے مستغنی ہو اور اخبار اودھ پنچ

فارسی خطوط نویسی

اسوقت تک فارسی زبان، ہندوستان کے شرفا کی علمی زبان تھی۔ اُس زمانہ میں بلکہ علی گڑھ پہنچنے تک مولانا تمام خط وکتابت فارسی میں کرتے تھے اور قلم برداشتہ خطوط لکھتے تھے انکے اکثر فارسی خطوط لوگوں کے پاس موجود ہیں۔

غیر مقلدوں کی تردید

مشاعروں کے علاوہ سب سے بڑا شغل آپ کا اِس زمانے میں غیر مقلدوں کی تردید، بلکہ تعذیب تھی۔ فرماتے تھے کہ انسان عیسائی ہوسکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہوسکتا"

بقیہ صفحہ ما قبل اکاطرح ان کی دیگر اخلاقی و اصلاحی تصنیفات جو بلحاظ اپنی ندرت بیان، شگفتگی تحریر، دلنشینی نتائج قبولیت عامہ کا درجہ حاصل کرچکی ہیں، اہل ہند کو طوفانِ حوادثات کے مواقع پر ہمیشہ ساحل سلامتی کی طرف اشارہ کیا کریگی۔ کیا اچھی زندہ دلی تھی جو دوسروں کی زندگی کو زندگی بنائے۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام   مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

آپ کے اخبار کے مضمون نگاروں میں سید اکبر حسین صاحب سابق جج اور منشی جوالا پرشاد برق سابق جج خفیفہ قابل الذکر ہیں۔ جناب اکبر کو اپنے خاص رنگ میں جو امتیاز حاصل ہوا وہ محتاج تشریح نہیں۔ اگر سرسید احمد خاں اور اودھ پنچ نہ ہوتے تو سید اکبر حسین صاحب بھی شاعر نہ ہوتے۔ سید صاحب کے ہر کام پر نکتہ چینی کرنا اکبر کا اس زمانہ میں فرض تھا اور اسکی اشاعت کے لیے اودھ پنچ کے اوراق وقف تھے رفتہ رفتہ جناب اکبر ایک بردست شاعر اور مسلم الثبوت استاد ہوگئے منشی جوالا پرشاد برق بھی اودھ پنچ میں لکھتے لکھتے آخر کار مُصنّف ہوگئے اگرچہ آپ کو تیسرے دورے کے مصنفین میں کوئی خاص درجۂ امتیاز حاصل نہیں ہے اور نہ آپ کا شمار ایسے ایسے لائق وفائق مصنفین کے زمرہ میں کیا جاسکتا ہے تاہم آپ کی ناول نگاری ایک درجہ ضرور رکھتی ہے اور آپ کی کتابیں وقعت سے دیکھی جاتی ہیں۔

مگر گردشِ زمانہ بھی عجیب چیز ہے کہ یہ دریائے تعصب کا جوش بے تعصبی سے بدل ہو گیا۔ اس زمانے میں غیر مقلدین کی تردید میں اردو، فارسی اور عربی میں کئی رسالے لکھے۔ بعض خود اُنکے نام سے اور بعض دوسروں کے نام سے چھپے اسی عہد کا عربی رسالہ "اسکات المعتدی" ہے جسکے مؤلف کی نادانستہ طور پر سفر بیت المقدس میں ایک فاضل نے خود مولانا کے سامنے داد دی تھی

درس و تدریس اور مذہبی پابندی کی سختی

اس عالم میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مولوی حمید الدین صاحب اسی زمانے کے فیض یافتہ ہیں۔ مولانا اس عہد میں سخت درجہ متقشف اور مذہبی جابر تھے۔ تارکین و غافلین صلوٰۃ کو سخت تنبیہ فرماتے تھے بعض لڑکوں کو اس لیے کہ وہ آیندہ نماز پڑھنے کا مستحکم وعدہ کریں دو دو گھنٹہ تک مارا ہے۔

وکالت کا امتحان

گھر کے لوگوں کو فکر تھی کہ اب یہ کوئی دنیاوی کام کریں زمینداری کے کاروبار سپرد ہوئے لیکن علم و دانش کا رئیس اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ بعد ازاں آپ کے والد اور تمام خاندان کی یہ مرضی تھی بلکہ حکم تھا کہ آپ علمی مشاغل چھوڑ کر وکالت یا ملازمت کریں اس زمانہ میں اکثر فارسی و عربی داں لوگ اردو میں وکالت کا امتحان دیکر وکیل بنتے تھے۔ خود مولانا کے والد اور اُنکے اُستاد مولانا فاروق صاحب اسی قسم کے وکیل تھے۔ ناچار مولانا نے بھی امتحان وکالت دیا اور دوسری بار کامیابی حاصل کی اور چند مہینے اعظم گڑھ اور بستی میں وکالت بھی کی۔ لیکن ایک متقشف عالم کے لیے صدق و کذب اور صحت و خطا کی تبدیل و تقلیب سخت نفرت انگیز فرض تھا۔

زمانۂ وکالت کا ایک عجیب واقعہ

مولانا ایک مقدمہ کا عجیب و غریب واقعہ بیان فرماتے تھے۔ کسی ٹھاکر نے اپنی کمسن لڑکی بیاہ دی تھی۔ داماد جوان ہوکر خسر کو پسند نہ آیا۔ ادھر سے رخصتی کا تقاضا تھا اور ادھر سے شدید انکار تھا۔ ناچار شوہر نے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ لڑکی کا باپ مولانا کے والد کے پاس جوابدہی لیکر آیا۔ وکیل صاحب نے مولانا کو حکم دیا کہ تم اسکی جوابدہی لکھدو۔ مولانا نے قصہ پوچھا تو اُسنے ساری داستان کہہ سنائی۔ آپ نے سُنکر فرمایا کہ جب تم خود اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جاچکی ہے تو اب کیا ہوسکتا ہے۔ جاؤ لڑکی کو رخصت کردو۔ وہ ہنستا ہوا وکیل صاحب کے پاس آیا۔ وکیل صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ "بس آپ وکیل بن چکے" آخر خود وکالت نامہ لکھا۔ اور مقدمہ کی روداد بنائی اور بیان تحریری داخل کیا۔ مقدمہ لڑایا گیا اور جیتا گیا۔

وکالت چھوڑکر امانت

وکالت چھوڑکر مولانا امین دیوانی ہوگئے۔ رمضان کے زمانے میں جبکہ شدید گرمی تھی مولانا روزہ رکھتے تھے اور گھوڑے پر سوار گانوں گانوں پھرتے تھے۔ نہ افطار کی فکر اور نہ سحری کا سامان۔ اسی طرح پورا مہینہ گزار دیا۔ آخر اس کوچہ میں بھی جی نہ لگا کیونکہ ہادی فطرت بلند آواز سے پکار رہا تھا کہ **شبلی** تو اس سے اعلیٰ و ارفع تر کام کے لیے خلق کیا گیا ہے۔ ناچار اس ملازمت سے بھی سبکدوش ہوکر گھر میں بیٹھے اور مطالعہ و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ قصائد و رسائل لکھنے شروع کیے۔

مدرسۃ العلوم مسلمانان علیگڑھ کی پروفیسری

یہ وہ وقت تھا کہ سرسید کے شور و ہنگامے سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب **سنین الاسلام** نئی نئی شائع ہوئی تھی

وہ اکثر زیر مطالعہ رہتی تھی۔ مفاخر اسلام و عرب پڑھ پڑھ کر وجد کرتے تھے اور
اب پہلی مرتبہ اُنکے دل نے علماء کی غفلت، تضیع اوقات، نادانی اور کجروی
کا درد محسوس کیا۔ مولانا کے ایک نوجوان بھائی مہدی مرحوم علی گڑھ کالج
میں تعلیم پاتے تھے ۱۸۸۲ء میں اس قدرتی زنجیر نے مولانا کو کالج میں کھینچا اور
وہ بھائی سے ملنے گئے۔ وہاں بانی مدرستہ العلوم سے ملاقات کی اور اس پر پیکرہ کو
دل دے کے آئے۔ پیر کہن سال نے جوہر دانش، ناصیۂ شباب پر نمودار پایا۔
پس سرسید مولانا سے بجد مُصر ہوے اور مجبور کیا کہ مولانا مدرستہ العلوم علی گڑھ
میں پروفیسری اختیار کریں۔ مولانا کو بجز قبول اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا اور آپ
فارسی و عربی کے پروفیسر بمشاہرۂ للعہ ماہوار مقرر ہوگئے۔ اور آخر کار لاتنے
انقلابات اور گردشوں کے بعد جس کام کے اہل تھے وہی سپرد ہوا۔

سرسید کا کتبخانہ

سرسید نے مولانا کو خود اپنی کوٹھی میں رہنے کے لیے
ایک کمرہ دیدیا۔ اسوقت مولانا حالی بھی قیام فرماتھے
مسٹر آرنلڈ بھی آگئے تھے شب و روز عجب صحبت رہتی تھی۔ مولانا فرماتے تھے
کہ میں سید صاحب کا کتبخانہ دیکھ کر باغ باغ ہوگیا مصر و یورپ کی تمام جدید
و قدیم مطبوعات الماریوں میں بالترتیب سجی ہوئی تھیں۔ مولانا کئی کئی گھنٹے الماریوں
کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ اور کبھی تھک کر انھیں الماریوں کے پاس زمین پر
بیٹھ جاتے تھے۔

تاریخی رسالے اور قومی نظمیں لکھنا

سنین الاسلام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے تھا
پہلے چھوٹے چھوٹے تاریخی رسالے اور قومی نظمیں
لکھیں گزشتہ تعلیم اور مثنوی صبح امید وغیرہ
اسی فصل کے میوے ہیں۔ اول تاریخ بلاد اسلامیہ

لکھنے کا خیال آیا۔ پھر اس خیال کو گھٹا کر **تاریخ بنی العباس** شروع کی لیکن جسقدر آگے بڑھتے گئے۔ میدان زیادہ کشادہ، فراخ اور نتیجہ صبر آزما اور دیر طلب نظر آنے لگا۔ ناچار "ناموران اسلام" کی منزل پر مسافر خیال نے دم لیا اور **المامون** شروع ہو کر ختم ہو گئی۔ اسکے بعد رفتہ رفتہ اور کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ بعض بعض مباحث مہمہ پر کانفرنس میں رسائل لکھکر پیش کیے اور قبول عام کی سند حاصل کی۔

المامون کے بعد سیرۃ النعمان اور سفر مصر و روم و شام

۱۸۹۲ء میں **سیرۃ النعمان** سے قلم نے فراغت پائی تھی اور **الفاروق** کے لکھنے کا ارادہ تھا کہ مصر و شام و روم کا سفر در پیش ہوا۔ مسٹر آرنلڈ کی معیت میں رہ سپر **قسطنطنیہ** ہوئے۔ وہاں سے ایشیاے کوچک، شام اور مصر ہوتے ہوئے چھ ماہ کے بعد ہندوستان واپس آئے جدید اسلامی ہندوستان کا یہ پہلا علمی سفر تھا جو کسی عالم کی ہمت نے قبول کیا ان رہ نوردیوں میں انھوں نے کیا کیا تماشے اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھیں خود ان کا خامۂ نقاش **سفرنامہ** میں اُن کی رنگین تصویریں دکھا چکا ہے۔ واپس آکر **کالج** میں وہ قصیدہ پڑھا جسکا مطلع یہ ہے

قاصدِ خوش خبر امروز نوا ساز آمد   کز سفر یارِ سفر کردۂ ما باز آمد
از سفر شبلیِ آزادہ بہ **کالج** برسید   یا مگر بلبلِ شیراز بہ **شیراز** آمد
دوستاں مژدہ کہ آں بلبلِ خوش لہجہ دگر   اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد

مولانا نے اس سفر میں **الفاروق** کے لیے بھی کافی مواد بہم پہنچانے کی کوشش کی اور کوئی دقیقہ تلاش و جستجو کا باقی نہ رکھا۔ لیکن دل کی آرزو دل ہی میں رہی اور ناکام واپس آئے۔

پروفیسری سے استعفا

آخر عمر میں سید صاحب کالج کے برائے نام سکرٹری تھے اصل مالک سید محمود بن گئے تھے جنکے طرز عمل سے ہر شخص نالاں تھا۔ مولانا نے کئی بار استعفا دیا، مگر مسٹر بک نے نامنظور کیا آخر ۱۸۹۸ء کے ماہ مئی میں کالج سے رخصت لی۔ سید صاحب کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اپنے وطن پہنچکر سولہ سال کی خدمت کے بعد ۱۸۹۸ء میں کالج کی پروفیسری سے استعفاء دیدیا۔ اب مستقلاً اعظم گڑھ میں قیام کیا۔ یہاں ۱۹۰۰ء میں اتفاقیہ بندوق کی گولی چل جانے سے مولانا شبلی مرحوم کے پاؤں میں سخت ضرب آئی لیکن خدا کے رحم و فضل سے وہ جلد اچھے ہو گئے۔ لنگ ضرور باقی رہا۔

الفاروق کی تدوین اور سفر کشمیر

الفاروق زیر ترتیب تھی۔ ایک انگریزی کا مدرسہ **نیشنل اسکول** یہاں قائم تھا اسکے انتظام و ترقی میں بھی کوشش کی ۱۸۹۹ء میں تبدیل آب و ہوا کے لیے کشمیر گئے۔ مگر وہاں صحت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے اور علیل ہو گئے لیکن **الفاروق** کی تالیف و تحریر کا سلسلہ جاری رہا جس روز نہ **الفاروق** کی آخری سطور قلم نے لکھی ہیں، مصنف بستر مرض پر دراز تھا اور گھنٹوں تک عالم بیہوشی طاری رہا۔ اس مرض نے اسقدر طول کھینچا کہ مہینوں تک لکھنا پڑھنا متروک ہو گیا اور بمشکل صحت حاصل ہوئی **قصیدہ کشمیریہ** میں یہی واقعات منظوم کیے ہیں۔ اسی مرض سے شفا پانے کے بعد **مولانا حالی** نے وہ تہنیت لکھی جسکا مطلع یہ ہے

للہ الحمد پس از ناخوشی و رنج دراز
شبلی ما بمراد از سر بالیں برخاست

حیدر آباد کا قیام اور نظامت علوم و فنون

قیام کشمیر کے زمانہ میں **الفاروق** چھپکر شایع ہوئی۔ ابھی یہاں سے واپس نہ ہوئے تھے کہ مولوی **سید علی** بلگرامی نے آپ کو باصرار تمام ریاست حیدر آباد میں بلایا اور وہاں نظامت علوم و فنون کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ حیدر آباد سے **الغزالی، سوانح رومی، علم الکلام، الکلام** اور **موازنہ انیس و دبیر** بالترتیب تصنیف ہوکر اطراف ہندوستان میں پھیلیں۔

ندوة العلماء

ندوۃ العلما کا تخیل مولوی **محمد علی** صاحب کانپوری اور دیگر ارباب فہم کی تجویز تھی۔ مولانا اس قسم کے کاموں کے لیے سراپا انتظار تھے۔ چنانچہ آپ دوسرے ہی اجلاس سے شریک ہوگئے **مصر و قسطنطنیہ** کے سفر نے **تعلیم و نصاب تعلیم و طریقہ اصلاح تعلیم** کے متعلق عجیب و غریب خیالات پیدا کر دیے تھے۔ اور اسی خوشی میں مولانا نے **دار العلوم** کا خاکہ تیار کیا۔ اور اب بھی کوئی اسکو پڑھے تو یہ کہنے پر مجبور ہو کہ مصنف **قسطنطنیہ** کی فضا میں کھڑا ہو کر مسلمانانِ ہندوستان کے لیے راہ تیار ہا ہے۔ مولانا مسلمانوں کی ہر قسم کی اصلاح کو علما کی اصلاح پر منحصر رکھتے تھے۔ اور علماء کی اصلاح، طریقہ تعلیم کی اصلاح پر موقوف جانتے تھے۔ اس بناء پر **دار العلوم** اور **ندوہ** ہی اُن کے نزدیک اصلی کام تھا مولوی محمد علی صاحب کے استعفا دینے پر **ندوہ** میں جب انحطاط شروع ہوا تو مولانا خود **لکھنؤ** چلے آئے اور دار العلوم کو تقریباً ۱۹۰۵ء میں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس کے بعد جو خدمات ندوہ کی انھوں نے انجام دیں اور جس حد تک اُس کو ترقی دی سب لوگوں کو معلوم ہے۔ یہاں اسکی تفصیل کا موقع نہیں

البتہ اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ خیرہ چشموں سے کامیابی کی یہ درخشندگی دیکھی گئی اور لوگوں نے رخنہ اندازی شروع کردی۔ مجبوراً سنہ ۱۹۱۳ء میں مولانا ملول ہو کر علیحدہ ہو گئے۔

دنیاوی حیثیت سے مولانا نے جو وقار حاصل کیا وہ بھی کم نہ تھا۔

شبلی زخیل زمزمہ سنجاں حشم گرفت — بااینکہ ہیچ گونہ زخیل وحشم نداشت

سنہ ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغۂ مجیدی عنایت کیا۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ نے دیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمن خاں والی کابل نے ترجمہ کا محکمہ قائم کیا۔ اس کے لیے ہندوستان سے مولانا کا انتخاب ہوا لیکن مولانا نے جانے سے انکار کیا۔ تقریباً سنہ ۱۹۰۰ء میں اڈنبرا اسلامک سوسائٹی کے پریسیڈنٹ ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں شملہ کی گورنمنٹ اورینٹل کانفرنس میں مدعو ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں الہ آباد کی سرکاری ورنیکلر اسکیم کمیٹی میں شریک ہوئے۔ اور گورنمنٹ نے مولانا ہی کی تجویز پر مسئلہ کا فیصلہ کیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسوں میں بلائے گئے۔ حکام صوبہ اور والیانِ ریاست اکثر خلوص و محبت سے ملتے تھے۔ گزشتہ موقع تاجپوشی میں ہز مجسٹی جارج پنجم نے شرف ملاقات بخشا۔ بھوپال، رامپور، جنجیرہ اور حیدرآباد کے رؤساء مولانا کے قدردان تھے۔ حیدرآباد میں مشرقی یونیورسٹی کے وضع نصاب کے لیے تقرر ہوا۔

ممالک غیر میں شہرت رکھتے تھے	حضور نظام	نے اوّلاً سو روپیہ ہوار

کا منصب جاری کیا۔ پھر ۱۲ ۱۹۱ء سے تین سو روپیہ ماہوار کر دیا ہندوستان مصر و شام و ٹرکی و جزائر ملایا۔ بلکہ انگلینڈ پیرس اور برلن سے علمی استفتا اور سوالات ہمیشہ آیا کرتے تھے۔ مسٹر آرنلڈ انگلینڈ مسیو بوا پیرس، ڈاکٹر محمود لبیب برلن سے علمی استفادہ کرتے تھے۔ ۱۸۹۹ء کی اورینٹیل کانفرنس میں جو اٹلی میں منعقد ہوئی تھی شرکت کا ارادہ تھا کہ دفعۃً بیمار ہوگئے اور نہ جاسکے۔ ۱۹۱۳ء میں ٹرکی کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی کے قیام کا جو خیال تھا، اسکے واضعین نصاب میں مولانا کا نام بھی داخل تھا۔

قانون وقف اولاد اور آخری عمر کے اراد ادھر قانون وقف اولاد کی مہم سر اٹھائی اور باحسن وجوہ مسودہ قانون پاس کرا کر کامیابی کے ساتھ ختم کی۔ ادھر اشاعت اسلام کی عظیم الشان اسکیم کئی بار لکھی مگر ہر بار قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹ گئے ندوہ میں قرآن کا اکثر درس جاری رکھا۔ آخر میں دار المصنفین کا ارادہ تھا کہ قوم میں اچھے لکھنے والے اصحاب پیدا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ارادہ بھی ایک حد تک پورا ہوگیا اور دار المصنفین اعظم گڑھ قائم ہوگیا۔

سیرۃ نبوی سب سے آخری اور اہم تصنیف سیرۃ نبوی زیر تالیف و نظر تھی۔ کچھ اجزا تیار ہوچکے تھے۔ کچھ باقی تھے کہ پندرہ روز کی علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ ہجری میں وفات پائی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۵۷ ہی برس کی عمر پائی۔ ہنگامۂ مشرق (غدر) میں ظہور کیا اور ہنگامۂ مغرب (جنگ یورپ) میں مختفی ہوئے بدء الاسلام سیرۃ نبوی سے پہلے تصنیف کی اور سیرۃ نبوی پر آخر دم توڑا

مرنے سے کچھ دنوں پہلے کیا خوب فرمایا تھا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی | مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم | خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

خصائل و عادات

مولانا ایک خط میں اپنے واقعات زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"........ متعدد دفعہ حیدرآباد اور دیگر ریاستوں میں بیش قرار تنخواہ پر بلایا گیا۔ لیکن علمی مشغلہ کو چھوڑ کر نہ گیا۔ حیدرآباد سے جو معمولی وظیفہ مقرر ہے اس پر قناعت کی۔ ریاستوں نے صلے اور نذرانے دیے اور دینے چاہے لیکن ہمیشہ انکار کیا اور واپس کر دیا۔ رائے میں ہمیشہ آزاد رہا سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا۔ اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔

سفر ٹرکی و مصر صرف علمی تحقیقات کے لیے کیا اور تمام مصارف خود گوارا کیے۔ ریاست رامپور نے مصارف دینے چاہے انکار کیا بزرگوں نے قسطنطنیہ میں روپے بھیجے وہ بھی واپس کر دیے۔ ہمیشہ بڑے بڑے اہم مقاصد مدِ نظر رہے۔

وطن یعنی اعظم گڑھ میں مسلمانوں کا کوئی اسکول نہ تھا اور مسلمان انگریزی سے بالکل الگ تھے میں نے نیشنل ہائی اسکول قائم کیا، اس کے اکثر مصارف خود ادا کیے۔ پھر ندوہ کی تحریک میں جزوِ غالب رہا۔ اور جب ندوہ بالکل مرگیا تھا تو اسکو ازسرِنو زندہ کرکے ترقی دی تصنیفات میں خاص یہ خیال رہا کہ مستقل شاخیں تیار کر دوں۔ چنانچہ علم الکلام، تاریخ لٹریچر (موازنہ و شعرالعجم) تین شاخوں پر سیریز تیار کر دی۔

فارسی شاعری میں زبان کو اصول پر برتا۔ ملازمت تو اکثر علمی ہی اختیار کی لیکن وکالت اور سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا اور یہ فطرت تھی، بچپن سے میری صحبت بدچلن لوگوں میں تھی اور وہ لوگ ہمیشہ ان مشاغل کی تحریک کرتے تھے لیکن کبھی ناچ، رنگ بلکہ گانے میں بھی شریک نہ ہوا۔

جب راجہ کشن پرشاد وزیر ہوئے اور حسب دستور نذر دینے گیا۔ تو اُن کے ایڈی کانگ نے کہا کہ آپ نے تو تہنیت کا قصیدہ لکھا ہوگا میں نے کہا یہ اوروں کا پیشہ ہے۔ میں یہ کام نہیں کرتا۔ اس پر رد و بدل ہوئی اور میں نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ میں "کسی کی مدح نہیں کرتا"۔

قلمی اور نایاب کتابیں بہت بہم پہنچائیں اور کثرت سے مطالعہ کیں۔ یہ سرسری باتیں لکھدیں خود اپنا آلھا کیا گاؤں؟

شبلی ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء

ہم اس تحریر میں مولانا کی عادات و شمائل کے تحت میں صرف دو باتوں کا اضافہ کرتے ہیں وہ یہ کہ مولانا کسی قدر متلون المزاج اور بے حد زود رنج تھے۔ تلون اُن کی زندگی کے حالات سے آشکارا ہے اور زود رنجی کی ایک مثال مولوی سید علی بلگرامی کے حالات زندگی میں تحریر کی جا چکی ہے۔

مولانائے مغفور اس بزم میں سب سے پیچھے آئے لیکن سب سے پیچھے نہیں بیٹھے۔

اس قافلہ میں آ کے ملا گو وہ سب کے بعد
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

تصنیفات بہ ترتیب زمانہ حسب ذیل تصنیفات مولانا سے یادگار ہیں:-
رسالہ گزشتہ تعلیم (غالباً ۱۸۸۴ء) الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ
المامون، رسائل شبلی، سیرۃ النعمان، الفاروق، سفرنامہ
الغزالی، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانائے روم
موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، مقالات شبلی، مضامین
عالمگیر، سیرۃ النبی، مجموعۂ کلام اردو۔
فارسی میں دیوان شبلی، دستۂ گل، بوئے گل وغیرہ رسائل مختصر
عربی میں اسکات المعتدی، بدء الاسلام، الجزیہ
النقد علی التمدن الاسلامی اور بعض مضامین جو مصری رسالوں میں لکھے

یہ امر قابل افسوس ہے کہ مولانا کا کوئی سلسلۂ تصنیف مکمل نہ ہوا نامورانِ
اسلام کے سلسلہ میں صرف المامون اور الفاروق مرتب ہوئیں علم کلام
کے سلسلہ میں علم الکلام، الکلام، الغزالی اور سوانح مولوی روم
تصنیف ہوئیں۔ شعر العجم کی پانچ جلدوں میں سے چار جلد چھپ سکیں پانچویں جلد
کے اجزاء بحالت مسودہ رہ گئے تھے جو بعد وفات شائع ہوئے۔
سیرۃ النبی کی ناتمامی کا داغ تو اخیر وقت تک ان کے دل میں رہا۔
اپنی زندگی میں دوستوں سے فرمایا کرتے تھے کہ "سیرۃ کو تمام ہی کرنا ہے
گو جان دیگر سہی" آخر اسی مقولہ کے مطابق اسی دھن میں اس بزرگ
نے جان دی۔ اگرچہ سیرت النبی کو مولانا شبلی مرحوم ناتمام چھوڑ گئے تھے

لیکن سید سلیمان[1] صاحب ندوی قابل شکریہ ہیں جن کی ادارت میں یہ عمدہ اور نفیس

[1] سید سلیمان صاحب ندوی باپ کی طرف سے رضوی سید اور ماں کی طرف سے زیدی سید ہیں۔ آپ بہار ضلع پٹنہ عظیم آباد کے ایک مردم خیز قریہ دیسنہ میں صفر ۱۳۰۲ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حکیم سید ابوالحسن ہے جو بڑے درویش اور صوفی منش تھے۔ اگرچہ آپ کا آبائی پیشہ طبابت تھا لیکن عربی ادب و تاریخ کے ذوق نے آپ کو طبیب کی بجائے ادیب بنا دیا۔ آپ نے عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم مولوی سید ابو حبیب مجددی سے حاصل کی۔ خاندانی ارتباط اور رسم کے مطابق پہلے پھلواری شریف ضلع پٹنہ کی خانقاہ مجیبی میں کچھ دنوں پڑھا، پھر چند مہینے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کی نذر کیے۔ لیکن پوری تعلیم القیہ اور تہذیب سے لیکر آخر تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاصل کی۔ امتحان کی کامیابی اور سب سے پہلے عربی تقریر کے صلہ میں خود شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم نے اپنی دستار بہت بڑے مجمع میں جس میں اکثر مشاہیر اور ارباب کمال موجود تھے آپ کے سر پر باندھی آپ نے مولانا مفتی عبداللطیف صاحب، مولانا حفیظ اللہ صاحب، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی مولانا شبلی نعمانی، اور مولانا سید عبدالحی صاحب سے ادب، منطق، فلسفہ، تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی طبیعت میں ادب کا شوق فطری تھا۔ مولانا فاروق کی تعلیم سے اس شوق نے نشو و نما پایا۔ مولانا سید عبدالحی صاحب سے اس میں ترقی ہوئی اور مولانا شبلی نے اس کی تکمیل کی۔ تحریر و تقریر کا ذوق بھی فطری تھا۔ دربھنگہ کے مدرسہ میں جب آپ نے سب سے پہلے تحریر لکھکر پڑھی تھی تو بڑی داد ملی تھی۔ مولانا شرر کے تاریخی ناولوں نے اردو ادب کا ذوق پیدا کیا۔ اور مولانا شبلی کی تربیت اور اصلاح میں علم کلام تاریخ اور قرآن پاک اور تصنیف کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔ انگریزی بھی ندوہ میں حاصل کی۔ آپ کا پہلا مضمون الندوہ ۱۹۰۳ء میں علم حدیث پر نکلا جسکی مولانا شبلی اور مولانا حالی نے تعریف کی۔ سب سے پہلا خطبہ آپ نے "عقل و مذہب" پر اپنے قریہ کی انجمن اصلاح

کتاب شایع ہو رہی ہے۔

بقیہ صفحہ ماقبل میں دیا جو علی گڑھ منتھلی ۱۹۰۳ء میں چھپا۔ آپ کی پہلی تصنیف لغات جدیدہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے ارض القرآن کی دو جلدیں، سیرتِ عائشہ، حیات مالک اور اہل السنۃ تصنیف کیں۔ سیرت نبوی کی دو جلدوں کی تکمیل کی اور تیسری جلد چھ سو صفحوں میں مستقل لکھی۔ علاوہ ازیں آپ نے سینکڑوں مضامین ادبی، فلسفیانہ، مذہبی، تاریخی اور تنقیدی لکھے جو مخزن، علی گڑھ منتھلی، الندوہ، الہلال کلکتہ اور معارف میں شایع ہوئے۔ آپ نے عربی مضامین بھی لکھے جو مصر کے رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔

آپ ۱۹۰۶ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر الندوہ کے اڈیٹر اور دار العلوم ندوہ میں ادبیات عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں دفتر سیرت میں نائب مصنف سیرت ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں **الہلال** کی ادارت میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۲ء کے قریب گورنمنٹ دکن کالج میں عربی و فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے لیکن آپ نے ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کی وفات پر ان کی وصیت کے مطابق دار المصنفین قائم کیا اور سیرت نبوی کی تکمیل کا کام شروع کیا اور ابتک کر رہے ہیں۔ آپ ۱۹۱۴ء میں انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں انجمن علمائے بنگالہ نے آپ کو اپنا صدر مقرر کیا۔ آپ نے تحریک خلافت میں بھی حصہ لیا اور سب سے زیادہ تحریری خدمت انجام دی۔ آپ وفد خلافت متعینہ یورپ کے بھی ممبر منتخب ہوئے۔ اور انگلستان، فرانس، سوئیزرلینڈ اور اٹلی کی سیاحت کی۔ وہاں کے وزراء، علماء اور ارباب سیاست سے ملاقات کی کتبخانوں کو دیکھا۔ آپ نے ہندوستان کے بھی اکثر مشہور کتبخانوں کی سیر کی ہے جب آپ یورپ سے واپس آئے تو سنہ ۱۹۲۰ء کی میرٹھ آل انڈیا خلافت کانفرنس کے صدر منتخب کیے گئے۔ احمد آباد کانگریس میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ بمبئی ایشیاٹک سوسائٹی کی ممبری بھی آپ کو دی گئی۔ انگورہ ڈیپوٹیشن اور نجد و حجاز وفد کے ممبر منتخب ہوئے

تصنیفات و تالیفات ایک نہایت تجربہ کار اور وسیع معلومات جرمن مستشرق نے مولانا کی تصانیف کے متعلق رائے دی ہے لہذا ہم اس کو یہاں

پر عام رائے

نقل کرتے ہیں:-

"علماء اور مصنفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے اول مادۂ تحقیق و تدقیق - دوم جانچ پڑتال - سوم جدت - چہارم استحکام رائے اور قوت استدلال، علماء اور مصنفین ہند کا متخیلہ تو بے شک زیادہ زوردار ہے - لیکن ان میں مبالغہ کی عادت ہے - ان کی تاریخی حکایات اور جنگی افسانے مبالغہ اور متضاد خیالوں سے پر ہیں - برخلاف اس کے اہل مغرب کے دماغ منطقی استدلال اور موزوں اور درست الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں - اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں - گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لیے ہوتی ہیں"

ہمارے نزدیک جرمن مستشرق کی رائے جہاں تک اس کا تعلق مولانا شبلی کی ذات تک ہے درست ہے لیکن اسکی رائے کے بقیہ حصہ سے ہمیں اتفاق نہیں اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس دور کے مصنفین میں

بقیہ صفحہ ماقبل | حال ہی میں ایک دوسرے وفد حجاز سے واپس تشریف لائے ہیں بس کے آپ صدر تھے عجب نہیں کہ آپ اپنے استاد مولانا شبلی سے بھی تصنیف و تالیف میں سبقت لیجائیں اور آپ کی علمی تصنیفات بھی وہی درجہ اور مرتبہ حاصل کریں جو مولانائے مرحوم کو حاصل تھا ہماری رائے میں سیرت النبی کی تکمیل اور آپ کا نائب مصنف مقرر ہونا دلیل اس امر کی ہے کہ آپ صحیح معنوں میں مولانا شبلی مرحوم کے قائم مقام ملنے جائیں -

ایک یا دو کے سوا باقی تمام مصنفین اُن صفات سے جنکا ذکر جرمن مستشرق کرتا ہے متصف ہیں۔ ممکن ہے اور لوگ جنکو ہم نے اس دور کے مصنفین میں شامل نہیں کیا یا جن کا شمار بحیثیت علماے اسلام کے زمرہ میں ہے ان صفات سے عاری ہوں لیکن تیسرے دور کے مصنفین ہرگز اس الزام کے مورد نہیں ہو سکتے۔

مولوی چراغ علی۔ سر سید۔ اور مولانا حالی کی تصنیفات ان تمام خوبیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ آزاد کی کتابیں تحقیق و تدقیق، درایت اور جدت وغیرہ سے پُر ہیں اگرچہ بعض اصحاب اُن کی تحقیقات کے نتائج کو غلط ثابت کرنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ امتداد زمانہ سے علم انسانی میں اضافہ ہو جانے کی بدولت ان کی بعض کتابیں تحقیق کے درجہ سے گرتی جاتی ہیں۔

بلاشبہ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ استدلال و انداز کسی مستند یوروپی تصنیف سے کم نہیں۔ آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت مضبوطی راے اور منطقی استدلال ہے۔ ان میں ایک قسم کی جدت بھی ہے اور طرز ادا میں دل آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ عالمانہ عبور، غور و خوض کی قوت، تجسس، درایت، علمی جانچ پڑتال کی عادت، اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان سے نکال کر سلجھانا اور پھر تقسیم و تحلیل کرنا، بعد ازاں اسے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا شبلی کو درجہ امتیاز بخشتی ہیں اسی کے ساتھ مولانا ے مرحوم میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید

میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی معاملہ فہمی اور دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے۔

آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہو جاتی ہیں۔ یہ کتابیں سہل پسندی عام فہمی اور دلاویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔

"آپ کا مذاق علمی مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف تو آپ سخت فلسفیانہ اور محققانہ پہلو لیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف آپ بیحد نیچر پرست واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی فارسی غزلیات سے جذبات لطیفہ درد و عشق اور حسن و جمال کا پتہ چلتا ہے"

لیکن جہاں ہم مولانائے مرحوم کی مقبول انام تصنیفات کے دلدادہ ہیں وہاں اُن خیالات و آراء کا اظہار بھی ضروری ہے جو ارباب نظر اُن کی کتابوں کے متعلق رکھتے ہیں۔

چونکہ آپ کی کتابیں زیادہ تر سوانح عمریاں ہیں۔ اور سوانحعمریاں بھی اکابر اسلام کی ہیں پس جن بزرگوں کے پاک ناموں کی ہمارے دلوں میں ضرورت سے زیادہ عزت و توقیر ہو اُن کی زندگی کے کارناموں کی نسبت ہمیں یہ کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ فی الواقع اُس زمانہ میں وہ انجام بھی دیئے گئے یا نہیں۔ مثلاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی **الفاروق** میں پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی شائستگی اور اس زمانہ کے تمدن میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا حالانکہ تیرہ سو برس کے عرصہ میں زمانہ نے ہر شعبۂ زندگی میں بیحد ترقی کی ہے اور جو محکمے اور دفاتر موجودہ طرز حکومت کے لازمی عناصر ہیں کم و بیش وہ سب دربار خلافت کے ارکان پائے جاتے ہیں جن کو

درایت کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ ایک صاحب نے **الفاروق** پر اعتراضات کیے تھے جو **الناظر** ماہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں شایع ہو چکے ہیں۔ اور ان سے حسب ذیل نتائج مستنبط کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) جو درجۂ حزم و احتیاط تاریخ کی کسی مستند کتاب کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے **الفاروق** اس سے محروم ہے۔

(۲) ہمارے مولانا پرستاران عقلیت کی رایوں کے مطابق اسلام کی تاریخ گذشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا منشا پورا نہ ہو لیکن متبعین یورپ کی تشفی ہو جائے۔"

(۳) لہذا "ارباب نظر کی نگاہوں میں **الفاروق** کو ایک مستند تاریخ کا درجہ میسر نہیں ہوا

(۴) مولانا کی ایسی تمام تحریروں نے اگر ایک طرف حاملان شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر کیا تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیا ہے۔"

(۵) اگر لا مذہبی یا مذہب حقہ سے عدم واقفیت کی بنا پر کچھ ایسے بدبخت ہیں کہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے تو ارباب علم و دانش کو یہ زیبا نہیں کہ ان کو قابو میں رکھنے کی غرض سے غلط اور خود ساختہ تاویلات پیش کر کے مذہب و تاریخ کی قلب ماہیت کر دیں۔

"از مولوی ظفر الملک علوی اڈیٹر الناظر"

شعر العجم پر بھی رسالہ **اردو** میں حافظ محمود خانصاحب شیرانی کے اعتراضات شایع ہوے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے کتاب مذکور لکھنے میں کافی تحقیق اور تدقیق سے کام نہیں لیا مثلاً نظامی گنجوی کے حالات قلمبند کرتے ہوے لکھا ہے "الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلص باپ کا نام موید تھا" حالانکہ شیخ نظامی کا نام دراصل الیاس ہے اور اسکے لیے یہ شعر سند ہے۔ لیلی مجنوں

والیاس کالف بری زلامش — ہم با نو دو نہ ہست تاشں"

ایک اور شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا نام **اویس** بھی تھا۔ لیلی مجنوں

یارب تو مرا کاویس نامم — درعشق محمدی تمامم

زاں شہ کہ محمدی جمال است — روزیم کن آنچہ درخیال است

یوسف اُن کے والد کا نام تھا، زکی دادا کا اور موید پردادا کا۔ لیلی مجنوں۔

گر شد پدرم بنسبت جد — یوسف پسر زکی موید

مولانا کی رائے میں **نظامی** کا اصل وطن **تفرش** ہے یا یہ کہ وہ تفرش کے موضع **تامن** کے رہنے والے تھے۔ حالانکہ خمسہ میں نظامی گنجوی کے ساتھ اس کثرت سے اپنے آپ کو مضاف کر رہے ہیں کہ اس تعلق کی موجودگی میں کسی اور شہر یا وطن کی طرف نسبت دینے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہتی۔ سال ولادت بھی مولانا نے ۵۳۲ھ قرار دیا ہے اور ۵۹۶ھ سال وفات لکھا ہے حالانکہ بروایات صحیح سال ولادت ۵۳۵ھ ہے اور سال وفات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۵۹۹ھ کے بعد تک زندہ رہے مولانا اپنی کتاب شعر العجم میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا۔ اسنے اپنے ہاتھ سے **نظامی** کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھکر بھیجا کہ لیلی مجنوں کی داستان نظم کیجیے۔ حالانکہ لیلی مجنوں کے لیے منوچہر نے فرمایش نہیں کی وہ اس عہد سے ایک زمانہ مدت قبل وفات پا چکا تھا یہ کتاب منوچہر کے فرزند ابوالمظفر جلال الدین اخستان کی فرمایش پر لکھی گئی تھی۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

بہرحال آپ پہلے شخص ہیں جس نے اپنی تصنیفات سے اس خیال کو دور کر دیا کہ شاعر اور نثار صرف دہلی اور لکھنؤ ہی کی سرزمین سے پیدا ہو سکتے ہیں مولانا **حالی** پانی پت کے رہنے والے ہیں لیکن دہلی میں نشو و نما پائی ہو اسلیے آپ کے نام کے ساتھ بھی دہلی کا لفظ جزو لاینفک ہے۔ شیخ **مصحفی** امروہہ کے رہنے والے ہیں لیکن **دہلی** کے فیض یافتہ ہیں اور خود اس بات پر نازاں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں

دلی نہیں دیکھی ہے زباندان یہ کہاں ہیں

مولوی سید علی بلگرامی نواح لکھنو سے ہیں اور کھینچ تان کر وہ بھی لکھنوی ہو سکتے ہیں۔ لیکن مولانا شبلی کسی طرح دہلوی یا لکھنوی نہیں ہو سکتے۔ باایں ہمہ آپ کی زبان مستند ہے اور آپ اُردو زبان میں پایۂ استادی رکھتے ہیں۔

سلطان اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہندوستان کے کسی خاص شہر کو یہ امتیاز حاصل نہیں رہا کہ وہ بلحاظ زبان دوسرے شہروں پر اپنی فوقیت یا برتری کا دعویدار ہو سکے لیکن دہلی اور لکھنؤ کی فوقیت کو برطرف کر دینا اور مساوات کے درجہ پر پہنچا دینا مولانا شبلی جیسے بزرگوں کا کام تھا کہ اُنھوں نے اطراف ہندوستان میں اپنی تصنیفات سے ایک نام پیدا کر لیا اور اہل زبان ہونے میں وہ بھی اوروں کے برابر کے شریک ہو گئے انھیں بزرگوں میں مثال کے طور پر ہم نواب شمس العلماء مولوی سید امداد امام صاحب **اثر** کا نام نامی پیش کر سکتے ہیں جنھوں نے بلحاظ نظم و نثر اُردو زبان میں ایک درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ذیل میں آپ کی زندگی کے مختصر حالات ہدیۂ ناظرین ہیں۔

آپ صوبہ بہار کے ایک معروف خاندان سادات سے ہیں۔ آپ کے والد کا نام شمس العلماء خان بہادر سید وحید الدین ہے جو خان بہادر سید امداد علی کے بیٹے تھے آپ کے بزرگوں میں نواب حاجی سید محمد سعید خاں فیروز جنگ میر الوزراء وزیر اعظم شاہ جہاں و اورنگ زیب تھے نواب سید عتیق اللہ خاں صوبہ دار اٹاوہ تھے۔ نواب سید ابو المعالی خاں جاگیر دار شاہجہانی تھے نواب میر حسن عسکری بخشی افواج دہلی تھے۔ نواب میر امجد علی ڈیڑھ ہزاری تھے۔ نواب میر مرداں علی خان بہادر عامل انگلشیہ تھے آپ کے دو بیٹے نواب مؤید الملک بہادر سر علی امام کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ اور سید حسن امام بیرسٹر اسوقت مشاہیر ہندوستان سے ہیں۔

آپ سترہ اگست ۱۸۴۹ء کو پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی، اردو اور انگریزی کی تعلیم اپنے وطن ہی میں پائی۔ اگرچہ آپ کو مختلف علوم و فنون کے ساتھ مناسبت

ذیل میں ہم اُن تین تحریروں کا اقتباس درج کرتے ہیں جو مولانا شبلی مرحوم

بقیہ صفحہ ماقبل پیدا ہوئی گئی مگر طبابت سے آپ کو ہمیشہ خاص دلچسپی رہی جسکا یہ نتیجہ ہوا
کہ آپ کو ۲۲ سلسلہ ہائے طبابت پر حسب مراد قدرت حاصل ہوگئی۔ ۴۵ - برس سے آپکو
شوق طبابت ہے اس عرصۂ درازہ میں لاکھوں بیمار شفایاب ہوچکے ہیں ان میں سیکڑوں مریض
ایسے تھے جولاعلاج سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی طبابت کا ایک کمال یہ ہے کہ آپ نے سرجری یعنی
جراحی کو بالکل غیر ضروری امر قرار دیدیا ہے۔ اکثر سرطان وخنازیر وغیرہ کے بیمار صرف دواؤں سے
صحت یاب ہوئے ہیں۔ آپ کو علم کلام کی طرف بھی ایک میلان طبعی ہے۔ آپ کو ادیان ماسبق
وحال کی واقفیت میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے آپ کی اس فن میں چند کتابیں معیار الحق
مصباح الظلم مناظر المصائب وغیرہ توجہ طلب ہیں۔ ان کتابوں سے آپ کی وسیع معلومات کا اندازہ
ہوسکتا ہے۔ زراعت وباغبانی میں آپ کی کتاب الاثمار وکیمیائے زراعت مشہور عام ہیں فلسفہ
قدیمہ اور فلسفہ جدیدہ میں آپ کی کتاب مرآۃ الحکما سوئیڈن اور جرمنی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہے
بہارستان سخن جسکا موضوع شاعری ہے چار جلدوں میں ہے ان میں سے صرف دو جلدیں اشاعت
پذیر ہوئی ہیں۔ ان اشاعت شدہ جلدوں کی نسبت پٹنہ کالج کے ایک پرنسپل کا یہ ریمارک ہے
کہ آج تک یورپ میں کوئی کتاب اس نہج کی تصنیف ہی نہیں ہوئی ہے۔ بقول نواب مسعود جنگ
بہادر سید راس مسعود آپ کی شاعری کا خاص رنگ ہے، فطرتی جذبات محققانہ مسائل اور
عارفانہ واردات کو تغزل کے رنگ میں نبھانا آپ ہی کا حصہ ہے اسی کے ساتھ بلند پروازی
جو غزل سرائی کی جان ہے ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔ آپ صاحب دیوان ہیں۔ اور آپ
نے کچھ کتابیں انگریزی میں بھی لکھی ہیں مثلاً رسالہ طاعون وسوانح عمری حضرت مخدوم الملک
شرف الدین بہاری جس میں مسائل تصوف پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ انگریزی میں آپ کی متفرق
تحریرات ہیں جن میں سے علل اربعہ اور قدم مادہ کی بحثیں قابل توجہ ہیں۔ آپ امامیہ مذہب رکھتے
ہیں آپ بہت زیادہ ملنسار ہیں اگرچہ وقت کی پابندی ہاتھ سے نہیں دیتے خلق اللہ کے فوائد کو

کی وفات کے بعد مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی، خواجہ غلام الثقلین اور مولوی عبد الحلیم شرر کے قلم سے نکلیں۔ یہ تینوں بزرگ مولانا شبلی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ لہذا ان تینوں کی آراء جو کچھ وہ مولانا کو سمجھتے تھے درج کی جاتی ہیں تاکہ ان صاحبان کے ذریعے سے ہم لوگ بھی مولانا سے روشناس ہو جائیں

از مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

"علامہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آغاز تعارف اختلاف سے ہوا کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا بعض اہم مسائل پر اعتراض کیا۔ غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جسکا علامہ شبلی نے جواب لکھا یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب مذکور میں تھا۔

رسی انگہ بہ درد ماکہ چو ما ۔۔۔ خامہ گیری و حرف بنگاری

یہی اختلافی تعارف باعث ملاقات ہوا۔ ملاقات بڑھ کر سرحد نیازمندی تک پہنچی۔ نیاز مخلصانہ محبت سے مبدل ہوا اور الحمد للہ کہ وہ اخلاص علامہ مرحوم کی رحلت تک قائم رہا۔ موت نے اخلاص میں کمی نہیں کی بلکہ حسرت کا اضافہ کر دیا قریباً سی سالہ مدت کے دوران میں صدہا ملاقاتیں ہوئیں۔ بارہا پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔ حبیب گنج بھی چند مرتبہ قدوم سے مشرف ہوا۔ ہر قسم کے مسائل پر بحث و مباحثے رہے۔ اسی تمام تجربہ کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا نظر میں بلندی تھی، مزاج میں استغنا، حوصلے میں عزم تھا، مزاج میں نفاست تھی

بقیہ صفحہ ما قبل ہمیشہ مد نظر رکھتے ہیں۔ صید افگنی کا بھی شوق ہے لیکن اب تقاضائے سن سے گھوڑے اور نیزہ سے شکار کا کھیلنا متروک ہو گیا ہے۔

دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں۔ لیکن دوستوں کی مروت کبھی اُن کو تہی تملق و چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے رو برو نہیں رُکتے تھے مگر اُن کے پس پشت بیانِ اختلاف میں کبھی اُن کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے، اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اس کو ذلیل و رسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجہ کا ہو اُن کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے اُن کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں۔ عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی ان کے بیان کی رفیق و ہمدم تھی جب کبھی کسی علمی مسائل پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کیے فضول باتیں میں نے اُن کی زبان سے کبھی نہیں سُنیں۔

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دل گیری کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی۔

احساس بہت شدید تھا۔ اس لیے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں کانفرنس کے اجلاس کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے ان کے پاؤں پر ڈنک مار دیا اس قدر بے تاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہو گئی۔ اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔ ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک کھانے میں تیز ہو۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے اور

کھانے میں ڈالتے جاتے۔ شیرینی بھی گلو سوز مرغوب تھی۔ یہ عام منظر تھا کہ
کاغذ پر قند رکھا ہوا ہے باتیں کرتے جاتے ہیں قند کے دلنے منھ میں ڈالتے
جاتے ہیں وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیریں کام ہے۔

سخنہائے شیریں بہ از قند ہست

ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بریلی ان کا، میرا ساتھ ہوا
اُس زمانے میں تندرست تھے۔ قریبًا ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی بلکہ کھائی
محض شیریں ہونا کافی تھا۔ اُسکے حسن و قبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے
جاڑوں میں بھی یہی ہوتا۔ اسی کے ساتھ سردی و گرمی بہت محسوس کرتے۔ ایک
مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے۔ متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہوئی
دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ گرمیوں
میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پہ چلے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں
بمبئی کے سفر فارسی شعر و سخن کے لیے یادگار رہیں گے۔ چائے سادہ اور کڑی
پیتے تھے۔ صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔ عادت
میں سادگی تھی۔ لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ غذا بہت کم تھی۔ آخر آخر میں اسکی
قلت سے حیرت ہوتی تھی۔

از آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب[1]	"مجھ کو اندازًا ۱۸۸۴ء میں جب میں انگلو عربک اسکول دہلی کی جماعت مڈل میں پڑھتا اور

[1] سلسلۂ نسب پیدائش اور ابتدائی تعلیم — خواجہ غلام الثقلین کا سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتا ہے۔ آپ کے
آباؤ اجداد شاہ بلبن کے عہد میں ایران سے ہندوستان آئے۔ یہ زمانہ بلبن کے عہد حکومت
کا آخری سال تھا۔ بادشاہ نے پانی پت کے مضافات کا علاقہ بطور جاگیر و معافی دوام نسلاً بعد نسل

مولانا حالی صاحب قبلہ کے ساتھ رہتا تھا پہلے پہل مولانا شبلی کو دیکھنے کا
اتفاق ہوا۔ جن لوگوں نے مولانا شبلی کو آخر زمانہ میں دیکھا ہے وہ اُن کی

بقیہ صفحۂ ماقبل اُن کو عطا کیا جسپر خواجہ صاحب مرحوم کی قوم اب تک قابض ہے۔

آپ ۱۸۶۲ء میں پانی پت میں جبکہ وہاں لنگڑے بخار کا زور تھا پیدا ہوئے
جب آپ نے الف بے شروع کی تو عرصہ تک آپ کی زبان پر حروف نہیں چڑھتے تھے
اور آپ کے والد خواجہ غلام عباس صاحب کو یہ اندیشہ تھا کہ یہ لڑکا کہیں جاہل نہ رہجائے
قرآن شریف پڑھنے تک آپ سے کسی خاص ذہانت کا اظہار نہیں ہوا سوائے اس کے کہ
کچھ عرصہ بعد آپ نے خود تقاضا کر کے اپنے آپ کو سرکاری مدرسہ میں داخل کرایا۔ اس دن
سے بی اے پاس کرنے تک بعض وقفوں کو چھوڑ کر اپنی جماعت میں عموماً اول یا دوم
طلباء میں سے ایک رہے۔

جس زمانہ میں آپ انٹرنس کلاس میں پڑھتے تھے تو ایک مضمون انگریزی میں لکھا
جس کو پڑھ کر ہیڈ ماسٹر صاحب کو یقین نہ آیا کہ وہ انھیں کا لکھا ہوا ہے چنانچہ انھوں نے کہا
کہ "تم ایسا مضمون لکھ سکتے ہو تو تم کو دو سو روپیہ کی نوکری ملسکتی ہے"

اگرچہ آپ کو انٹرنس پاس کرنے تک زیادہ تر درسیات سے شغل رہا تاہم عام
مطالعہ کچھ کم نہ تھا اور مولانا حالی مرحوم کے قریب رہنے سے جنکے آپ قریبی عزیز تھے
تصنیف و تالیف کا شوق ہوتا گیا۔ مگر اس زمانہ میں دو تین مضامین رفیق ہند
یا سر مور گزٹ میں بھیجنے کے علاوہ لکھنے کی اور کوئی مشق نہیں کی۔

مضامین لکھنے کا شوق ایک دن مولانا حالی سے مولوی ذکاء اللہ نے پوچھا کہ "یہ کچھ
لکھتے بھی ہیں یا پڑھا ہی کرتے ہیں" مولانا حالی نے فرمایا
"جی نہیں پڑھنے ہی کا شوق ہے۔ لکھنا لکھانا نہیں جانتے" مولوی ذکاء اللہ نے کہا
"برتن میں جب پانی بھرے گا تو وہ رسے گا بھی" آپ کو ان باتوں سے غیرت آئی چنانچہ

اس شباہت کا اندازہ نہیں کر سکیں گے۔ اسوقت ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور چہرا گول اور بھرا ہوا تھا جس سے ذہانت اور قوت کے آثار نمایاں تھے

بقیہ صفحہ ماقبل چند ماہ کے بعد انٹرنس کا امتحان دیکر ایک مضمون ۱۸-۲۰ صفحہ کا "النظر فی التاریخ" لکھ کر رسالہ حسن حیدرآباد میں بھیجا۔ اس مضمون کو پڑھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ یہ زبردست معلومات ایک سترہ برس کی عمر کے لڑکے میں کس طرح پیدا ہوئی۔ مضمون بہت دھوم دھام سے چھپا اور ایک اشرفی انعام ملی۔

علیگڑھ کالج سے تعلق اکتوبر ۱۸۸۹ء سے اپریل ۱۸۹۴ء تک یعنی ساڑھے سولہ سال کی عمر سے اکیس سال کی عمر تک آپ کو چند ماہ کی تعطیل کے علاوہ برابر علی گڑھ کالج میں رہنا پڑا۔ اول کچھ عرصہ تک آپ کی ملاقات طلباء سے کمتر رہی۔ مگر خیالات میں وسعت اور قومی معاملات میں دلچسپی جسقدر علی گڑھ کالج کی وجہ سے پیدا ہوئی کسی اور تعلیمگاہ سے نہ ہوسکتی تھی۔ سرسید مرحوم سے آپ کو بے تکلف مختلف معاملات پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مسٹر بیک نے آپ کے کالج چھوڑتے وقت لکھا تھا "علمی لحاظ سے ہمارے طلباء میں کوئی ایسا نہیں ہوا"۔ ۱۸۹۱ء کی محمڈن کانفرنس میں آپ نے تعلیم نسواں پر ایک تحریری اسپیچ بڑے جوش کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک پڑھی جس کی تعریف سرسید مرحوم کی تقریروں میں موجود ہے۔ آپ نے اسی زمانہ میں مسئلہ غلامی کی تحقیق میں ۶۴ صفحہ کا ایک رسالہ چھپوایا۔ یہ سرسید کے رسالہ پر ریویو تھا اور سرسید نے اس کو پسند کر کے اپنے رسالۂ غلامی کی جلد توڑ کر اپنی کتاب میں شامل کر لیا تھا۔ مارچ ۱۸۹۳ء میں بیس سال کی عمر میں بی اے پاس کیا اور اس کے بعد بغیر کسی کام کے اپریل ۱۸۹۴ء تک امتحان ایل ایل بی کے خیال سے علیگڑھ رہے۔ جولائی ۱۸۹۵ء میں دوبارہ علی گڑھ گئے اور نومبر تک وہاں مقیم رہے۔ اس پانچ ماہ کی محنت سے ایل ایل بی کا امتحان نومبر میں دیا اور بفضل خدا کامیاب ہوئے۔

دریافت کرنے پر مولانا حالی صاحب قبلہ نے فرمایا کہ یہ بہت قابل آدمی ہیں
غالباً ان کی مشہور نظم مثنوی "صبح امید" اس سے قبل شایع ہو چکی تھی۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء

بقیہ صفحہ ماقبل۔ نواب محسن الملک بہادر اور ممبئی (وسط مارچ ۱۸۹۴ء سے بی اے۔ پاس کرنے کے ایک سال بعد تک نواب محسن الملک مرحوم نے آپ کو بحیثیت اپنے مترجم اور سکریٹری کے رکھا۔ آپ چودہ پندرہ ماہ اُن کے ساتھ اکثر ممبئی اور بہت کم علی گڑھ میں رہے۔ اُن کے طرز عمل اور تجربہ سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ آپ کو نواب مرحوم کے واسطے غالباً ہزار ڈیڑھ ہزار صفحوں کی مشکل مطالب کی انگریزی کتب مابعد الطبیعات والہیات واصول اخلاق وغیرہ کا ترجمہ کرنا پڑا۔ اور اسی سے مغرب کے اہل مذاہب و فلسفہ کے اصول سے اچھی واقفیت پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں انگلستان میں ترکوں اور سلطان المعظم کے برخلاف بدزبانی کی جنگ جاری تھی۔ آپ نے ایک مضمون اس شورش کے خلاف لکھکر مسلمانان ہند کے خیالات ظاہر کیے یہ مضمون جون ۱۸۹۵ء کے رسالہ "نیسویں صدی وبعدہ" میں چھپا اور اس کا بڑا چرچا انگلستان میں ہوا۔ اس کے معاوضہ میں آپ کو دو سو پچپن روپے ملے۔

حیدرآباد سے تعلق۔ آپ ۴ جنوری ۱۸۹۶ء کو حسب الطلب مولوی سید علی حسن صاحب ابن عم نواب محسن الملک بہادر حیدرآباد پہنچے اور اُن کی عنایت سے زائد طور پر سرو قار الامراء کے اسٹاف میں ۶ جنوری کو مقرر ہو گئے اپریل سنہ ۱۹۰۱ء تک یعنی پانچ سال سے کچھ اوپر آپ کا تعلق ریاست حیدرآباد سے رہا اور مختلف خدمات پر سرفراز رہے۔ آپ نے قیام حیدرآباد میں ایک سلسلہ انگریزی مضامین اور کلمات کا لکھا جو کتاب کی شکل میں چھاپا گیا۔ آپ نے ہندی ناگری کے مباحثہ کے متعلق سنہ ۱۹۰۰ء میں ایک کھلا خط لارڈ کرزن کے نام لکھا جسکا خاص شکریہ لارڈ موصوف نے ادا کیا۔

میرٹھ و علی گڑھ سنہ ۱۹۰۱ء لغایتہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں وزارت حیدرآباد نے

جبکہ میں کالج میں داخل ہوا، دسمبر ۱۸۹۵ء تک جبکہ میں نے کالج چھوڑا چند درمیانی وقفوں کو چھوڑ کر کرے کے علاوہ بھی مولانا سے ہفتے میں دو چار بار

بقیہ صفحہ ماقبل | آپ کو وکالت کے لیے دو سال کی رخصت دیدی اور آپ اس وقت مستقلاً شمالی ہندوستان میں چلے آئے۔ دو تین ہفتہ آپ علی گڑھ میں رہے اور وہاں ایک بسیط لکچر انگریزی زبان میں دیا جسکا عنوان ہے "مسلمانوں کی حالت انیسویں صدی میں" وہ آبزرور میں شایع ہوا اور اخبار المؤید مصر نے نہایت تعریف کے ساتھ فصیح عربی میں اُس کا ترجمہ کیا۔

۲۱ مئی سنہ ۱۹۰۱ء کو آپ نے میرٹھ میں وکالت شروع کی اور چند وقفوں کو چھوڑ کر آپ برابر میرٹھ میں وکالت کرتے رہے۔ دہلی کانفرنس سنہ ۱۹۰۲ء میں آپ نے ایک بہت بڑی تقریر کی جسکی وجہ سے کانفرنس میں ایک صیغہ "اصلاح تمدن" قائم ہوا۔ اور آپ اسکے سکرٹری مقرر کیے گئے۔

جنوری سنہ ۱۹۰۳ء سے عصر جدید شایع کیا اور اُسکے ذریعہ سے اصلاحی انجمنیں جابجا قائم ہونے لگیں۔ اخباروں کے مقاصد وسیع ہونے لگے۔ اصلاح تمدن کا چرچا ہونے لگا اسی زمانہ میں آپ نے اپنے شوشل اور اصلاحی مضامین اور اصلاح تمدن کے قواعد ایک کتاب میں مضامین اصلاح و ترقی کے نام سے شایع کیے۔

مالیر کوٹلہ اور لکھنؤ | اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء میں آپ کو ولیعہد صاحب مالیر کوٹلہ نے طلب کیا اور آپ وہاں نومبر سنہ ۱۹۰۶ء تک رہے۔ بعد ازاں آپ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۰۸ء کو لکھنؤ پہنچے۔ وہاں شیعہ سنی فرقوں میں کشمکش تھی۔ خواجہ صاحب نے اس کو رفع کرنا چاہا مگر دونوں فرقوں میں خود پسندی و جہالت بڑھی ہوئی تھی لہذا آپ کی کوشش بخوبی سرسبز نہ ہوئیں اور سنہ ۱۹۰۸ء میں سنی اور سنہ ۱۹۰۹ء میں شیعہ ناراض رہے عصر جدید کے مصلحانہ مضامین پر مخالفانہ ریمارک ہونے لگے۔ شیعہ کانفرنس کے واقعات پیش آئے

ملاقات کا موقع حاصل ہوتا تھا۔ اس کے بعد حیدرآباد اور لکھنؤ میں بھی ملاقات کے بہت سے موقعے حاصل رہے۔ اس لیے ذاتی طور پر میں مرحوم کے خصائل کو بیان کر سکتا ہوں۔

بقیہ صفحۂ ماقبل اور لکھنؤ میں مالی نقصان بھی ہزار ہا روپیہ کا ہوا۔

اثنائے قیام لکھنؤ میں آپ نے تین ہزار میل کا ریل پر دورہ کیا۔ اور بیس پچیس شہروں میں اسلام اصلاح تمدن اور اصلاح اخلاق پر ۵-۶-۱۰ تک لیکچر دیے۔ عصر جدید میں قومی بینک بنانے پر مسلسل مضامین لکھے۔ میرٹھ سے بہت سے خطوط آپ کے پاس آ رہے تھے لہذا لکھنؤ سے جون ۱۹۰۸ء میں پھر میرٹھ چلے آئے۔

میرٹھ کی مراجعت آپ کی وکالت کا کام یہاں پھر بڑھ گیا۔ ۱۹۰۸ء کے ختم ہونے پر آپ نے عصر جدید کو ملتوی کر دیا جس کا اجراء ۱۴ مئی ۱۹۰۳ء میں دوبارہ ہوا

اپریل ۱۹۰۹ء میں آپ میرٹھ سے ایک مرتبہ پانی پت تشریف لے گئے۔ وہاں جاکر سخت بیمار ہو گئے رستہ میں لو لگ گئی تھی زیست کی امید جاتی رہی تھی مگر خدا نے شفا دی آپ نے صحت یاب ہونے کے بعد اسی زمانہ میں اخبار "شحنہ ہند" میں (جو مولوی احمد حسن شوکت کی زیر ادارت شایع ہوتا تھا) متعدد مضامین خواجہ صاحب اور بعض دیگر مضمون نگاروں کی طرف سے شایع ہوئے جن میں علیگڑھ کلیک کی خفیہ سازشوں کو ظاہر کیا گیا تھا

۱۹۰۹ء کے آخر میں رفارم اسکیم منظور ہو گئی اور پراونشیل کونسل کی ممبری کے لیے آپ نے کوشش شروع کی لیکن صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے مقابلہ میں ناکام رہے۔ اس زمانہ میں صرف ایک انگریزی مضمون بعنوان "انگلستان کی پالیسی ایران میں اور اسکے خطرات" لکھا جو مسلم ریویو الہ آباد میں شایع ہوا۔ اور دو چار مضمون فارسی زبان میں اخبار "حبل المتین" میں لکھے یہ مضمون بھی ایران اور اہل ایران کی بہبودی کے لیے تھے۔

علی گڑھ کے طلباء میں مولانا شبلی عموماً غیر ہر دل عزیز تھے ان کو طلباء
خشک اور مغرور سمجھتے تھے۔ لیکن یہ خیال غلط تھا۔ مولانا کی نگاہ دوررس تھی۔

بقیہ صفحہ ما قبل: زیارات مقامات مقدسہ ۲۰ مئی ۱۹۱۱ء کو آپ یکا یک یکہ و تنہا سفر ممالک اسلامیہ و زیارات مقامات مقدسہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور عراق عرب، ایران، جنوبی روس، قسطنطنیہ، بیروت، دمشق، شام، حجاز اور مصر کی سیاحت کی۔ اور آخر دسمبر ۱۹۱۱ء میں واپس آ گئے۔ یہاں آ کر آپ نے ایک سفرنامہ جو بطور ایک روزنامچہ کے ہے اور سفر ہی میں لکھ لیا تھا اور اسی وجہ سے اس کا نام بھی "روزنامچہ سیاحت" رکھا گیا ہے چھپوا کر شایع کیا۔ یہ کتاب مفید اور دلچسپ ہے اور ممالک اسلامی کے حالات پر زبردست روشنی ڈالتی ہے۔

شروع ۱۹۱۲ء سے آخر جولائی ۱۹۱۵ء تک یعنی انتقال سے صرف ایک مہینہ پہلے تک آپ میرٹھ میں رہے ۱۹۱۲ء کے آخر میں جب کونسل کی ممبری کا دوبارہ انتخاب ہوا تو خواجہ صاحب مرحوم کامیاب ہوئے اور کونسل کا کام اس تندھی اور محنت سے کیا کہ عرصہ دراز تک ان کی نظیر کونسل کے متعلق دی جائے گی مسئلہ سود کے متعلق آپ نے ایک کتاب تحریر کی اور جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے خواجہ صاحب مرحوم نے سود کی کمی کے متعلق بے انتہا کوشش کی۔

موت سے دو تین برس پہلے آپ نے وقف منصبیہ میرٹھ کے متعلق بھی پوری جدّ و جہد کی اور وقف کو اسکے اصلی منشاء پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ بد دیانت متولی علیحدہ کیے گئے اور ایک انتظامی کمیٹی مقرر ہوئی۔ سید محمد حسین صاحب شوق سہارنپوری سابق ڈپٹی مجسٹریٹ انہار آج کل اس کے متولی ہیں اور نہایت عمدہ طور پر اپنے فرائض کو ادا کر رہے ہیں۔

انتقال شروع اگست میں خواجہ صاحب مرحوم میرٹھ سے بغرض تبدیل آب و ہوا

اس لیے فاصلے سے طلباء کو پہچان نہیں سکتے تھے اور جب کوئی سلام کرتا
یا سامنے سے گذرتا تو اس کو غور سے دیکھا کرتے تھے اس سے طالب علموں
کو غلط فہمی ہوتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خواہ طالب علم ہو یا غیر طالب علم
جو شخص ان سے ملتا تھا وہ اس سے جلد اور آسانی آشنا نہیں ہوتے تھے
بلکہ جس میں کوئی خاص علمی یا ادبی مذاق نہ ہوتا تھا اس کی ملاقات سے
مولانا کسی مسرت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس کے برخلاف جو علمی
مباحث میں دلچسپی لیتے تھے اور اسی قسم کی گفتگو کرتے تھے ان سے ملکر
وہ بہت خوش ہوتے تھے اور جلد بے تکلف ہو جاتے تھے۔ ان کی صحبت میں
غیر دلچسپ یا جاہلانہ گفتگو کو بہت کم دخل ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انکے
ملنے والوں کا دائرہ بہت محدود رہتا تھا۔

مولانا شبلی کی زندگی میں چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک
یہ کہ باوجود نہایت ضخیم کتابیں تالیف کرنے کے اور کثیر التصانیف ہونے
کے وہ کسی دن بھی فلسکیپ کے دو یا تین صفحے سے زیادہ نہیں لکھتے تھے
زیادہ وقت مطالعہ میں اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے لکھنے میں
صرف کرتے تھے۔ لکھتے دیر میں اور سوچ کر مگر اس میں کاٹ چھانٹ بہت

بقیہ صفحہ ماقبل منٹگمری تشریف لیگئے بیس بائیس روز وہاں رہکر ۲۲۔ اگست سنہ ۱۹۱۵ء
کی صبح کو سخت علالت کی حالت میں پانی پت آگئے۔ وہاں تیرہ روز تک بیمار رہے ۳ ستمبر
کو رات کے دس بجے بروز جمعہ یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے قرآن مجید
سنتے سنتے انتقال فرمایا۔ دراصل یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ایسا شخص جو ہمدرد اسلام تھا
تینتالیس برس سے زیادہ زندہ نہ رہا اور جو زمانہ اسکے کام کرنے کا آیا تھا عین اسوقت
وہ ہمارے درمیان سے اٹھا لیا گیا۔

کم ہوتی تھی ہمیشہ ایک دو سطر بیچ میں چھوڑ کر کھلا کھلا لکھتے تھے خط نہایت صاف اور باقاعدہ ہوتا تھا۔ آخر عمر تک خوشنویسی کی شان اس قدر تھی کہ شاید ہی کوئی اتنا بڑا مصنف حروف کی خوبصورتی کی اس قدر پرواکرتا ہو ایک خاص بات ان کی طبیعت میں یہ تھی کہ بجز تعلیم اور علمی مذاکرہ و مباحثے کے اور کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ غالباً ۱۷ برس کی عمر سے ۵۷ برس کی عمر تک ان کے پورے ۴۰ سال خالص علمی زندگی میں بسر ہوئے یہ علمی زندگی بھی محض تقلیدی و ورق گردانی نہ تھی اور نہ صرف بیکار معلومات کا دماغ میں جمع کرنا اس کا مقصد تھا۔ بلکہ وہ اس کے ذریعے روشنی اور آزادی پھیلانا چاہتے تھے۔

انسانوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو مذہبی تخیلات رکھتے ہیں دوسرے وہ جو مذہب سے بالکل بیگانہ و بے پروا رہتے ہیں اور ایک آزاد دماغ رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جن کے دماغ میں مذہب و آزادی مرکب صورت میں پائی جاتی ہے اس گروہ کی دو شاخیں ہیں۔ اول جن میں مذہب غالب ہے۔ دوم وہ جن میں آزادی قومیت اور مدنیت کا خیال مذہب پر غالب ہے۔ میرے خیال میں مولانا شبلی کا شمار آخری گروہ میں ہے۔ لیکن وہ آزاد خیالی مذہب ہی کے دائرے میں محدود نہ رکھتے تھے بلکہ اس کو پالیٹکس تک پہنچاتے تھے چنانچہ آخری عمر میں انھوں نے اپنے پولٹیکل خیالات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ سرسید احمد خاں مرحوم مذہب میں کچھ کم آزاد خیال نہ تھے لیکن سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر قدامت پسند یا کنزرویٹو واقع ہوئے تھے۔ اس لیے کالج کی پروفیسری کے زمانے ہی سے مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات

سخت کراہت تھی مگر یہ بات عجیب ہے کہ مولانا شبلی کی حریت خیال جہاں مذہب اور اپنے زمانے کے پالیٹکس میں حاوی تھی وہاں تاریخی معاملات میں خاصکر مطلق العنان اور جابر بادشاہوں کی تائید میں وہ مفقود ہو جاتی تھی۔ انسانی دماغ اس قسم کے متبائن رجحانات سے معمور ہے اُن کے اس میلان کی زیادہ تر یہی وجہ تھی کہ یورپین اور عیسائی مورخوں اور آریہ مناظروں نے طریقہ اعتدال کو چھوڑ کر ہر مسلمان حکمراں پر اعتراضات کی ناواجب سختی روا رکھی تھی اور اس بات کو عمداً نظر انداز کر دیا تھا کہ کسی قرن کے افعال کو بدنیتی کی طرف محمول کرنا ایک غیر عاقلانہ اور غیر فلسفیانہ فعل ہے۔ اس بے اعتدالی کے جواب میں مولانا شبلی بعض تاریخی مضامین و تصانیف میں اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ عموماً مسلمان بادشاہ (لہذا اُن کے عام درباری اور اہل زمانہ) نہایت مفید اور اچھے کام کرتے تھے۔ حالانکہ اگر کل تک یہ حالت تھی تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت آج اسقدر خراب نظر آتی ہے۔ لیکن یہ رائے کا اختلاف ہے مولانا شبلی کا خیال تھا کہ عالمگیر، جہانگیر یا عبدالحمید خاں کی تائید سے اصل اسلام پر الزام تک کی نوبت نہیں پہنچے گی ہمارا خیال اسکے خلاف ہے

ع ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔

مولانا شبلی کے عزم و استقلال، محبت قومی، علمیت اور بلند ارادوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ روپے کی محبت مولانا کو کبھی ایک لمحہ کو بھی نہیں ہوئی۔ اُن کے ارادوں میں پچھلے دس پندرہ برس کے اندر کسی قدر تنزل اور تلون کا پتہ ملتا ہے لیکن اس تہ میں دو باتیں تھیں۔ اول یہ کہ وہ ایک ہی مقصود کو مختلف راستوں سے تلاش کرتے تھے جسمانی

ضعف اور بیرونی حوادث کا نتیجہ تھا کہ وہ علمی معاملات میں مزاحم مشکلات پر
غالب نہ آسکتے تھے۔ خدا اُن پر رحم کرے کہ وہ ہم سے ایسے وقت میں جدا ہوئے
ہیں جب وہ ہمارے لیے نہایت مفید کام انجام دے رہے تھے اور دے سکتے تھے

مولانا **شبلی** نے تین اہم کام انجام دینے کی کوشش کی اور ان میں ایک
بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی **ایک وقف علی الاولاد** کا
مسئلہ جسکو پہلے بھی لوگوں نے مختلف طریقے سے چھیڑا تھا، انھیں کی کوشش
سے سرسبز ہوا۔ دوم مولانا کی یہ کوشش تھی کہ حالات زمانہ سے باخبر
روشن دماغ اور مفید دینی عالم پیدا ہوں۔ اس کی بنیاد پڑ گئی ہے اور کچھ لوگ
جو مولانا کے نام لیوا ہیں اور انھیں کے طرز کا تحریر میں اتباع کرتے ہیں
ان میں تاریخ نویسی اور قومی عصبیت کے ساتھ روحانیت کا بھی سادہ سا پہلو
ملا تو ہم کہینگے کہ یہ دوسری کوشش بھی کامیاب ہوئی۔ سوم وہ چاہتے تھے
کہ مسلمان بادشاہوں پر سے تاریخی الزامات رفع کیے جائیں۔ ان کی نسبت
ہم اوپر رائے دے چکے ہیں۔ مولانا کو اس معاملہ میں بھی خاص کامیابی
ہوئی۔ اگرچہ اسلام اور مسلمین کی تاریخ کو ہم دانستہ جدا جدا سمجھتے ہیں۔ ایک
شخص کی زندگی میں ایسے عظیم الشان کارنامے اس کو سیکڑوں برس تک
زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں"

از مولوی عبدالحلیم صاحب شرر

"...... مولانا کو ہجوم امراض قبض و بواسیر کی تکالیف اور معدہ کی
کمزوری نے بہت ہی ضعیف اور ناتوان بنادیا تھا جسکی وجہ سے انکی
عمر اصل سے زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ اُن کے بیان کے مطابق اُن کی عمر
۵۵-۵۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔

مولانا نے جن درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی اور جن اساتذہ سے پڑھا انکی صحبت نے ابتدا ہی میں انھیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق میں انھوں نے اپنے نام کے ساتھ **نعمانی** کا لقب لکھنا شروع کیا جسکی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں نے انھیں غلطی میں پڑکر نسبًا نعمانی یعنی امام اعظم ابو حنیفہ کوفی کی نسل میں خیال کر لیا مگر اسکی کوئی اصلیت و حقیقت نہیں ہے وہ متشدد حنفی تھے اور حنفیت میں اپنے آپ کو اوروں سے ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے اسی جوش کا تقاضا یہی تھا کہ امام صاحب کی سوانحمری انھوں نے **سیرت النعمان** لکھی تو امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل بخاری پر جا بجا حملے کیے اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے یہاں تک کہ امام ابو الحسن اشعری بھی محض اتباع حدیث کے باعث انکے مورد سہام بن گئے۔

.... علی گڑھ کالج کو عربی کے ایک اچھے ادیب اور فاضل پر کی ضرورت ہوئی۔ انھوں نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق و سفارش سے درخواست بھیجی۔ سید صاحب نے مولانا کی درخواست کو قبول کر لیا چنانچہ مولانا بستی اور وہاں کے قانونی مشاغل کو چھوڑ کر لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے۔ میں اسوقت داروغہ حمید بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا اور ان کے چہرے سے محسوس کر رہا تھا کہ یہاں کے طلبہ میں سے ہر ایک کو وہ وحشت و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے مگر باوجود اس وحشت کے طلبہ ہی میں رہتے تھے اس لیے کہ اس وقت تک پبلک سے ان کو سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی جو سب سے الگ بالکل باہمہ اور بے ہمہ تھا اور ایک خاموش مقام تھا۔ ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھکر سید صاحب

نے اُن سے ربط وضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور مورخانہ تحقیق کے غور وخوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کے لیے انھیں اکثر حدیث و فقہ و تاریخ وغیرہ کی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا۔ اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جسقدر سید صاحب کی دقیقہ رسی اور وسعت نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے اُس سے زیادہ سید صاحب اُن کی تلاش جستجو اور طلب روایات کے معتقد و معترف ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جاکے ٹھہرنے اور اُنکے ذریعے سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتوں کھانا کھانے اور شریک صحبت رہنے کا موقع ملا۔ مولانا سے اور مجھ سے حد درجہ کی بےتکلفی تھی اور میں اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر اُن سے مشورہ کے نہ کرتے اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم جو اُن دنوں شایع ہوئی تھی (صبح امید) ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے اُن کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُر لطف اور مؤثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے اور اسی زمانے میں علی گڑھ کے ایک طالبعلمانہ تھیٹر میں انھوں نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی۔

ان چیزوں نے انھیں فارسی اور اردو کا ایک مقبول عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک دقیقہ رس شاعر تھے اور اپنی نظموں کو ایسی نغمہ خیز دھن میں سُنایا کرتے تھے کہ پبلک نے بہت پسند کیا اور طلبہ نے اسے اختیار کرکے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبول عام دھن بنا کے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا۔ مگر پھر بھی میں کہوں گا کہ وہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے بلکہ علم کے عالم میں انکی شان ایک شاعر کے درجے سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھی۔

اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے وہ تاریخی تنقید و تحقیق میں مصروف تھے جبکا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ان کا لکچر تھا جسے انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا یہ لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور بہت ہی دلچسپ چیز تھا۔ چنانچہ جب اُس پر دلگداز میں ریویو ہوا ہے تو کوئی نہ تھا جو اسکے دیکھنے کا مشتاق ہو گیا اسی نوعیت کی اُن کی دوسری کتاب المامون تھی جو علی العموم بہت پسند کی گئی اور اسی کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس قسم کے مصنف ہیں اور یہ کہ وہ آیندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں۔

اب سید صاحب کی صحبت اور پبلک کی حوصلہ افزائی نے مولانا کو اسی کوچہ میں آگے بڑھانا شروع کیا۔ سیرۃ النعمان لکھی۔ الفاروق لکھی اور تاریخی جستجو کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کتابوں کی تلاش میں قسطنطنیہ پہنچے اور واپس آکے اپنا سفرنامہ شائع کیا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شوق میں وہاں گئے تھے وہ پورا نہ ہوا اور اسی وجہ سے اُن کی یہ تصنیف ایک ناکام تصنیف ہے۔

اس موقع پر اُن کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان
کردینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ سرسید دراصل غیر مقلد اور اہل حدیث کے
گروہ میں تھے لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک ٹی ہی
حد تک انھیں معتزلی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر
نہ ہونا غیر ممکن تھا مگر اہل حدیث کی طرف سے اُن کے دل میں جو بھڑک تھی
وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انھیں نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی
لہذا بغیر اسکے کہ غیر مقلدی کا کچھ بھی رنگ چڑھنے پائے وہ بلا واسطہ نعمانی
سے معتزلی بننے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت
کو اصلی اعتزال ثابت کریں اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے جو حنفیت کو اشعری
کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں انھوں نے اپنی حنفیت کو اشعریت کا سخت دشمن
اور فقہ کے پردہ میں چھپی ہوئی معتزلیت ثابت کرنا چاہا جسکا لازمی نتیجہ تھا
کہ انگریزی طلبہ اُن کی باتوں سے خوش ہو ہو کر دینداری و خوش اعتقادی کے
دھوکے میں معتزلی ہونے لگے اور موجودہ علمائے حنفیہ سے انکو سخت عناد ہو لیا

اب اس کے ساتھ ہی ان میں ایک دوسرا تغیر شروع ہوا۔ ان میں باوجود انتہا
درجے کے اخلاق کے، خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی
صحبت علی گڑھ کالج کی مرجعیت اور انکی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداءً اس
حیثیت سے پبلک میں متعارف کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ
اور انکی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں خصوصاً جبکہ سید صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گئے
تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہوگئی مگر خود مولانا شبلی کی خودداری[1] اس

[1] یہ جملہ اپنے مطلب کی صاف اور واضح طور پر بیان کرنے میں قاصر ہے اور شبہ ہوتا ہے کہ کچھ الفاظ بدل گئے ہیں یا رہ گئے ہیں حالانکہ دونوں باتیں نہیں حضرت شرر نے اس جملہ کو لکھتے وقت اس امر کا خیال نہیں کیا کہ اس سے عبارت کی روانی میں فرق آتا ہے اور ایک قسم کی رکاوٹ اور الجھن پیدا ہوتی ہے ہم نے اسے واضح کرنیکی غرض سے کاما لگا دیے ہیں

حیثیت کو اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے، لیکن پھر بھی اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلماء میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعے سے میں علماء کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجہ پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔ میں نے بارہا انکو اس خیال سے روکا اور اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ علماء بس میں آنے والے نہیں ہیں ان مرحومین امت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس زمانہ میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں اسپر آیہ کریمہ لوکان فیہما آلہتان الا اللہ لفسدتا پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علی گڑھ کالج ہی ہے مگر انھوں نے نہ مانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو انھوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا مگر آخر میں ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے۔ جسکا ان کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا اور وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کف افسوس ملتے ہوئے مرے۔"

تعلیمیافتہ گروہ سے خطاب جدید تعلیم یافتہ صاحب جو قرآن و حدیث سے ناواقف ہونے کی بنا پر عقلائے یورپ کے ناموں پر ایمان لے آئے ہیں، ان کو مولانا شبلی اس طرح مخاطب کرتے ہیں

اے کہ بر مائدۂ یورپ مہماں باشی	حیف باشد اگر از جملۂ ایشاں باشی
حیف اگر از اثر فلسفۂ مغربیاں	منکر فلسفہ سنت و قرآں باشی
مسمر از شعبدۂ جلوہ دہ سرنہی	منکر معجزہ موسیٰ عمراں باشی
گفتۂ سولن و آئین جہانبانی او	بر زباں داری و بیگانہ زلقماں باشی

از خیال عمدا فسانہ و دستاں گوئی — جاہل از معرکہ ہائے شہ مرداں باشی
قیصران ہمہ یک یک بشماری ز آغاز — بے خبر از عمرو حیدر و عثماں باشی
(از الفاروق)

حضرت خالد کا معزول ہونا

شام کی فتوحات اور ۱۷ھ ہجری کے واقعات میں حضرت خالد کا معزول ہونا ایک اہم واقعہ ہے۔ عام مورخین کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا جو حکم دیا وہ خالد کی معزولی تھی۔ ابن الاثیر وغیرہ سب یہی لکھتے آتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی سخت غلطی ہے افسوس ہے کہ ابن الاثیر کو خود اپنی اختلاف بیانی کا بھی خیال نہیں خود ہی ۱۳ھ ہجری کے واقعات میں خالد کا معزول ہونا لکھا ہے اور خود ہی ۱۷ھ ہجری کے واقعات میں انکی معزولی کا الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ بالکل ایک سے واقعات نقل کیے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر خالد کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے مدت سے ناراض تھے۔ تاہم آغاز خلافت میں ان سے کچھ تعرض کرنا نہیں چاہا۔ لیکن چونکہ خالد کی عادت تھی کہ وہ کاغذات حساب دربار خلافت کو نہیں بھیجتے تھے، اس لیے اُن کو تاکید لکھی کہ آئندہ سے اس کا خیال رکھیں خالد نے جواب میں لکھا کہ میں حضرت ابوبکر کے زمانے سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں اور اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا حضرت عمر کو ان کی یہ مختاری کیونکر پسند ہو سکتی تھی اور وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بیدریغ کیونکر کسی کے ہاتھ میں دے سکتے تھے چنانچہ خالد کو لکھا کہ تم اسی شرط

سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو۔ **خالد** نے اس شرط کو نامنظور کیا اور اس بنا پر وہ سپہ سالاری کے عہدہ سے معزول کر دیئے گئے۔ چنانچہ اس واقعہ کو **حافظ ابن حجر** نے **کتاب الاصابۃ** میں **حضرت خالد** کے احوال، بہ تفصیل لکھا ہے۔

باایں ہمہ انکو بالکل معزول نہیں کیا بلکہ **ابو عبیدہ** کے ماتحت کر دیا اسکے بعد سنہ ہجری میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت **خالد** نے ایک شاعر کو دس ہزار روپیہ انعام میں دیئے پرچہ نویسوں نے اسیوقت حضرت عمرؓ کو پرچہ لکھا۔ حضرت عمرؓ نے ابو عبیدہ کو خط لکھا کہ **خالد** نے یہ انعام اپنی گرہ سے دیا تو اسراف کیا اور **بیت المال** سے دیا تو خیانت کی۔ دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں **خالد** جس کیفیت سے معزول کیے گئے وہ سننے کے قابل ہے۔ قاصد نے جو **معزولی** کا خط لیکر آیا تھا مجمع عام میں خالد سے پوچھا کہ یہ انعام تم نے کہاں سے دیا **خالد** اگر اپنی خطا کا اقرار کر لیتے تو حضرت **عمر** کا حکم تھا کہ ان سے درگذر کی جائے لیکن وہ **خطا** کے اقرار کرنے پر راضی نہ تھے۔ مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر ان کے سر سے ٹوپی اتارلی اور انکی سرتابی کی سزا کے لیے انہی کے عمامہ سے اُن کی گردن باندھی۔ یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایسا بڑا سپہ سالار جس کا نظیر تمام اسلام میں کوئی شخص موجود نہ تھا اور جس کی تلوار نے **عراق** و شام کا فیصلہ کر دیا تھا، اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور مطلق دم نہیں مارتا۔ اس واقعہ سے ایک طرف تو **خالد** کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہے اور دوسری طرف **حضرت عمر** کی سطوت و جلال کا اندازہ ہوتا ہے **خالد** نے **حمص** پہنچکر اپنی معزولی کے متعلق ایک تقریر کی تقریر میں

یہ بھی کہا کہ امیرالمومنین عمر نے مجکو شام کا افسر مقرر کیا اور جب میں نے تمام شام کو زیر کر لیا تو مجکو معزول کر دیا۔ اس فقرے پر ایک سپاہی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے سردار چپ رہ، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے خالد نے کہا ہاں! لیکن عمر کے ہوتے فتنہ کا کیا احتمال ہے؟"

ایک اور موقع سے انتخاب کیا جاتا ہے۔

خاتمہ

شاہ ولی اللہ صاحب نے حضرت عمر کی اس خصوصیت (یعنی جامعیت کمالات) کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے اور ہم اسی پر اس کتاب کو ختم کرتے ہیں۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

سینۂ فاروق اعظم را بمنزلہ خانہ تصور کن کہ درہاے مختلف دارد در ہر درے صاحب کمالے نشستہ و در یک در مثلاً سکندر ذوالقرنین باآنہمہ سلیقۂ ملک گیری وجہاں ستانی وجمع جیوش وبرہم زدن اعدا، و در دیگر نوشیروانی باآں ہمہ رفق ولین ورعیت پروری وداد گستری (اگرچہ ذکر نوشیرواں در مبحث فضائل حضرت فاروق سوء ادب است) و در دیگر امام ابوحنیفہ وامام مالکی باآں ہمہ قیام بہ علم فتوی واحکام و در دیگر مرشدی مثل سیدی عبدالقادر جیلانی یا خواجہ علاء الدین و در دیگر محدثے بروزن ابوہریرہ وابن عمر و در دیگر حکیمے مانند جلال الدین رومی یا شیخ فریدالدین عطار ومردمان گرداگرد ایں خانہ ایستادہ اند وہر محتاجے حاجت خود را از صاحب فن درخواست می نماید وکامیاب می گردد"

مولانا شبلی کا اعتراض ہے کہ عام مورخین نے جو لکھا ہے کہ حضرت عمر نے عنانِ خلافت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا جو حکم دیا وہ خالد کی معزولی

بھی غلط ہے۔ لیکن اس غلطی کا ازالہ صرف حافظ ابن حجر کی کتاب سے نہیں ہو سکتا اور ابن الاثیر پر جو اعتراض کیا ہے وہ خود مولانا کی تحریر سے دور ہو جاتا ہے ۱۳ہجری کے واقعات میں خالد کا معزول ہونا اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ وہ ابو عبیدہ کے ماتحت کر دیے گئے تھے۔ بالکل معزول ہونے اور معزول ہونے میں کیا فرق ہے؟ جب ایک سپہ سالار نائب سپہ سالار کر دیا تو سپہ سالاری سے تو وہ بالکل معزول ہی ہو گیا۔ اور ۱۷ہجری کے واقعات میں ابن الاثیر کا الگ عنوان قائم کرنا بھی صحیح ہے جب کہ خالد نائب سپہ سالار بھی نہ رہے حافظ ابن حجر وہ شخص ہیں جس کی نسبت سیرت النبی میں خود مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں:۔

"حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث (بحیرا کا مشہور واقعہ سفر شام میں) کو صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن چونکہ حضرت ابوبکر اور بلال کی شرکت بداہتہً غلط ہے، اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں"

پس کیا وجہ ہے کہ عام مورخین کے بیان کو باطل کہا جائے اور صرف حافظ ابن حجر کا بیان تسلیم کر لیا جائے۔ غالباً ابن الاثیر کی طرح خود مولانا کو بھی اپنی اختلاف بیانی کا خیال نہیں رہا۔ (از سیرت النبی جلد اوّل)

سب سے پہلے وہ الفاظ جن سے مولانا شبلی نے اپنی تصنیف دربار رسالت میں پیشکش کی ہے درج کرتا ہوں دیکھنے میں ایک جملہ ہے اور ایک مصرع لیکن غضب کا اثر بھرا ہوا ہے کم از کم راقم کی آنکھوں سے

یہ سرنامہ پڑھ کر ہمیشہ آنسو نکل آتے ہیں اور جتنی مرتبہ پڑھا ہے اتنی ہی مرتبہ اشک جاری ہو گئے ہیں۔

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں، اخلاص وعقیدت کی نذر لیکر آیا ہے،

زچشمم آستیں بردار وگوہر را تماشا کن

شبلی، شوال سنہ ۱۳۳۲ھ

"عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کیجائے یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع کی نہایت صحیح طریقہ سے قائم کیے جائیں اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کیجائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے۔ اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جا کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں، اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر، محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں۔ اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا،

لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے، کہ نہ زبان سے کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کیے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے، بلکہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے، اور جس کا ایک ایک اشارہ، اوامر سلطانی بن جائے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں۔

لیکن اس وقت تک دنیا کی جسقدر تاریخ معلوم ہے اس نے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کیے ہیں، وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے۔ مثلاً جناب **مسیح** علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لیے جو فضائل اخلاق درکار ہیں مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے حضرت **موسیٰ** اور **نوح** علیہما السلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں۔ اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لیے عالم انسانی اپنی تکمیل کے لیے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشورکشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریادل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفۂ یزدانی، عالم کون کی آخری معراج ہے، الیوم اکملت لکم دینکم۔

عالم فانی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لیے یہ ہستی جامع، دنیا میں آکر ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے ضرور ہے کہ اسکی زبان کا ایک ایک حرف، اسکی

حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا، اس کے حُلیۂ وجود کے ایک ایک
خط و خال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحل زندگی میں جہاں ضرورت پیش
آئے رہنمائی کے کام آئے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام
بانیانِ مذہب جامعیت کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، اُن کے کارنامۂ
زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں۔ جناب مسیح کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے
صرف تین برس کے حالات معلوم ہیں۔ فارس کے مصلحانِ دین صرف
شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، **ہندوستان** کے پیغمبر
افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت **موسیٰ** علیہ السلام کی نسبت آج
جو کچھ معلوم ہے اُس کا ذریعہ صرف موجودہ **توراۃ** ہے جو حضرت موسیٰ
کے تین سو برس بعد عالم وجود میں آئی۔ یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا
کہ ان کے کارنامے اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اس لیے نقل و روایت
کے آئینہ میں جس قدر ان کا ناتمام عکس اُترا اس سے زیادہ ضروری بھی
نہ تھا۔ قدرت، خود ضرورت کی اندازہ داں ہے، اور جب جس چیز کی
ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اسی قدر عزیز ہے
جس قدر دوسرے کو ہے، اس لیے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ
دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیت کبریٰ کا وصف نمایاں تھا، تو ہر طرف
سے مختلف صدائیں آئیں گی لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل جائے
کہ دنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کا کارنامہ زندگی، اس طرح قلمبند ہوا
کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لیے بھی نہ ہو سکا
اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال

وضع قطع، شکل وشباہت، رفتار وگفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہوسکتی ہے (محمد عربی فدیتہ بابی وامی)

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصد تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم وفنون کی صف میں سیرت (بیوگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے علمی حیثیت ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لیے دلیل راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کسطرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے، اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی وعمل، جدوجہد، ہمت وغیرت کی عجیب وغریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن، عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو "شخص" کا سوال نظرانداز ہوجاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصائے تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحل زندگی کی تمام راہیں، اور ان کے پیچ وخم ایک ایک کرکے نظر کے سامنے آجائیں لیکن اگر خوش قسمتی سے فرد کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہوجائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہوسکتی ہے۔

وجوہ مذکورۂ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں، بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے جسکا نام مبارک "محمد" (رسول اللہ ہے) اللہم صل علیہ وسلم صلوٰۃ کثیراً کثیرا، یہ ضرورت، صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے، اور مختصر یہ ہے کہ مجموعۂ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرض اولیں یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرت نبوی کی خدمت انجام دیتا لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک، فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔

اگلے زمانہ میں **سیرت** کی ضرورت، صرف تاریخ اور وقعہ نگاری علم کلام کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کی کہتے ہیں کہ اگر مذہب، صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث بہیں تک حیثیت رہ جاتی ہے۔ لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے سیرت کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کی کیا تھے۔؟

ضرورت

یورپ کے مورخین، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم

کر دیا ہے، اس لیے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں۔ اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہانتک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جسنے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔ اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجکو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرت نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھکر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھدینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کرینگے کہ خاص سیرت پر آجتک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، سیرت نبوی میں لکھتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ما صح وما قد انکرا

(یعنی طالب فن کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کیجاتی ہیں، صحیح بھی اور قابل انکار بھی۔)

ص ۱۵۷ کتاب میں سیرت پر ایک بہت بڑا فٹ نوٹ درج ہے جسکو بخوف طوالت ہم نے یہاں نظر انداز کر دیا ہے

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہوگئیں، اس بنا پر ضرور تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث و رجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں، اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے ایک مستند تصنیف تیار کی جاسے، لیکن سیکڑوں کتابوں کا استقصا کے ساتھ دیکھنا اور اُن سے معلومات کا اقتباس کرنا، ایک شخص کا کام نہ تھا، اُسکے ساتھ ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ **یورپ** میں **آنحضرت** (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بدقسمتی سے **یورپ** کی کوئی زبان نہیں جانتا، اسلیے ایک مجلہ تصنیف کی ضرورت تھی جس میں قابل عربی داں اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں، خدا نے جب یہ سامان پیدا کردیے تو اب مجکو کیا عذر ہوسکتا تھا، اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھکر کیا بدقسمتی ہوسکتی تھی۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہوسکے، اور نہ آیندہ توقع کی جاسکتی ہو اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہوسکتی ہے کہ **آنحضرت** (صلی اللہ علیہ وسلم) کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریبًا تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کیے گئے اور اس زمانہ میں کیے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا، **طبقات ابن سعد، کتاب الصحابۃ لابن السکن، کتاب لعبد اللہ**

بن علی بن جارود، کتاب العقیلی فی الصحابۃ، کتاب ابن
ابی حاتم الرازی، کتاب الازرق، کتاب الدولابی
کتاب البغوی، طبقات ابن ماکولا، اسد الغابۃ، استیعاب
اصابہ فی احوال الصحابۃ، صرف انہی بزرگوں کے حالات میں
ہیں۔ کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقا میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات
درج تحریر ہو سکے ہیں؟"

مولانا نے سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت، علمی حیثیت اور علم
کلام کی حیثیت سے بہت خوب ظاہر فرمائی ہے اور نہایت عمدہ نتائج
نتیج کیے ہیں۔ ہم نے مولانا کی تصنیفات کے متعلق جو گزشتہ صفحات میں یہ رائے
ظاہر کی تھی کہ "آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت مضبوطی والے
اور منطقی استدلال ہے۔ ان میں ایک قسم کی جدت بھی ہے اور طرز ادا میں دل
آویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے" وہ گزشتہ اقتباس پر سب
کم و کاست صادق آتی ہے۔

ایک دوسرے موقع سے حسب ذیل اقتباس کیا گیا ہے۔

"ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمہ میں حدیثوں کے معتبر
ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں ہم اس کا
خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

۱۔ جس حدیث میں فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ کی زبان سے نہیں نکل
سکتیں، مثلاً یہ کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا
کرتا ہے جس کے ستر زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار لغتیں ہوتی ہیں الخ"

۲۔ وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "بیگن کھانا ہر مرض

کی دوا ہے"

۳۔ وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

۴۔ جو حدیث واقع کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ "دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے"

۵۔ وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا"

۶۔ وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشینگوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہو مثلاً یہ کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

۷۔ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں مثلاً یہ کہ "ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے" یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے"

۸۔ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہیں، مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا۔

۹۔ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے، کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

۱۰۔ وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

۱۱۔ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

۱۲۔ وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا اور ان کی بنا پر بہت سی روایتیں رد کر دیں مثلاً ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "آنحضرت صلعم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا۔ اور معافی کی دستاویز لکھوا دی تھی" ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

۱۔ اس معاہدہ پر سعد بن معاذ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے،

۲۔ دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے

۳۔ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

۴۔ دستاویز میں تحریر ہے کہ "یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی۔ حالانکہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

۵۔ خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، ان سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا

۶۔ عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی، تو خیبر والے کیونکر معاف ہو سکتے تھے

۷۔ اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایۃ ہیں، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دیے گئے۔

اس اقتباس سے اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے کہ "عالمانہ عبور، غور و خوض کی قوت تجسس، درایت، علمی جانچ پڑتال کی عادت، اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔

مولانا شبلی نے ایک تبصرہ بھی سیرت پر تقریباً ۵۰ صفحات کا لکھا ہے لہذا اس میں سے حسب ذیل اقتباس کیا جاتا ہے۔

۸۔ فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ اُن کا قلم تلوار سے نہیں دبا، حدیثوں کی تدوین بنوامیہ کے زمانہ روایت میں ہوئی جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک پر خارجی اور اندلس تک مساجد جامع میں آل فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ اسباب میں سر منبر حضرت علی پر لعن کہلوایا، سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہؓ کا اثر وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں۔ آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے اور بنوامیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں انکو ہونا چاہیے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین! اگر تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے"۔ وہیں سر دربار ایک شخص نے اٹھکر کہا "تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المومنین کا باپ (حضرت عباس جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اس کو کس نے پوچھا؟" مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر مؤثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اسلیے **مغازی** میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم ونسق اور تمدن ومعاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے، یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں پڑتی تھی اسلام میں جب تالیف وتصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی نمونے پیش نظر تھے، اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ **سیرت** کا نام **مغازی** رکھا گیا جسطرح سلاطین کی تاریخیں **جنگ نامہ** وشاہ نامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں چنانچہ **سیرت** کی ابتدائی تصنیف مثلاً سیرت **موسیٰ بن عقبہ** اور سیرت **ابن اسحاق**، **مغازی** ہی کے نام سے مشہور ہیں ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح سنین کو عنوان بناتے ہیں، اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں۔ یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت وحکومت کی تاریخ کے لیے بھی صحیح نہ تھا، لیکن نبوت کی سوانح نگاری کے لیے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں، اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے، لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے۔ پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط وخال، تقدس نزاہت، حلم وکرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے۔ بلکہ عین اسوقت جبکہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکہ ہوتا ہے، ژرف بین نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے

کو سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے۔

متذکرہ بالا انتخاب مولانا شبلی کی اس خصوصیت کو نمایاں کرتا ہے کہ وہ پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان سے نکال کر سلجھاتے ہیں اور اس طور سے ترتیب دیتے ہیں کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگتی ہے۔

ایک اور مقام سے حسب ذیل عبارت نقل کی جاتی ہو جو تبصرہ کے آخری صفحہ پر درج ہے۔

نتائج مباحث مذکورہ گزشتہ صفحات میں ہم نے روایتِ حدیث کے متعلق صحابۂ کبار کا جو طرز عمل پیش کیا ہے اور علمائے نقدِ حدیث کے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے؛ ذیل میں ترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے واقعات کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں، اور اُن کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) سیرت کی روایتیں باعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں۔ اسلیے بصورتِ اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

(۴) بصورتِ اختلافِ روایاتِ احادیث، رواۃ اربابِ فقہ و درایت کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

(۵) سیرت کے واقعات میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۶) نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیے۔

(۷) روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی راے و فہم کا کسقدر جزو شامل ہے۔

(۸) اسباب خارجی کا کسقدر اثر ہے؟

(۹) جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، قابل حجت نہ ہوگی۔

(۱۰) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اسکی تسلی کر لینی چاہیے کہ راوی سے اداے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

(۱۱) روایات احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے۔

ان اصول کے تقرر و تفصیل کے بعد نظر آسکتا ہے کہ اسلامی فن روایت، عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علماے حدیث نے تصحیح روایت کے لیے کتنی محنت، کتنی جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی، اور کتنی دقت رسی صرف کی ہے، کیا اس اہتمام و اعتنا کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے"؟

کیا خوب تقسیم و تحلیل کی ہے اور کس خوبی کے ساتھ نتائج مباحث

کو ترتیب دیا ہے۔

یہاں ہم صفحہ ۱۶۶ سے حسب ذیل عبارت نقل کرتے ہیں جس میں آنحضرت صلعم کے سفر شام کا واقعہ درج ہے۔

شام کا سفر ابو طالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے، قریش کا دستور تھا۔ سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہو گی کہ ابو طالب نے حسب دستور شام کا ارادہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساتھ نہیں لیجانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت صلعم کو ابو طالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپ ان سے لپٹ گئے ابو طالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا۔ عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابو طالب بصرے میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے، جسکا نام بحیرا تھا۔ اس نے آنحضرت صلعم کو دیکھکر کہا کہ "یہ سید المرسلین ہیں"۔ لوگوں نے پوچھا تم نے کیونکر جانا؟ اُس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جسقدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لیے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جسقدر عام مسلمانوں کو شغف ہے، اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے۔ سر ولیم میور، ڈریپر، مرگولوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقایق و اسرار اس
راہب سے سیکھے، اور جو نکتے اسنے بتلائے تھے۔ انہی پر آنحضرت (صلی اللہ
علیہ وسلم) نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی۔ اسلام کے تمام عمدہ اصول
انہی نکتوں کے شروح و حواشی ہیں۔[1]

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح
ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے۔ اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر
نہیں۔ قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے
تمام دقائق سکھا دیے جائیں، اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے
تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ اس روایت کے
جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں۔ یعنی راوی اول واقعہ کے وقت

[1] ڈریپر صاحب معرکہ مذہب و سائنس میں لکھتے ہیں "بحیرا راہب نے بصری کی خانقاہ میں
محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی ...... آپ کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف
اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا ...... بعد میں آپ کے
طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی
فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا" سر ولیم میور
صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلعم کو بت
پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا وہ سب اسی
سفر اور اسکے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام
بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا، تو ناممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ
اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اسکے سینہ میں پیدا ہوسکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔ شبلی

خود موجود نہ تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے، جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔

(۱) ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ "حسن اور غریب ہے، اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے" حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

(۲) اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمن بن غزوان ہے اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے، لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی، میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ "عبدالرحمن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے، جن میں سب سے بڑھکر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے"

(۳) حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے" علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں"[1]

(۴) اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلال اور ابوبکر بھی اس سفر میں شریک تھے، حالانکہ اس وقت بلال کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکر بچے تھے۔

[1] ہر اس فی شرح عیون السیر لابن سید الناس اور زرقانی اور میزان الاعتدال اور اصابہ (تذکرہ عبدالرحمان بن غزوان)۔

(۵) اس حدیث کے اخیر راوی ابو موسیٰ اشعری ہیں۔ وہ شریک واقعہ نہ تھے، اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد، مستدرک وغیرہ میں جو سلسلہ سند مذکور ہے، سب مرسل ہیں، یعنی بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے۔

(۶) حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکر، بلال کی شرکت بداہۃً غلط ہے اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہوگیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں، عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "وہ خطا کرتا تھا۔ اسکی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اسنے ممالیک کی روایت نقل کی ہے"، ممالیک کی ایک روایت ہے جسکو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔

اقتباس مذکورہ بالا مولانا شبلی کی اس خوبی کو ظاہر کرتا ہو کہ انکی رائے مضبوط ہوتی ہے اور منطقی استدلال پر مبنی ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف ہوجاتی ہیں

(از شعر العجم جلد چہارم)

شاعری

شاعری کی حقیقت

شاعری میں چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لیے اس کی جامع اور مانع تعریف چند

الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھنا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعے سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں۔ ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں ادراک اور احساس ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کے ایجادات، تحقیقات، انکشافات اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے، حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو احساس، انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر گونجتا ہے مور چنگھاڑتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں۔ انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی اس لیے

جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے۔

اب منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہ سکتے ہیں کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعے سے ادا ہوں وہ شعر ہیں اور چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوتا ہے، اس لیے شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لاوے وہ شعر ہے۔

ایک یورپین مصنف لکھتا ہے کہ "ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے"۔ اس بنا پر فلک نیلگوں، نجم درخشاں، نسیم سحر، گلگونۂ شفق، تبسم گل، خرام صبا نالۂ بلبل، ویرانی دشت، شادابی چمن غرض تمام عالم شعر ہے۔ یہ آج کل کا خیال ہے لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے آج سے چھ سو برس پہلے کہا تھا۔ ع

پس جہاں شاعر بود چوں دیگراں

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی، مصوری صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کرتی ہے، سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لیے بینائی شرط ہے لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ۔ ذائقہ۔ شامہ۔ لامسہ سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے

نہیں ہے، اس لیے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک مؤثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لیا جائے، پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں، پھر ان صفات کو ایک ایک کرکے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہمجنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہوتی گئی ہے۔

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے یعنی اس کو سُنکر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت شاعری کو سائنس اور علوم و فنون سے ممتاز کر دیتی ہے۔ شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے سائنس استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے لیکن شاعری احساسات کو دلکش منظر دکھاتی ہے لیکن یہ خاصیت موسیقی تصویر بلکہ مناظر قدرت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسلیے کلام یا الفاظ کی قید لگانی چاہیے کہ یہ چیزیں بھی اس دائرہ سے نکل جائیں تاہم خطبہ، لکچر، تاریخ افسانہ اور ڈراما شاعری کی حد میں داخل رہیں گی۔ ان میں اور شعر میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے، زیادہ دقت اسلیے ہوتی ہے کہ اکثر اعلیٰ نظمیں افسانہ کی شکل میں ہوتی ہیں اور اکثر افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے۔ اسلیے دونوں جب باہم مل جاتے ہیں تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اسی حد تک افسانہ ہے جہاں تک اس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے، جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں وہاں شاعری کی سرحد آجاتی ہے افسانہ نگار بیرونی اشیا کا استقصاء کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے بخلاف اس کے شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

تاریخ اور شعر کا فرق ایک مثال کے ذریعے سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ ایک شخص جنگل میں جارہا ہے کسی گوشہ سے ایک مہیب شیر ڈکارتا ہوا نکلا، اُس کی پر رعب گونج، بھیانک چہرہ، خشمگین آنکھوں نے اُس شخص کے دل کو لرزا دیا۔ یہ شخص کسی کے سامنے شیر کا حلیہ اور شکل و صورت جن موثر لفظوں میں بیان کرے گا وہ شعر ہے۔

علم الحیوانات کا ایک عالم کسی عجائب خانہ میں جاتا ہے وہاں ایک شیر کٹھرہ میں بند ہے۔ یہ عالم شیر کے ایک ایک عضو کو علمی حیثیت سے دیکھتا ہے اور علمی طریقہ سے کسی مجمع کے سامنے شیر پر لکچر دیتا ہے۔ یہ سائنس یا تاریخ یا واقعہ نگاری ہے۔

شاعری کے اقسام میں ایک واقعہ نگاری ہے یعنی شاعر خارجی واقعات کی تصویر کھینچتا ہے لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ فی نفسہ وہ کیا ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے جذبات پر کیا اثر ڈالتی ہیں شاعر ان اشیاء کے سادہ خط و خال کی تصویر نہیں کھینچتا بلکہ ان میں قوت تخئیل کا رنگ بھرتا ہے تاکہ مؤثر بن جائے۔

اس تقریر سے شاعری اور واقعہ نگاری کا فرق واضح ہوجاتا ہے

لیکن خطابت اور شاعری کی حدِ فاصل اب بھی نہیں قائم ہوئی۔ خطابت میں بھی شاعری کی طرح جذبات اور احساسات کا برانگیختہ کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن حقیقت میں شاعری اور خطابت بالکل جُدا جُدا چیزیں ہیں۔ خطابت کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے۔ اسپیکر حاضرین کے مذاق، معتقدات اور میلان طبع کی جستجو کرتا ہے کہ اس کے لحاظ سے تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے ان کے جذبات کو برانگیختہ کرسکے اور اپنے کام میں لائے۔ بخلاف اس کے شاعر کو دوسروں سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کوئی اس کے سامنے ہے بھی یا نہیں۔ اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ بے شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو ان کے دل پر اثر کرینگے لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر نہیں رکھا تھا جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اس کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سنائے لیکن اگر کوئی شخص سن لے تو ضرور تڑپ جائیگا۔

اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہو لیکن جو لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام سے مطلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اسکے سامنے موجود ہیں لیکن اگر ایکٹ کرنیکی حالت میں وہ اس علم کا اظہار کردے تو سارا پارٹ غارت ہو جائے گا۔ شاعر اگر اپنے نفس کی بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے، دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں

کے لیے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہوگا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس کا نتیجہ ہے۔ بخلاف اس کے خطابت لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ رسم رکھنے کا ثمرہ ہے۔ اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے لیکن خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نباض ہو۔

شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں؟ ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وزن ہوتا ہے محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے خیال بندی ہوتی ہے۔ الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں، بندش صاف ہوتی ہے، طرز ادا میں جدت ہوتی ہے لیکن کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزاء ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر، شعر نہ ہوتا۔ اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص اُن چیزوں کو متعین کر دینا چاہیے جن کے بغیر شعر، شعر نہیں رہتا۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے، اسی لیے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں لیکن محققین کی یہ رائے نہیں۔ وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں تاہم اُنکے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوری ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ شعر خیال کیے جاتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخئیل اس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس لیے

تخئیل بھی محاکات ہے۔ لیکن یہ زبردستی ہے، آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخئیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخئیل ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسنِ بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزا اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔

محاکات کی تعریف

محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی اشیا کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصور انسان کی ایسی اچھی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی، تفکر، حیرت، استعجاب، پریشانی اور بیتابی ظاہر ہوں۔ جہانگیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں۔ تلووں کے سہلانے کے وقت چہرہ پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرے سے نمایاں تھا تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی سیکڑوں گوناگوں واقعات حالات اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں مثلاً قاآنی ایک موقع پر بہار کا سماں دکھاتا ہے۔

نرمک نرمک نسیم زیر گلاں میخزد	غنغب این می مکد عارض آن می گزد
سنبل این می کشد گردن آں میگزد	گہ بہ چمن می چمد گہ بہ سمن می وزد

گاہ بہ شاخ درخت، گہ بہ لب جوئبار

یعنی ہلکی ہلکی ہوا آئی، پھولوں میں گھسی۔ کسی پھول کا گال چوم لیا، کسی کی ٹھوڑی چھو لی۔ کسی کے بال کھینچے، کسی کی گردن دانت سے کاٹی، کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبیلی کے پاس پہنچی اور درختوں کی ٹہنیوں میں ہوتی ہوئی نہر کے کنارے تک پہنچ گئی۔ اس سماں کو مصور تصویر میں کیونکر دکھا سکتا ہے۔

یہ تو مادی اشیا تھیں خیالات، جذبات، اور کیفیات کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے۔ تصویر اس سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتی ہے؟ مثلاً اس شعر میں

نسب نامۂ دولت کیقباد   ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہو گیا۔ یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے۔

ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اس کا ایک خال و خط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام و غیر مطابق ہو گی۔ بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں۔ شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے، جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے۔ باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں ان سے خلل نہ آئے۔ فرض کرو کہ ایک پھول کی تصویر کھینچی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھلائے لیکن شاعر کے لیے ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعے

وہ اثر پیدا کر دے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک اور بڑا فرق مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس چیز کو دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن شاعر باوجود اسکے کہ تصویر کا ہر جز نمایاں کر کے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سبزہ پر شبنم دیکھکر وہ اثر نہیں پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا   تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی۔ نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی۔ اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔"

شاعری پر بہت خوب بحث کی ہے اور اس کی خوبی کو اپنے انداز بیان سے ذہن نشین کر دیا ہے۔

(از الکلام جلد دوم صفحہ)

علوم جدیدہ اور مذہب

تمام دنیا میں ایک غل مچ گیا ہے کہ "علوم جدیدہ اور فلسفۂ جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کر دی ہے" فلسفہ اور مذہب کے معرکہ میں ہمیشہ اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلسفۂ قدیم قیاسات اور ظنیات پر مبنی تھا اس لیے وہ مذہب کا استیصال نہ کر سکا بخلاف اسکے فلسفہ جدیدہ تمام تر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے، اس لیے مذہب کسی طرح اسکے مقابلہ میں جانبر نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہے، لیکن ہم کو غور سے دیکھنا چاہیے کہ اس واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہو گیا ہے۔

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا جس میں طبعیات عنصریات، فلکیات، الٰہیات، مابعد الطبعیات سب کچھ شامل تھا لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیے، جو مسائل مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ان کو سائنس کا لقب دیا جو مسائل، تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا۔

مسائل جدیدہ کی نسبت یہ عام خیال جو پھیلا ہوا ہے کہ وہ قطعی اور یقینی ہیں، اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ جو چیزیں قطعی اور یقینی ہیں وہ صرف سائنس کے مسائل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یورپ میں ان کی نسبت

طبقہ علما میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ لیکن فلسفہ کی یہ حالت نہیں ہے یورپ میں آج فلسفہ کے بیسوں اسکول ہیں، اور ان میں اس شدت سے اختلاف ہے کہ اگر ان سب کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک ہی چیز سفید بھی ہو سکتی ہے اور سیاہ بھی۔

اب دیکھنا چاہیے کہ سائنس کو مذہب سے کیا تعلق ہے سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے، مذہب کو ان سے مطلق سروکار نہیں عناصر کسقدر ہیں؟ پانی کن چیزوں سے مرکب ہے؟ ہوا کا کیا وزن ہے نور کی کیا رفتار ہے؟ زمین کے کسقدر طبقات ہیں؟ یہ اور اس قسم کے مسائل، سائنس کے مسائل ہیں، مذہب کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔

مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے وہ یہ ہیں۔ خدا موجود ہے یا نہیں؟ مرنے کے بعد اور کسی قسم کی زندگی ہے یا نہیں؟ خیر و شر اور نیکی و بدی کوئی چیز ہے یا نہیں؟ ثواب و عقاب ہے یا نہیں؟ ان میں سے کون سی چیز ہے جس کو سائنس ہاتھ لگا سکتا ہے؟ سائنس کے اساتذہ نے جب کہا ہے تو یہ کہا ہے کہ ہم کو ان چیزوں کا علم نہیں یا یہ کہ یہ چیزیں مشاہدہ اور تجربہ کے احاطہ سے باہر ہیں، یا یہ کہ ہم ان باتوں کا یقین نہیں کرتے کیوں کہ ہم صرف ان باتوں کا یقین کرتے ہیں جو تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہو سکتی ہیں، کوتاہ نظر عدم علم سے علم عدم سمجھ جاتے ہیں سائنس والے کہتے ہیں کہ ہم کو یہ چیزیں معلوم نہیں، کوتاہ بیں اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ہم کو ان چیزوں کا نہ ہونا معلوم ہے۔ حالانکہ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

یورپ میں تقسیم عمل کے اصول پر عمل ہے یعنی تمام اہل فن

نے اپنے اپنے کام تقسیم کر لیے ہیں اور ہر فرقہ اپنے کام میں اس طرح
مشغول ہے کہ اس کو دوسری چیزوں سے مطلق غرض نہیں۔ ان میں ایک
فرقہ مادئین کا (میٹریلسٹ) ہے جس کا موضوع بحث مادہ ہے۔ اس گروہ
نے مادہ کے متعلق نہایت عجیب عجیب اسرار معلوم کیے ہیں۔ یہی فرقہ ہے
جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مذہب کا، خدا کا، روح کا منکر ہے،
لیکن بحقیقت وہ ان باتوں کا منکر نہیں بلکہ یہ کہتا ہے کہ ان چیزوں کا
ثبوت ہمارے دائرۂ تحقیقات سے باہر ہے۔ پروفیسر لیتیرہ Lewre
جو اس گروہ کا بہت بڑا عالم ہے لکھتا ہے کہ "چونکہ ہم کائنات کے آغاز اور
انجام سے ناواقف ہیں اسلیے ہمارا یہ منصب نہیں کہ کسی ازلی یا ابدی وجود
کا انکار کریں، جس طرح ہمارا یہ کام بھی نہیں کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ مادی
مذہب اپنے آپ کو علت اول کے وجود کی بحث سے بالکل الگ
رکھتا ہے کیونکہ اسکے متعلق کسی قسم کا علم نہیں ہم حکمت الٰہی کے
منکر ہیں نہ مثبت ہمارا کام نفی و اثبات سے بالکل الگ رہنا ہے"
فرانس کے ایک طبی رسالہ میں ایک دفعہ ایک مضمون چھپا تھا
کہ "ادراک اور فکر اس فاسفورس سے پیدا ہوتا ہے جو دماغ میں ہے اور
فضائل انسانی مثلاً شجاعت، اخلاص، شرافت نفس
یہ سب اعضائے انسانی کی کیمیائی تموجات ہیں" اس پر فرانس کے
ایک مشہور فاضل کامل فلاماریان نے جو طبعیات کا بڑا ماہر ہے
ایک مضمون لکھا جس میں اُسنے مضمون نگار سے اس طرح خطاب کیا۔
یہ کس نے تم سے کہا؟ لوگوں کو گمان ہوگا کہ تمھارے استادوں نے
تم کو کہا یا ہوگا۔ لیکن یہ گمان صحیح نہیں، میں نہیں جانتا کہ یہ بیہودہ دعوے

زیادہ تر قابلِ تعجب ہے یا دعیانِ علم کی جرأت؟ نیوٹن جب کوئی مسئلہ بیان کرتا تھا تو کہتا تھا کہ "بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے" کیپلر کہا کرتا تھا کہ "تم ان چیزوں کو فرض کر لو" بخلاف اس کے تم لوگ کہتے ہو کہ "ہم ثابت کرتے ہیں" "ہم باطل کرتے ہیں" "یہ موجود ہے یہ معدوم ہے" "علم نے یہ فیصلہ کر دیا ہے" "علم نے یہ ثابت کر دیا ہے" حالانکہ تمہارے ان دعووں میں علمی دلائل کی جھلک بھی نہیں۔ تم اپنی حماقت سے دلیری کر کے علم پر اس قدر بڑا بار ڈال دیتے ہو؟ جو باتیں تم کہتے ہو اگر علم کے کان میں پڑ جائیں (اور پڑنی ہی چاہئیں کیونکہ تم علم کے فرزند ہو) تو تمہاری حماقت پر اس کو ہنسی آجائیگی۔ تم کہتے ہو کہ "علم مثبت ہے، نافی ہے آمر ہے، ناہی ہے" یہ باتیں کہکر غریب علم کے ہونٹوں پہ لیے بڑے بڑے بھاری الفاظ رکھدیتے ہو جس سے ممکن ہو کہ اسکے دل میں غرور آجائے۔ عزیزو! علم ان تمام مسائل میں سے نہ کسی کا اثبات کرتا ہے نہ انکار"

یہ ہے ماہرین فن کی رائے لیکن بعض کم درجہ کے مادیین اپنی حد سے بڑھ کر نفی کا دعویٰ بھی کر بیٹھتے ہیں، اور انہی کی ملمع کاریاں ہیں جس نے ہمارے ملک کے نوجوانوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہو، اسلیے ہم کو زیادہ غور و فکر سے دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے دعوے پر کس قسم کے دلائل قائم کرتے ہیں۔ مثال کے لیے ہم ایک اہم مسئلہ یعنی روح کے وجود کے متعلق اُن کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شفلر Sheffler کہتا ہے کہ "روح مادہ ہی کی ایک قوت کا نام ہے جو اعصاب سے پیدا ہوتی ہے" دیرشو کا قول

کہ "روح ایک قسم کی میکانکل حرکت ہے۔ **بوشنر** Buchher کہتا ہے کہ "انسان صرف مادہ کا ایک نتیجہ ہے" **ڈو بوا ریموں**: Du : Bois Reymond کہتا ہے کہ "تمام اعصاب میں ایک کہربائی تموج پایا جاتا ہے اور جسکو فکر کہتے ہیں وہ مادہ ہی کا ایک نام ہے" **دوترشیہ** Du Dutrochet جو فزیکل سائنس کا بڑا عالم ہے کہتا ہے کہ "زندگی فطرت کا کوئی اصلی قاعدہ نہیں بلکہ ایک اتفاقی استثنا ہے جو مادہ کے عام اصولوں کے مخالف ہے" فرانس کے ایک مشہور میگزین نے ایک مضمون میں بیان کیا تھا کہ دماغ میں جو فاسفورس ہے، فکر اسی کا ایک نتیجہ ہے اور جس چیز کو **اخلاص، شجاعت** اور **فضیلت** کہتے ہیں وہ اعضائے جسمانی کی کہربائی موجیں ہیں۔

کیا یہ رائیں قطعیات میں شمار ہو سکتی ہیں۔ کیا ان کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ **علوم جدیدہ** نے روح کو باطل ثابت کر دکھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ **مذہب** اور **سائنس** کے حدود بالکل الگ الگ ہیں، سائنس کا جو موضوع ہے مذہب کو اس سے کچھ واسطہ نہیں، اور نہ مذہب کو جن چیزوں سے بحث ہے، سائنس کو ان سے کچھ غرض نہیں، فلسفہ البتہ کہیں کہیں مذہب سے ٹکرا جاتا ہے لیکن قطعیات اور یقینیات میں اس کا شمار نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسکے مختلف اسکول ہیں اور ان اسکولوں میں باہم نہایت سخت اختلاف ہے ان میں سے بعض خدا کے منکر ہیں تو بہت سے خدا کے قائل بھی ہیں، وجود روح کے مقر بھی ہیں اور منکر بھی۔ اخلاق کے اصول ایک فرقہ کے نزدیک کچھ ہیں اور دوسرے کے نزدیک کچھ۔ اس حالت میں مذہب اس

لحاظ سے مطمئن رہتا ہے کہ۔

چو دیدی کہ در دشمن افتاد جنگ

خلط مبحث اُسوقت پیدا ہوتا ہے جب سائنس اور مذہب دونوں میں سے کوئی اپنی حد سے بڑھ کر دوسرے کی حد میں قدم رکھتا ہے اور یہی خلط مبحث تھا جس نے ملاحدہ اور منکرین مذہب کے خیالات کو قوت دی بلکہ درحقیقت اسی خلط مبحث نے الحاد اور بیدینی کے خیالات پیدا کر دیے۔ یورپ میں پہلے مذہب کو اسقدر وسیع کر دیا گیا تھا کہ کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب کی دست اندازی سے بچ نہیں سکتا تھا، چنانچہ خاص اس مقصد کی غرض سے اسپین میں مجلس انکویزیشن (محکمۂ احتساب عقائد) قائم ہوئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جو لوگ، مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہوں انکی تحقیقات کرے اور اُن پر کفر اور ارتداد کا الزام لگائے۔ چنانچہ اٹھارہ برس میں یعنی سنہ ۱۴۸۱ء سے لے کر سنہ ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بیس آدمی، ارتداد کے الزام میں زندہ آگ میں جلا دیے گئے۔ اس مجلس نے ابتدائے قیام سے اخیر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر اور ملحد قرار دیا جن میں سے کئی لاکھ آگ میں جلا دیے گئے۔

جس قسم کی باتوں پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا کوپرنیکس نے نظام بطلیموسی سے انکار کر کے یہ ثابت کیا کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں اس پر مجلس انکویزیشن نے فتوے نافذ کیا کہ یہ رائے کتاب مقدس کی مخالف ہے اور اس بنا پر کوپرنیکس مرتد اور کافر ہے۔

گلیلو نے جو دوربین کا موجد گزرا ہے، ایک کتاب کوپرنیکس کی حمایت میں لکھی جس میں ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے اس پر مجلس انکویزیشن نے فتویٰ دیا کہ وہ مستوجب سزا ہے چنانچہ اس کو گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا اور حکم دیا گیا کہ وہ اس مسئلہ سے انکار کرے لیکن جب وہ اپنے عقیدہ پر ثابت قدم رہا تو قید خانہ بھیج دیا گیا۔ اور دس سال تک محبوس رہا۔

کولمبس نے جب کسی نئے جزیرے کے دریافت کرنے کی امید پر سفر کرنا چاہا تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب کے خلاف ہے،

زمین کے کروی ہونے کا خیال جب اول ظاہر کیا گیا تو پادریوں نے سخت مخالفت کی کہ یہ اعتقاد، کتاب مقدس کے خلاف ہے۔

غرض ہر قسم کی علمی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے تاہم چونکہ علمی ترقی کا اٹھان تھا انکی کوششیں بیکار گئیں، اور علوم و فنون تکفیر ہی کے سایہ میں پھولے اور پھلے۔

پادریوں کے تعصبات اور وہم پرستی اگرچہ علم کو دبا نہ سکے لیکن اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں ہی کے خیالات اور اوہام کو مذہب سمجھا اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے ان کی رائے قائم ہوگئی کہ مذہب جس چیز کا نام ہے وہ علم و حقیقت کے خلاف ہے یہی ابتدائی خیال ہے جسکی آواز بازگشت آجتک یورپ میں گونج رہی ہے۔

بے شبہ اگر مذہب اسی چیز کا نام ہے تو وہ سائنس کے مقابلہ میں کسی طرح نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن اسلام نے پہلے ہی دن کہدیا تھا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ یعنی تم لوگ دنیا کی باتیں خود خوب جانتے ہو

یہ ظاہر ہے کہ سائنس اور تمام علوم جدیدہ اسی دنیا سے متعلق ہیں معاد اور آخرت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں۔

اس موقع پر یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ اسلام میں سیکڑوں فرقے پیدا ہوئے اور ان میں اسقدر اختلافات رہا کہ ایک نے دوسرے کی تکفیر کی، تکفیر بڑے بڑے مسائل پر محدود نہ تھی بلکہ نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر دیا تھا یہ سب کچھ ہوا لیکن علمی تحقیقات اور انکشافات کی بنا پر کبھی کسی شخص کی تکفیر نہیں کی گئی قدمائے مفسرین کا خیال تھا کہ پانی آسمان سے آتا ہے یعنی آسمان پر ایک دریا ہے، بادل اس سے پانی لیتے ہیں اور برساتے ہیں؛ آفتاب، پانی کے ایک چشمہ میں غروب ہوتا ہے۔ زمین سطح کروی نہیں ستارے جو ٹوٹتے ہیں شیاطین کے شعلہ ہائے آتشیں ہیں مفسرین ان تمام باتوں کو قرآن کے نصوص سے ثابت سمجھتے تھے چنانچہ امام رازیؒ مفسرین قدیم کے یہ تمام اقوال تفسیر کبیر میں نقل کیے ہیں۔

لیکن جب عباسیوں کا علمی دور آیا اور فلسفہ اور طبعیات نے ترقی کی تو لوگوں نے ان خیالات کی مخالفت کی۔ باوجود اس کے خود مفسرین کے گروہ میں سے ایک شخص نے بھی ان لوگوں کو کافر اور منکر قرآن نہیں کہا معتزلہ کو محدثین اس بنا پر کافر کہتے ہیں کہ وہ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں لیکن اس بنا پر کوئی ان کو کافر نہیں کہتا کہ وہ جادو کی حقیقت سے منکر ہیں، غرض جس حد تک تحقیق وتفتیش کی جائے عموماً یہ ثابت ہوگا کہ مسلمانوں نے علمی تحقیقات اور ایجادات کو کبھی مذہب کا حریف مقابل نہیں سمجھا۔ بلکہ محققین نے صاف تصریح کر دی کہ اسباب

کائنات اور مسائل ہیئت وغیرہ نبوت کی سرحد سے بالکل الگ ہیں اور انبیا کو تہذیب اخلاق کے سوا اور کسی چیز سے غرض نہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:-

(اصل عبارت عربی، اصل کتاب میں نقل کی گئی ہے لیکن ہم یہاں صرف ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں، تنہا)

"انبیاء کا ایک اصول یہ ہے کہ جو امور تہذیب نفس اور قوم کی سیاست سے تعلق نہیں رکھتے ان میں وہ مشغول نہیں ہوتے مثلاً بارش، گرہن اور ہالہ کے اسباب بیان کرنا یا نباتات اور حیوانات کے عجائبات یا چاند سورج کی رفتار یا روزانہ حوادث کے اسباب یا انبیاء اور سلاطین کے قصے یا شہروں کے حالات بیان کرنا ان چیزوں سے وہ بحث نہیں کرتے مگر ہاں چند معمولی باتیں جن سے لوگوں کے کان آشنا ہو چکے ہیں اور اُن کی عقلوں نے ان باتوں کو قبول کر لیا ہے اُن باتوں کو بھی انبیاء علیہم السلام خدا کی شان اور قدرت کے ذکر میں ضمنی طور پر اجمالاً بیان کرتے ہیں اور اس میں مجاز اور استعارہ سے کام لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے آنحضرت صلعم سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت دریافت کی تو خدا نے اُسکے جواب سے اعتراض کیا اور اسکے بجائے مہینوں کی تعیین کا فائدہ بیان کر دیا چنانچہ فرمایا ویسئلونک الخ"

شاہ صاحب نے انبیا کی تعلیم کا جو اصول بتایا، اسکے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مذہب اسلام کو سائنس اور علوم جدیدہ سے کسی قسم کے خطرہ پہنچنے کا احتمال ہے"

سچ یہ ہے کہ سرسید اور مولوی چراغ علی کے بعد مولانا شبلی ہی نے مذہب اسلام کو فطرت کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور خوب خوب معانی پیدا کیے ہیں۔

مطبع منشی نولکشور

سلطنت مغلیہ کی بربادی کے بعد اور حکومت موجودہ کے دور اول میں کتب السنہ مشرقیہ کا احیاء اور ارزاں ہونا منشی نولکشور کی ذات سے وابستہ تھا۔ مسلمانوں کا تنزل اور عربی فارسی کی کم رواجی دونوں مترادف الفاظ تھے چنانچہ بحران انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد روز بروز عربی کا کیا ذکر، فارسی کا رواج بھی کم ہونے لگا تھا۔ کتابیں مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں اور گراں قیمت پر ملتی تھیں اور ہر کس وناکس کی دسترس سے باہر تھیں۔ خدا جانے منشی نولکشور آنجہانی کے دل میں تجارت کے خیال نے گدگدی کی یا ان کو ذاتی طور بھی فارسی عربی علوم سے وابستگی تھی کہ آخر کار اس دلی محبت و شیفتگی نے یہ رنگ پکڑا کہ عربی خصوصاً فارسی کی نایاب اور کمیاب کتابیں تلاش اور جستجو سے بہم پہنچا کر منشی جی چھپوانی شروع کیں۔ ملک نے ان پرانی کتابوں کو جو نئے لباس میں جلوہ گر ہوئیں ہاتوں ہاتھ لیا اور قبولیت کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں جب کہ انگریزی کا روز بروز زیادہ رواج ہوتا جا رہا تھا اور نئی تہذیب پرانی تہذیب کو دھکے دیکر ملک سے نکال رہی تھی اور علوم قدیمہ کی سرگزشت ایک داستان پارینہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی، منشی صاحب نے کم ہمت چست کی اور فارسی زبان کے اخراج ملک میں روڑے اٹکائے اور پچیس تیس برس تک فارسی کا کوس لمن الملک الیوم بجاتے رہے۔ لیکن آخر کہاں تک؟ علوم جدیدہ کی تیز روشنی نے پرانے جواہرات ماند کر دیے اور مغرب کے خود ساختہ لعل و گوہر بازی لے گئے جب فارسی پر یہ مصیبت پڑی تو اردو غریب کس شمار میں تھی۔ مفلس زبان کے دن کی تھی۔ بالکل بچہ تھی اور ابھی اس کو بولنا ہی کیا آتا تھا۔ البتہ خیریت

یہ ہوئی کہ اُردو چونکہ آریائی زبان ہے اور انگریزی بھی آریائی اسلیے دونوں
بہنوں میں اگرچہ مشرق و مغرب کا بُعد اور مغائرت تھی مگر ایک نے دوسری
کو خیر مقدم کہا۔ اور صاحبان ذیشان نے اُردو کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھانا شروع کیا
منشی نولکشور بھی رفتار زمانہ سے بیخبر نہ تھے سمجھ گئے کہ اب اُردو کا دور دورہ ہوگا
زمانہ کی مخالفت بیکار ہے، اس لیے انھوں نے قصص و حکایات کی متعدد ضخیم
جلدیں فارسی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ یہ ضرور ہے کہ قصص و حکایات کی
کتابیں جو ترجمہ کرائی گئیں ایک افسردہ اور مردہ قوم کے لیے مضرت رساں
اور غیر مفید تھیں لیکن اُردو کی ہر دلعزیزی کو ان کتابوں سے بھی جنکا ذکر ہم آیندہ
کرینگے بہت کچھ تعلق ہے۔ منشی نولکشور خود مصنف نہ تھے اور نہ اس زمانہ میں
اُنکے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ اُردو میں مفید کتابیں ترجمہ کرائی جائیں،
علاوہ ازیں اب تک اُردو میں زیادہ تر افسانے ہی تھے۔ خواہ دوسری زبان
سے آئے ہوں یا خود اپنی زبان میں تصنیف کیے گئے ہوں، یا چند اخلاقی
کتابیں تھیں جو فارسی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی تھیں اور اسی قسم کی کتابیں پبلک
پسند کرتی تھی۔ لہٰذا ہم ذیل میں اُن چند کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو عام طور پر مشہور
ہیں اور ضخیم ہیں۔

یہاں اس امر کا بھی اظہار ضروری ہے کہ ہم نے عنوان پر منشی نولکشور
کیوں نہ لکھا اور مطبع منشی نولکشور کیوں تحریر کیا؟ جیسا کہ سب کو معلوم ہے
منشی نولکشور محض مالک مطبع تھے اور وہ خود مصنف یا مولف نہ تھے اور انکے
مطبع میں جو لوگ کام کرتے تھے وہ بجائے خود ایسے نہ تھے جن کو درجۂ اول
کے زمرۂ مصنفین میں شمار کیا جاتا۔ مجبوراً مطبع منشی نولکشور عنوان قائم کیا
گیا اور اس کے تحت میں اُردو کی وہ سب کتابیں آگئیں جو لکھنؤ یا کانپور کے

مطبع منشی نولکشور سے شائع ہوئیں۔

داستان امیر حمزۂ صاحبقراں۔ شیخ تصدق حسین

ایک داستان گو تھے۔ انھوں نے منشی نول کشور کے ایما اور اپنے دوست **شیخ حامد حسین** کے اصرار سے **داستان امیر حمزۂ صاحبقراں** کے دفتروں کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا۔ اصل میں یہ داستان علامہ ابوالفیض **فیضی** کی تصنیف سے ہے جو دربار اکبری کے نورتن میں شامل تھے۔ انھوں نے جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی تفریح طبع کے لیے یہ داستان تصنیف کی تھی جو آٹھ دفتروں پر شامل ہے اور بعض دفتروں کی کئی کئی جلدیں ہیں۔ یہاں یہ کہنا بیموقع نہ ہوگا کہ دفتر پنجم یعنی **طلسم ہوشربا** کی جلد اول لغایتہ جلد چہارم کا ترجمہ منشی **میر محمد حسین جاہ** نے اور جلد پنجم لغایتہ ہفتم کا ترجمہ **منشی احمد حسین قمر** نے کیا اور شائع کرایا۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

تعداد دفتر	نام داستان	تعداد جلد
اول	نوشیرواں نامہ	۲ جلد
دوم	کوچک باختر	۱ جلد
سوم	بالا باختر	۱ جلد
چہارم	ایرج نامہ	۲ جلد
پنجم	طلسم ہوشربا	۷ جلد
ششم	صندلی نامہ	۱ جلد
ہفتم	تورج نامہ	۲ جلد
ہشتم	لال نامہ	۱ جلد

ہم نے صرف دفتر پنجم یعنی **طلسم ہوشربا** کی کل جلدوں کے صفحات

مجموعہ کیا تو آٹھ ہزار چار سو چون صفحات ہوئے یعنی تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار صفحات ۔ اسی لحاظ سے اگر قیاس کیا جائے تو بقیہ دفتر بھی کم از کم اسی قدر ضخامت کے ہونگے۔ بالفاظ دیگر یہ کل داستان بڑی تقطیع کے سترہ ہزار صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ واقعی علامہ فیضی نے اپنے دماغ خلاق قدس سے کام لیکر یہ داستان بے مثل و بے نظیر بڑی عرق ریزی اور جانکاہی سے تصنیف فرمائی ہے۔ چونکہ ملک مرفہ الحال تھا اور بادشاہ سے لیکر رعایا تک سب خوش و خرم اور آباد و شاد تھے، گزر اوقات کے لیے محنت شاقہ کی ضرورت نہ تھی اور آجکل کی سی گرانی اور مصیبت نہ تھی۔ اسلیے سب امیر و غریب اور چھوٹے اور بڑے داستانوں اور قصوں کے شائق تھے۔ انکو وقت گزارنا مشکل معلوم ہوتا تھا پس تفریح طبع کے لیے داستانوں کی بہت سخت ضرورت تھی۔ لہذا یہ مشہور و معروف داستان ڈھائی تین سو سال تک زندہ رہی۔ جب زمانے نے اپنا ورق الٹا اور وہ فارغ البالی نہ رہی، تو داستانوں کی بھی کساد بازاری ہونے لگی پینتیس سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا ہوگا کہ منشی نولکشور نے اس داستان کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کرایا اگر ملک میں داستان پڑھنے یا سننے کا شوق نہ ہوتا تو منشی صاحب موصوف کیوں زر خطیر صرف فرما کر کثیر منافع اٹھاتے چنانچہ جو اعلان کارپردازان مطبع نے شائع کیا ہے اس سے اس داستان کی مقبولیت اور ضرورت اشاعت پر روشنی پڑتی ہے وھو ہذا۔

"زمانۂ تصنیف سے آج تک اس داستان کو ایسی ترقی روز افزوں ہوتی گئی اور ایسی پسندیدہ خلائق ہوئی کہ ہر شخص اسکے سننے کا دل مشتاق رہا لیکن چونکہ یہ داستان عظیم الشان بزبان فارسی تھی اور بوجہ عزیز الوجود ہونے کے سوائے کتب خانہ شاہی یا امرائے والا مقام کے دستیاب ہونا اس کا

ممکن نہ تھا، لہٰذا ہر شخص عموماً اسکے مطالعہ سے بہرہ یاب نہ ہو سکتا تھا۔ البتہ کچھ چیدہ چیدہ ارباب شوق نے اس داستان کو جابجا سے یاد کیا اور بطور پیشہ داستان گوئی کے اسکو بیان کرنا شروع کیا اس صورت مین بھی علی العموم اس داستان کے تمام و کمال سننے سے حضرات کم مایہ فرحت اندوز نہ ہو سکتے تھے اور سوائے مجالس امرا و اصحاب ذی مقدور کے اس کا بیان عام طور سے غیر ممکن تھا کیونکہ یار مصارفت داستان گو کا متحمل ہونا ہر شخص کے اختیار مین نہ تھا.......... اب زمانہ کو ناز کرنا چاہیے کہ اس داستان عظیم الشان کے کل دفترون کا بہم پہنچانا اور ان سب کا بصرف زر کثیر عمدہ عمدہ داستان گویون اور نثارون کی معرفت بزبان اردوے شستہ و رفتہ محاورۂ اہل مذاق میں ترجمہ کرانا اور پھر بعنوان پسندیدہ طبع کرا کے تمامی ملک مین اشاعت دینا اور کوڑیوں کے مول میں اس گلستان سخنداں کی تمام شائقین عیش پسند کو سیر کرانا (اسی مالک مطبع کا کام تھا) شکر ہے کہ اس امر بزرگ اور کار سترگ کا انصرام بھی ہو گیا۔"

ہمارے پیش نظر اس وقت دفتر اول نوشیرواں نامہ کی پہلی جلد ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جلد ۱۸۹۳ء میں بار اول طبع ہو کر شایع ہوئی ہے اور دوسری بار ۱۸۹۸ء میں چھپی ہے جسکا یہ نسخہ ہم آج مطالعہ کر رہے ہیں یعنی پہلا ایڈیشن صرف پانچ برس میں بقول لیکہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور دوسری مرتبہ طبع کرانے کی نوبت آئی لیکن دوسرا ایڈیشن بمشکل پچیس برس میں فروخت ہوا۔ وجہ کیا ہے؟ بیسویں صدی کے آغاز سے لوگوں کے اخراجات میں بیجا اضافہ ہو گیا اور آمدنی میں بھی گو بہ نسبت سابق زیادتی ہو گئی مگر خرچ نسبتاً آمدنی سے بہت زیادہ ہے۔ اس لیے اب وہ بیفکری نہیں رہی اور وقت

عزیز کو ضائع کرنے کی بجائے محنت و جفاکشی میں صرف کیا جاتا ہے تاکہ اپنی اور
اہل و عیال کی پرورش ہو۔

بہر حال علامہ **فیضی** اگر اپنی طبیعت خلاق قصص کو ایک انسائیکلو
پیڈیا کی ترتیب و تدوین میں لگاتے اور اسکا ترجمہ منشی نول کشور صاحب
چھپواتے تو ملک و زبان کے لیے کارآمد اور مفید مسالہ بہم پہنچتا۔ لیکن ہر زمانہ کی
ضرورت جدا ہوتی ہے، اسوقت افسانوں کی ضرورت تھی اور اب علمی کارناموں
کی حاجت ہے۔

مختصر نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ گو یہ
مصرع صرف زبان کی نسبت صحیح ہے خیالات کے لیے یہ عرض کرنا ضروری
ہے کہ حسب ذیل انتخاب عمدہ سمجھکر ایک مقام سے کیا گیا ہے ورنہ تمام کتاب
فضول حکایتوں اور قصوں سے پُر ہے۔

نوشیرواں شکار کھیلنے گیا تھا۔ **بختک** اور **بزرجمہر** دونوں وزیر
اس کے ہمراہ تھے۔ ان میں باہم چشمک اور عداوت تھی۔ نوشیرواں، بزرجمہر
کا بہت ادب اور لحاظ کرتا تھا اور اسکو عم نامدار سے مخاطب کرتا تھا
ابوالخیر نامی ایک قزاق تھا، اسنے اپنی جان نوشیرواں کے ہاتھ سے
اس طرح بچائی تھی کہ اسنے بادشاہ سے کہا کہ میں جانوروں کی گفتگو سمجھتا ہوں
اور دوسروں کو بتلا سکتا ہوں مجھے قتل نہ کرو۔ چنانچہ بزرجمہر کو جانوروں کی
بولیاں **ابوالخیر** سے سیکھنے کا حکم دیا گیا۔ **بزرجمہر** سمجھ گیا کہ **ابوالخیر** نے اس
حیلہ سے جان بچائی ہے۔ لیکن اب **بزرجمہر** کی دلی خواہش یہ ہوئی کہ **ابوالخیر**
کی جان سلامت رہے اور وہ خطرہ میں نہ پڑے پس وہ **نوشیرواں**
کو یقین دلاتا رہتا تھا کہ وہ جانوروں کی گفتگو سمجھنا سیکھ رہا ہے۔ اتفاق سے

ایک روز نوشیروان شکار کے پیچھے اپنے لشکر سے دور ہوگیا تھا اور یہ دونوں وزیر سایہ کی طرح اسکے ساتھ تھے۔ بادشاہ ایک گاؤں کے قریب آرام لینے کے لیے بیٹھ گیا۔

اسی سلسلہ میں نوشیروان نامہ کی عبارت حسب ذیل ہے۔

ہر طرف صحرا کے جو خیال کیا، دیکھا کہ یہ مقام ویران ہے، انسان ہے نہ حیوان ہے، ایک گاؤں قریب ہے، سامنے دو درخت سوکھے ہوئے کھڑے ہیں۔ اُن پر دو طائر بیٹھے ہوئے آپس میں نغمہ سنجی کر رہے ہیں بختک تو اسی فکر میں رہتا تھا، دل پر غم و الم سہتا تھا، چپکے سے بادشاہ سے کہا اے جہاں پناہ! آپ خواجہ بزرجمہر سے پوچھیے کہ یہ دونوں جانور کیا باتیں کرتے ہیں اور آپس میں کیا باتیں ہیں۔ بادشاہ نوشیروان تو اس امر کا مشتاق رہتا تھا، فوراً خواجہ بزرجمہر کی طرف رُخ کر کے فرمایا کہ اے عمدہ نامدار! ارشاد فرمائیے کہ یہ دونوں جانور شاخ شجر خشک پر کیا باتیں کرتے ہیں۔ خواجہ سوچے کہ اگر نہ بتلاؤں گا تو بادشاہ کے سامنے دروغگو ٹھہروں گا۔ اور اگر بتلاؤں تو میں کیا جانوں کہ یہ جانور آپس میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ سوچے کہ ایسی بات کہوں کہ ذرا بھی جھوٹ ثابت نہ ہو، ٹھیک درست اترے۔ موزوں اور مقتضائے وقت ہو۔ گردن جھکا کے کلام کو اُن طائروں کے سُنا، بڑی دیر کے بعد جواب دیا کہ اے بادشاہ عادل! یہ جانور آپس میں نسبت کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ تو جو اپنی بیٹی کی میرے بیٹے کے ساتھ شادی کرے گا تو کیا جہیز دے گا۔ وہ جواب دیتا ہے کہ جب تک نوشیرواں زندہ ہے اور تخت سلطنت پر جلوہ آرا ہے، تمام جہان تباہ و ویران ہے

عدل و داد نہیں، کوئی شاد نہیں۔ شہر، قصبے، گاؤں، پرُوے آباد نہیں مجھ سے جبیں ایسے منحوس زمانہ میں کیونکر دیا جاے۔ اور کہاں سے آئے لیکن خیر ہیں ساٹھ خزانے جانتا ہوں وہ جبیں میں دیدوں گا اور زیادہ مجھ نہیں ہوسکتا۔ اس زمانہ میں یہ بھی بہت ہے، دیکھتے ہو کیسا پرآشوب زمانہ ہے کوئی کسی کا آشنا نہیں۔ جب نوشیرواں نے یہ باتیں اس حکیم حاذق و لائق و فایق سے سُنیں، سر گریبان میں ندامت سے ڈالا اور کہا اے عم نامدار آپ بجا ارشاد فرماتے ہیں حقیقت میں، میں ایسا ہی غافل ہوں عیش و عشرت کی طرف مائل ہوں، خلقت میری غفلت سے تنگ، ہر ایک مجھ سے اور میری غفلت شعاری سے تنگ۔ شعر

نہ ہے بے تمیزی و بے عاقلی — کہ از فکر دنیا و دیں غافلی

اے خواجہ بزرجمہر سچ کسی نے کہا ہے۔ بیت

آب زر لکھا ہے بو علی نے — کہ سونے سے مسافر کو خطر ہے

یہ دنیا کھیتی عاقبت کی ہے، جو یہاں بوئے وہ وہاں اُگے۔ بقولے الدنیا مزرعۃ الآخرۃ۔ جو یہاں دے وہ وہاں پاے نہیں تو آخر کو پشیمانی ہاتھ آے۔ اب مجکو آپ کبھی غافل نہ پائیے گا، داد و دہش میں ہرگز پہلو تہی نہ کروں گا۔ یہ فرماکر وہ بادشاہ عادل طرف دار الامارت کے روانہ ہوا محل میں قدم رنجہ فرمایا۔ اُسی وقت حکم دیا کہ ایک زنجیر طلا کا در عدالت پر لٹکائی جاے مستغیث اسے ہلاے تاکہ میں اطلاع پاؤں، اُسکو اپنے سامنے بلاؤں حال سنوں اُسکا مطلب برلاؤں۔ اس زنجیر کے سرے کو محل کے اندر خوابگاہ تک پہنچایا، اس میں ایک گھنٹہ طلائی لٹکایا کہ شاید میں سوتا ہوں اور کوئی مستغیث زنجیر در ہلاے، مجکو فوراً خبر ہو جا

شاید کہ میں بستر خواب پر خوابیدہ ہوں تو صدائے زنجیر طلائی سے بیدار ہو جاؤں۔ گھنٹے کی آواز سے ہوشیار ہو جاؤں، اسی وقت عدالت کرکے داد دوں"

چنانچہ یہی نوشیرواں ہے جس کی نسبت شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں
زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل
گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند

باقی دفتروں کے نمونے بخیال طوالت قلم انداز کیے گئے۔ جو صاحب شوق رکھتے ہوں اصل کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔

کتاب صادق الاحوال یعنی بوستان خیال۔ اس کتاب کی تقطیع بہت بڑی ہے جو ناموزوں ہے ذیل میں **گزارش ضروری مترجم** کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

بخدمت جمیع ناظرین باتمکین عرض ہے کہ جناب خواجہ امان صاحب دہلوی مرحوم و مغفور نے اس کتاب یعنی **مہدی نامہ و اسمٰعیل نامہ** کا شاید کسی وجہ سے ترجمہ نہیں کیا اور بغیر اس کتاب کے اور کتابوں کا کہ جنکا ترجمہ جناب خواجہ صاحب مغفور نے کیا ہے لطف نہ تھا کیونکہ اکثر مطالب بغیر مطالعہ اس کتاب کے معلوم نہیں ہو سکتے لہذا مسود اوراق ہرزہ سیاق اضعف العباد سراپا تقصیر بیہودہ زبان **مرزا محمد عسکری** المعروف بہ چھوٹے آغا عرض رسا ہے کہ باوجود کم استعدادی **حسب الایماء** حسب الارشاد محب دلی و شفیق ازلی جناب ڈاکٹر سید ناصر علی صاحب کے اس کتاب نادرۂ زمانہ کا موافق اپنی زبان کے ترجمہ کیا، الحمد للہ کہ وہ انجام کو پہونچا۔ حضرات ناظرین انصاف آئین سے امید ہے کہ بندہ اپنی کم علمی پر خود مقر ہے لہذا بحالت معائنہ خطا و نسیان مرکبۂ بشریت پر

توجہ نہ فرمائے کے منتظر خطا پوشی ملاحظہ فرمائیں اور اگر میری اس جانکاہی اور عرق خراشی سے بالطبع محظوظ ہوں تو دعائے خیر سے احقر کو فراموش نہ فرمائیں ان اللہ لایضیع اجر المحسنین والعاقبۃ للمتقین والحمد للہ رب العالمین۔

ایک تقریظ سے جو کتاب کے آخر میں درج ہے چند سطور نقل کی جاتی ہیں۔

خدا محمد تقی خاں خیال مرحوم کی تربت کو عنبر بیز کرے۔ بلا کا دماغ، آفت کا دل گردہ رکھتا تھا۔ کتاب کیا لکھی ہے گویا اس زمانہ کے خیالات آئینہ کر دیے ہیں۔ بوالہوس اسے فسانہ سمجھتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ حکمت اور عقل و نصیحت کا کارخانہ ہے اسکے کل خیالات اگر اول سے آخر تک دیکھے جائیں، آدمی تو آدمی جانور تک معنی پرست ہو جائیں۔ مگر آج کل ایک تو کمیاب، دوسرے فارسی جو موجودہ حالت کے لحاظ سے ہم لوگوں کی دماغی ترقی کے مانع۔ اس لیے جس طرح رندوں کو پیمانہ، بادہ نوشوں کو میخانہ مہجوروں کو وصال جانانہ، تاج خسروی کو گہر، پیر کنعاں کو جوان پسر کی تلاش و تمنا اس کا اردو ہونا بھی ضروری تھا۔ کئی برس ہوئے سخنور بے عدیل خواجہ بدرالدین خاں صاحب عرف خواجہ امان صاحب دہلوی مرحوم نے اس کی چار پانچ جلدیں ترجمہ کی تھیں کہ بوستان علیین کی سیر میں راغب ہوئے۔ ہر چند وہ دہلی کی زبان کے استاد تھے، ان کا کیا کہنا، خیر مختصر ان کا ذکر اس جگہ کیا ضرور ہے، مطلب کی سنیے بوستان خیال کی پہلی جلد جسے مہدی نامہ کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ سب سے پہلے ضروری تھا۔ ہمارے لکھنؤ کے شاعروں کی آبرو، ناظموں کی عزت، ذی علم صاحب کمال، قدردان علم و ہنر، سخن شناس، سخن فہم و سخن سنج رئیس با توقیر عالی جناب، ہلال رکاب مرزا محمد عسکری صاحب عرف

چھوٹے آغا صاحب خلف ارشد مرزا حسن رضا صاحب عرف مرزا اسلفو صاحب مرحوم رئیس اعظم لکھنؤ نے اس کا ترجمہ نہایت محنت اور عرق ریزی سے ہماری سلیس زبان یعنی اردو میں فرمایا.......... اگر مبالغہ نہ سمجھیں تو میں صاف کہتا ہوں کہ یہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ اپنی زبان میں ایسے دریا مواج خیالات کو از سر نو تصنیف کیا ہے۔ بلا کی آتش خیالی دکھائی ہے"

خواجہ نور الدین صاحب نے "ترجمۂ دلکش و مقبول عام" (۱۲۹۷ھ) اور "گل بے خزاں بوستان خیال" تاریخ کہی اور محمد حسن صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع پرتاب گڈھ نے "نہال گل بوستان خیال" (۱۸۸۰ء) سے تاریخ نکالی۔

خاتمۃ الطبع (۱۲۹۰ھ) کے تحت میں لکھا ہے کہ۔

لا بد داستان و سرگزشت باستان وہ شے ہے کہ جس کے معلوم ہونے سے گھر بیٹھے تجربہ نیرنگی زمانہ کا حاصل ہوتا ہے۔ گویا ظاہری النظریں داستان ایک افسانہ ہے کہ ظاہر پرستوں کی افکار و پریشان خاطری مٹانے کا بہانہ ہے غم غلط کرنے میں اُن کا رفیق و یار، مونس و غمخوار ہے۔ مگر اہل نظر باطن آگاہ لوگوں سے پوچھیے کہ اُن کی نظر حقیقت بیں میں معدن جواہر بے بہا ہے کہ جس کے لمعات مفاہیم ذاتی سے کیسے کیسے قیمتی نتائج انتظامی اعاظم امور ملکی کے حاصل ہوتے ہیں۔ اور اکثر ناقص کاران عزلت گزیدہ بوسیلہ قصص اسلاف بغیر تجربہ کامل ہو جاتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ داستان صرف جوانان عاشق مزاج کی آتش عشق بھڑکانے کا واسطہ ہے بلکہ مدبران عافیت بین کی دانش افزائی کا ذریعہ ہے..........

بوستان خیال جس کو مجموعۂ علم و کمال محمد تقی خاں خیال مرحوم جن کا بلا کا دماغ تھا بعبارت فارسی تصنیف فرمایا ہے اور ساتوں جلدیں بیا

زمانہ بھر کے خیالات کو آئینہ کر دکھایا ہے۔ قبل ازیں سوائے جلد اول و دوم کے کہ مقدم الکرام یقین خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان مغفور دہلوی نے باندازبول چال دہلی کے، پانچ جلدوں کا اردو ترجمہ کیا تھا کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور کتاب ناتمام رہی۔ جو کہ اتمام کو پہنچانا ایسی کتاب نغز و نایاب کا کہ جسکا مثل و نظیر آج ہندوستان میں نہیں ہے ضروری نظر آیا و مزید برآں اصرار اہل شوق کا دوبارہ ترجمہ اردو جلد اول و دوم اس داستان نادرالبیان کے افزوں پایا لہذا لکھنؤ کے نثر نگاروں اور ناظموں کی آبرو و عزت مرزا محمد عسکری صاحب عرف چھوٹے آغا صاحب نے ترجمہ اردو جلد اول و دوم بوستان خیال کا کہ جسکا نام مہدی نامہ ہے جس میں ذکر اجداد والانژاد صاحبقران عالی جناب شاہزادہ معزالدین کامیاب کا ہے اور تذکرہ جد امجد گیتی ستان جو پہلے تخت نشین سلطنت ہوئے یعنی احوال سلطان ابوالقاسم محمد مہدی جو صاحبقران و صاحب خروج زماں اور حال ملکہ عالیہ خاتون مادر صاحبقران عالی شان کا لکھا ہے، نہایت عرق ریزی سے عمدہ سلیس زبان میں فرمایا۔ جو بوستان خیال فارسی دیکھ چکا ہوگا وہ اسکی خوش بیانی کی داد دیگا۔ پرانے قصہ نے نیا رنگ پایا ہے۔ ہر داستان شمع بزم جہاں ہے جس پر پروانہ ہر قصہ خواں ہے"

دوسری مرتبہ بنظر ثانی مصنف یعنی مترجم بماہ مارچ ۱۸۸۸ء کے کرسی نشین نقش انطباع ہوا۔

اس کتاب میں ۴۹۶ صفحات ہیں۔ ہم صفحہ ۵ سے مہدی نامہ کی حسب ذیل عبارت نقل کرتے ہیں تاکہ مترجم کا انداز تحریر معلوم ہوسکے۔

راوی کہتا ہے کہ جب قچار اس طرف گیا زمرد نابکارہ اس
فکر میں ہوئی کہ جس طرح ہو سکے بار دگر سلطان سے لوح لوں تاکہ سحر اُسپر
کارگر ہو۔ راوی کہتا ہے کہ اُس کوہ کے حوالی میں ملکہ غزالہ کا ایک
باغ تھا۔ زمرد وہاں جا کے رہنے لگی اور بزور سحر اپنی صورت غزالہ
کی بنائی۔ اور اُسکے خیال میں یہ آیا کہ غزالہ آہو چشم کی صورت ہو کے
سلطان کو کمند عشق میں مبتلا کر دوں۔ حالانکہ سلطان کا عاشق ہونا
غزالہ پر اسکو معلوم نہ تھا۔ پس اس نجیبہ نے بوضع ملکہ کے سواری آہو
کی اختیار کی۔ اور اسی دستور سے اور آہو گرد و پیش لیکے جسطرف کہ
سلطان شکار کے واسطے آتے تھے وہ بھی اسی طرف جاتی تھی یہاں تک
کہ سلطان نے ایک آہو کے عقب میں گھوڑا ڈالا۔ زمرد بھی بقصد
شکار آئی تھی لیکن سلطان نے ایک درخت کے نیچے پہنچکے آہو کو
شکار کیا۔ چونکہ بسبب لوح کے خاطر جمع تھی، اُس جگہ آہو کو ذبح کر کے
کباب پکانے میں مشغول ہوئے۔ ناگاہ عقب آہوان سے وہی عورت
بصورت غزالہ آہو چشم اسی وضع سے سوار نمودار ہوئی سلطان
نے جب یہ دیکھا شادی مرگ ہو گیا۔ اور اُٹھ کے بزبان نیازمندی
دعا و ثنا اپنی محبوبہ کی بجا لایا اور یہ بیت ملا نظیری کی پڑھی۔

کجا بودی کہ ہر دم سوختی آزردہ جانرا　　بقدر روز محشر طول دادی ہر زمانے را

اے جان جہاں واے آرام دل مشتاقاں! جس روز سے کہ تم کو
دیکھا ہے، ہوش و طاقت مجھ میں باقی نہیں رہی اور محض تیری محبت
کے باعث دزدی میں متہم ہوا اور فروخت کیا گیا اور تم میرے
حال سے غافل ہو۔ کہتے ہیں۔

دل را بدل نزہت دریں گنبد سپہر — از زر گینہ کینہ وا ز سوے مہر مہر

میں نے اس کا اثر کچھ نہ دیکھا۔ باوجود اس اشتیاق کے تم کو اپنے حال پر مہربان نہ پایا۔ زمرد نے جو یہ سخن سلطان عالی شان سے سنا خوش ہوئی اور دل میں کہا۔ اے زمرد تیرے طالع معزل شاہ کے کہیاں دیگ پختہ و تیار ہے کیونکہ سلطان، غزالہ پر پیشتر سے عاشق ہے۔ القصہ ناز و کرشمہ شروع کیا اور اشارے سے باتیں کیں لیکن گھڑی گھڑی اونہستی تھی۔ سلطان نے اس سے کہا کہ آؤ قدرے کباب اس شکار کے تناول کرو۔ اسنے قبول نہ کیا۔ اس اثنا میں قراولان سلطان پہنچے زمرد بمجرد اُس گروہ کے آنے کے مانند برق کے چلی گئی سلطان بہت خفا ہوے اور فرمایا۔ کوئی مجکو کھائے نہیں جاتا تھا کیونکہ لوگ میرے پاس ہیں تم کیوں ہجوم کرکے میرے پاس آئے۔ میں کل سے سوائے مہتر طرفنگ کے اپنے ہمراہ دوسرے کو نہ لاؤں گا۔ کچھ احتیاج کسی کی نہیں ہے۔ لیکن جب وہ قحبہ گئی تھی سلطان نے وعدہ لے لیا تھا کہ کل بھی اسی جگہ آکے اپنے جمال سے مجکو بہرہ مند کرنا۔ اُس مکارہ نے بھی سر رضا ہلایا تھا۔ الغرض سلطان دوسرے دن بھی اس طرف گئے اور اسی درخت کے نیچے کہ جہاں ملکہ سے ملاقات ہوئی تھی، آہو شکار کرکے تنہا کباب پکانے میں مشغول ہوے مہتر طرفنگ اگرچہ ہمراہ تھا لیکن اُسکو دور کھڑا کیا تھا۔ وہ قحبہ بصورت غزالہ آئی اور سلطان نے بار دگر نیازمندی و اظہار تعشق شروع کیا۔ زمرد نے طرفنگ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ کون ہے سلطان نے فرمایا کہ میرا عیار و ہمراز ہے۔ اُس روز اس قحبہ نے اتنا کہا کہ دیوار ہم گوش دارد۔ ڈرتی ہوں کہ

کہ باپ میرا سن لے اور میرے واسطے قباحت ہو۔ سلطان نے کہا۔ ہرگز وسواس نہ کرو۔ تمھارے باپ تک کون خبر پہنچائے گا۔ امروز فردا میں تمھارا باپ بھی میری اطاعت کرے گا یا میرے ہاتھ سے قتل ہوگا کیونکہ تم نے بھی سنا ہوگا کہ میں نے طلسم کو توڑا ہے۔ اور تمھارے باپ نے چند روز کی مجھ سے مہلت لی ہے تاکہ اسکے پہلوان ورزش کرکے تیار ہوں اور جنگ زور بازو کریں کیونکہ اُن کے سحر سے کچھ نہ ہوا۔ اُس مکارہ نے کہا۔ اے شہریار کل کی شب میرا باپ کہتا تھا کہ میں نے بامید جنگ فلاں فلاں تامل کیا ہے۔ اگر وہ بھی مغلوب ہوئے۔ اس خدا پرست کی اطاعت کروں گا۔ بشرطیکہ بادشاہ طلسم محکو کرے۔ سلطان نے فرمایا۔ اے ملکہ جس صورت میں تمھارا باپ مسلمان ہوا، سلطنت دوسرے کو کب پہنچ سکتی ہے۔ اس قحبہ نے پوچھا اگر مسلمان نہ ہوا تو کیا کروگے۔ سلطان نے کہا اسوقت واجب القتل ہے زمرد نے رونا شروع کیا اور کہا ڈرتی ہوں کہ مرگ اُس کی تمھارے ہاتھ سے ہے۔ اگرچہ میں تم کو بھی دوست رکھتی ہوں لیکن محبت پدری کو کیا کروں۔ اے سلطان عالی شان واے ہلاک کنندۂ جادواں! اگر وہ گرفتار ہوا اور مسلمان نہ ہو چندے اسکو قید رکھنا شاید راہ راست پر آئے سلطان نے قبول کیا"

بوستان خیال جلد دوم جسکا نام دوحۃ الابصار یعنی ترجمہ معز الدین نامہ ہے پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکو نواب مرزا محسن علی خانصاحب عرف آغا جو صاحب **ہندی** تخلص نے ترجمہ کیا ہے اور نہ صرف اسکو بلکہ جلد سوم موسوم بہ **ضیاء الابصار** و جلد چہارم موسوم بہ **شمس النہار** و جلد پنجم موسوم بہ **مطلع الانوار** و جلد ششم موسوم بہ خزینۃ الاسرار

وجلد ہشتم موسوم بہ نورالانوار بھی صاحب موصوف ہی نے ترجمہ کی ہیں اگرچہ یہ جلدیں کہیں کہیں سے ناتمام تھیں لیکن مرزا محمد عسکری صاحب عرف چھوٹے آغا صاحب کی نگرانی میں جو مرزا محسن علی خانصاحب کے بھائی تھے مکمل ہوئیں اور منشی نولکشور آنجہانی نے ان سب کو طبع کرایا۔

یہاں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ پانچ جلدوں کا ترجمہ جیسا کہ پیشتر ذکر کیا جا چکا ہے خواجہ امان صاحب دہلوی نے بھی نہایت عمدہ طور پر کیا ہے اور دوسرے مطبعوں سے شایع ہوا ہے[1]۔ بہرحال بقیہ جلدیں بھی سنہ ۱۸۹۰ء کے بعد ہی چھپی اور شایع ہوئی ہیں اور مہدی نامہ و اسمٰعیل نامہ کی طرح معزالدین نامہ میں بھی ۵۲۶ صفحات ہیں۔ تقطیع اسی قدر بڑی ہے جسقدر کہ مہدی نامہ کی ہے مختصر یہ کہ اس بڑی تقطیع کے چار ہزار صفحات بوستان خیال کی جملہ ساتوں جلدوں کی نذر ہوگئے ہیں۔ اور جو تقطیع عام طور پر اردو کتابو

---

[1] مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں بوستان خیال کے ترجمہ کا ذکر کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ کسنے کیا ہے۔ بظاہر ایسا خیال ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے کسی شاگرد یا عزیز نے کیا ہے ورنہ انکو اسکے چھپوانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"بوستان خیال کا ترجمہ موسوم بہ حدائق الانظار معرض طبع میں ہے۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو تو جتنے مجلد فرمائیے اسقدر بھجوا دوں۔ چھ روپے مع محصول ڈاک قیمت ہے اسی مطبع میں جس میں حدائق الانظار کا انطباع ہوا ہے۔ اخبار بھی چھاپا جاتا ہے اب کے ہفتہ کو دو ورقہ بھیجدوں گا۔ بشرط پسند آپ توقیع خریداری لکھ بھیجیے گا۔"

اگر یہ ترجمہ خواجہ امان دہلوی کا ترجمہ نہیں ہے تو بوستان خیال کے تین اردو ترجمے سمجھنے چاہییں۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب اڈیٹر رسالہ اردو بوثوق کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ خواجہ امان صاحب دہلوی کا ہے۔

کی رکھی جاتی ہے یعنی ۲۶۴۲۰۔ اسکے لحاظ سے آٹھ ہزار صفحات کی یہ ضخیم جلدیں سمجھنی چاہییں۔ ہماری قصہ پسندی کا یہ ادبی کرشمہ ہے کہ آٹھ ہزار صفحات فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیئے گئے ہیں۔ علمی کتابوں کا شوق اسوقت پبلک کو نہ تھا ورنہ آٹھ ہزار صفحات کی علمی و ادبی کتابیں فارسی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی جاتیں تو کیا اچھا ہوتا ع چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔

اب صاحب بوستان خیال کے مختصر حالات بھی سن لیجیے اور اس کتاب کا سبب تصنیف بھی ملاحظہ فرمائیے۔

میر تقی گجرات کے رہنے والے تھے۔ ان کا تخلص خیال تھا۔ اور بعض اشخاص کی زبان سے ان کو ملقب بہ ملا بھی سُنا گیا ہے۔ نہایت ذی استعداد تھے اور طالب العلیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ گردش گردوں سے پریشان حال ہو کر محمد شاہ رنگیلے کے عہد سلطنت میں دہلی کی طرف رخ کیا۔ یہاں اُن کی منظور نظر ایک زن مطربہ تھی۔ وہ ان سے اکثر شب کو قصص تازہ کی فرمایش کیا کرتی تھی۔ یہ اپنی محبوبہ کی خاطر سے روز ایک تازہ قصہ اپنی طبیعت سے ایجاد کر کے سُنا دیتے تھے۔ ان کے مکان کے پچھواڑے کچھ لوگ جمع ہوتے تھے اور داستان امیر حمزہ پڑھوا کر سنتے تھے میر تقی بھی کبھی کبھی تفریحاً شریک جلسہ ہوتے تھے۔

ایک روز بعد ختم داستان، اہالیان جلسہ نے داستان امیر حمزہ کی نہایت تعریف کی لیکن داستان گو نے میر تقی کو سنا کے کہا کہ داستان کے مرتب کرنے کے واسطے خداوند عالم قابلیت پیدا کرے تو ممکن ہے ورنہ علوم و فنون کی تحصیل سے اگر کوئی شخص داستان مرتب کرنا چاہے تو محال ہے۔ یہ بات میر تقی کو نہایت ناگوار گزری اور کہا کہ کیا کہتے ہو، صاحبان علم و فضل

کے سامنے ایسے خیالات کی کیا حقیقت ہے۔ لیکن ان کو علوم کی کتابوں کی تصنیف سے اسقدر فرصت نہیں کہ وہ ان مزخرفات میں اپنا وقت ضایع کریں۔ بعض لوگوں نے ان کی راے سے اتفاق کیا اور بعض لوگوں نے اختلاف کیا اسکے بعد جلسہ برخاست ہوگیا۔ چونکہ اپنی محبوبہ کی فرمائش کی وجہ سے ہر روز ان کو تازہ قصوں کی فکر رہتی تھی، اس لیے اس واقعہ کے بعد اب خیال کو زیادہ وسعت دینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کتاب کے چند اجزا مرتب کرکے اسی جلسہ میں گئے اور داستان امیر حمزہ ختم ہونے کے بعد اہالیان جلسہ کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ ایک نئے قصے کے چند اجزا دستیاب ہوے ہیں اگر اجازت ہو تو ان کو سناؤں۔ سب نے متفق اللفظ ہوکر کہا بسم اللہ ضرور پڑھیے۔ جب پڑھا تو تمام حاضرین جلسہ محو ہوگئے اور ہر طرف سے صداے تحسین بلند ہوئی اور آپس میں کہنے لگے کہ واقعی اس طرح کا قصہ آجتک سننے میں نہیں آیا۔ یہ قصہ مصنوعی نہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ اصلی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی خبر بادشاہ وقت تک پہنچی میر تقی خیال دربار میں طلب کیے گئے اور بادشاہ نے باعزاز و احترام خلعت فاخرہ سے ممتاز فرمایا اور اس عجیب قصہ کی طوالت کا حکم دیا اور ایک مدت مدید کے بعد یہ قصہ فارسی زبان میں تکمیل کو پہونچا۔

بوستان خیال کی زبان نہایت عمدہ ہے اور ایک خاص بات یہ ہے کہ جو نام ہے بلا وجہ تسمیہ نہیں۔ اس قصہ کی تصنیف میں مصنف کو جسقدر انہماک تھا اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ کسی ضرورت سے دریا کے سفر کا اتفاق ہوا جس کشتی پر **میر تقی خیال** سوار تھے، اس کشتی پر ان کے ایک دوست بھی عازم سفر تھے

وہ اس قصہ کی ترتیب کے لیے اس درجہ غرق بحر فکر تھے اور اسقدر قلم فرسائی میں مشغول تھے کہ جب ساحل مقصود پر اترنے کی نوبت آئی تو انھوں نے اپنے دوست کو پہچانا اور ان سے ملاقات کی اور اسوقت معلوم ہوا کہ انکے دوست بھی اسی کشتی پر تھے" نمونہ کی ضرورت نہیں شائقین صحاب اصل جلدیں ملاحظہ فرمائیں۔

منشی نولکشور صاحب نے بعض مفید کتابوں کا بھی ترجمہ اردو میں کراکر چھپوایا ہے۔ سیر المتاخرین فارسی زبان میں ہندوستان کی تاریخ ہے اس کی تینوں جلدوں کا ترجمہ آپ ہی کے ایماء سے منشی گوکل پرشاد المتخلص بہ رسا نے کیا ہے۔ آپ کے والد کا نام گوردیال ہے اور آپ قوم سری باسپت کھرے ہیں۔ یہ ترجمہ ۱۸۷۶ء میں ختم ہو کر طبع ہوا ہے چنانچہ مترجم نے خود قطعہ تاریخ لکھا ہے:-

آغاز ترجمہ میں یہ دل کو ہوا خیال — تاریخ ایسی لکھ کہ جسے اختصاص ہو
فوراً مسیح بولے کہ لکھ بید حرف رسا — منشی نولکشور کے مطبوع خاص ہو

کارپردازان مطبع کی طرف سے جو سبب ترجمہ درج کیا گیا ہے وہ یہ ہے "اگرچہ سیر المتاخرین کی عبارت فرط سلاست سے ہر دلعزیز و پسندیدہ خاطر ہر سرا پا تمیز تھی مگر چونکہ اس زمانہ میں اکابر و اصاغر کو زبان اردو معلیٰ اور اس زبان بلاغت ترجمان کی جامعیت بدل وجان مرغوب ہے اسواسطے مالک مطبع عالی وقار کے ایما سے اسکا ترجمہ اس زبان فصاحت توامان میں منشی گوکل پرشاد لکھنوی نے ترتیب دیا" اس کتاب کا نام مراۃ السلاطین ہے اور تینوں جلدوں میں گیارہ سو آٹھ صفحات ہیں۔ مختصر نمونہ بنظر ناظرین کرام ہے۔

(از ترجمہ سیر المتاخرین معروف بہ مرآۃ السلاطین)

میاں تان سین اور مولانا عرفی شیرازی اور شیخ ابوالفیض فیضی کی رحلت کا بیان

میاں تان سین نغمہ سرا خوش آہنگ اپنے فن میں یکتا بلکہ نادرات زمانہ سے تھا جسکے مقابل اُسکے پہلے اور پیچھے آج تک کوئی نہ ہوا۔ ساتویں سال جلوس کو راجہ رام چندر مرزبان باندھو نے تان سین کو تحفہ کے طور سے حضور میں بھیجا۔ چونکہ بادشاہ علم موسیقی میں مہارت تام رکھتا اور تان سین بھی اس فن میں برگزیدۂ انام تھا، باہم صحبت موافق ہوئی۔ چونتیسویں سال جلوس کو اس دائرۂ پرشور سے میاں تان سین ناساز ہوکر مقام اصلی کو سدھارے۔ بادشاہ کو اس کج آہنگی چرخ سے تاسف بے اندازہ ہوا۔ چھبیسویں سال جلوس کو مولانا عرفی شیرازی نے چند روز عطر آمیزی مشام اہل دانش کرکے نہانخانۂ عدم کی راہ لی تیس برس اس سپنجی سرا کے قیام میں موجب یادگار ہو گیا چالیسویں سال جلوس کو شیخ ابوالفیض فیضی نے بھی سیر ارم کو نہضت کی اس شخص نے جلوس کے بارھویں سال کو دربار اکبری میں دخل پایا تھا بروقت اول اول دربار میں پہنچنے کے نقرئی پنجرے کے باہر کھڑا کیا گیا تھا۔ اسوقت یہ قطعہ بدیہہ زبان پر لایا قطعہ۔

بادشاہا بروں پنجرہ ام	از سر لطف خود مرا جادہ
زانکہ من طوطی شکر خایم	جائے طوطی درون پنجرہ بہ

بادشاہ کو پسند ہوا۔ اُسی روز قرب حاصل کیا۔ اپنے اخلاق حمیدہ سے

روز بروز ترقیاں پایا گیا۔ تینتیسویں برس ملک الشعرائی کا خطاب پایا۔
انتالیسویں برس **قرآن کی تفسیر** بے نقط اور مرکز ادوار **مخزن**
اسرار کی بحر میں تصنیف کیا جو نظر شاہی میں مقبول ہوئیں۔ ان کتابوں
سے اس کی لیاقت ظاہر ہے۔ اسی طرح **سلیمان بلقیس** بوزن **شیریں**
خسرو اور **ہفت کشور**، **ہفت پیکر** کے برابر اور **اکبرنامہ**
سکندرنامہ کے مقابلہ میں بنایا چاہتا تھا۔ ہنوز یہ ارادہ تمام نہ ہوا
تھا کہ خود آپ کا کام تمام ہو گیا۔ ازبسکہ حسن اخلاق اس کا دامنگیر تھا
اور شاہزادے بھی اس سے استفادہ کرتے تھے، رحلت سے دو روز قبل
شاہ اکبر مع شاہزادوں کے شیخ کے دیکھنے کو گیا اور اسنے یہ رباعی اسی
وقت پڑھی۔ **رباعی**

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد — مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آن سینہ کہ عالمے درو میگنجید — تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد

المختصر اس مطبع سے عمدہ کتب تواریخ بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں
علاوہ **سیر المتاخرین** کے **تاریخ فرشتہ** اور **تاریخ ٹاڈ راجستان** کا ترجمہ
اردو بھی اسی مطبع میں طبع ہو کر شائع ہوا **تواریخ راجگان اودھ** ایک اور
قابل قدر کتاب ہے جو اسی مطبع سے شائع ہوئی ہے **صحیفۂ زریں** بھی اس
مطبع کا سنہری کارنامہ ہے۔

واقعی اردو زبان کی خدمت جسقدر اس مطبع سے ہوئی شاید کوئی اور
مطبع آیندہ زمانہ میں بھی یہ فخر نہ حاصل کر سکے تیسرے دور کے دونامور اور مشہور
مصنف بھی اسی مطبع سے سروکار رکھتے تھے اور عرصہ تک **اودھ اخبار** کی
اڈیٹری اور اسسٹنٹ اڈیٹری کا کام سرانجام دے چکے ہیں۔

رامائن بالمیکی بھاشا بھی بخط فارسی تحریر ہو کر اسی مطبع سے شائع ہوئی ہے۔ الغرض اس مطبع کے احسانات اُردو زبان پر بہت ہیں اور جب تک یہ زبان زندہ رہیگی۔ اس مطبع کا نام بھی ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اسی سلسلہ میں منشی نولکشور رائے بہادر کے حالات زندگی بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

آپ علی گڑھ کے قریب ایک موضع میں جس کا نام ساسنی ہے پیدا ہوئے تھے۔ اس گاؤں میں بڑے بڑے لوگ اور مالدار آباد تھے منجملہ ان کے آپ کے والد منشی جمنا پرشاد بھارگو بھی ایک خوش نصیب اور مرفہ الحال زمیندار تھے۔ خدا نے اپنے فضل سے اُن کو پانچ بیٹے دیے تھے جنکے نام علی الترتیب حسب ذیل ہیں۔

بھوچند۔ نول کشور۔ تلسی رام۔ سیوک رام۔ دامودر داس۔ یہ سب صاحب نصیب اور اہل علم ہوئے لیکن منشی نولکشور فخر خاندان ثابت ہوئے۔ اور ہندوستان کے علم دوست صاحب میں آپ کا شمار کیا گیا۔ آپ سمبت ۱۸۹۲ پوس بکرماجیت میں متھرا کے قریب ایک موضع ریڑھا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی تعلیم موضع ساسنی میں جو آپ کا آبائی وطن تھا چھ برس کی عمر میں شروع ہوئی تھی۔ پانچ سال تک آپ اپنی مادری زبان میں تعلیم پاتے رہے اور اسکے بعد آگرہ کالج میں داخل ہو گئے اور وہاں پانچ برس میں امتحان پاس کیا۔ آپ کو اخباروں کے مطالعہ اور حب الوطنی کے مضامین پڑھنے سے خود بھی مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور آپ اخبار "آگرہ سفیر" میں مضامین لکھنے لگے۔ گورنمنٹ نے آپ کی علمی لیاقت کا اندازہ کر کے آپ کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا اسوقت

منشی ہر سکھ رائے کی شہرت تھی یہ مطبع کوہ نور لاہور کے مالک تھے لہذا
آپ آگرہ سے لاہور چلے گئے اور وہاں جاکر ملازم ہو گئے منشی ہر سکھ رائے
نے آپ کی حسن کارگزاری سے خوش ہو کر مطبع کا کل کام آپ کے سپرد کر دیا۔
اتفاق سے منشی ہر سکھ رائے ایک فوجداری مقدمہ میں ماخوذ ہو گئے
اور عدالت اول نے اُن کو سزا دیدی منشی نولکشور نے جید پیروی کی اور
آخر کار عدالت اپیل سے منشی ہر سکھ رائے بری کیے گئے۔ منشی نولکشور
کی حسن خدمات سے منشی ہر سکھ رائے نہایت خوش تھے لیکن منشی نولکشور
کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نوکری کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو آخر غلامی ہے
چند روز کے بعد اس خیال نے عملی صورت اختیار کی اور نوکری چھوڑ کر لاہور
سے لکھنؤ آئے اور یہاں آکر خود اپنا مطبع جاری کیا۔ رفتہ رفتہ اس مطبع
نے وہ نام پیدا کیا کہ ہندوستان میں کوئی اس کا نظیر نظر نہیں آتا عربی
فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت کی نایاب کتابیں جو قلمی تھیں اور زمانہ کی
دست برد سے گوشۂ گمنامی میں جا پڑی تھیں تلاش کرا کر فراہم کیں اور جہاں
جہاں ضرورت ہوئی حواشی لکھوا کر اُن کو شایع کیا۔

آپ نے ایک خیراتی شفاخانہ بھی جاری کیا جس میں حکیم، وید اور
ڈاکٹر مفت علاج کرتے تھے۔ غریبوں کو دوا اور غذا مفت دی جاتی تھی
منشی صاحب غریب طلباء کو اپنے پاس سے فیس دیتے تھے اور بعض اوقات
کتابیں بھی مفت دیتے تھے۔ گورنمنٹ نے آپ کی ملکی خدمات کے صلہ میں
آپ کو اودھ کے درباریوں میں شامل کیا اور آپ کو سی۔ آئی۔ ای کا
خطاب مرحمت کیا۔ آپ میونسپلٹی لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹی کے ممبر بھی
مقرر کیے گئے۔ آپ جیل اور اودھ روہیلکھنڈ ریلوے کے آنریری انسپکٹر

بھی مقرر ہوئے اور گورنمنٹ پریس الہ آباد بھی آپ کی زیر نگرانی کیا گیا امیر عبدالرحمن مرحوم والی افغانستان جب ہندوستان میں بتقریب شرکت دربار تشریف لائے تو آپ سے مل کر بیحد محظوظ ہوئے اور آپ کے کام کی بہت تعریف کی۔

ایک مرتبہ آپ کلکتہ تشریف لے گئے۔ سیر و تفریح کی غرض سے بندرگاہ پر پہنچے۔ اسوقت ایک جہاز کاغذ سے لدا ہوا آیا تھا۔ آپ نے اُس کو نیلام میں خرید لیا۔ آپ کے ساتھیوں کو بیحد فکر تھا کہ مال کی قیمت کہاں سے ادا کیجائیگی لیکن آپ نے اُن کو ڈھارس دی اور کہا کہ ہرگز اندیشہ نہ کرو ہم کو اس مال میں نقصان نہ ہوگا۔ چنانچہ آپ نے سب روپیہ میعاد سے پیشتر ادا کر دیا اور مال کو دوسرے خریداروں کے ہاتھ نفع سے فروخت کر دیا اور ہزاروں روپیہ منافع لیکر لکھنؤ واپس آئے۔

آپ کا مطبع روز افزوں ترقی کرتا رہا اور کوٹھی غالب جنگ جو بڑی شاندار عمارت ہے وہ بھی ناکافی رہی اور آپ نے ایک اور کوٹھی اور کارخانے کے مکانات حضرت گنج میں تعمیر کرلے جب یہ بھی ناکافی ثابت ہوئے تو چند اور کوٹھیاں جو قرب و جوار میں واقع تھیں خریدیں اور کانپور الہ آباد، لاہور، دہلی، آگرہ، اجمیر قریب ہر ایک نامی شہر میں اپنا مطبع قائم کیا اور اپنا تجارتی کارخانہ لندن تک پھیلا دیا۔ اور خدمت ملک کے لیے بھی ہزاروں روپیہ صرف کیا۔

۵۹ برس کی عمر میں سنہ ۱۹۵۱ بھاگن بدی دسویں بروز منگل کام کرتے ہوئے ہنسی خوشی کے ساتھ اس دنیائے ناپائدار سے رخصت ہو گئے۔ اور پچپن ہزار روپیہ کا زرخرید علاقہ وقف کر گئے۔ (ماخوذ از جیون چرتر)

ناولِ نگارانِ اُردو

ہماری زبان میں خدا کے فضل سے افسانوں اور قصّوں کی کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ سوا سو برس سے زیادہ زمانہ گزرا کہ اُردو زبان کی نثر معرضِ وجود میں آئی تھی اسوقت سے اب تک زیادہ تر قصص ہی ہمارے علم ادب کے سرمایۂ صد ناز و افتخار رہے۔ **میر امّن کی باغ و بہار** سے لے کر شرر کے آخری ناول تک سوائے افسانوں کے اور یہاں کیا دھرا ہے اگر تیسرے دور کے مصنفین میں یہ چند نفوس قدسیہ یعنی آزاد، سرسید، مولوی چراغ علی، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور بلگرامی نہ ہوتے تو آج اردو میں سوائے داستانوں کے ایک کتاب بھی قابل ذکر نہ ہوتی۔

پہلے دور کے مصنفین نے آسان اور عام فہم قصے تحریر کیے۔ ترجمے بھی کیے تو قصّوں ہی کی کتابوں کے۔ دوسرے دور میں بھی زیادہ تر قصّوں ہی کو جگہ دی گئی۔ ایک آدھ کتاب اگر کسی اور عنوان پر لکھدی تو کیا قابل فخر کام کیا۔ بے شک تیسرے دور کی ابتدا سرسید کے مبارک ہاتوں نے رکھی اور علمی و ادبی دور کا آغاز ہوا۔ لیکن اگر اُن مطبوعات پر نظر ڈالی جائے جو واقعہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۱۴ء یعنی **ابتدائے جنگ یورپ** تک شائع ہوئیں تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ غالب تعداد ہمارے قصّوں اور ناولوں ہی کی ہے۔ مفید اور کام کی کتابیں نسبتاً بہت کم ہیں۔

کہتے ہیں کہ ہر زبان میں قصّوں اور ناولوں کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ہر زبان کے علم ادب میں زیادہ جگہ اُن ہی سے پر ہوتی ہے یہ قول ایک حد تک صحیح ہے۔ ایک صاحب نے عرصہ ہوا ادیب الہ آباد میں

اُردو زبان اور ناول کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا اور ناول نگاری کی حمایت اِن الفاظ میں کی تھی:۔

دو کسی زبان کا ادب لے لیجیے۔ افسانہ کا رنگ غالب نظر آئے گا قصہ کا رنگ مذہب، اخلاق، سیاست غرض جمیع مشاغل زندگی پر حاوی نظر آتا ہے۔ قصوں کے ذریعہ سے اخلاق کی تزئین، معرفت کے رموز، تاریخ کے انقلابات زمانہ قدیم سے ظاہر ہوتے چلے آئے ہیں۔ عربی ادب کا نام ایک قصہ الف لیلہ سے روشن ہے۔ **ہارون الرشید** کے زمانہ کے طرز تمدن، طرز سیاست، طرز تعلیم، اخلاق و آداب کی اس سے بہتر تاریخ نہیں مل سکتی۔ عربی ادب کے شعراء، فلسفہ نگار، مورخین کسی کے نام سے دنیا آشنا نہیں ہے مگر **الف لیلہ** کی داستان شاید ہی کسی بدقسمت شخص کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اُردو میں **بنگلہ ادب** سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے مگر **بنکم بابو** کا نام ہر شخص جانتا ہے۔ **گوبند رام ترپاٹھی** کا جو گجراتی زبان کے مشہور و معروف ناول نویس تھے سنہ ۱۹۱۰ء میں جب انتقال ہوا تو ایک گجراتی رسالہ نے ایک کارٹون کے ذریعہ سے یہ دکھایا تھا کہ گجراتی ادب کا آفتاب غروب ہو گیا جس طرح **بنکم بابو** بنگلہ ادب کے بادشاہ تھے، اسی طرح **گوبند رام** گجراتی ادب کے تاجدار تھے علیٰ ہذا اور مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہو جائے گا کہ ناول نویس کا رتبہ ادبی دنیا میں کیا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کو لے لو **ڈکنس** اور **تھیکرے**، **اسکاٹ** اور **ایلیٹ** کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ شیکسپیر کو بھی نصیب نہیں **سر جان لبک**

لـه مجھے ذاتی طور پر اس سے اتفاق نہیں۔ تنہا

نے اپنی ایک کتاب میں دنیا کی بہترین سو کتابوں کی فہرست دی ہے
اسکاٹ کے سب قصے اس میں موجود ہیں۔ **لارڈ بیکنسفیلڈ** جو
ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں کئی بار وزیر اعظم رہے۔ **لارڈ لٹن** جو ہندوستان
کے ویسرائے رہ چکے ہیں انگریزی ادب کے رکن سمجھے جاتے ہیں اور
یہ دونوں اعلیٰ پایہ کے ناولسٹ ہیں .... گیٹے جرمن
زبان کا سب سے زیادہ مشہور مصنف ہے اور وہ ناولسٹ ہے
کاؤنٹ ٹالسٹائے روس کے موجودہ ادب کے بادشاہ ہیں
اور وہ ناولسٹ ہیں۔ ان مثالوں سے یہ کافی طور پر واضح ہوگیا ہوگا
کہ ناول نویس کا رتبہ ہر ایک زبان کے ادب میں سب سے زیادہ
ممتاز ہوتا ہے اور ادبی دنیا اسکے احسانات و خدمات کے بوجھ سے
سکدوش نہیں ہو سکتی۔ ایسی حالت میں کیا یہ افسوس اور عبرت کا مقام
نہیں ہے کہ اردو زبان میں ناول اور ناول نویسی کی یہ بیقدری ہو رہی
ہے۔ اس میں زیادہ قیل وقال کی گنجایش نہیں ہے کہ ہندوستان
کی دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی قدیم طرز کے افسانوں کا نعم البدل
ناول ہی رہیگا۔ گویا ناول ادب کا وہ اہم ترین حصہ ہے جسے افسانہ
کہتے ہیں کیا حامیانِ اردو اپنے ادب کا اس بیدردی سے
گلا گھوٹیں گے دنیائے تخیل میں مشرق ہمیشہ سے مغربی اقوام کا
محسود رہا ہے۔ وہ بلند پروازیاں۔ وہ وسعت خیال
وہ بندش کی رنگا رنگی جو مشرقی افسانوں میں نظر آتی ہے
مغربی قصوں میں عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ یورپ
باوجود اس قدر مزاولت کے آج تک

الف لیلہ کا ثانی نہ پیدا کر سکا قصہ حاتم طائی ایک عام کتاب ہے مگر مغرب میں شاید ہی کسی نے ایسا دل آویز قصہ لکھا ہو باغ و بہار بھی اپنی طرز کی بے نظیر کتاب ہے۔ کیا دلدادگان اردو، فسانہ نگاری کی بیقدری کر کے ایسے ادبی معجزات کے لیے میدان باقی نہ رکھیں گے"

"دنیا میں زندگی کی زبردست کشمکش ہو رہی ہے۔ انسانی آبادی کا بیشتر حصہ کسب معاش کی فکروں میں پریشان رہتا ہے۔ سارے دن اور کچھ رات گئے تک ہمارے دل و دماغ کا عطر سا نکلتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں، فلسفہ، پالٹیکس یا تاریخ کا مطالعہ بجائے دلچسپی کے خود ایک ریاضت شاقہ ہو جائے گا جنھیں فرصت ہے جنھیں ہوادار کمروں میں آرام کرسیوں پر لیٹے لیٹے یا دن بھر میں دو چار گھنٹوں کی سیر سپاٹے کے بعد لقمۂ لطیف کھانے کو مل جاتا ہے ان کے لیے تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ، ریاضی، منطق سب کچھ زیبا ہے۔ مگر ایسے لوگ فیصدی کتنے ہیں۔ آبادی کا بہت بڑا حصہ وہی ہے جسے چوبیس گھنٹوں میں بارہ گھنٹے فکر معاش کی نذر کرنا پڑتے ہیں۔ یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہیں یا کچھ نہیں پڑھ سکتے یہی سبب ہے کہ آج یوروپین زبانوں میں سائنس، فلسفہ اور تاریخ کے اکثر موضوع پر ناول لکھے جاتے ہیں تاکہ انسانی آبادی کا یہ مصروف حصہ ان مسائل سے بالکل غیر مانوس نہ ہو جائے۔ اور علم کے خشک مسئلے اقل درجہ کی دماغی کاوش سے اسکے ذہن نشین ہو جائیں۔ اہل یورپ نے ناول کو ادب کا سب سے ضروری صیغہ تسلیم کر لیا ہے اور ناول نویسی کو سائنس کا رتبہ دیدیا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو پبلک یوروپین علم ادب کی اس رفتار سے بیخبر ہے"

ہم کو صاحب مضمون سے اتفاق ہو یا اختلاف۔ بحث صرف اس قدر ہے کہ ہماری زبان کے ناول نویس علم کے خشک مسئلوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے اقل درجہ کی دماغی کاوش سے کام بھی لیتے ہیں یا نہیں۔ جو تاریخی ناول لکھے جاتے ہیں۔ وہ کہاں تک صحیح معنوں میں تاریخ کے علم کی اشاعت کرتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کے موضوع پر تو کسی صاحب نے ناول لکھنے کی زحمت شاید گوارا بھی نہ کی ہو۔ جب یہ حال ہو جیسا کہ وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ

"ہر کس و ناکس نے ناول لکھنا شروع کیا۔ اسکول اور کالج کے طلبا اور معمولی لیاقت کے لوگ جنھیں سو پچاس اشعار یاد ہو گئے قلم لیکر بیٹھ گئے اور سمان باندھنا شروع کر دیا۔ کئی کئی صفحے تک بے سر پیر کی بکواس کے بعد بازاری حسن و عشق کا قصہ چھیڑ دیا، موقع موقع سے اشعار چسپاں کر دیے۔ عاشق کی بیقراری، اور معشوق کی بے نیازی دکھائی۔ کچھ دنوں تک جدائی کی تکلیفیں رہیں۔ میاں عاشق پر جنون سوار ہو گیا۔ تب دوستوں کی ہمدردیوں نے پوشیدہ ملاقاتیں کرائیں اور عاشق و معشوق کا وصال ہو گیا۔ قصہ تمام ہوا۔ شرر اور سرشار کے سوا قریب قریب سبھوں نے یہی طرز اختیار کیا۔ اسی خاکے پر ہر ایک مصنف اپنی لیاقت اور مذاق کے موافق رنگ بھر لیا کرتا تھا۔ آخر ناولوں کی ایسی افراط ہو گئی کہ پڑھنے والے تنگ آ گئے"

تو ہم ناول نویسی کی کہاں تک مدح سرائی کر سکتے ہیں؟ اور کہاں تک بے سر و پا حکایتوں کی قدر افزائی اور علمی کتابوں کی بیقدری دیکھ سکتے ہیں؟ اگر دنیا میں کوئی کام باقی نہیں رہا اور صرف تفریح کی ضرورت ہے تو شوق سے ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ کیا کیجیے۔ روزانہ کشاکش زندگی میں

اگر سات آٹھ گھنٹے کی مسلسل دماغی محنت کے بعد ایک دو گھنٹے تفریح کی ضرورت ہے تو اسی نسبت سے علمی اور ادبی کتابوں کے مقابلہ میں ناولوں کی تعداد ہونی چاہیے۔ لاریب کھانے میں نمک کی ضرورت ہے لیکن تمام کھانا نمک نہ ہونا چاہیے۔

شرر اور سرشار کے بھی تمام ناول یکساں طور پر عمدہ نہیں ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جو بالکل قابل التفات نہیں۔ بے شک ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ہر طرح قابل تعریف و تحسین ہیں۔ اردو میں ان دونوں صاحبوں کی تصنیفات کے علاوہ بھی بعض بعض ناول ایسے ہیں جو علم ادب میں جگہ پا چکے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ہم کو یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہماری زبان میں ناولوں اور قصوں نے ضرورت سے زیادہ جگہ گھیر لی ہے۔ اور پڑھنے والوں کے دلوں پر اس قدر احاطہ کر لیا ہے کہ وہ ناول کے علاوہ کسی کتاب کا مطالعہ کرنا تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اردو داں پبلک، کتابیں خریدنے میں نہایت بخل سے کام لیتی ہے اور کام کی کتاب خریدنا تو اسے دوبھر ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ عمدہ سے عمدہ اور نامور سے نامور مصنف کی تصنیفات کی جلدیں زیادہ نہیں صرف ایک ہزار کئی برس کی لگاتار اشتہار بازی کے بعد خدا خدا کر کے ختم ہوتی تھیں ورنہ زیادہ عرصہ تک ختم ہونے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اب البتہ پبلک کا مذاق کسی قدر بدلا ہے اور ناول بینی سے کم دلچسپی ہو گئی ہے۔ علمی اور ادبی کتابوں کے دیکھنے کی طرف طبیعتیں راغب ہو چلی ہیں اگرچہ اب بھی صحیح مذاق پیدا ہونے میں۔ ہنوز دلی دور است۔ کی مثل صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان میں علوم کی کتابیں بالکل نایاب ہیں۔ اگرچہ دوسری زبانیں اس قسم کی کتابوں سے مالا مال ہیں۔ ظاہر

ہے کہ پبلک کی ناقدردانی اور کم التفاتی اعلیٰ مصنفین پیدا کرنے میں سدِ سکندری ثابت ہوگی اور ہماری زبان بہت عرصہ تک اچھی کتابوں سے محروم اور مفلس رہے گی۔

یہی پبلک کی ناقدری، یہی گر بدمذاقی ہے
نہ دکھلائے خدا وہ دن کہ ہم جس دن سے ترساں ہیں

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہماری زبان میں ناول نویسی کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی؟ ایک دوسرے صاحب رسالہ مخزن ۱۹۰۶ء میں لکھتے ہیں کہ۔

زمانے کی تبدیلی کے ساتھ جب لوگوں کے مذاق میں تبدیلی ہوئی تو بوستان خیال و طلسم ہوشربا کی پر لطف داستانیں پھیکی معلوم ہونے لگیں اور اس بات کی ضرورت مختلف اہل قلم کو محسوس ہوئی کہ اُن زبانوں کے لیے جو قصہ خوانی کی چاٹ پر لگی ہوئی تھیں انگریزی مطبخ سے ایسی غذا لائی جائے جو ناگوار نہ گزرے۔ سب سے پہلے اُردو ناول نویسی کی بنا ڈالنے والوں کی توجہ اس امر کی طرف منعطف ہوئی کہ وہ کونسی بات ہے جس نے طلسم ہوشربا کی داستانوں کو موجودہ نسل کے لوگوں کی نگاہ میں مبغوض بنا رکھا ہے۔ اُن کے ناپسند ہونے کی وجہ یہ تو ہو نہیں سکتی کہ وہ دلچسپ نہیں کیونکہ اگر انصاف کی رو سے دیکھا جائے تو خاص خاص مقامات کو چھوڑ کر جہاں رطب و یابس نے دلچسپی کو کم کر دیا ہے، طلسم ہوشربا کے اکثر مقامات اپنے رنگ میں انوکھی دلچسپی رکھتے ہیں تخیل کی ان میں کمی نہیں بلکہ شاید اگر تخیل کو واقعیت کا متضاد تصور کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طلسم ہوشربا

کے مصنف یا مصنفین کا تخیل کسی نئے رنگ کے فسانہ نویس کو حاصل نہیں ہوا۔ زبان بھی چنداں بُری نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنی طرز میں لاجواب ہے۔ ہم نے مانا کہ آج کل یہ رنگ مفقود ہے، اگر لوگ سیدھے اور صاف الفاظ کو بہترین اسلوب خیال کرتے ہیں۔ لیکن طلسم ہوشربا کی بے قدری محض رنگینی عبارت کی وجہ سے نہیں اسکی قدر کو اس امر نے کھو دیا کہ تعلیم یافتہ لوگ محض تخیل کے کرشموں میں دلچسپی لینے سے قاصر ہیں۔ اُن کی نظروں میں صرف وہی عمارت جچ سکتی ہے جسے تخیل کا معمار واقعات کی بنا پر کھڑا کرے۔ غیر تعلیم یافتہ دماغ کی مثال بالکل ایک بچے کی سی ہوتی ہے جو جنوں اور پریوں کی داستانوں کو یقین کے ساتھ سنتا ہے اور ناممکن الوقوع باتوں کو اپنی سادگی یا سادہ لوحی کی وجہ سے سچا تصور کرکے اُن میں وہ حظ پاتا ہے جو ایام طفولیت سے باہر قدم رکھ کے مدت العمر میں پھر کبھی حاصل نہیں ہوتا برخلاف اسکے تعلیم یافتہ قصوں میں بھی ممکن وغیر ممکن کا سوال درمیان میں لاتا ہے۔ علاوہ بریں تعلیم یافتہ آدمی یا یوں کہیے کہ وہ آدمی جسکے دماغی قویٰ کو پورا نشوونما کا موقع ملا ہو، صرف ان امور ہی میں دلچسپی لے سکتا ہے جو انسان وفطرت انسانی سے متعلق ہوں محض فرضی معاملات میں دلچسپی لینا صرف انہی لوگوں تک محدود ہے جو زندگی کو بجائے ایک جلوے امتحان کے بازیچۂ اطفال تصور کرتے ہیں کسی حکیم کا مقولہ ہے کہ انسان کے لیے بہترین مضمون مطالعہ خود انسان ہے اور یہ ایسا قول ہے جسکی صداقت کی دلیلیں دنیا کے ہر ایک ملک کے علم ادب کی تاریخ میں مل سکتی ہیں بالخصوص ناول نویسی کا یہ فرض ہے کہ اپنے قصے میں اس قول سے

فائدہ اٹھا کر تمام واقعات کو ایسے پیرائے میں لکھے جس سے اسکی تحریر ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا سرمایہ بہم پہنچا سکے اس عالمگیر اصول کو واضح کرنے کے لیے بہترین مثال جو مل سکتی ہے، وہ اس عجیب و غریب کتاب **الف لیلہ** کی ہے۔ حالانکہ اس میں بعید از قیاس واقعات ہیں لیکن چونکہ اس کی اکثر حکایات فطرت انسانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں اور اس حکمت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی خوبیاں و خصائل کے مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہوتی ہے اس لیے انکی دلچسپی اب تک برابر قائم ہے "

الغرض اس انسانی زندگی کے مطالعے کی دلچسپی نے ناول نویسی کی بنیاد ڈالی اور ہماری زبان میں انگریزی زبان کی تقلید کی گئی۔ غالبًا سرشار پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کی ایڈیٹری اختیار کر کے اپنا دلچسپ اور مشہور **فسانۂ آزاد** اخبار مذکور میں شائع کرنا شروع کیا اور اس کے بعد ناولوں کی بہتات حشرات الارض کی طرح ہو گئی۔

اردو فسانہ نویسی کے آسمان پر سرشار اور شرر دو درخشندہ ستارے نظر آتے ہیں جنکے سامنے چھوٹے موٹے ستارگان فلک ماند پڑ گئے ہیں اسلیے ہم نے اپنی کتاب میں انہی دو بزرگوں کا ذکر خیر کیا ہے اور باقی صاحبوں سے اغماض کیا ہے۔ اب ہم دونوں کی ناول نویسی کی نسبت ان چند خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو آخر الذکر صاحب مضمون نے تحریر کیے ہیں تاکہ ایک کو دوسرے سے تمیز کر سکیں۔

"فطرت انسانی کا علم جس قدر سرشار کے یہاں نمایاں ہے شرر کے یہاں اس کی مثال نہیں پائی جاتی۔ یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ شرر

اس سے بالکل محروم ہے یا سرشار کو اس علم کا کوئی غیر معمولی حصہ ملا ہے
دونوں میں بہت زیادہ فرق نہیں لیکن فرق ہے اور اس فرق کی وجہ سے
سرشار کا پلہ بھاری ہے۔

سرشار کی نگاہ گو بالعموم ظاہری نمائش و آرائش کی طرف رہتی ہے
اور عبارت آرائی اُس کا خاص شیوہ ہے تاہم اُس کی ذہانت سے زیر و تنگ
اس معراج پہ پہنچا دیتی ہے جو کبھی شرر کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کے اشخاص
فسانہ غیر معمولی آدمی ہیں اور یہیں شبہ ہے کہ آزاد اور خوجی جیسے آدمی
دنیا میں تلاش کیے سے بھی مشکل ملیں گے تاہم وہ آدمی ہیں۔ اُن کی رفتار
و گفتار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی رگوں میں انسانی خون دوڑ رہا ہے
اُن کے خیالات میں اگرچہ بہت عمق نہیں لیکن انسانیت کی بو ضرور آتی ہو
اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ سرشار کا ہر ایک کیرکٹر اپنی ذاتی خصوصیات
کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے شرر
کے سب ہیرو ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں اُن کے خیالات کی پرواز
ایک ہے۔ اُن کی رفتار و گفتار کا انداز ایک ہے۔ اگر کوئی اختلاف ہے
تو لباس کا۔ منصور کے جسم پہ افغانی لباس ہے، عزیز کے جسم پر ترکی
زیاد کے جسم پہ عربی لیکن اُن کی باہمی مشابہت اس قدر زیادہ ہے
کہ سب سگے بھائی معلوم ہوتے ہیں بلکہ کسی کے بھائیوں میں بھی اختلاف
ہوتا ہے یوں کہنا چاہیے کہ وہ مختلف سوانگ ہیں جنکے پردے میں
ایک ہی ایکٹر اپنا ہنر دکھاتا ہے بعض لوگ اس بیان سے چونکیں گے
کیونکہ شرر کے ناول بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف رنگ کے
ہیں اور اُن کو مختلف الالوان بنانے کے لیے انھوں نے اپنے وسیع علم کو

بدرجۂ غایت استعمال کیا ہے۔ لیکن اس اختلاف الوان سے کیا فائدہ جب کہ ہم ہر رنگ میں خود حضرت شرر کی ذات والاصفات کو موجود پاکر یہ شعر زبان پر لاتے ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

شرر میں یہ بڑا عیب ہے کہ وہ اپنی قوت مشاہدہ کو استعمال نہیں کرتے اور اپنے قصّوں کی ترتیب میں اپنی ذاتی آرائے و تعصبات کو جا و بیجا دخل دیتے ہیں۔ برخلاف اسکے سرشار نے اپنے کیرکٹروں کے پیچھے خود کو پورے طور پر چھپا لیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنی شخصیت کو بالکل محو کر دیا ہے

شرر کے سب قابل قدر ناول بلا استثنا تاریخی افسانے ہیں تاریخی افسانوں کے علاوہ جو ناول اُن کے قلم سے نکلے ہیں وہ کسی طرح اُن کی شہرت میں کچھ اضافہ نہیں کرتے۔ دلچسپ تو خیر غنیمت ہے لیکن دلکش میں سوائے اسکے کوئی خصوصیت نہیں کہ شاید کسی اصلی واقعہ کی بنا پر لکھا گیا ہے۔

بدر النسا کی مصیبت اور بیہودہ تلخ بدقسمتی سے شرر کی تصنیف ہیں اور شاید جسقدر نقصان اُن کو ان دو قصوں کی تصنیف سے پہنچا ہے اُسکی تلافی اُن کا مقبول سے مقبول ناول بھی نہیں کرسکتا۔ تاریخی ناولوں پر اصولاً یہی ایک اعتراض ہے وہ یہ کہ اُنکے ذریعے سے غلط خیالات عوام میں رائج ہو جاتے ہیں اور لوگ خلاف واقعہ امور کو تاریخی واقعات تصور کرنے لگتے ہیں۔ عوام کو گمراہ کرنیکا الزام اس قدر زبردست ہے کہ ضرورت دلچسپی کا عذر بھی اسکی تلافی نہیں کرسکتا۔

یہ تو قصہ ویر کا ایک رُخ ہے لیکن اگر دوسرے رخ پر نگاہ ڈالیے
تو شرر کو سرشار پر ایک خاص قسم کی فوقیت حاصل ہے کہ جسے کوئی
علم ادب کا نقاد نظر انداز نہیں کر سکتا۔ علم ادب کو اکثر فن تعمیر سے تشبیہ
دی گئی ہے کیونکہ جس طرح معمار ایک ایک اینٹ کو تراش کر موزوں موقع سے جماتا
ہے اور نہ صرف اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ عمارت کا ایک ایک
حصہ فرداً فرداً خوبصورت ہو بلکہ کل عمارت کو ایسے عمدہ اسلوب پر تمام
کرتا ہے کہ تیار شدہ عمارت بحیثیت مجموعی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے
اسی طرح مصنف ایک ایک لفظ کو جانچتا اور تولتا ہے۔ اور اسے عبارت
میں اس طرح جماتا ہے کہ مرغوب طبع ہو۔ علاوہ بریں وہ اس امر کا بھی
ساعی رہتا ہے کہ جب اسکی کتاب یا مضمون تکمیل کو پہنچے تو مکمل ہو کر پڑھنے
والوں کو اس میں کسی طرح کی کمی نہ معلوم ہو۔ بلکہ کسی پسندیدہ عمارت کی طرح
وہ تمام و کمال از سرتاپا بھلی معلوم ہو۔ اس فن کو علم تنقید کے بنانے والوں
نے بہت ارفع مرتبہ دیا ہے اور ہمیں اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے
بہت مسرت ہے کہ شرر نے بہت کچھ اس فن کا اکتساب کر لیا ہے۔ ان کے
پلاٹ بہت موزوں ہوتے ہیں اور قصہ کو اس طرح اول سے لیکر آخر تک
تمام کرتے ہیں کہ اس میں کوئی نقص محسوس نہیں ہوتا بلکہ ذوق سلیم کو پوری
طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا
پڑتا ہے کہ سرشار کی تصانیف میں اس فن کا وجود بالکل مفقود ہے اگر
فسانۂ آزاد جیسی معجونِ مرکب ہی کا نام افسانہ یا ناول ہے تو شاید
دنیا میں سرشار سے پہلے ان الفاظ کا مفہوم کسی بشر کی سمجھ میں نہیں
آیا تھا۔

اگر اسلوبِ تحریر کو مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی شرر
کو ایک خاص قسم کی فوقیت اسی طرح حاصل ہے۔ سرشار کا
اسلوب انوکھا ہے۔ لیکن اس کا انوکھا پن بناوٹ کی وجہ سے نہیں انکی
پُر مذاق طبیعت کا یہ رنگین طرزِ تحریر قدرتی چیز ہے۔ سرشار کا ایک ایک
فقرہ شوخی سے معمور ہے۔ لفظ لفظ سے ظرافت ٹپکتی ہے۔ ترکیبوں کی
رنگینی سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سفید روشنی کی شعاعیں کسی پہلو دار
شیشے میں سے گزر کر قوس قزح کی بہار دکھا رہی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس میں
ایک عیب بھی موجود ہے وہ یہ کہ قوس قزح کے رنگوں کی طرح انکا
اسلوب غیر معین ہے۔ الفاظ کوئی خاص معنی نہیں رکھتے۔ ان کی ندرت
و جدت توجہ کو اصلی مفہوم سے مستغنی کر دیتی ہے۔ برخلاف اس کے شرر
کا اسلوب صاف اور سنجیدہ ہے۔ اس کی ترکیبیں غور و فکر کا پتہ دیتی ہیں
اس کے الفاظ انتخاب کی شہادت دیتے ہیں اور سرشار کے اسلوب
کے برخلاف اس کی طرزِ تحریر علاوہ افسانہ و ناول کے علمی مضامین کے
لیے بھی موزوں ثابت ہو سکتی ہے لیکن سرشار کا اسلوب اپنی ایجاد ہے
شرر کی تحریر محنت کا نتیجہ ہے۔ سرشار کو نقل کرنا شفق و قوس قزح کے
رنگ اڑانے کی کوشش کرنا ہے لیکن شرر کے ناقلوں کی تعداد
روز افزوں ترقی پر ہے

سرشار اپنی جدت کی وجہ سے مستثنیٰ ہیں ان کا کوئی
اصلی و واقعی اثر اردو علم ادب پر نہیں پڑا۔ لیکن شرر کے طرزِ تحریر کی جماعت انکی
پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن افسانہ نویسی کی خار دار وادی
اور خطرناک گھاٹیوں میں وہ بجائے خضر کے چھوڑا وہ کام دیتا ہے اور

راہنمائی کے بدلے انھیں راہ راست سے بہت دور لیجاتا ہے۔ برخلاف اس کے شرر نے نومشق مصنفوں کے لیے ایک نہایت قابل قدر و معتبر نمونہ پیش کیا ہے۔ اُس کی تقلید انھیں اگر کامیابی کی اعلیٰ ترین چوٹی پر نہیں پہنچائے گی تو کم از کم ناکامی کے گڑھے میں بھی نہیں گرائیگی اہم اختلافات کے علاوہ ان دونوں میں ایک جزوی اختلاف بھی ہے وہ یہ کہ سرشار کا افسانہ ظرافت کی کان ہے شرر کے ناول ظرافت و مزاح کی چاشنی سے بالکل خالی ہیں۔ اور اس معاملہ میں بھی سرشار کو ترجیح و فوقیت کا پورا استحقاق ہے۔

اردو ناول نویسی کی عمارت ابھی کھڑی نہیں ہوئی۔ صرف بیرونی حصہ کچھ کچھ تعمیر ہوا ہے اور اس حصہ کے شرر اور سرشار بڑے رکن ہیں۔ تاہم ان ارکین کی عظمت و نفاست سے توقع کی جاتی ہے کہ عمارت ضرور دلکش و شاندار ہوگی۔[1]

پنڈت رتن ناتھ درسرشار لکھنوی

ولادت جب حضرت سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے تو محمد علی شاہ کا آخری عہد تھا۔ چونکہ آپ کی تاریخ وفات ۲۷ جنوری سنہ ۱۹۰۲ء ہے اور آپ کی عمر وقت رحلت پچپن یا چھپن برس کی تھی اس حساب سے آپ کی ولادت غالباً سنہ ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ آپ کی عمر چار برس کی تھی کہ آپ کے والد ماجد

---

[1] تیسرے دور کے مصنفین میں بجز حضرت سرشار کوئی صاحب اہل ہنود میں اس پایہ کے صاحب تصنیف و تالیف نہیں ہوئے جنکا ذکر خیر ان کے ہمعصروں کے

پنڈت بیجناتھ صاحب ور کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا اور آپ دامان مادری کے سایہ میں پرورش پاتے رہے۔

عالم طفلی

کہتے ہیں کہ بچپن ہی سے طبیعت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور طباعی اور ذہانت زبان کی طراری کے پردہ میں اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ جس مکان میں رہتے تھے اس کے پڑوس میں اہل اسلام کی مخدرات رہتی تھیں۔ حضرت سرشار نے لڑکپن ہی میں اردو انھیں شریف خاتونوں سے سیکھی اور انہیں کے فیضان تعلیم سے ان کو بیگمات کی طرز معاشرت سے بہت کچھ آگاہی کم سنی ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔ معمولی آدمی پر یہ صحبت کچھ اثر پیدا نہ کرتی لیکن آپ میں چونکہ ذہانت اور جودت کا خلقی مادہ موجود تھا لہذا انکے حق میں ایسی پاکیزہ صحبت کیمیا ہو گئی۔ جب فسانۂ آزاد لکھا تو لڑکپن کی تحقیقات کا یہ ذخیرہ دماغ میں موجود تھا۔ عربی فارسی کی تعلیم بھی قدیم دستور کے مطابق پائی تھی۔ جب زمانے نے اودھ کی سلطنت کا ورق الٹا اور انگریزی حکومت کی بنیاد پڑی تو انگریزی تعلیم کے لیے کیننگ کالج قائم ہوا۔ پنڈت رتن ناتھ صاحب بھی اس میں داخل ہوئے مگر کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے

بقیہ صفحۂ ماقبل ساتھ ساتھ کیا جاتا تاہم رائے بہادر لالہ بیجناتھ صاحب اس پایہ کے ضرور مستحق ہیں کہ ان کا ذکر حاشیۂ کتاب میں تحریر کیا جائے۔ پس ہم ذیل میں ان کی زندگی کے مختصر حالات درج کرتے ہیں۔

رائے بہادر لالہ بیجناتھ صاحب اگست سنہ ۱۸۵۳ء میں دلی کے ایک قدیم خاندان ویش میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار صراف تھے مگر ہمیشہ مریض رہتے تھے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں آئے دن مبتلا رہتے تھے۔ اگرچہ آپ کی والدہ آپ کو صرف ڈیڑھ برس ہی کا چھوڑ کر انتقال کر گئی تھیں لیکن آپ کے والد اور آپ کی دادی نے آپ کی پرورش

سلسلۂ معاشرت اور نئی تہذیب

جب آپ تمیز کو پہنچے تو کشمیری گیٹ کے ضلع اسکول میں مدرسی کا سلسلہ نکالا اور حصول معاش کا ڈھنگ ڈالا۔ اسی زمانہ میں ہندوستان میں نئے خیالات کا دریا طغیانی پر تھا۔ نظام معاشرت کے ہر صیغہ میں اصلاح کے مسائل درپیش تھے اردو زبان میں بھی اختراع و ایجاد کا جادو چل رہا تھا۔ ایسے رسالے اور اخبار جاری ہو رہے تھے جن میں پرانے ایشیائی تکلفات کو خیرباد کہکر واقعات نفس الامری پیش ہوتی تھیں۔

بقیہ صفحہ ماقبل

اور تعلیم و تربیت پر نہایت توجہ کی۔ چونکہ اس زمانہ میں انگریزی تعلیم کا رواج حال ہی میں ہوا تھا۔ اسلیے ہر قسم کی امداد گورنمنٹ کی طرف سے ہوتی تھی اور تعلیم بھی غور اور توجہ سے دی جاتی تھی پس آپ کو انگریزی اسکول میں داخل کردیا گیا آپ کی قدرتی ذہانت نے اپنا اثر بہت جلد دکھایا اور آپ اپنی جماعت میں شروع سے آخر تک اول رہے۔

انٹرنس کا امتحان اول درجہ میں پاس کرنے کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے اس زمانہ میں آپ کے ہم عصر لالہ مکھن چند صاحب ایم اے۔ تھے جنکی کتاب قانون ضابطہ دیوانی سے اور خاصکر قانون امر مجوزہ کی شرح سے ہر قانون داں واقف ہے اور یورپ، انگلستان اور امریکہ تک مشہور ہے۔ نیز لالہ سری رام صاحب ایم اے جو عرصہ دراز تک دیوان ریاست الور رہے۔ اور مسٹر مدن گوپال صاحب ایم اے جو اپنے زمانہ کے سربرآوردہ بیرسٹر تھے اور صوبہ پنجاب کی پہلی کونسل کے ممبر مقرر ہوئے تھے آپ کے ہم عمر طلباء میں سے تھے گو ہم جماعت نہ تھے۔

جسوقت آپ ایف۔ اے کلاس میں پڑھتے تھے۔ اسوقت عربی لینی پڑتی تھی فارسی کا رواج نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب عربی سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ اور آپ نے سنسکرت لینے کا ارادہ کیا۔ حالانکہ آپ ہندی یا سنسکرت کا اسوقت تک ایک حرف

ابتدائی مضامین اسی سلسلہ میں کشمیریوں میں بھی ایک ماہوار رسالہ موسومہ کشمیر کے نام سے شائع ہوتا تھا جس میں اصلاح اور

بقیہ صفحہ ماقبل نہیں جانتے تھے۔ آخر سنسکرت زبان میں تیاری کرکے ایف۔اے

کا امتحان دیا اور درجۂ اول میں پاس ہوئے۔ تمغہ اور وظیفہ بھی پایا ہمت مردان مدد خدا

اسی شوق میں بی۔اے بھی سنسکرت میں پاس کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان میں

اپنے صوبہ سے اول اور کل یونیورسٹی میں پانچویں نمبر پر درجۂ اول میں پاس ہوئے

تمغہ اور دو سو روپیہ کی کتابیں اور وظیفہ بطور انعام ملا۔ لیکن اس زمانہ میں آپ کے والد کا

بھی انتقال ہو گیا تھا۔ آپ ایم۔اے کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور فکر معاش دامنگیر ہو گئی

چنانچہ آپ نے کئی انگریزوں کو بھی اس زمانہ میں اردو پڑھائی۔ اس کے بعد

آپ رڑکی سے امتحان حساب پاس کرکے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں اکونٹنٹ

ہوئے مگر انگریز افسروں کے طریق عمل سے تنگ آکر مستعفی ہو گئے اور محکمہ تعلیم میں

ملازمت اختیار کی اسی سلسلہ میں آپ گورداسپور میں ۲ سال تک ہیڈ ماسٹر رہے

اس کے بعد سر سید کے علی گڑھ اسکول میں سیکنڈ ماسٹری کا عہدہ قبول کیا۔ آپ کی

تعلیم و تربیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سر سید نے آپ کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا لیا

آپ اکثر سر سید کے اخلاق، بلند خیالی اور دور اندیشی کی ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے۔

سر سید بھی آپ سے بہت خوش رہتے اور آپ پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔

آپ کو ہواخوری کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ اس زمانہ میں علی گڑھ میں جو ڈسٹرکٹ

جج تھے اُن سے ہواخوری کے موقع پر ملاقات ہو گئی۔ گو انھوں نے یہ رائے دی کہ

آپ محکمۂ ججی میں آجاویں۔ اگرچہ سر سید آپ کی خدمات کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن

جج صاحب سے بھی انکار نہ کر سکے۔ آخر کار آپ جج صاحب کے دفتر میں عرصہ تک

بطور مترجم کام کرتے رہے جج صاحب نے ترغیب دی کہ وہ قانون کی تیاری کرکے

فائدہ کے متعلق مضامین لکھے جاتے تھے۔ اسی زمانہ میں اودھ پنچ بھی اپنا رنگ جما رہا تھا حضرت سرشار کے دل میں انشا پردازی کا خداداد مذاق موجود تھا

بقیہ صفحہ ماقبل وکیل ہائی کورٹ کا امتحان دیں۔ چنانچہ آپنے چھ ماہ کی تیاری کے بعد امتحان دیا۔ اس امتحان میں گیارہ سو سے زائد اشخاص شامل تھے مگر آپ سب سے اول پاس ہوئے اور وکیل ہائیکورٹ کی سند حاصل کی۔ جج صاحب موصوف نے ہائی کورٹ اور گورنمنٹ میں سفارش کی اور آپ کی لیاقت کا اظہار کیا۔ تو حکام بالانے سنہ ۱۸۷۸ء میں منصفی کے عہدہ پر مامور کیا۔ اسوقت سے سنہ ۱۹۰۸ء تک اسی سلسلہ میں ممتاز رہے۔ اور ڈسٹرکٹ و سشن ججی کے عہدہ سے پنشن لی۔

سنہ ۱۸۸۶ء میں آپ کی خدمات ریاست اندور کے چیف جسٹس اور کونسل کے جوڈیشل سکرٹری کے عہدہ کے لیے گورنمنٹ سے مستعار لی گئیں۔ اندور میں جس خوش اسلوبی اور غیر جانبداری سے آپ نے کام کیا اسکی ہمیشہ تعریف ہوتی رہی تا یہاں کہ مہاراجہ صاحب نے سنہ ۱۹۰۳ء میں خود دوبارہ اپنی مشکلات آسان کرنے کے لیے یاد فرمایا لیکن گورنمنٹ نے خدمات مستعار دینا مناسب خیال نہیں کیا۔

سنہ ۱۸۸۷ء میں مہاراجہ صاحب اندور منجانب گورنمنٹ انگلشیہ ملکہ معظمہ کی جشن جوبلی میں مدعو ہوئے۔ اُسوقت حکم ہوا کہ چیف جسٹس صاحب ہمرکاب ہوں چنانچہ آپ مہاراجہ صاحب کی خدمت میں رہے اور فرانس اور انگلستان اور اسکاٹ لینڈ اور مصر وغیرہ ممالک کی سیر کی۔ یہ سیر معمولی سیاحوں کی طرح سے نہیں کی بلکہ ہر شئے کو ایک مبصر کی نگاہ سے دیکھا۔ آپ کا سفرنامہ انگلستان و ہندوستان (انگلینڈ اینڈ انڈیا) انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں شایع ہوا۔ اور بہت مقبول ہوا۔

پبلک کاموں میں حصہ لینے کا شوق شروع سے تھا۔ چنانچہ آپ اُن عمائد

لہذا مراسلۂ کشمیر، اودھ پنچ وغیرہ میں لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ اسوقت حضرت سرشار کے کمال کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور اُسکی شعاعیں دور دور تک

بقیہ صفحہ ماقبل ہیں سے تھے جو کانگریس کے پہلے اجلاس میں بمقام بمبئی مجتمع ہوئے تھے آپ کا نام رپورٹ میں درج ہے۔ کانگریس کے بانی مبانی مسٹر ہیوم آپ سے بڑی محبت کرتے تھے اور ہمیشہ نیک مشورہ سے ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ دادابھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ، راناڈے بڑے بڑے قوم پرستوں سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔

جب گورنمنٹ نے شمولیت کانگریس کی ممانعت کر دی تو آپ برابر سوشل کانفرنس میں شریک ہوتے رہے اور بالآخر آپ انڈین سوشل کانفرنس کے اجلاس اکتوبر ۱۸۹۹ء کے صدر بہ ایماء جسٹس راناڈے ہوئے۔ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۱۴ء تک آپ دیش کانفرنس کے جنرل سکرٹری رہے اور اسکو اپنی کوشش سے بہت کچھ فروغ دیا۔

آپ صنعت و حرفت کے مضامین سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ صوبہ متحدہ کی اوّل صنعتی کانفرنس کے صدر ۱۹۰۷ء میں منتخب ہوئے اور بہت سے مضامین انڈین انڈسٹرل کانفرنس میں پیش کرتے رہے۔ سودیشی کے آپ خاص حامیوں میں تھے۔ ۱۹۰۶ء-۱۹۰۷ء میں جبکہ گورنمنٹ سودیشی کے خلاف تشدد روا رکھتی تھی آپ نے نہایت بیباکانہ مضامین نامور اخباروں اور رسالوں میں سودیشی کی حمایت میں لکھے جنکی ملک نے بہت قدر اور تعریف کی۔

انگریزی، فارسی اور سنسکرت کے فلسفہ سے نہایت درجہ شغف تھا اور ہر زبان کے مستند مصنفین کی کتابیں آپ کے مطالعہ سے نکل چکی تھیں۔ ویدانت یعنی خیالات صوفیہ میں خاص مہارت تھی اور اس عنوان پر بڑے بڑے معنی خیز مضامین تحریر کیے

نہیں چھپی ہیں مگر اُس وقت کے مضامین پڑھنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں ایک خاص شوخی اور بے تکلفی ہے اور طرزِ تحریر میں عجب تازگی ہے

بقیہ صفحہ ماقبل جو اہلِ مشرق کی بین الاقوامی کانگریس میں پیش ہوئے اور اس جماعت کے آپ ممبر بھی منتخب کیے گئے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی ممبر بنانے کی تجویز پیش کی مگر کچھ شرائط میں اختلاف رہا اور آپ ممبر نہ ہوئے۔

آپ کو تالیف و تصنیف کا شوق کالج کی تعلیم ختم ہونے کے بعد ہی ہو گیا تھا اوّل اوّل جب پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی تو وہاں الیفرڈ پٹیالہ وظیفہ مستند کتب کے ترجمہ بزبان اردو و ہندی مقرر ہوا۔ چنانچہ ایک وظیفہ آپ کو بھی ملا۔ اور آپ نے فاؤلر صاحب کی کتاب منطق کا ترجمہ ہندی میں کیا۔ اسکے بعد ہندو دھرم شاستر پر ایک کتاب قانون حیثیہ اشخاص کی امداد کے لیے تحریر کی۔ بعد ازاں اردو میں ایک نہایت مکمل مضمون از نام **مسائل قانون** لکھا جو ملک میں بہت مرغوب ہوا اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ ایک کتاب عام اصلاح معاشرت اہلِ ہنود انگریزی اردو، ہندی میں تحریر کی جو مقبول عام ہوئی۔

ولایت کا سفرنامہ انگریزی اور اردو میں **انگلینڈ و انڈیا** لکھا جسکا ذکر پیشتر کیا جا چکا ہے۔ ہندوؤں کے مذہب کی کیفیت اور اصول کی بابت ایک کتاب **ہندوازم (اینشینٹ اینڈ موڈرن)** تصنیف کی جو ہندوستان اور یورپ و امریکہ میں بڑے بڑے عالموں نے پسند کی۔

آپ نے ہندوستان کی تاریخ پر ایک نئے نقطۂ نظر سے ایک کتاب موسوم بہ **ہندوستان گزشتہ و حال** تحریر فرمائی جس میں ہندوستان کی علمی اور صنعتی عظمت کو دکھلا کر موجودہ حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور آیندہ کی بہبودی کے لیے تجاویز پیش کی ہیں۔ آپ نے چند مذہبی کتابیں انگریزی اور ہندی میں تحریر کیں جو

جو دلوں کو مزا دے جاتی ہے۔ ہاں اتنا کہنا لازمی ہے کہ حضرت سرشار کی اس زمانہ کی نثر فسانۂ عجائب کی نثر کے پہلو بہ پہلو ہے۔ وجہ یہ کہ اُس

بقیہ صفحۂ ماقبل عوام اور گورنمنٹ میں مقبول ہوئیں رسالوں اور اخباروں میں متعدد اور مختلف مضامین لکھے جنکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

جن لوگوں کو آپ سے شرف ملاقات حاصل ہوا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ کسقدر صائب الرائے تھے اور آپ کی گفتگو سے آپ کی عمیق معلومات اور غور و فکر کا خود بخود اندازہ ہو جاتا تھا۔ آپ کا طریقۂ بود و باش نہایت سادہ تھا۔ ہر شخص آپ سے مل سکتا تھا کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی تصنیف کا شوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ عدالت کے وقت میں سے بھی ایک آدھ گھنٹہ روزانہ کسی نہ کسی کتاب کی تیاری کے لیے نکال لیتے تھے لیکن اس کے ساتھ عدالت کے کام میں کبھی کوئی ہرج نہیں آنے دیتے تھے۔

آپ پابند اوقات تھے۔ علی الصباح چار بجے اُٹھ کر اور ضروریات سے فارغ ہو کر یادِ خدا میں مصروف ہو جاتے تھے۔ آٹھ بجے کے قریب بلاناغہ ہوا خوری کے لیے جو تین چار میل سے کم نہوتی تھی چلے جایا کرتے تھے اور واپسی پر کچھ نہ کچھ مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ عدالت کے کام سے فارغ ہونے کے بعد کچھ آرام کرتے تھے اور پھر ہوا خوری کے لیے چلے جاتے تھے۔ بعد اذان رات کو سوتے وقت تک یادِ خدا میں مصروف رہتے تھے۔ حتی الامکان اس میں فرق نہیں آنے پاتا تھا اگرچہ آخر عمر میں آپ اکثر امراض میں مبتلا رہتے تھے۔

آپ کی ملاقات اپنے زمانہ کے قریب قریب ہر وائسرائے سے تھی اور کوئی لفٹنٹ گورنر صوبہ کا ایسا نہ تھا جس سے آپ کو خلوص کے ساتھ ملنے کا اتفاق نہ ہوا ہو لارڈ رپن سے خاص مراسم تھے ولایت اور ہندوستان میں جلیل القدر اصحاب سے آپ کی ملاقات تھی سب لوگ آپ کو بے لوث اور بالیاقت جانتے تھے۔

زمانہ میں مرزا رجب علی بیگ سرور کا سکہ لکھنؤ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نثر اُردو کے پیمبر سمجھے جاتے تھے۔ ہر مضمون نگار کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ انکی تقلید کرے۔ اس صورت میں اگر سرشار کی ابتدائی نثر میں سرور کی کیفیت پائی جائے تو جائے تعجب نہیں۔

فارسی کا اس زمانہ میں ایسا رواج تھا کہ پہلے وہ مضامین جو حضرت سرشار نے مراسلۂ کشمیر میں اشاعت کے لیے بھیجے، وہ فارسی زبان میں تھے۔ اسی زمانہ میں سررشتۂ تعلیم کی جانب سے ایک اخبار نکلتا تھا، اس میں اکثر علمی اور اخلاقی مضامین کے ترجمے شایع ہوا کرتے تھے۔ اس رنگ میں بھی حضرت سرشار نے اپنی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت دیا چنانچہ سررشتۂ تعلیم کے مہتمم اعلیٰ نے اپنی سالانہ روئداد محکمہ میں اس امر کا اعلان کیا کہ جیسا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ پنڈت رتن ناتھ کا ہوتا ہے ویسا کسی دوسرے شخص کا صوبہ میں نہیں ہوتا۔ غرضکہ حضرت سرشار کا مضمون نگاری کا شوق دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اودھ پنچ، مراسلۂ کشمیر، مرآۃ الہند، ریاض الاخبار آپ کے زورِ قلم سے فیضیاب ہوتے رہے۔

بقیہ صفحۂ ماقبل اُردو اور ہندی کا جو جھگڑا بعض بھولے انس پھیلا دیتے تھے اسکو آپ قطعی فضول سمجھتے تھے اور ہمیشہ اس امر کے شاکی رہتے تھے کہ ہمارے نوجوان صاف اور صحیح مادری زبان نہیں بول سکتے۔ اس بات کے ضرور خلاف تھے کہ ہماری زبان میں ثقیل اور سخت الفاظ استعمال کیے جائیں۔

آپ کی وفات ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۰ع میں بمقام آگرہ ہوئی۔ اور ہمارے درمیان سے ایک تجربہ کار سیاسی رہنما اور اُردو کا ایک ادیب اٹھ گیا اور ہمکو ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دیگیا

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
رویئے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجیے

سنہ ۱۸۷۸ء میں ایک علم طبعی کی کتاب کا اُردو میں انگریزی سے ترجمہ کیا
اس میں ابر و ہوا و برف وغیرہ کی ماہیت کا حال درج ہے۔ چونکہ اسکے ہر صفحے
میں تحقیقات علمی کا نور سمایا ہوا تھا ہوا تھا لہذا نام شمس الضحیٰ رکھا ایسے ادق
مضامین کا بیان جن کا نقشہ ادا کرنے کے لیے اُردو میں پورے الفاظ بھی موجود
نہیں نہایت عام فہم اور سلیس عبارت میں لکھا ہے۔ اس سال تقدیر نے حضرت
سرشار کی زندگی کے کارنامے میں ایسا ورق الٹا جس سے کہ آپ کا کمال
اہل ملک اور اہل قوم پہ آئینہ ہو گیا اور خود اس صاحب کمال کو قبول عام
کی سرکار سے نکتہ سنجی اور زباندانی کی سند ملی یعنی یہ وہ مبارک سال تھا جب کہ
منشی نولکشور نے حضرت سرشار کو اودھ اخبار کی ایڈیٹری کا قلمدان سپرد کیا
اس زمانہ میں اودھ اخبار کو جو عروج ہوا، اس کا زمانہ شاہد ہے حضرت
سرشار نے وقایع نگاری میں بھی اپنا رنگ جما لیا۔ پولٹیکل اور سوشل مضامین
میں بھی وہ نکتے اور باریکیاں پیدا کیں کہ دلوں کو تسخیر کر لیا لیکن ابھی حضرت
سرشار کی شہرت کے تاج میں سب سے اعلیٰ نگینہ نہیں جڑا گیا تھا یعنی فسانۂ آزاد
کی ابھی تک بنیاد نہیں پڑی تھی۔

جس صورت میں ہم آج فسانۂ آزاد کو دیکھتے ہیں اس طرح پر یہ شروع میں
شایع نہیں ہوا تھا۔ مصنف نے اسکے آغاز کے وقت اسکی ابتداء و انتہا کا خیال
نہ کیا تھا۔ اصل کیفیت فسانہ مذکور کی بنیاد پڑنے کی یوں ہے کہ جب سرشار
کشمیری سے لکھنؤ آئے تو یہاں شب و روز یاران دقیقہ رس و صحیح نفس کی صحبت
میں گزرتی تھی۔ اس صحبت میں جہاں ایک سے ایک طرار و حاضر جواب
موجود ہوتا تھا، وہاں منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ و پنڈت
تربھون ناتھ ہجر بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ جہاں ایسے ایسے زندہ دل

موجود ہوں وہاں کی کیفیت کا کیا کہنا۔

غم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یاروں میں

افسوس زمانہ نے اس مجموعہ صحبت کو پریشان کر دیا۔ اردو انشا پردازی کا نام لکھنؤ میں انھیں کی ذات سے زندہ تھا۔

یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ   یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

اس صحبت میں ایک روز پنڈت **تربھون ناتھ ہجر** نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھیے اور ممکن نہیں کہ ہیں مرتبہ نہ ہنسئے تو وہ ڈان کیک زاٹ (Don Quiksot) ہے اگر اردو میں اس طرز کا فسانہ لکھا جائے تو خوب ہو۔

حضرت **سرشار** کے دل پر اس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی کہ اردو میں ڈان کیک زاٹ کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ **اودھ اخبار** میں ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شائع ہونے لگے مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی محرم پر ایک مضمون نکل گیا، کبھی جہلم پر، کبھی عیش باغ کے میلے پر۔ اسوقت تک لوگوں کا خیال تھا کہ دس بیس مضامین نکل کر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور حضرت سرشار کا بھی شاید یہی منشا ہو گا۔ مگر لوگوں کو یہ سلسلہ مضامین ایسا بھایا کہ اُسکے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ مختلف مضامین کی کڑیوں کو گوندھ کر فسانہ کا سلسلہ نکالا

اصل داستان

ایسے مضامین میں جن کا تعلق ایک دوسرے سے بہت ہی کم تھا، سلسلہ پیدا کرنا آسان کام نہ تھا اور اصل تو یہ ہے کہ کامل سلسلہ پیدا نہ ہو سکا۔ اگر سلسلہ ہے تو اتنا ہے کہ اس افسانہ کے ہیرو میاں آزاد، خانہ برباد ہر فن میں طاق اور ہر کمال میں مشاق ہیں جتنے علوم

عقلی ونقلی ہیں اُن میں اُن کو مداخلت ہے۔ سپہ گری کے فنون میں بھی برق ہیں
شاعر بھی ہیں حسن میں اگر یوسف ثانی کہیے تو بجا ہے۔ صبح ہوئی اور یہ بوئے گل
کی طرح گھر سے نکلے اور دنیا بھر کی سیر پر کمر باندھی۔ کبھی لکھنؤ کا محرم دیکھنے چلے گئے
کبھی عیش باغ کے میلے پہنچے، کبھی کسی نواب کی دربارداری کی۔ غرضکہ جہانیاں
جہاں گشت آدمی ہیں۔ اِن کے لیے کسی خاص مشغلے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہر صبح میزند چو شفق جوش خون ما ۔۔۔ موقوف بر بہار نہ باشد جنون ما

اسی کوچہ گردی میں ایک روز اُن کی نگاہ ایک نا طورہ وُزاہر کش
ملک فریب سے لڑ گئی۔ ادھر سے پیغام وصال ہوا۔ بعد ہزار ناز و نیاز اس
پری پیکر نے جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون تھی، اس شرط پر ان سے
شادی کرنا منظور کی کہ یہ روم جائیں اور سلطان کی فوج میں شریک ہو کر روس
کے خلاف لڑیں۔ حضرت آزاد بھی اپنی دُھن کے پکے تھے۔ سیدھے روم پہنچے
اور وہاں سے سرخرو ہو کر اپنی محبوبہ کے پاس آئے اور خوشی خوشی بیاہ رچایا
اصل قصہ فسانۂ آزاد کا اسقدر ہے مگر مصنف کے زورِ قلم کا یہ عالم ہے کہ
پچیس سو صفحے اس مختصر مطلب کے ادا کرنے میں لکھ ڈالے اور داستان کی
دلچسپی میں فرق نہ آنے دیا۔ علاوہ "ڈان کیک ذاٹ" کے مختلف

قلم میں جادو

انگریزی افسانوں کے حالات اس کتاب میں درج ہیں
لیکن مصنف کے قلم میں وہ جادو ہے کہ ہر بیان کو اپنا
کر لیا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ فلاں داستان فسانہ آزاد کی فلاں
انگریزی ناول سے اخذ کی گئی ہے مگر ثابت نہیں کر سکتے۔ حضرت سرشار کی
یہ کیفیت تھی کہ چار آدمیوں میں بیٹھے باتیں کرتے جاتے ہیں اور وہی باتیں
افسانہ میں لکھتے جاتے ہیں مگر اس انداز سے کہ عبارت کی شوخی اور مضامین

کی ہمارگی میں سرمو فرق نہیں آتا۔ واللہ کیا زبان پائی تھی جو اس زبان سے نکل گیا، عالم کو بھایا اور تاثیر کا طلسم بن گیا۔ جس زمانہ میں یہ فسانہ اودھ اخبار میں نکل رہا تھا حضرت سرشار کا ہندوستان بھر میں طوطی بول رہا تھا ملک کے متعدد حصوں سے آپ کے پاس خطوط آتے تھے جن میں آپ کی اعلیٰ دماغی قابلیت اور زباندانی کی داد دہی مدنظر ہوتی تھی یہ خط معمولی لوگوں کے نہ ہوتے تھے بلکہ ایسے حضرات کے جن کی قابلیت و لیاقت ضرور قابل تحسین ہے۔ تمثیلاً ایک خط مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جناب پنڈت صاحب زاد فضائلکم۔ حضرت تسلیم۔ آپ نے فسانہ آزاد کیا لکھا ہے، زبان اردو کے حق میں مسیحائی کی ہے یاد رکھئے وہ بیچاری آج کل زباندانوں سے اس قدر روٹھی ہے، جیسے میاں خوجی کی قرولی سے ہیں۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ ہماری بیچاری پرانی مردہ زبان کے ایک آپ تو معین نکلے۔ الحمد للہ......... اور تو ہم سے کیا ہو سکتا ہے صرف قطعہ تاریخ آپ کے پاس بھیجتے ہیں۔ خود ملاحظہ فرما کر قسطنطنیہ میں میاں آزاد کے ملاحظہ میں ضرور بھیج دیجئے گا تاکہ وہ خود دیکھیں۔ نہیں صاحب آپ کا لکھا ہے تو تکلیف فرمائیے جب چھپے گا وہ خود ہی دیکھ لیں گے

راقم آثم خاکسار محمد عبدالحلیم شرر لکھنوی

قطعہ تاریخ

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ — کن کن محاوروں کا کیا ہے نباہ واہ

دیکھیں جو شوخیاں ترے خامہ کی [illegible] — بولے شفیق واہ، عدو بولے آہ آہ

کرتا شرر ہے مصرعہ تاریخ پیشکش — کیا بول چال لکھی رتن ناتھ واہ واہ

۱۲۹۸ھ

اودھ پنچ کی مخالفت

مگر فلک پیر کی تفرقہ اندازی دیکھیے کہ اسی اثنا میں اودھ پنچ جو شروع میں حضرت سرشار کے زور قلم سے فیضیاب ہوتا رہا تھا، آپ کے خلاف ہو گیا۔ فسانۂ آزاد پر جابجا اعتراضات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ پھر تو ہیں ظرافت کے نہنگ بحر آشام نے بھی کروٹ لی اور ایسے ایسے دندان شکن جواب دیے کہ معترضین کے منہ پھر گئے اس تنازعے نے یہاں تک طول کھینچا کہ منشی سجاد حسین صاحب اور حضرت سرشار سے صاحب سلامت ترک ہو گئی۔ مگر چونکہ دونوں کا آئینۂ دل زنگ کدورت سے صاف تھا اور دونوں پرانے یار تھے لہٰذا پھر باہم صفائی ہو گئی، اور اگلی سی محبت قائم ہو گئی۔ چنانچہ سرشار کا آخری مضمون جو انھوں نے مرنے کے دن لکھا تھا اودھ پنچ ہی کے لیے تحریر کیا تھا اور اسی میں شایع ہوا تھا۔

یہ فسانہ اودھ اخبار کے ضمیمے کے طور پر دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک برابر شایع ہوتا رہا۔ بعد ازیں سنہ ۱۸۸۰ء میں کتاب کی شکل میں شایع کیا گیا۔ قدر دانان سخن شوق کا دامن پھیلائے پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ شایع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ لفظوں کی نئی تراش، ترکیبوں کی خوبصورتی، کلام کی گرمی، مضامین کی شوخی، طرز تحریر کی نزاکت، جواب و سوال کی نوک جھوک، زبان کی پاکیزگی، محاورے کی صفائی، روزمرہ کی لطافت، ظرافت کی گلکاری، تراشوں کی نئی پھبن، ایجادوں کے بانکپن نے لوگوں کو حضرت سرشار کا دالہ و شیدا بنا دیا۔ اردو میں ایسے افسانہ کا شایع ہونا بالکل ایک نئی بات تھی۔

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ محض قصہ سمجھ کر

فسانۂ آزاد کی وقعت کا اندازہ کرنا سرا سر نافہمی ہے۔ فسانہ کی دلچسپی کا انحصار اسکی داستان کے مسلسل ہونے پر نہیں ہے۔ حضرت سرشار نے اس میں لکھنؤ کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اس مرحوم شہر کے باشندوں کا طرزِ معاشرت اس کی گزشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل میں دردِ محبت پیدا کرتا ہے۔ البتہ نگاہ عبرت درکار ہے یہاں کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ کبھی امیروں اور شہزادوں کی آنکھ کا سرمہ تھی۔ یہاں کے عالیشان مگر شکستہ عمارتوں کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار زمانہ کے نشیب و فراز کی تصویریں ہیں۔

ہر کجا خشت کہن بینی دریں ویرانہ — ہست فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانہ

اگرچہ یہاں کے شرفا فلاک زدہ ہیں اور زمانہ نے ان کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا مگر اُن میں ابھی بڑے ریاست پائی جاتی ہے وہ ایک وضع کے پابند ہیں جس کو وہ آئینِ شرافت سمجھتے ہیں اور ایک خاص تہذیب کی یادگار ہیں۔

اُن کی تقریر و گفتگو شستگی و پاکیزگی کی معیار ہے اُن کی نشست و برخاست کا طریقہ سلیقہ و امتیاز کا دستور العمل ہے۔ باوجود ہزاروں عیوب کے یہاں کے باشندوں کے طرزِ معاشرت میں اب بھی ایک لطافت ہے زبان کی شستگی، علو ہمتی، جوہر شناسی، ادب و سلیقہ، حسنِ تقریر تو گویا اُن کی گھٹی میں پڑی ہے۔

سرشار نے جو شاعر کا دماغ اور مصور کی آنکھ اپنے ساتھ لایا تھا فسانۂ آزاد میں اس تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ مگر اس تہذیب کا صرف

خوشنما پہلو ہی نہیں دکھایا ہے بلکہ اُسکے عیوب بھی جو اُسکے جوہروں کو چھپائے ہوئے ہیں اور جو ہر تہذیب کے زوال کا پیش خیمہ ہوتے ہیں ظرافت کے پیرایہ میں بیان کیے ہیں خصوصاً محلات کے طرزِ معاشرت اور بول چال کا وہ رنگ دکھایا ہے کہ بایدو شاید۔ بیگمات کی نستعلیق چال ڈھال اور شستہ و پاکیزہ تقریر کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

محلات کا طرزِ معاشرت اُلّھڑ اور کمسن لڑکیوں کی شوخی اور طرّاری کا عالم دل پہ بجلی گراتا ہے۔ ہر ایک بادۂ جوانی سے سرشار ہے۔ رگ رگ میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ایک ایک بات سے ہزار ہزار رنگینیاں پیدا ہیں۔ قدم قدم پر ناز و انداز قربان ہوتے ہیں مگر ایسی حیا پرور کہ فرشتے اُن کے دامن پہ نماز پڑھیں۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو ۔۔۔ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

پُرانی جہاندیدہ بڑھیوں کی محبت آمیز بدگمانی اپنے رنگ میں لطف دیجاتی ہے۔ اُن کی زبان سے جو نصیحت آمیز کلمے نکلتے ہیں وہ ادب اور سلیقہ سے معمور ہوتے ہیں۔ مامائیں، مغلانیاں ہیں کہ ہوا سے لڑتی ہیں ضلع جگت میں طاق ہیں۔ زبان تڑاق پڑاق چلتی ہے رستے چلتے لوگوں پہ پھبتیاں کہتی ہیں۔ نواب صاحب اپنے رنگ میں مست ہیں عجب انداز سے شام کو چوک کی سیر کو نکلتے ہیں۔ گلے میں منت کے طوق پڑے ہیں بازو پر امام ضامن کا روپیہ بندھا ہے۔ تین گھر توئی کا انگرکھا زیب بدن ہے۔ کمر کا دم و جود برابر ہے۔ چوڑی دار پائجامہ پنڈلیوں سے چپکا ہوا ہے نگے دار ٹوپی البیلن سے ٹکی ہوئی ہے۔ پانچ چار اٹھونی مصاحب ساتھ ہیں۔ خدمتگار کے ہاتھ میں خاصدان ہے اور بغل میں بٹیروں کی کابک

دبی ہوئی ہے۔ غرضکہ اس صورت میں اس نگار بند معانی پر مختلف نقشے مانی و بہزاد کے قلم سے کھینچے ہیں اور ہر جا نظر افروز ایسی کمال کاری کی ہے کہ جس طرح اتنی بڑی داستان لکھنے میں مصنف کا قلم نہیں تھکتا ویسے ہی پڑھنے والا بھی نہیں تھکتا۔ جہاں خوبی کی قوّالی میاں سے نکلی کہ پڑھنے والے کی باچھیں کھل گئیں ہر دو چٹکے اور لوا زعفران کے معرکے خندے سنتے لٹا دیتی ہیں۔

موجد طرز نو اردو میں حضرت سرشار اس طرز نو کے موجد ہیں اور ان کا یہ مصرع کہ

ہر مرغ کہ پر زد بہ تماشائے پری
اوّل بہ شگون کرد طواف حرم ما

نہایت درست ہے۔ پرانے زمانے کے فسانوں میں یہی فسانہ پایۂ عالی رکھتا ہے۔ زندگی کے کل مراحل روحانی قوتوں کی مدد سے طے کیے جاتے ہیں۔ ان میں انسانی جذبات اور دانش و بینش کی وہ تصویریں نہیں پائی جاتیں جو کہ فسانۂ آزاد کی رونق اور زینت ہے۔

پرانے افسانوں میں قریب قریب ہر داستان اسی طرح پر ہوتی ہے کہ طوطا بولا اے شہزادۂ والا تبار فلاں ملک میں جو یہاں سے اسی کروڑ کوس فاصلہ پر ہے ایک شہزادی ہے جس کا حسن دیکھا نہ سنا ضیائے رخ کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں رات ہوتی ہی نہیں۔ یہ سننا تھا کہ شہزادے صاحب کو اس سے شادی کرنے کا شوق چرایا۔ اب اندھا دھند نکل کھڑے ہوئے کہیں صحرائے طلسم میں اسیر ہوئے کہیں دیووں سے مڈبھیڑ ہوئی کہیں رات کو پریاں فرش خواب سے اٹھا لے گئیں، کہیں حضرت خضر سے ملاقات ہو گئی۔ غرضکہ اس انداز پر کل داستان کی داستان پوچ و پادر ہوا خیالات کا ذخیرہ ہوا کرتی ہے۔ فسانۂ آزاد کے بعد یہ طرز بالکل متروک ہو گیا

اس کے انداز تحریر نے ایک نیا رستہ پیدا کر دیا جس نے کہ پرانی وضع کی فسانہ نگاری کی وقعت کھو دی۔

فسانۂ آزاد کے عیوب (۱) سلسلہ نا مکمل — اس موقع پر اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ فسانۂ آزاد میں باوجود اتنی خوبیوں کے اکثر عیوب بھی موجود ہیں جو قدردانوں کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں اور جن کی وجہ سے فسانۂ مذکور کی اشاعت کے وقت معترضین کو حرف گیری کا موقع ملا۔ اوّلاً جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے فسانۂ آزاد میں وہ سلسلہ یا انتظام نہیں ہے جو عموماً ناولوں کی شان میں داخل سمجھا جاتا ہے مثلاً ثریا بیگم کی داستان بجائے خود ایک چھوٹا سا فسانہ ہے جس کا تعلق کل قصہ سے ایسا کامل نہیں جیسا کہ لازمی ہے۔ اسی طرح اکثر مقامات پر کالمانے مضامین کے انبار لگے ہوئے ہیں جن سے اہل تماشا کا دماغ معطر ہے لیکن ان پھولوں میں کوئی ایسا رشتہ نہیں جس سے ایک ہار گوندھا جائے۔

(۲) آزاد کا چال چلن — علاوہ بریں میاں آزاد کا چال چلن متضاد صفات سے مملو ہے۔ شروع میں یہ شخص ایک آوارہ مزاج اور بد باش آدمی تھا۔ پنج عیب شرعی اس میں موجود تھے لیکن یکایک ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ تہذیب و شائستگی رگ رگ میں سما گئی۔ ایسے وارفتہ مزاج شخص کا بلا وجہ اس قدر مہذب ہو جانا خلاف قانون فطرت ہے۔

(۳) حسن آرا کا طرز معاشرت — حسن آرا کا بھی یہی حال ہے یعنی مسلمانوں میں خلاف فطرت انسانی ابھی دو صدی تک ایسی آزادی یا پستہ عورتیں نہیں پیدا ہو سکتی۔ نیز یہ عقدہ نہیں کھلتا کہ حسن آرا کے خیالات کیونکر ایسے قدر عالی ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ خیالات پر صحبت کا اثر پڑتا ہے یا تعلیم کا حسن آرا کے

کی صحبت ہمیشہ پرانے خیالات کی بیگمات سے رہی ہے اور تعلیم فارسی پائی ہے
اس صورت میں مغربی تہذیب کا رنگ اس خاتون کے خیالات پر کیونکر
چڑھا۔ غرضکہ حسن آرا کی چال ڈھال کا انداز جیسا کہ اس فسانہ میں دکھایا گیا
ہے خلاف فطرت انسانی ہے۔

(۴) خوجی کی یکرنگی۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ باتیں ایسی
نہیں ہیں جن سے فسانۂ آزاد ناول کے لقب کا مستحق نہ سمجھا جائے۔ خوجی جو فسانہ
کی جان ہے ہر مقام پر اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جس طرح آزاد کو ہر وقت
حسن آرا کا خیال رہتا ہے اسی طرح اس کو افیون کا عشق ہے۔ روم ہو کہ
ہندوستان اس کی قرولی ہر وقت میان سے باہر ہے۔ کتنی ہی مرمت کیوں
نہ ہو مگر اس کے تیور میلے نہیں ہوتے کیسی ہی مصیبت کیوں نہ ہو لیکن زندہ دلی
اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی آزاد کتنا ہی ستائیں مگر وہ ان پر جان نثار کرنے
کو تیار ہے۔ خوجی کی چال ڈھال شروع سے آخر تک ایک سے سانچے میں ڈھلی
ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمایوں فر، سپہر آرا، بڑی بیگم، اللہ رکھی
وغیرہ فطرت انسانی کی سچی تصویریں ہیں۔ اس کے علاوہ فسانۂ آزاد میں ناول
کے اور قرائن بھی موجود ہیں۔ جذبات دلی، کیفیات قلبی، شادی و غم، عشق،
شجاعت، جلوہ ہائے قدرت، صبح و شام، سیر باغ و دریا جس کیفیت کو بیان کیا
ہے تصویر کھینچ دی ہے۔

(۵) اکثر نامناسب واقعات میں خلل۔ فسانۂ آزاد میں یہ بھی خفیف سا عیب ہے کہ مصنف
اکثر مقامات پر مناسب واقعات نہ سمجھ سکا۔ مثلاً ایک روز کا ذکر یوں لکھا ہے
کہ حسن آرا نے میاں آزاد کے علم و فضل کا امتحان لیا اور فرمائش کی کہ ایک
بوڑھے کی شادی ہوئی ہے اس شادی کی تاریخ کہو۔ میاں آزاد نے کہا

"پیرنا بالغ" پیرنا بالغ سے ۱۲۹۶ھ ہجری تاریخ نکلتی ہے۔ روم کی لڑائی ۱۲۹۶ھ ہجری کے دو تین برس پہلے ہوئی مگر میاں آزاد اس تاریخ کے نکلنے کے بعد روم کی لڑائی میں شریک ہونے کے لیے گئے لہذا تاریخ غلط ہو گئی اور واقعات میں تناسب قائم نہ رہ سکا۔

اسی طرح ایک مقام پر حضرت سرشار خدا جانے کس ترنگ میں لکھ گئے ہیں کہ "بام پر بیش بہا شال کا خیمہ نصب ہوا" اب معترض سوال کرتا ہے کہ میخ کہاں ٹھونکی گئی چھت تو اس کام کی نہیں ہوتی۔ اس موقع پر ہم کو بھی لاجواب ہونا پڑتا ہے۔

ایک مقام پر مصر کا اٹاچی خوجی سے کہتا ہے کہ "کرسی کے احمق ہو" یہ خاص لکھنؤ کا محاورہ ہے، مصر کے اٹاچی کو اسکی کیا خبر۔ اس قسم کی لغزشیں فسانہ آزاد میں اکثر جگہ پائی جاتی ہیں گو تعداد میں بہت کم ہیں مگر چونکہ یہ فسانہ نہایت عجلت اور لاپروائی کے ساتھ لکھا گیا تھا لہذا ایسی لغزشیں قابل معافی ہیں

(۶) غلط محاورے | اکثر محاورے بھی فسانہ آزاد میں ایسے پائے جاتے ہیں جو قابلِ اعتراض ہیں۔ حضرت سرشار فسانہ آزاد میں لکھتے ہیں "طبیعت بے مزہ ہے ذرہی جانے کیا سبب" اس پر یہ اعتراض ہے کہ بے مزہ کھانا ہوتا ہے طبیعت بدمزہ ہوتی ہے۔ ایک مقام پر لکھا ہے "دائیں طرف" اصل محاورہ ہے "داہنی طرف" ایک اور جگہ تحریر ہے کہ "کئی بار پاٹی پر سر دے مارا" پاٹی لفظ غلط ہے "پٹی" درست ہے۔ "پھر غم مفارقت میں دل پھٹا جاتا ہے۔ کلیجہ منھ کو آتا تھا" اس جگہ یہ محاورہ بالکل غلط ہے۔ "دل پھٹ جانا" قطع امید ہو جانے یا بیزار ہونے کی جگہ آتا ہے۔ نہ کہ عاشق کا معشوق سے دل پھٹ جائے۔ "وہ تو عین دوپہر کے وقت جب چیل انڈے پر انڈا چھوڑتی ہے الخ" یہ محاورہ بھی غلط ہے اصل محاورہ

صرف اتنا ہے کہ ایسی گرمی پڑتی ہے کہ چیل انڈا چھوڑتی ہے" مراد یہ ہے کہ چیل کسی حالت میں انڈوں سے جدا نہیں ہوتی مگر ایسی گرمی پڑتی ہے کہ وہ بھی اپنے انڈوں سے الگ ہو جاتی ہے یعنی سینا ترک کر دیتی ہے اس محاورہ سے صرف گرمی کا مبالغہ مدنظر ہے۔ حضرت سرشار شاید انڈا چھوڑنے سے انڈا دینے سے مراد سمجھے۔

اس قسم کی لغزشیں دیگر مقامات پر بھی پائی جاتی ہیں مگر ایسی لغزشوں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت سرشار زباندان نہ تھے سراسر ناانصافی ہے۔ ایسی لغزشوں کی ہستی اتنی بڑی کتاب میں ایسی ہے ع جیسے کہ کسی قلزم ذخار میں خاشاک۔ اور کون ایسا مصنف ہے جسکی تصنیفات بالکل عیب سے پاک ہیں

(۷) بھرتی کے مضامین فسانہ آزاد میں اکثر بھرتی کے مضامین بھی ہیں۔ مثلاً تہیا سوفی کے وعظ یا اخلاقی پند و نصائح کے متعلق تقریریں محض خانہ پری کے لیے درج ہیں۔ خلاق عالم نے حضرت سرشار کو کسی سنجیدہ کام کے انجام دینے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا تھا۔ صرف ہنسنے ہنسانے کے لیے دنیا میں آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں پند و نصائح کا دفتر کھولا ہے فسانہ کا رنگ پھیکا ہو گیا ہے۔

مگر باوجود ان عیوب کے جنکا ذکر سلسلہ وار کیا گیا ہے۔ فسانہ آزاد بحیثیت مجموعی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اسکے جوہر اسکے عیبوں کو چھپائے ہوئے ہیں تحقیقات جدید سے ثابت ہوا ہے کہ آفتاب میں بھی داغ سیاہ موجود ہیں لیکن جس طرح یہ سیاہ دھبے آفتاب کی ضیاء نہیں گھٹا سکتے اسی طرح حضرت سرشار کی طبع نورانی باوجود اکثر خفیف عیوب کے قدردانان سخن کی آنکھوں کو ہمیشہ نور بخشتی رہیگی۔ یہ حضرت سرشار کو فخر حاصل ہے کہ پرانے شیشوں میں

اچھوتی ترکیبوں اور نئے نئے خیالات کی بادہ فرحت انگیز اس خوبصورتی سے بھری ہے کہ پرانے اور نئے رنگ کی طبیعتوں کو یکساں کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

سرشار کی طرزِ تحریر پر عام رائے

حضرت سرشار صرف فسانہ نگاری ہی کے موجد نہ تھے بلکہ اردو کے سب فسانہ نگاروں میں ان کا پایہ عالی تر ہے۔ آج کس کا منہ ہے جو دو صفحے ان کے رنگ میں لکھ سکے۔ ہندوستان میں آج جس قدر ناول نویس موجود ہیں شاید بارش کے موسم میں اس قدر حشرات الارض بھی نہ پائے جاتے ہوں گے لیکن سرشار میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے ع چراغِ مردہ کجا شمع آفتاب کجا جو باتیں یہ لوگ نہایت غور و فکر کے بعد پیدا کرتے ہیں وہ اُنکے لیے پیش پا افتادہ تھیں۔ اگر ان کے صفحوں کے صفحوں میں کہیں ایک آدھ فقرہ شوخ ہے تو وہ راکھ کے ڈھیر میں چنگاری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ان کو دیکھو ہزاروں صفحے لکھ ڈالے مگر پھر بھی کلام کی گرمی میں فرق نہ آیا۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ کبھی اُنھوں نے اپنے لکھے ہوئے مسودہ کی نظر ثانی نہیں کی۔ جس زمانہ میں فسانہ آزاد اودھ اخبار میں شایع ہو رہا تھا۔ یہ لوگوں کے چشم دید واقعات ہیں کہ اخبار شایع ہونے کو ہے اور کاتب پنڈت جی کو ڈھونڈھ رہا ہے کہ فسانہ کا مقررہ حصہ لکھ دیں تاکہ اُسی روز نکل جائے۔ پنڈت جی آئے اور نہایت بے تکلفی سے چار صفحے کھینچکر پھینکدیے اور کہا کہ آج کے پرچے میں بھیجدو۔ دیکھنے والے سمجھے کہ اس عجلت میں کیا لکھا ہوگا مگر نگاہ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ موتی پروئے ہیں۔

ہمایوں فر کا قتل ہونا

فسانہ آزاد کا ذکر ختم کرنے سے پیشتر ہمایوں فر کے قتل کا اہم واقعہ بیان کرنا جس سے فسانہ آزاد کی بقیہ داستان غیر معمولی طور پر کم دلچسپ ہو جاتی ہے ضروری ہے

کیونکہ سنا جاتا ہے۔ (دروغ برگردن راوی) کہ منشی نولکشور صاحب نے پنڈت جی سے جو معاوضہ کا معاہدہ فسانہ آزاد کی نسبت کیا تھا، فسانہ کی ہردلعزیزی اور کثیر منافع کو دیکھکر اسکے ایفا میں کوتاہی کی اور پنڈت جی نے اپنی محنت کے معاوضہ کی کمی کا بدلہ اس طرح لیا کہ یکایک ہمایوں فر کو قتل کرادیا جسکا یہ نتیجہ ہوا کہ اودھ اخبار کو لوگوں نے بند کردیا اور ان کو ہمایوں فر کی موت ایسی شاق گزری کہ فسانہ آزاد کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا منشی نولکشور صاحب نے یہ رنگ دیکھا تو پنڈت جی کے قرارداد کو پورا کیا اور انھوں نے بمشکل تمام فسانہ کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی۔ اور ہمایوں فر کو زندہ کیا اگرچہ مردہ کبھی زندہ نہیں ہوسکتا لیکن اپنی سحر نگاری سے مردہ میں جان ڈالدی۔

فسانۂ آزاد کے علاوہ اور ناول حضرت سرشار نے علاوہ فسانۂ آزاد کے بہت سے ناول لکھے۔ اور کئی انگریزی ناولوں کے ترجمے بھی کیے۔ ان تصنیفات میں سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، زیادہ تر مشہور ہیں۔ سیر کہسار میں ادنیٰ درجہ کی مسلمان سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے۔ عبارت شوخ اور رنگین ہے۔ مگر فسانۂ آزاد کے مقابلہ میں سست ہے۔ کامنی کی کیفیت پیشتر ہی تحریر ہوچکی ہے۔ جام سرشار بھی فسانہ آزاد کی کیفیت سے خالی ہے خدائی فوجدار "ڈان کیک ذاٹ" کا ترجمہ ہے۔ اس کا رنگ ان کی تصنیفات میں بہت پھیکا ہے۔ لکھنؤ سے حیدرآباد جانے کے قبل چھوٹے چھوٹے ناولوں کا ایک سلسلہ "خمکدۂ سرشار" کے نام سے جاری کیا تھا۔ ہشو، کڑم دھم، بچھڑی ہوئی دلھن، طوفان بے تمیزی وغیرہ اسی سلسلہ میں تصنیف ہوے

مگر ان ناولوں کو دیکھ کر اسیر مبرور کا شعر یاد آتا ہے۔

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس   عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

واقعی یہ ناول اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ ایک زبردست مصنف کا کمال کسقدر زوال پذیر ہو سکتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ حضرت سرشار اس خمکدہ کی طرف رجوع ہی نہ ہوتے۔ مگر وہ تو اپنے قابو ہی میں نہ تھے۔ اس خمکدہ کا سلسلہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کا حال حضرت سرشار نے خود کشمیر پرکاش بابتہ مارچ ۱۹۰۵ء میں یوں تحریر فرمایا ہے:-

حیدرآباد کا سفر

چار برس کا زمانہ ہوا کہ میں کانگریس کا ممبر ہو کر مدراس گیا تھا۔ وہاں سے بخت رسا حیدرآباد دکن لایا۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان امرا اور پبلک نے میری بڑی خاطر کی۔۔۔۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر فوج آصفی نے جو وزیر اور مدارالمہام بھی رہ چکے ہیں مجھے بلوایا اور دو سو کا نوکر رکھ لیا اور شعر و سخن نثر کی اصلاح لینے لگے۔ اور کسی کلام پر خوش ہوتے تو فوراً ایک اشرفی انعام۔ خلعت اور جوڑے سال میں تین چار بار عطا ہوتے ہیں .... حضور نظام مجھے پہلے سے جانتے تھے، جس روز اول بار میں نے نذر پیش کی اور کتابیں بھی بطریق نذر پیش کیں تو حضور نے یہ شرف بخشا کہ ایک گھنٹہ کامل تک ناول "سیر کہسار" کی عین دربار دُربار میں سیر کی۔ جام سرشار کا ایک سین ملاحظہ فرما کر اپنے سینیر اے ڈی کانگ نواب محبوب یار جنگ بہادر سے فرمایا کہ "یہ دلچسپ ناول میں پڑھ چکا ہوں، میری لائبریری میں موجود ہے" میں نے ولادت شاہزادہ عالی تبار کی تاریخ اسی وقت بذریعہ نواب سرفراز جنگ پیش کی۔ مادہ تاریخ حضور پُرنور نے بہت پسند فرمایا۔ میرا نام معزز

درباریوں میں لکھ لیا گیا۔ اب میرے منصب کی کوشش ہو رہی ہے۔
نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ انشاء اللہ تعالیٰ .... خدا نے چاہا تو پندرہ
روز کے اندر میرا نو تصنیف ناول گورِ غریباں شائع ہوگا۔"

حیدرآباد سے حضرت سرشار نے ایک رسالہ موسوم بہ دبدبۂ آصفی نکالا تھا۔ ابتدا میں اس میں اچھے اچھے مضامین شایع ہوتے رہے۔ خود بھی اکثر لکھتے تھے مگر طرزِ تحریر میں وہ اگلی سی آب وتاب نہیں رہی تھی گورِ غریباں ناول خدا معلوم شایع ہوا یا نہیں "دبدبۂ آصفی" میں ایک ناول موسوم بہ "چنچل نار" سلسلہ وار شایع ہوتا تھا۔ وہ بھی ناتمام رہا اور اچھا ہوا کہ ناتمام رہا۔

شاعری حضرت سرشار شاعری میں منشی مظفر علی صاحب آسیر کے شاگرد تھے۔ اپنے استاد کو نہایت محبت کے ساتھ یاد کرتے تھے کہتے تھے کہ منشی اسیر خالی استاد نہیں تھے بلکہ اُستاد گر تھے۔ شاگردوں کو استاد بنا گئے۔ حضرت سرشار کا کلام عاشقانہ اور رندانہ طرز کا ہوتا تھا مگر طبیعت کی شوخی اور زبان کی پاکیزگی عجب عالم دکھاتی تھی۔ اکثر مضمون آفرینی کی طرف جھک پڑتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک مرتبہ مشاعرہ میں ایسا شعر پڑھا کہ مشاعرہ الٹ گیا ؎

حال سب میری سخت جانی کا	باڑھ کہتی ہے مڑ کے خنجر سے

واقعی کیا نازک خیالی اور باریک بینی کی داد دی ہے ایک اور شعر ان کا انھیں کے حسبِ حال یاد آگیا۔

پینے پہ جب آتے ہیں تو پھر بس نہیں کرتے	میخانہ میں سُنتے نہیں سرشار کسی کی

ایک غزل کا مطلع ہے ؎

سیاہ بخت و تیرہ روزگار ہم بھی ہیں | جوابِ زلفِ پریشان یار ہم بھی ہیں

۱۹۲۹ء میں جو کشمیری کانفرنس ہوئی تھی اس میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جس کا یہ مطلع ہے ؎

پھلیں گے پھولیں گے گلزارِ قوم کے اشجار | اٹھا ہمالیہ پربت سے ابرِ گوہر بار

فارسی بھی کہتے تھے مگر بہت کم۔

عادات و اطوار غرضکہ عجیب بذلہ سنج، حاضر جواب، ظریف اور خندہ جبیں تھے بات بات میں نکتے اور ہر نکتے میں ہزار رنگینیاں پیدا کرتے تھے۔ ہمیشہ ہنستے بولتے رہتے تھے۔ چہرہ پر مسکراہٹ نور برساتی تھی جس صحبت میں بیٹھ گئے معلوم ہوتا تھا کہ بلبلِ ہزار داستان چہک رہا ہے۔ زندگی بھر کبھی غم و غصہ اور رنج پاس نہ آنے پایا۔ تمام عمر بیباکانہ اور آزادانہ حالت میں کاٹ دی۔ طبیعت کبھی غور و فکر کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ وہ اپنی طبیعت کو خوب پہچانتے تھے چنانچہ کشمیری سوشل کانفرنس میں جو قصیدہ پڑھا۔ اس میں تعلی کے اشعار کے زمرہ میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

زباں وہ پائی کہ لے نطق سیکڑوں لوسے | طبیعت ایسی ملی شوخ جیسے چنچل نار

آزادی واقعی سرشار کی طبیعت ایک چنچل نار ہے جس کی ہر ادا میں شوخی اور ہر انداز میں بانکپن ہے جب یہ شوخی اور بانکپن درجہ اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں تو دیکھنے والے شرما جاتے ہیں مگر وہ خود نہیں شرماتے۔ اس آزادی اور بیباکی کی وجہ سے کبھی شہرت یا جاہ و ثروت کی آرزو دل میں نہ آنے پائی۔ گو زمانہ سے کمال کی سند مل گئی تھی مگر بے نیاز طبیعت نے کسی امیر یا رئیس کے در کی طرف رخ نہ کرنے دیا۔

تمنائے دولتِ دنیا کی لے آتش نہیں رہتی قناعت سے غنی اللہ کر دیتا ہے سکیں کو

آخر عمر میں حیدرآباد میں ایک رئیس کے دربار میں رسائی ہو گئی تھی مگر وہ بھی اپنی کوشش سے نہیں۔

ذہنِ خداداد عجب ذہن خداداد اپنے ساتھ لائے تھے۔ فارسی اور عربی میں فاضلانہ لیاقت نہ تھی مگر طبیعت داری کا یہ عالم تھا کہ علماء اور فضلاء کی صحبت میں اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ ہزاروں شعر اردو فارسی کے ازبر تھے۔ یہی اشعار مختلف موقعوں پر اپنے مضامین میں عجب انداز سے چسپاں کرتے تھے بس معلوم ہوتا تھا کہ فلاں شعر فلاں موقع کے لیے ہی کہا گیا تھا۔

بے اعتدالی مگر کیا افسوس کی بات ہے کہ اس باکمال نے اپنی قدر آپ نہ کی۔ بے اعتدالیوں نے بے طرح دل میں جگہ کر لی تھی۔ سرشار اسم بامسمے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبردست مصنف کا کمال روز بروز زوال پذیر ہوتا گیا اور زندگی فارغ البالی کے ساتھ نہ بسر ہو سکی سنتے ہیں کہ آخر زمانہ میں حیدرآباد میں بھی مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی بے اعتدالیوں سے ناراض ہو کر اپنا دستِ شفقت کھینچ لیا تھا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی صاحب کمال بوڑھا ہوتا ہے تو اس کا کمال جوان ہوتا ہے۔ لیکن سرشار کی عمر کے ساتھ اُسکے کمال میں بھی ضعف آتا گیا۔ اس عالی فہم مصنف کو خود اس امر کا احساس تھا چنانچہ کشمیری کانفرنس والے قصیدے میں اپنے تئیں یوں خطاب کیا ہے۔

ہے اس کمال پہ لیکن ہزار بار افسوس کہ تو نے قدر نہ کچھ جانی اپنی خود زنہار
کمال کے لازم جو ہے زوال ضرور اب ایک قطرہ ہے پہلے تھا قلزم ذخار
نہ آب و تاب وہ اگلی سی ہے نہ رنگ نہ روپ نہ ہیں وہ شاہدِ مضموں کے پھول سے رخسار

نہ حافظہ ہی رہا وہ نہ قوتِ ادراک — ہے کہاں سے ہر اک شے کی حد ہے آخر کار
اُسی زمانہ میں توبھی اسیر ہو جاتا — قبولِ زر میں نہ ہوتا اگر تجھے انکار

یہ زوال لازمی تھا۔ شاعری ہو یا نثاری یہ سب دماغ کا کھیل ہے۔ آبِ آتشیں نے جب دماغ ہی میں آگ لگادی تو کھلے مضامین بھی آتشبازی کے پھول ہو کر رہ گئے۔ طبیعت بجھ گئی۔ کلام میں گرمی باقی نہ رہی۔ یہ ممکن نہیں کہ ایسا ذہین اور ذکی شخص اس بلائے بے درماں کے اثر سے واقف نہ ہو چنانچہ اپنے مختلف فسانوں میں اس کی ہجو اور مذمت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اپنے اوپر بس نہ چلا۔ **ذوق** نے کیا خوب کہا ہے مصرع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

افسوس صد افسوس! اگر اس باکمال کا دماغ اپنی اصلی حالت پر رہتا تو خدا جانے وہ کن کن بلند پروازیوں کی ہوا میں اُڑتا اور کیسے کیسے تارے انشا پردازی کے عرش سے توڑ کر لاتا۔

کہتے ہیں کہ آخرِ عمر میں تپ دروں نے بالکل گھلا دیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آخر کار ۲۷ جنوری ۱۹۰۳ء کو اس دارفانی سے رحلت کی۔ تقریباً پچپن یا چھپن برس کی عمر پائی۔

سرشارِ فصیح و نکتہ پرور نہ رہا — سرمایۂ نازِ اہلِ جوہر نہ رہا
اعجازِ قلم کے جس کے سب قائل تھے — وہ نثر کا اُردو کے پیمبر نہ رہا[1]

ذیل میں حضرت سرشار کی تصنیفات سے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

---

[1] یہ مضمون رسالہ زمانہ کانپور بابتہ ماہ مئی ۱۹۰۳ء سے ماخوذ ہے۔

(از فسانۂ آزاد)

(جلد اول صفحہ ۶۵۲)

بہار النسا۔ اچھی بہن! ہماری بہن! لے اب اتنا بتا دو کہ میاں آزاد کون ہیں؟

حسن آرا۔ رنگ فق۔

سپہر آرا۔ آنکھ نیچی۔

روح افزا۔ لجاتی کیوں ہو بھلا۔

سپہر آرا۔ کیا جانے کیا واہی تباہی باتیں کرتی ہو۔

بہار النسا۔ واہی تباہی! ذرا ادھر تو دیکھو۔

روح افزا۔ واہی تباہی! چہ خوش۔

حسن آرا۔ یہ میاں آزاد کون ہیں؟

روح افزا۔ ہماری پیاری بہن کے پیارے۔

سپہر آرا۔ بجا ہے۔

بہار النسا۔ وہ بجروں کی روانی۔

روح افزا۔ وہ دریا کی طغیانی۔

بہار النسا۔ وہ روٹھنا وہ منانا۔

روح افزا۔ وہ روم روانہ ہونا۔

بہار النسا۔ وہ گرم جوشی۔

روح افزا۔ اور وہ عشرت کوشی۔

بہار النسا۔ وہ راز و نیاز کی باتیں۔

روح افزا۔ وہ عشق کی گھاتیں۔

بہار النسا۔ وہ چھلکے سے گلوریاں کھانا۔
روح افزا۔ وہ محل میں گلچھرے اڑانا۔
بہار النسا۔ وہ مزے مزے کی حکایتیں۔
روح افزا۔ اور وہ مزے مزے کی شکایتیں۔
بہار النسا۔ وہ امتحان لینا۔
روح افزا۔ اور وہ قول دینا۔
بہار النسا۔ اور وہ نکاح کا ذکر۔
روح افزا۔ اور وہ شادی کی فکر۔
بہار النسا۔ وہ صبح کا سہانا سماں، وہ بہار۔
روح افزا۔ وہ ترشح وہ پھوہار۔
بہار النسا۔ وہ ڈوبنا، وہ نکالنا، وہ ڈوبتوں کو بچانا۔
روح افزا۔ اور وہ کسی کا قدموں پر گرنا۔
بہار النسا۔ ع۔ کیا کہتی ہوں میں ادھر تو دیکھو۔
روح افزا۔ میری طرف ایک نظر تو دیکھو۔
بہار النسا۔ سنا کہ میاں آزاد پہلوان ہیں۔
روح افزا۔ اور سنا کہ حسین جوان ہیں۔
بہار النسا طرح دار ہیں۔ طرار ہیں۔
روح افزا۔ اور باغ و بہار ہیں۔
بہار النسا۔ ہنوزش گردگل نارستہ شمشاد + زخوبی سرو او چوں سرو آزاد۔
روح افزا۔ وہ رُخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر + وہ نور کہ صدقے ماہِ انور۔
بہار النسا۔ پھر ہرج کیا ہے، شریف ہیں، عالی خاندان ہیں۔

روح افزا۔ ہاں! بھلے مانس ہیں معالی ندوماں ہیں۔

بہارالنسا۔ اب چھپانے سے کیا ہوتا ہے بھلا صاف صاف بیان کردو

روح افزا۔ سن تو چکے ہی ہیں ہم اب مخفی رکھنا یعنی چہ۔

بہارالنسا۔ (حسن آرا سے گلے مل کر) اب بتاؤ بس۔

حسن آرا (تنک کر) بتائیں کیا جب کچھ اصلیت بھی ہو۔

سپہر آرا۔ ان دونوں بہنوں نے خواب دیکھا تھا کل معلوم ہوتا ہے

حسن آرا۔ ہاں سچ کہا، خواب دیکھا ہوگا۔

روح افزا۔ ہاں ہمنے تو آزاد کو خواب میں بھی نہیں دیکھا مگر جہاں آرا کہتی تھیں کہ وہ حسن و جمال میں کروروں میں ایک ہیں، خوش فکر، تیز طبیعت، شریف اور نیک ہیں۔

حسن آرا۔ جہاں آرا بہن کیا کہتی تھیں۔

روح افزا۔ اللہ گواہ ہے بڑی تعریف کرتی تھیں، کہتی تھیں کہ ایسا خوبرو آدمی، آنکھوں دیکھا نہ کانوں سنا۔

بہارالنسا۔ مگر ایک عیب بھی بتاتی تھیں۔

سپہر آرا۔ عیب! وہ کیا؟

بہارالنسا۔ سُنا شراب بہت پیتے ہیں۔

حسن آرا۔ اے توبہ! کہیں شراب مردار کا نام بھی نہ لینا

بہارالنسا۔ ہونھ، ہم سے اُڑتی ہو، شانِ خدا! بھلا شراب نہیں پی تھی تو بہکے کیوں، مہری کی طرف کیوں جھکے۔

حسن آرا۔ (دانتوں کے تلے انگلی دباکر) چپ چپ۔

روح افزا۔ آخر یہ سوجھی کیا۔ اللہ ہم کیونکر میاں آزاد کو دیکھیں۔

اب کے جو خط لکھو گی تو لکھ دینا کہ تمھاری سالی بہت مشتاق ہیں، جلد آؤ۔
سپہر آرا۔ بڑے ہنسوڑ۔ خوش مزاج آدمی ہیں اور برق جیسے بجلی اُف۔
ایسا چالاک اور ہوشیار اور طرحدار جوان تو آج تک دیکھا ہی نہیں۔
روح افزا۔ ڈیل ڈول کیسا ہے۔
سپہر آرا۔ چھریرا بدن ہے۔ کشیدہ قامت، نک سک سے درست،
چہرے مُہرے سے ٹھیک، دیکھو تو گھنٹوں گھورا کرو۔
بہار النسا۔ جب دیکھیں بھی۔
حسن آرا۔ انشاءاللہ۔
بہار النسا۔ ہمایوں فر تمھارے پڑوس میں رہتے ہیں، سپہر آرا کا اُن کے
ساتھ نکاح ہو جائے تو ہم سمجھیں کہ یہ بڑی خوش نصیب ہیں۔
سپہر آرا۔ میرے تو تلوؤں کو بھی نہ پہنچیں۔
حسن آرا۔ ہونھ، چہ خوش، چاند کو گہن لگانا چاہتی ہو۔ طوطی کو کوے سے
جوڑا لگانا۔ واہ اچھی بہن ہو۔
بہار النسا۔ ایں! وہ نور شہزادگی چہرے سے برستا ہے کہ واہ واہ۔
اماں جان سے آج ہی تو کہوں گی میں۔
حسن آرا۔ تو اچھا جو تمھیں ایسے ہی پسند ہیں تو اماں جان سے ذکر کرو
بہار النسا۔ کریں ہی گے۔
سپہر آرا۔ اور ایجاب و قبول کوئی چیز ہی نہیں۔
روح افزا۔ انکار کرو گی تو تم سے بدقسمت ہم کسی کو نہ سمجھیں گے۔
سپہر آرا۔ دیکھا جائے گا۔
روح افزا۔ الخموشی نیم رضا۔

نوجوانی اور شباب کی سرمستیاں اور بہنوں کی آپس میں خوش فعلیاں
کس لطف سے ظاہر کی ہیں۔ اگرچہ ہمیں شکایت ہے کہ قدیم لکھنؤ میں بڑی بہنیں
چھوٹی بہنوں سے ایسی چہلیں کرتی ہوں تاہم جو تصویر کھینچی گئی ہے اسکے دلکش
ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں۔ اگر سرشار کا قلم بیجا لیوں سے اس قسم کے الفاظ ادا
کراسکتا تو یہ ٹکڑا بھی واقعیت کے اثر سے خالی نہ ہوتا۔

(جلد اوّل از صفحہ ۱۷۸)

نواب صاحب اور رفقا کی چہ میگوئیاں

اب ادھر نواب کے یہاں کا حال سنیے کہ وہاں کیا ہوتا تھا جب
کئی دن گزر گئے تو خوشامد خوروں نے پلنگ پر چڑھایا کہ پیر و مرشد دیکھا

ملے میاں آزاد ان نواب صاحب کے مصاحبین میں داخل تھے۔ نواب صاحب اپنی
آمدنی کا بہت بڑا حصہ بٹیر بازی میں صرف کرتے تھے۔ چونکہ آزاد روشن خیال تھے اسلیے انہیں
یہ اسراف ناپسند تھا۔ انھوں نے ایک روز موقع پاکر بٹیر خانہ میں سے سب بٹیریں اڑا دیں
اور ایک بٹیر جسکا نام نواب نے صف شکن رکھ چھوڑا تھا چھپا لیا۔ یہ بٹیر سب سے
بہتر تھا اور نواب کو اسکے اڑ جانے کا بیحد قلق تھا۔ کئی مصاحب نے کہا گیا کہ وہ صف شکن
کو بچا سمجھا کر لے آئیں کسی نے ہامی نہ بھری۔ صاف صاف کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ بٹیر جو اڑ گیا
وہ کیسے واپس آسکتا ہے بلکہ نواب کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور کہتے تھے کہ صف شکن
بڑا منطقی ہے ہمارے دلائل سے وہ واپس نہ آئے گا۔ آخر کار یہ صلاح ٹھیری
کہ میاں آزاد جائیں اور صف شکن کو خوش کر کے لے آئیں۔ جب آزاد کو واپس
آنے میں کئی مہینے گزر گئے تو نواب بھی پریشان ہوئے۔ اسوقت مصاحبین اور نواب
میں جو باہم گفتگو ہوئی سرشار نے اسکا نقشہ کھینچا ہے۔ تنہا۔

ہم نہ کہتے تھے کہ میاں آزاد خانہ برباد کا ٹھکانا کیا۔ حضور نے نہ مانا آخر شش
سانڈنی کی سانڈنی گئی اور رنج کا رنج ہوا۔

خوجی۔ اور بیوقوف کے بیوقوف بنے۔

میر صاحب۔ اور انعام و زاد راہ جو دیا گیا گھاٹے میں اسکی گنتی ہی نہیں

غفور۔ مجبور اب وہ پھرتے بغیر نہیں آتے۔ دو تین سو کی سانڈنی پر
پانی پھر گیا۔

خوجی۔ ہونہہ یہ دو ہی تین سو لیے پھرتے ہیں۔ اے میاں وہ سانڈنی
بلا کی دھاوا کرنے والی ہے۔ ریل کی دم میں باندھ دو۔ دیکھو چند ہی تک
برابر چھم چھم کرتی چلی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان سے ملک میں ویسی ایک
تو نظر آتی نہیں۔ کیا دم خم ہے بھئی میں دو ایک دفعہ سوار ہوا۔ واللہ ہے
یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہوا پر جا رہا ہوں۔ وہ ٹھمک ٹھمک چال کہ اہو ہو ہو
سواری اور اونٹ، بگھی، گھوڑا، پالکی، ہاتھی سب اسکے مقابل میں گرد
ہیں اور بھئی سچ پوچھو تو میاں صف شکن سے اسکے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

میر صاحب۔ واہ خواجہ صاحب، آپ بھی واللہ کیا بے تکی باتیں
کرتے ہیں۔ کہاں بے زبان جانور کہاں ہمارے صف شکن سلمہ اللہ تعالے
پاجی اور بھلے مانس کا مقابلہ کیا۔ ارے وہ اشرف الحیوانات ہے ایسی
ایسی ہزار سانڈنیاں اسکی ایک لات پر نثار۔ کہنے لگے سانڈنی کے کھونے
کا زیادہ رنج ہوا۔

نواب۔ اتنے بڑے بوڑھے ہوئے مگر گوکھے ہی رہے۔ جو بات کرینگے
بے ٹھکانے۔ سانڈنی تنکے کا جانور گئی گئی اب اس کا رونا کیا۔ ہاے
رنج تو یہ ہے کہ میاں صف شکن اب ہاتھ نہ آنے کے میرا ہی دل جانتا ہے

کہ کلیجے پر کیسی چوٹ لگی ہے بھئی اس سے تو مجھے ہی موت آجاتی تو سمجھتا

بڑا خوش نصیب ہوں۔ افسوس۔

مصاحب۔ حضور صبر کیجیے ع۔ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

آتش کہہ گئے ہیں۔ بڑے نواب صاحب مر گئے تو حضور نے کیا کر لیا

چچا حضور کو چھوڑ کر چل بسے تو حضور نے کیا کر لیا۔ دادا جان ساری ثروت

سے منہ موڑ کر داغِ جدائی دے گئے، حضور نے کیا کر لیا۔ اب صبر کیجیے

صبر کیجیے۔

نواب۔ میاں بات یہ ہے کہ باپ دادا تو سب ہی کے مرا کرتے ہیں

مگر صف شکن سے وفادار جانور کا ایک دم بھی جدا ہونا کھلتا ہے نہ یہ کہ ایک

سے اڑ جانا۔ خیر خدا ان کو بخشے اس وقت دل ہے کہ بے اختیار اڈا چلا آتا ہے

خوجی۔ یہ کیا بات دیا کہ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔ آتش کہہ گئے

ہیں۔ واہ ری معلومات۔ اے حضرت یہ سعدی کا شعر شیخ جی کا کلام ہے۔

نواب۔ کیا خرافات بک رہا ہے۔ یہ شعر و شاعری کی تحقیقات کا بھلا کون

موقع ہے، وہ سعدی نہیں رودکی کہہ گئے سہی۔ پھر اس سے واسطہ

معلوم ہے کہ آپ بڑے شاعر کی دُم ہیں۔ عجیب نامعقول آدمی ہے بھئی۔

مصاحب۔ اور خداوند یہ ان میں سخت عیب ہے کہ کسی نے بات کی

اور انھوں نے چٹ کاٹ دی۔ یوں نہیں وہ یوں ہے وہ یوں نہیں یوں ہے

ہم نہیں الٹی ہے پوچھیے ہم تو اپنے آقا کی تسلی کے لیے تشفی آمیز باتیں کر رہے

ہیں کہ صبر کیجیے۔ یہ ٹیڑھے پر چڑھے بیٹھتے ہیں کہ آتش نہیں سعدی کا

کلام ہے جس میں لوگ سمجھیں کہ آپ بھی بڑے شاعر غرا ہیں اور املا تک

درست نہیں۔ بھلا صف شکن تو اس کا غذ پر لکھ دیجیے۔

خوجی۔ چلیئے صاحب وہ ہم نو کہے، گما مزہ گا دی سہی، آپ تو اپنے وقت کے افلاطون ہیں نہ، بس چھٹی ہوئی۔

نواب۔ چھٹی دنی کے بھروسے نہ رہیے گا چھٹی نہیں ہوئی۔ ایک بھلے انس کو آپ نے دس آدمیوں کے سامنے ذلیل کیا، آپ کو ہم ذلیل کریں گے

غفور قلم دوات کاغذ خوجی کو دو۔ لکھیئے قبلہ، صف شکن کا لفظ لکھیئے۔

مصاحب۔ نہیں حضور یہ فقرہ لکھوائیے کہ اسوقت ہوش و حواس درست نہیں

خوجی۔ نے یوں لکھا (اسوقت حوش وہواس درست نہیں)

مصاحب۔ (ہنس کر) واہ واہ واہ۔ کیا لیاقت ہے۔ حوش کو حاے حطی اور ہواس کو آپ ہاے ہوز سے لکھتے ہیں۔ یہ دیکھ لیجیے نہ۔

نواب۔ اے لعنت خدا۔ اور بڑھ بڑھ کر باتیں بناؤ گے۔ پھر کسیکو ٹوکوگے بچہ اے میاں ہوش و حواس نہیں لکھ سکتے۔ اے پھٹکار شرماے تو نہ ہوگے؟

میر صاحب۔ وہ شرما چکے۔ شرم چہ کتی است کہ پیش مرداں بیاید شرم تو انھوں نے بھون کھائی ہے۔ تب تو شرماتے نہیں، جب بڑی بڑی محفلوں سے نکالے گئے۔

خوجی۔ حضور کے مزاج میں انصاف تو ضرور ہے لیکن بریت کہ بسر اسوقت حضور نے میری گردن کند چھری سے ریتی۔ ہاے ہاے اتنا تو سمجھیے کہ اگر ہوش و حواس ٹھکانے ہوتے تو پیش پا افتادہ الفاظ کے املا میں بھلا کیوں غلطی کرتا۔ شاعر ہیں، نثار ہیں، مولوی ہیں، منشی ہیں۔ مگر جب ہوش بھی ہوں ہاے صف شکن کا پتہ نہ ملے اور ہم ماما بختیاں اڑائیں۔

نواب۔ واہ خوجی واہ۔ اسوقت طبیعت تمھاری نمک حلالی دیکھکر خوش ہوگئی، شاباش، کوئی ہے؟

مصاحبین۔ کوئی ہے؟ حاضر ہو جلد، چلا۔

پیرو۔ پیر و مرشد دست بستہ کیا حکم ہے۔

نواب۔ داروغہ سے کہو کہ ہمارے رفیق خواجہ صاحب کو وہ عباسی رومال اُڑھا دیں جو پرسوں خرید ا تھا۔ لو خوجی یہ ہم نے انعام دیا۔

واہ بھئی واہ۔ گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند

کہاں تو خوجی پر وہ عتاب تھا، کہاں اب انعام پایا۔ داروغہ نے طشت میں رومال لاکر خوجی کو اُڑھا دیا۔ خوجی نے استادہ ہوکر سات دفعہ سلام کیا اور کہا کہ واہ حضور کیا ریاست ہے۔ اب خدا گواہ ہے کہ اس وقت تہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ میاں آزاد مع صف شکن علی شاہ کے کھٹ سے آجائیں اور حضور واللہ دل گواہی دیتا ہے کہ آیا ہی چاہتے ہیں بس صبح و شام آئے داخل۔

نواب۔ تمہارے منہ میں گھی شکر۔

مسیتا بیگ۔ حضور مٹھائی کا اقرار کریں۔

خوجی۔ اور سنیے۔ یہ بندۂ شکم، گرسنہ چشم، خوب بولا۔ ابے مٹھائی کیسی وہ جلسے اڑیں، وہ جشن ہوں کہ واہ جی واہ۔ مہینوں طبلے پر تھاپ پڑے اور دور دور سے طائفے آئیں۔ صف شکن کا آنا کوئی ایسی ویسی بات ہے گیدی کہیں کا۔

نواب۔ انشاء اللہ۔ پھر میں اپنے دل کا ارمان نکالوں وہ دھما چوکڑی مچے کہ واہ جی واہ۔

مسیتا بیگ (میر صاحب کے کان میں چپکے سے) نقل مشہور ہے از تیش آنا، جانا، ملنا، ملانا معلوم۔ مگر واللہ آزاد بھی بلا کا جوان ہے وہ جھانسا دیا

کہ نواب بھی ساری عمر نہ بھولیں گے۔ سانڈنی تو بھئی اُسنے بیچ لی۔ اونے پونے دام سیدھے کیے، صف شکن کی دم میں نمدا۔

میر صاحب۔ (آہستہ سے) کیوں جی یہ ہمارے رئیس بھی کتنے بھولے ہیں۔ بٹیرے سے صف شکن ہوئے اور صف شکن سے اب **صف شکن علیشاہ** بنے (ہا ہا ہا) لاحول ولا قوۃ۔ واللہ نرا گاودی ہی رہا۔

مستا بیگ۔ اجی خدا کرے ایسا ہی بنا رہے مگر یہ یار خوجی کا عباسی رومال آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ یہ مردک بگڑی بات کو ایسا بنا لیتا ہے کہ کچھ پوچھیے نہیں۔

میر صاحب۔ ہاں مگر آزاد اُن کے بھی چچا نکلے۔ اُن کے کان انھوں ہی نے کاٹے۔ اور بھئی آدمی بھی پرکالۂ آتش ہے۔ پڑھا لکھا، عالم فاضل شاعر، شہسوار۔ پھر کشتی، پٹے میں طاق۔

نواب۔ اب زنان خانہ میں جاتے ہیں ہم، رخصت۔

قدیم لکھنؤ کے نوابوں کا طرز معاشرت اور اُن کی سادہ لوحی کو اس سے بہتر الفاظ میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔ موجودہ لکھنؤ میں غالباً ایسے گو کھے کم نکلیں گے لیکن سرشار کے زمانہ میں سمجھدار نوابوں کا ضرور قحط ہوگا۔ افسوس کہ لفظ نواب اس قسم کے حماقت شعار لوگوں کی وجہ سے فضولی اور بداخلاقی کا مرادف ہوگیا ہے۔

مرنے مرنے کی باتیں اور عشق صادق کی گھاتیں

(از صفحہ ۱۵۳ جلد اول)

حسن آرا۔ ہائیں ہائیں! بوڑھے میاں ہوش کی دوا کرو۔ تم تو اس وقت

اپنے آپے سے گزر گئے ہو۔ اے واہ! کہنے لگے آزاد آئے ہیں۔ پلنگ بچھواؤ، یہ پلنگ کی کیا بات چیت ہے۔

سپہر آرا۔ (گھبرا کر) اچھے تو ہیں۔

پیر مرد۔ بیہوش پڑے ہیں خدا ہی خیر کرے۔

حسن آرا۔ (ہاتھ مل کر) ہے ہے یہ کیا کہتے ہو، پانوں تلے سے مٹی نکل گئی جی سنسنانے لگا۔

سپہر آرا۔ (بدحواس ہو کر) کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اُف ایسی سُنانی اللہ ساتویں دشمن کو بھی نہ سُنائے۔

پیر مرد۔ کہارو قفس یہاں اُٹھا لاؤ۔

کہاروں نے قفس اُٹھائی اور پلنگ کے پاس لگائی۔ کئی آدمیوں نے مل کر میاں **آزاد** کو پلنگ پر سُلا دیا۔ کمرے میں فقط حسن آرا اور سپہر آرا، دل بہار اور پیر مرد۔ **حسن آرا** نے جو یہ کیفیت دیکھی تو سن سے جان نکل گئی، سپہر آرا کے گل رخسار پر آنسو ہی آنسو نظر آتے تھے **دل بہار۔** بیوی اس سے کچھ نہ ہونے کا۔ دوا درمن کرواؤ۔ دوڑ دھوپ کرو حکیم جی کو بلاؤ، تم سب کے تو جیسے ہاتھ پانوں پھول گئے (پیر مرد سے) لے جا کر حکیم صاحب کو بلا لاؤ۔

حسن آرا۔ حکیم جی کا یہاں کیا کام، اور یوں آپ چاہیں جسکو بلائیں

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج کہاے طبیب تھا ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

یہ کہکر وہ خاتون مہ لقا آہستہ سے پلنگ پر جا بیٹھی اور سپہر آرا پھولوں کی پنکھیا جھلنے لگی حسن آرا نے میاں **آزاد** کا سر اپنے زانو پر رکھا **پیر مرد** کسی کام کے لیے باہر چلے گئے حسن آرا نے فرطِ محبت سے

میاں آزاد کی نورانی پیشانی پر بڑے پیار سے بوسہ لیا۔ ہنوز جبیں بھی پیشانی کے پاس سے نہ ہٹی تھی کہ میاں آزاد نے آنکھ کھولدی اور کہا (ایک ور) حسن آرا کھل گئی سپہر آرا ہنس پڑی۔
آزاد۔ مرے جنازے کو ان کے کوچے میں ناحق احباب کے آئے
نگاہ حسرت سے دیکھتے ہیں وہ رخ سے پردہ اٹھا اٹھا کر
سحر ہے نزدیک شب ہے آخر سرائے چلتے ہیں ہم مسافر
جنھیں ہے ملنا وہ سب ہیں حاضر جرس سے کہدو کوئی صدا کر
حسن آرا۔ کیوں بندہ پرور یہ مکاری! خدا کی پناہ! میری تو بری گت ہو گئی
سپہر آرا۔ چلو بخیر گزشت۔
آزاد۔ ایک اور ایک اور بس ع یہی درویش کی صدا ہے آج۔
حسن آرا۔ سائیں اب پھر مانگیے۔ بس وہ وقت اور ہی تھا ع ہر روز عید نیست کہ حلوا خورد کسے۔
آزاد۔ میں نے کہا جو اُن سے کہ شب کو یہیں رہو۔ آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پہ
حسن آرا۔ آپ آخر یہاں تشریف کیوں لائے۔ چھپائیے نہیں صفا صفا بتائیے
آزاد۔ ابکی تو ہو کہ تم مری محفل میں آئے کیوں   آیا تھا کون کوئی کسیکو بلائے کیوں
کہتا ہوں صاف صاف کہ مرتا ہوں آپ پر   ظاہر جو بات ہو اسے کوئی چھپائے کیوں
یہاں مارے نقاہت کے جان لبوں پر آگئی۔ آپ مکر سمجھتی ہیں۔
حسن آرا۔ یہی نقاہت ہے تو بھر ناز کون اٹھائے گا۔ جور و جفا کون سہے گا۔
آزاد۔ اب کل روانگی کا عزم ہے۔ کل اگر ٹک جاؤں تو شریف نہیں روم و روس میں اب کھلم کھلا چھڑنے والی ہے۔
حسن آرا۔ ہاں حمیت تو اسی کی مقتضی ہے کہ جائیے اور ضرور جائیے۔

سپہر آرا۔ جائیے اور بخیر و عافیت واپس آئیے۔

حسن آرا۔ بسفر رفتنت مبارک باد+ بسلامت روی و باز آئی۔

اب ہم کو ایک بات یاد دلانی لازم آئی وہ یہ کہ میاں آزاد سچ مچ بیمار نہیں ہوئے تھے، بلکہ بیمار بن بیٹھے تھے وجہ یہ کہ ان کو خوف تھا کہ مبادا اللہ رکھی کا آنا حسن آرا پر بھی کھل جائے تو پھر قیامت ہی بپا ہو۔ لہٰذا انھوں نے یہ فکر کی کہ علیل ہو کر وہاں جائیں تا کہ حسن آرا ان کی علالت دیکھکر ترس کھائیں۔ سوچے کہ بیر مرد فلاں سڑک کی طرف سے روز آتے ہیں۔ لہٰذا حضرت آزاد موقع کو تاک کر ایک درخت کے نیچے لوٹ گئے کہ گویا جان ہی پر بن آئی۔

حسن آرا۔ اب تو مزاج حضور کا اچھا ہے۔ آخر نصیب اعدا طبیعت ناساز کیونکر ہوگئی آپ جاتے کہاں تھے۔

آزاد۔ آپ ہی کی قدم بوسی کو آتا تھا۔ اثنائے راہ میں جی گھبرانے لگا اور غش کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ درخت کے سایہ میں ذرا دم لینے بیٹھا تو بیہوش۔ حسن اتفاق سے یہ بیچارے ملے ورنہ خدا جانے کیا گت ہوتی اللہ کو کچھ اچھا کرنا منظور تھا۔

دن بھر اور رات بھر میاں آزاد نے وہیں بسر کی اور تڑکے اٹھتے ہی تیاری سفر کی کی کہ اتنے میں میاں خوجی لڑھکتے پڑھکتے پتہ پوچھتے ہوئے آن موجود ہوئے۔

خوجی۔ میاں ہوت ذرا آزاد کو تو بلاؤ۔

دربان کس سے کہتے ہو، آئے کہاں سے ؟ جاؤ گے کہاں ؟ ہو کون ؟

خوجی۔ ابے یہ تو کچھ تقریبا سا معلوم ہوتا ہے۔ ابے اطلاع کر دے کہ

خواجہ صاحب آئے ہیں۔

دربان۔ ہونھ۔ خواجہ صاحب! ہیں تو جولاہے سے معلوم ہوتے ہیں بھلے مانسوں کی ایسی ہی صورت ہوا کرتی ہے۔

خوجی۔ اور نہیں تو پھر کیسی صورت ہوا کرتی ہے۔

یہ تقریر میاں آزاد نے سُنی تو خوجی کو پردے کے پاس بلا لیا۔

خوجی۔ اجی اک ذری آئینہ تو بھجوا دینا۔ آئینہ بھیجیے گا ذری۔

آزاد۔ یا وحشت یہ آئینہ کیا ہوگا، بندگی نہ سلام، نہ مزاج پرسی، نہ کچھ بات چیت، آتے ہی آئینہ یاد آیا، بندر کے ہاتھ میں بھلا آئینہ کون دینے لگا۔

خوجی۔ اجی بھیجئے ہو یا دل لگی کرتے ہو، دربان سے ہم سے جھوڑ ہو گئی ہے اس وقت۔ مردود کہتا ہے کہ تمھاری صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں اب کوئی اس گیدی خر سے پوچھے تو کہ پھر کیا چمار کی سی ہے یا پاجی کی سی ذرا آئینہ بھیجئے۔ میں دیکھوں تو مجھے خود شک ہو گیا۔

یہ فقرہ جو سُنا تو حسن آرا اور سپہر آرا کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور آزاد سے کہا کہ کون جانگلو ہیں۔

آزاد۔ بھئی اگر سچ پوچھتے ہو تو صاف صاف یوں ہے کہ تمھاری صورت ایک طرح کا پاجی پن برستا ہے۔ خدا چاہے پاجی بنائے مگر پاجی کی صورت نہ بنائے۔ مگر اب اسکا علاج کیا۔

خوجی۔ واہ اس کا کچھ علاج ہی نہیں آپ کے پاس۔ ڈاکٹروں نے مردے تک کے جلا دینے کا تو بندوبست کیا آپ فرماتے ہیں کہ علاج ہی نہیں دیکھیے ہم بتا دینگے صورت ہی بدلتی ہے۔ پھر یہ کتنی بڑی بات ہے۔

آزاد۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اینڈا بینڈا علاج ہو اور منھ ہی بگڑ جائے۔ اس

تو باجی ہی بنا رہنا اچھا۔

خوجی۔ نہ صاحب باجی نہ بنینگے۔ باجی بن کے جیئے تو کیا۔

آزاد۔ کل ہم روم جلنے والے ہیں، چلیئے ہو ساتھ۔

خوجی۔ نہ چلے اپنی بھی لعنت نہ لے چلے اپ بھی (خم ٹھوک کر) ہم خوش ہمارا خدا خوش۔

آزاد۔ مگر وہاں چانڈو نہ ملے گا۔ اتنا یاد رکھیے۔

خوجی۔ اجی افیم ملیگی؟ کہ وہ بھی نہ ملیگی۔ بس تو پھر ہم اپنے چانڈو بنالیں گے آپ ہماری فکر نہ کیجیے۔ ہمیں ضرور لے چلیئے بالضرور لے چلیے۔

آزاد۔ حسن آرا۔ اب رخصت کا وقت قریب آتا جاتا ہے۔ اور کلیجہ منھ کو آتا ہے کہ تم سے مفارقت ہوگی۔ لیکن جوانمردوں کو ان باتوں سے خوف کیا زندگی شرط ہے خدا نے چاہا تو پھر ملیں گے اور جشن کرینگے اب ہمیں جانے دو۔

حسن آرا۔ (ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے)

سپہر آرا۔ (بہن سے چمٹ کر) کچھ تو منھ سے بولو۔ ہائے یہ خاموشی کا کون موقع ہے۔ جو مارے رنج مفارقت کے خاموش ہو تو وہ بات ہی کیوں کرو جس سے دکھ ہو۔

حسن آرا۔ (گال پر ہاتھ رکھکر) اُف (پھر رونے لگی)

آزاد۔ اُف دل بھر آیا۔ مگر قدم پیچھے نہ پڑے گا۔ جاؤں اور بیچ کھیت جاؤں

سپہر آرا۔ ہائے اندر والا نہیں مانتا۔ اسکو بھی تو سمجھاتے جاؤ یہ کس کا ہو کر رہے گا۔

آزاد۔ ذرا تھوڑی دیر تک یہ بات ہی بھول جاؤ۔ پھر میں ابھی خوجی سے دو دو باتیں کروں۔

اگرچہ اس فسانہ کے ہیرو آزاد ہیں لیکن تمسخر کا حصہ خوجی کی قسمت میں آیا ہے۔ جہاں کہیں سرشار کا قلم ظرافت کے لیے مچلتا ہے، فوراً میاں خوجی آدھمکتے ہیں اور ظرافت کی دُکان کھل جاتی ہے۔ ایسے موقع پر کہ حسن آرا اور آزاد یکجا ہوں بظاہر خوجی کو بار پانا مشکل تھا لیکن سرشار کے ظریف قلم نے اسے یہاں بھی پہنچا دیا۔

(از فسانہ آزاد جلد سوم صفحہ ۸۸۶)

"اب ایک اور لطیفہ سنیے۔ ایک ہاتھی پر دو بنگالی تھے یہ بیچارے شیر و شکار سے کچھ واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے صرف اسقدر سنا تھا کہ نواب صاحب شکار کے لیے جاتے ہیں۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ شیر کے شکار کو جاتے ہیں تو کرو در برس تک نہ آتے سمجھے تھے کہ جھیلوں میں پرند جانوروں کا شکار ہوگا یا شاید ہرن کا شکار ہو۔ جب یہاں آئے اور سنا کہ شیر کا شکار ہے تو روح فنا ہوگئی۔ ایک کا نام بابو کالیچرن گھوش دوسرے کا نام شب دیب بوس تھا۔ ان دونوں میں یوں گفتگو ہونے لگی۔ ذرا غور کرکے سنیے گا وہو ہوا

بوس۔ مہاشائے۔ یہ تو بڑی بات ہوئی ہمکو نواب نے بڑا دھوکا دیا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں، دوست نہیں ہے۔

گھوش۔ اوشالہ۔ یہ لوگ ہمارا دشمن ہے۔ اچھا ہم ان سے سمجھے گا اوشالہ بھیل کا بان۔ ہمارے کو مت لیجائیے گا۔

راوی۔ کیا خوب بھیل کا بان اس کے معنے ناظرین نہ سمجھے ہونگے بھیل کے معنے فیل، بھیل کا بان۔ اس کے معنے فیلبان۔

اب آپ پوچھیں گے یہ لفظ (کا) کہاں سے آیا یہ بابو صاحب

کی ایجاد خاص ہے۔ فیلبان کو انھوں نے (بھیل کا بان) کہا۔ اس
بے تکے پن کے صدقے۔ اوشالا، بھیل کا بان۔ بے اختیار ہنسی آتی ہو
کجا فیلبان، کجا بھیل کا بان۔ فیلبان ہنسوڑ آدمی تھا۔ اُسنے جو دیکھا
کہ بابو صاحب گھبرائے ہوئے ہیں اور گالیاں بک رہے ہیں تو ہاتھی کو
اور بھی تیز کیا اور دونوں بابوؤں کے دل پر اسقدر صدمہ ہوا کہ الامان
والحذر۔ ایک نے کہا۔ اوبھیل کا بان اوشالہ۔ دوسرا بولا باپ رے باپ
ارے ہم لوگ کا جان جاتا ہے بابا۔

فیلبان نے ہاتھی کو اور بھی تیز کیا تو یہ دونوں صاحب کمال منتشر
ہوئے اور اس قدر گھبرائے کہ اگر موقع ملتا تو ہاتھی سے کود پڑتے۔

بوس۔ اوشالا تم ہاتھی کا وان کا شالہ ہے کون ہے۔

گھوش۔ اوشالا بھیل کا بان (دھوتی سنبھالکر) واہ اچھا ہم مجسٹریٹ
صاحب کے ہاں تمھارے کا نالیش (نالش) کرنے سکے گا۔ اوشالا تم
ہمارے کی جان کا بیری ہے۔ تم بھیل کے بان کو پھیر دے گا۔

راوی۔ من چہ فش ام۔ برادر فلانِ ما بسیار فش ست۔ حضور کے
ساتھی تو (بیل کا بان، فیلبان کو کہتے تھے) اور حضور فرماتے ہیں
بھیل کے بان کو پھیر دیگا۔ ان سے بھی بڑھ گئے۔

گھوش۔ ارے بابا۔ ہم لوگ جانے نہیں مانگتا۔ شیر شالا کا مکابلہ (مقابلہ)
کون کرنے سکتا۔ ہم لوگ لکھ دینے مانگتا۔ اوشالہ ارے اوشالا
بھیل کا بان۔

فیلبان (ہنسکر) بابوجی ڈرو نہیں۔ ابھی تو شیر دور ہے۔ جب ہودا
پکڑ لے گا تب دل لگی ہوگی۔ گالیاں دیتے جاؤ میں ایک ہی دفعہ

بدلالوں گا۔ دل لگی نہیں ہے۔ شالا شالا کہتے جاؤ۔

بوس۔ ارے بائی تم ہمارے کا باپ۔ ہمارے باپ کا پتا۔ ہم ہاتھی کو بھیر نے مانگتا۔ اوشالا۔ تم آرام زادہ (حرامزادہ)

فیلبان۔ (ہاتھی کو تیز کر کے) اچھا بابو۔ دیتے جاؤ گالیاں۔ خدا کی قسم عین شیر کے منہ میں ہاتھی نہ لیجاؤں تو پاجی۔ دیکھو تو سہی۔

بوس۔ ارے مہا شائی۔ او مہا شائی۔ باپ رے باپ۔ اڈپیل کا بان۔ تم ہمارے کا باپ۔ پتا جی۔ ہمارے کو بچائیے۔ ہم ریشوت (رشوت) دینے سکے گا (شانہ پکڑ کر) اڈپیل کا بان۔ تم روک لیگا روک لیگا۔ او۔ اب ہم کیا کرے۔ ہمارا باپ ہے۔ ماں ہے سب تم ہے پتا جی۔

فیلبان نے ہاتھی دوڑایا تو گھوش بولے۔ اوشالا تم ہمارا جان لینے مانگتا ہے۔ اوشالا تم ہمارے کو دیک (دق) مت کرے گا ارے بابا ہم بنگال کا رہنے والا، بردوان سے آیا ہے۔ کہاں ہمارا مکان ہے، کہاں یہ جنگل ہے۔ ہمارا تو باپ بھی کبھی شیر کا شکار نہ کھیلنے سکا۔ او بابا ہمارے پر رحم کرے۔ جتنے آدمی ساتھ تھے سب نے قہقہے لگائے ان دونوں کی بتیابی، بیقراری قابل دید تھی۔ کبھی فیلبان کے ہاتھ جوڑتے تھے کبھی ٹوپی اُتار کر خدا سے دعا مانگتے تھے۔ کبھی جنگل کی طرف دیکھ کر کہتے تھے۔ اف ارے بابا ہمارا جان لینے کو ہم یہاں آیا۔ ہمارا موت ہم کو یہاں لایا۔ اڈپیل کا بان ہمارا کہنا جرور نہیں مانتا فیلبان نے ہاتھی روک کر کہا۔ بابو صاحب آخر آپ ہی ہاتھی پر سوار ہیں۔ یا کوئی اور بھی ہے۔ جان سب کو عزیز ہے یا آپ ہی کو۔ اس وقت کم سے کم پچاس ساٹھ آدمی شکار کھیلنے آئے ہیں مگر آپ کی طرح کوئی

بدحواس نہیں ہے۔ کبھی گالیاں دیتے ہو، کبھی دعا۔ کبھی ہاتھ جوڑتے ہو
اور تمھاری بدحواسی دیکھ دیکھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے۔
گھوش۔ ارے بابا۔ ہم لوگ لکھنے پڑھنے میں اچھا ہوتا ہے ہم لوگ
بلایت (ولایت) جاکے انگریجی (انگریزی) کھوب (خوب) سیکھتے ہیں
اور ہم لوگ بڑا لمبا چوڑا لکچر دیتا۔ رام موہن رائے، کیشب چندر سین
سرندر ناتھ بنرجی۔ پرتاپ چندر مجمدار۔ ڈاکٹر سرکار، لال موہن گھوش
اور ہجاروں (ہزاروں) آدمی ہیگا۔ اور ہم لوگ اپنا اپنا ہک (حق)
واسطے کھوب کھوب لڑتے۔ پرنتو ہم لوگ بنگال کا رہنے والا۔ ہم
کبھی شیر کا شکار جانے۔ تم لوگ جان کو سمجھتے نہیں۔ ارے بابا یہ پھیر کے
آنے نہیں والا ہے۔
بوس۔ ہمارا پھیل کا بان۔ اب تم ہاتھی کو پھیر دے۔ ہم تریپ (تعریف)
تمھارا چھاپے گا۔ کھبر کے کاگج میں (خبر کے کاغذ میں)
فیلبان۔ آپ اپنی تعریف رہنے دیں۔ آپ ہماری ہجو چھپائیں۔
گھوش۔ وَل نہیں۔ تمھارا نام ہو جائے گا۔ بڑا بڑا مہاراجہ لوگ نواب
لوگ بادشاہ لوگ کھبر کے کاگج میں تمھارا پڑھے گا تو بولے گا کہ پھیل کا
بان بلواناسے شکار کھیلیں گے اور تم پچاس ساٹھ کا نوکر ہو جائے گا ضرور
نوکر ہو جائے گا۔ سمجھا۔ تم کو ہم نوکر رکھا دے گا۔
فیلبان۔ اوہ۔ پچاس ساٹھ! ہو اسقدر روپیہ میں رکھوں گا کہاں۔
اچھا دوسری شادی کرلیں گے۔ مگر تعریف لکھیے گا کس بات کی۔
ذرا ہاتھی دوڑاؤں تو لطف ہو۔
بوس۔ تم بڑے نٹ کھٹ ہے۔ اوشالا تم پھر دوڑائے۔

جب جھیل کے قریب پہنچے تو گھوش اور پوس کو اور بھی خوف معلوم ہوا گھوش نے فیلبان سے پوچھا۔ ول جھیل کا بان۔ اس جھیل میں کتنا گہرا ہے فیلبان نے کہا دس ہاتھی ڈباؤ۔ یہ سنتے ہی دونوں کے رہے سہے حواس بھی فقرو ہو گئے۔ بالکل سٹپٹا گئے۔

گھوش۔ اور اس جھیل کے اندر سے ہم لوگ کو جانے ہوگا بھی۔

فیلبان۔ جی ہاں اسی میں سے (جانے ہوگا بھی) کیوں؟

پوس۔ اور جو ہاتھی کی پانوں پھسل گئی تو ہم لوگ کا کیا؟

فیلبان۔ اگر ہاتھی کی پانوں پھسل گئی تو تم لوگ کا ٹانگ اور ناک ٹوٹ جائے گا۔ بس اور کچھ نہ ہوگا۔ اور منھ بگڑ جائیگی تم لوگ کی۔

پوس۔ اور تم شالا کہاں سے بچنے سکے گا۔ او شالا۔

فیلبان۔ ہم عمر بھر ہاتھی پر چڑھا کیے، ہمیں اسکے حالات خوب معلوم ہیں ہاتھی پھسلے تو ڈر نہیں اور یہ جلے تو خوف نہیں۔

پوس۔ تمھاری ہاتھی پانی سے ڈرتی ہے یا نہیں۔ بابا ہم سے سلچ سلچ (سچ سچ) کہدو۔ ہم جان نہیں دینے مانگتا ہے گا۔ بولدو۔

گھوش۔ بڑا بیوقوف ہم تا۔ ہم سنتے شیر کا شکار تو ہم آتے نہیں سکتے ہم سے نواب بولا۔ بابو شاہب ہم چڑیا کا شکار کرینگے۔

فیلبان۔ بابو شاہب آپ چڑیا کے شکار سے بھی ڈرتے ہیں۔

پوس۔ ارے بابا۔ گولی لگانے سے تو شب کوئی ڈرتا ہے۔ جان پھیر کے آنے سکے گا نہیں۔ اور ہم لوگ شکار نہیں جاتا۔ ہم شکار کھاتا ہے گھوش اب تم تو بات کرتا کرتا اسکے اندر جاتا ہے۔ بابا۔

فیلبان نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہکر ہاتھی کو جھیل میں ڈالا

تو ان دونوں نے وہ چیل پوں مچائی کہ توبہ ہی بھلی۔ ایک بولا ارے بابا ہم نے ابھی اپنا (وِل) وصیت نامہ نہیں لکھا ہے۔ ہمارا کتاب کا کاپی رائٹ کون لے گا۔ ہمارا جاگیر کون کے پاس جائے گا۔ فیلبان مسکرا کر بولا، وہیں سے سب کلکٹر کے بھید بھیجے گا۔ دوسرے صاحب نے وحشتی لہجہ میں کہا۔ ہم وِل قتل مرڈر (قتلِ عمد) کرتا ہے۔ تم ہم لوگ کو ڈبونے مانگتا ہے تم تاجیرات ہند (تعزیرات ہند) نہیں جانتا ہے او شالا۔ تم ہمارا جان لے گا۔ تم جان لے گا شالا۔

فیلبان۔ بابو گول مال نہ کرو۔ خدا کو یاد کرو بابو صاحب۔

گھوش۔ او ڈیشٹ۔ گول مال تم کرتا ہے کہ ہم کرتا ہے۔

بوس۔ ہاتھی بہے گی تو ہم تم کو ڈھکیل دیگا۔ تم مر جائے گا۔ ہم مار ڈالے گا۔ ہم اب نہا لے گا۔ تم کیا سمجھا ہے۔

گھوش۔ ہاتھی بہے گی تو دانتوں سے تمہارا بوٹی نوچے گا۔

فیلبان۔ آپ گدھے کے گوشت پر دانت لگائیں گوشت خر دندانِ سگ۔ میں تو آدمی ہوں سمجھے خداوند۔

(یہ مکالمہ بہت دور تک چلا گیا ہے اور جیسا شیرینی نمودار ہوتی ہے اس وقت ان بابو صاحبان کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ چونکہ طویل انتخاب منظور نہ تھا۔ اس لیے اس اقتباس کو یہیں ختم کیا گیا۔ صاحبانِ ذوق و شوق اصل کتاب سے باقی مکالمہ ملاحظہ کر لیں) بنگالیوں کی گفتگو کا نقشہ کس عمدگی سے کھینچا ہے۔ حقیقتاً یہ سرشار ہی کا حصہ تھا۔ پڑھیے اور خوب ہنسیے۔

(از جام سرشار)

اٹھائی گیرا، لقا، لچا، شہدا، دغاباز، جعلساز، گرہ کٹ، چوٹہ، اچکا،
ڈاکو، بدمعاش، اوباش، یہ سب بُرے مگر شرابی ان سب کا گرو گھنٹال ہے
کوئی شخص جعل بنانے میں میاں حسین بخش کے کان کاٹے مگر شرابی سے ہم
اس کو اچھا ہی سمجھیں گے۔ حالانکہ حسین بخش نے ماشاءاللہ وہ نیک نامی
حاصل کی ہے کہ اچھے اچھے جعلیے اس کا نام سنکر اپنا کان پکڑتے ہیں۔ ڈکیتی میں
کوئی کیسے ہی ظلم بپا کرے لیکن ہمارے نزدیک شرابی سے وہ پھر بھی اچھا ہے
بدمعاش کیسا ہی پرلے سرے کا کیوں نہ ہو شرابی پر اس کو فضیلت ہے
قس علیٰ ہذا۔ اچکوں کو بھی شرابی پر ترجیح ہے۔ شرابی یہاں پر ہم ان حضرات
سے مراد لیتے ہیں جو شراب کے بندے ہیں۔ اور بادہ گساری ہی کو دین
و ایمان سمجھتے ہیں۔ دن رات ہیں ہر دم سیہ مست، ہر وقت بادہ پرست
جب دیکھیے مخمور نشہ میں چور یہ گرے وہ گرے۔

ع۔ پا بدست دگرے دست بدست دگرے

ٹھرا پینے سے انہیں عار نہیں۔ کلوار کی دوکان پر کجیاں اڑانے
میں انہیں انکار نہیں۔ سر بازار پی پی کر جھومنا اور گلی کوچوں میں لڑکھڑاتے
ہوئے گھومنا عین وضعداری ہے جن کی عقل حلیۂ عاقبت سے عاری
ہے، صبح سے شام اور شام سے صبح تک یہی شغل میخواری ہے۔

یہ وہ بلا ہے جو صدہا نوجوانوں کو ایسی چمٹی کہ پیرانہ سالی تک
پیچھا نہ چھوڑا، عمر بھر اسی چڑیل سے ناتا جوڑا۔ لوگوں نے لاکھ سمجھایا منہ
نہ موڑا، توبہ شکنی رہی۔ چھیڑ پر کبھی جام تک نہ توڑا۔ یہ وہ کالی ناگن ہے
جس کا کاٹا منہ سے پیے نہ سر سے کھیلے۔ لہر تک نہ آئے کلوار کی دکان

کبھی پی اور بازار میں گالیاں بکنے لگے۔ کبھی بدررو میں پڑے ہیں کبھی نالی میں لڑھک گئے۔ یہ انواع و اقسام کی ذلت کی کان ہے مگر شرابی کی جان ہے۔

شراب کہنہ کہ روشنگر روان من ست
مصاحب من و پیر من و جوان من ست

ایک دفعہ منہ لگی بس پھر عمر بھر چھٹنا محال ہے۔ گھر جنجال ہو جائے دین و دنیا دونوں کی خبر نہ رہے۔ ایسے عالی ظرف کم ہیں جو لیاقت کے ساتھ پئیں اور ہوش میں رہیں مگر ہاں کبریت احمر کا حکم نہیں رکھتے۔ دن بھر خوب جم کر محنت کی شام کو دو تین جام پیے۔ اعضاء رئیسہ کو قوت پہنچی۔ آنکھوں میں لال ڈورے آئے، سرور گٹھا، رنگ جما، محنت کی تھکاوٹ دور ہوئی، کسل اور ماندگی کافور ہوئی۔

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است | بلکہ مے میشود از صحبت ناداں بدنام

حق یوں ہے کہ عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے ایسی شراب غٹ رہی کی ایسی تیسی کہ پی اور کیچڑ میں لت پت۔ ایسے شرابی پر خدا کی مار شیطان کی پھٹکار۔ شراب پی کر خوش و تر دماغ ہونا لازم ہے یا سیہ مست خراب

اسی لت نے ہزاروں گھر بگاڑے، سیکڑوں نوجوان رئیس خاک میں ملائے۔ اچھے اچھے جوانانِ رعنا اس کی بدولت کفن پوش ہوئے۔ اجل سے ہم آغوش ہوئے۔ بھلے مانسوں کا دوالا اس نے نکالا ایسی کثرت مے نوشی کا منھ کالا۔

کیا ذکر شراب یار توبہ خاور | رہ ایسا نہ شرمسار توبہ خاور
دوزخ میں جلینگے مے کے پینے والے | توبہ خاور ہزار توبہ خاور

اسی سبب سے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب میں اسکے
استعمال کی قطعی ممانعت ہے۔ اہل ہنود میں برہمن، چھتری، ویش اسکو
نہیں پی سکتے اور یوں تو بڑے بڑے مولانا اور باجپئی پئیں تو کیا۔
یہ اور بات ہے۔

رسالہ تھیوسوفسٹ مطبوعہ جون سنہ ۸۸ء میں کسی انگریز کا ایک
خط جو صاحب ممدوح نے ہندوستان میں کسی بودھ مذہب والے کے
پاس بھیجا تھا پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے
لندن میں شراب خواری کی اس درجہ گرم بازاری ہے کہ الامان الحذر
چھوٹے، بڑے، پڑھے، بن پڑھے، غریب و امیر، برنا و پیر، سب کے
یہاں شرابی موجود ہیں۔ ایسے دھات کے پینے والے کہ بوتلوں کی بوتلیں
اور قرابوں کے قرابے خالی کریں اور ڈکار تک نہ لیں۔ آدمی کیا شراب
کی بھٹی ہیں۔ اولڈ ٹام کا پیپا ہیں۔ خدا ایسے حضرات سے پناہ میں رکھے
ججوں اور مجسٹریٹوں کے بیان سے ظاہر ہوا کہ لندن میں ۹/۱۰ مقدمے
ایسے آتے ہیں جو خاص کثرت بادہ گساری سے تعلق رکھتے ہیں جس
اخبار کو پڑھیے، جس رسالہ کو کھولیے، جس میگزین کو دیکھیے، یہ ضرور
پائیے گا کہ شرابیوں نے اتنے آدمی حالت نشہ میں قتل کر ڈالے فلاں
شخص نے شراب اس کثرت سے پی کہ مخمور و خراب ہو کر تین آدمیوں
پر گولی سر کی۔ دو زخمی ہوئے اور ایک راہی ملک بقا۔ الامان الامان
تین شرابیوں نے مل کر فلاں کوٹھی میں چوری کی، گرفتار ہوئے تو
غیں تھے۔

الغرض یہ شراب ام الخبائث ہے۔ انواع و اقسام کے گناہ اور

جرائم اور برائیاں اس سے سرزد ہوتی ہیں۔

اور لطیفہ سنیے وہ لکھتے ہیں کہ اگر وہاں کی شراب کی دوکانیں اور کوٹھیاں ایک قطار میں ہوں تو بہتر میل جگہ اُنکے لیے چاہیے۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ توبہ توبہ، بہتر میل کا فاصلہ یا تھا ہی چند ہی گھنٹوں میں طے کرتے ہیں اور وہ بھی اس حالت میں جب تیزی کے ساتھ لڑنے کے لیے فوج ڈبل مارچ کرتی جاتی ہے۔ کوئی چالیس برس کا عرصہ ہوا کہ لندن کے کاریگروں نے ایک جلسہ منعقد کیا اور کوشش موفور کی کہ شراب خواری کا انسداد ہو جائے مگر ان کی سعی مشکور نہ ہوئی۔ پادریوں نے ان کی مدد نہ کی کیونکہ وہ بھی عموماً شراب پیتے ہیں اور جن لوگوں کو مذہب کا خیال ہے انھوں نے پادریوں کے خوف سے ان بیچاروں کا ہاتھ نہ بٹایا۔ تاہم خدا کے ان مقبول بندوں نے اپنی کوشش کو قائم رکھا اور استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اب اُن کی رائے اور انکی سوسائٹی پر عوام بھی کسی قدر توجہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ شراب خواری کے لیے کوئی ایسا قانون نافذ ہو کہ اُس کی کثرت اس قدر نہ رہے جسقدر اب ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کثرت شراب خواری سے سرکار کی خوب بن آتی ہے کیونکہ اس کا محصول کثرت سے آتا ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ اگر مذہب بودھ کے چند پادری یہاں بھیجو تو خوب بات ہو۔ وہ لوگ یہاں آکر ہم کو سکھائیں اور بتائیں کہ شراب خواری کیسی بلا اور بے درماں ہے۔

بھئی واللہ بات تو خوب سوجھی۔ ادھر تو انگلستان اور امریکہ سے پادری یہاں آئیں کہ اہل ہند کو چل کر راہ نیک بتائیں اور ادھر ہمارے

ملک سے ہندوؤں اور یہودیوں کے گروہ انگلستان جائیں اور وہاں کے
لوگوں کو اپنے خیالات کے بموجب سیدھے ڈھرے پر چلائیں۔
الغرض شراب خواری کی مضرتیں اہل خرد پر مخفی نہیں رہ سکتیں
کوئی فرد بشر ایسا نہیں جو کثرت بادہ گساری کو پسند کرتا ہو یا اسکی توصیف
میں دلائل عقلی پیش کر سکتا ہو۔ ہاں دوا کے طریق پر پینا اور اعتدال کا ہمیشہ
خیال رکھنا عمدہ بات ہے۔ اس تمہید کے بعد ہم اپنے ناظرین کو مضار شراب
خواری کے ثبوت میں ایک داستان عبرت توامان سناتے ہیں اور بادہ گساری
کی بیشمار خرابیوں کو قصّے کے پیرائے میں موبمو بتاتے ہیں۔
عجب لطف ہے کہ شراب جو حضرت سرشار نے مرتے دم تک
نہ چھوڑی خود اُن کے مضمون سے کسقدر نفرت انگیز معلوم ہوتی ہے یہ دیکھکر
ہنسی بھی آتی ہے کہ آپ عالم بے عمل تھے یعنی آپ جانتے تھے کہ شراب
کی کیا کیا مضرتیں ہیں لیکن آپ اسکے چھوڑنے پر قادر نہ ہوئے ذوق
نے کیا خوب کہا ہے ع۔ چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

مولوی عبدالحلیم شرر

خاندان | مولوی عبدالحلیم شرر نسبًا شیخ ہاشمی وعباسی ہیں اور سلسلہ
امین الرشید سے ملتا ہے۔ اُن کا خاندان دولت عباسیہ کے عہد میں
عرب سے آکے عراق میں آباد ہوا۔ پھر ارض عراق کو چھوڑ کے ہرات میں
آیا۔ اسکے بعد سلطان محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اور سلطنت مغلیہ
کے دور میں جب نئے نئے ایرانی امرا کا دربار شاہی میں رسوخ ہوا تو

یہ خاندان وادی گنگا میں آکر سکونت پذیر ہو گیا۔ اُن دنوں یہ لوگ مشائخ اور علماء کی شان سے اضلاع جونپور و اعظم گڑھ میں اقامت گزیں تھے جہاں اُن کو ایک باوقعت جاگیر بھی ملی تھی۔ مولانا کے پردادا مولوی نظام الدین صاحب نے قصبۂ کرسی کے خطیب صاحب کی بیٹی سے عقد کر کے کرسی کی سکونت اختیار کر لی اور چونکہ خطیب صاحب کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اسلیئے وہی خدمت خطابت کے وارث ہوے۔

مگر چند ہی روز بعد مسٹر مارٹن جنکے نام کو لکھنو میں مارکین کی کوٹھی یاد دلا رہی ہے مولوی نظام الدین کے شاگرد ہوے اور اُن سے عربی و فارسی شروع کی مارٹن صاحب اُن کا نہایت ادب کرتے تھے اور انکے ساتھ اُن کا ایسا اچھا برتاؤ تھا کہ مولوی نظام الدین صاحب مع اہل عیال کے لکھنو میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ چنانچہ مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب مارکین کی کوٹھی ہی میں پیدا ہوے۔

مولوی نظام الدین صاحب سے اور مشہور شاعر ملک الشعرا مرزا رفیع سودا سے بہت کچھ ربط وضبط تھا۔ چنانچہ ایک دن سودا ایک خیمہ میں بیٹھے ہوے تھے۔ ایک چھوٹے سے سوراخ سے شعاع آفتاب نکل کے فرش پر پڑ رہی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ دری پر گویا کوئی موتی پڑا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے سودا سے کہا "اسوقت کوئی فی البدیہہ شعر سنائیے" مرزا رفیع نے دھوپ کی چتّی پر نظر ڈال کے ذرا فکر کی اور یہ شعر سنایا۔

عرصۂ دنیا میں اپنا تنگ کیا کاشانہ ہے
پرتو خورشید یاں موتی کا جیسے دانہ ہے

مولانا شررؔ کے والد حکیم تفضل حسین صاحب کا عقد اپنے ایک قریبی رشتہ کے ماموں منشی قمر الدین صاحب کی صاحبزادی سے ہو گیا جو روساء و شرفائے قصبہ کرسی میں سے تھے لیکن امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد میں ایک بڑی معزز خدمت پر مامور تھے اور دربار شاہی میں بہت اثر رکھتے تھے۔

مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب بڑے قابل اور فاضل لوگوں میں تھے۔ عربی کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی تھی۔ فارسی میں یگانہ عصر تھے۔ طب مشہور طبیب لکھنؤ حکیم محمد ابراہیم صاحب سے پڑھی تھی۔ غدر کے پانچ چھ برس بعد اپنے خسر منشی قمر الدین صاحب کے تعلقات کی وجہ سے وہ بھی کلکتہ پہنچے۔ اور سلطان عالم واجد علی شاہ کی ملازمت اختیار کی۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم

مولانا شرر سنہ ۱۸۶۰ء میں شہر لکھنؤ کے محلہ جھنوائی ٹولہ میں تکیہ پیر غیب کے متصل اپنے خاندانی مکان میں پیدا ہوئے اور پانچ برس کی عمر میں اپنے نانا کے بھائی مولوی محمد حفیظ الدین صاحب سے جو کٹرہ بزن بیگ خاں میں رہتے تھے اور فارسی و عربی کے مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے الف بے شروع کی۔ لیکن مکتب میں بیٹھے تین سال کے قریب زمانہ گزر گیا اور پارۂ عم سے زیادہ ترقی نہ کر سکے۔ تعلیم کی اس سست رفتاری نے سات ہی آٹھ برس کی عمر میں انھیں وطن سے نکال کے کلکتہ پہنچایا۔ جہاں والدہ کے کنار عافیت سے دور رہ کے طالب علمی کی تکلیفیں اور غربت کی مصیبت کم سنی ہی میں برداشت کرنی پڑی۔

کلکتہ کا قیام اور تعلیم

والد بزرگوار نے جب دیکھا کہ لکھنؤ میں تعلیم کی

پوری نگرانی نہیں ہوسکتی تو سنہ ۱۲۸۶ ہجری مطابق سنہ ۱۸۶۹ء میں انھیں اپنے پاس کلکتہ میں بلا لیا۔ وہاں مٹیا برج میں اُن کا قیام منشی سلطان بہادر کے مکان پر تھا جو دربار شاہی کے ایک بڑے بارسوخ رکن تھے۔ وہیں مولانا شرر کو بھی قیام کرنا پڑا۔ حافظ الٰہی بخش صاحب وہاں ایک بزرگ تھے اُن سے قرآن ختم کیا۔ اور والد بزرگوار سے ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے یہاں تک کہ دو سال میں شرح مائتہ عامل اور گلستان، بوستاں ختم کیں۔ اور شاہزادہ مرزا جہاں قدر بہادر کے استاد ملا باقر سے کتب ہدایۃ النحو، کافیہ اور شرح ملا جامی کو ختم کیا۔ اور منشی عبداللطیف صاحب مرحوم سے جو بڑے صاحب علم خوشنویس تھے، شرح وقایہ اور خطاطی کی تعلیم پائی۔ اُن دنوں مٹیا برج میں مولوی سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی (جو فی الحال حیدرآباد میں نظام کالج کے پروفیسر ہیں) بعض شاہزادوں کی تعلیم پر مامور تھے۔ مولانا نے معقولات کی ابتدائی درسی کتابیں قطبی و میبذی تک انھیں سے پڑھیں اور اسی زمانہ میں مولوی محمد حیدر صاحب سے انگریزی شروع کی اور ادب عربی کی بھی دو ایک کتابیں پڑھیں۔ اسی کے قریب زمانہ میں حکیم محمد مسیح صاحب مرحوم سے طب کی دو ایک کتابیں مطالعہ کیں اور چند روز مطب کیا۔ ان دنوں معمول تھا کہ ہمیشہ سال دو سال بعد لکھنؤ میں آکر پانچ چھ ماہ رہتے تھے۔ یہاں کے قیام میں بھی اکثر اساتذہ سے پڑھا۔ چنانچہ پہلے مولوی محمد یحییٰ صاحب سے پھر مولوی عبدالباری صاحب سے درمیانی درجہ کے کتب معقول پڑھے۔

شہزادوں سے خصوصیت اور محلات شاہی میں آمد و رفت

اب مولانا کی عمر تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہ ہوگی اور کلکتہ میں ان کو شہزادوں کی صحبت میسر تھی۔ مرزا محمد علی مرزا بہادر۔

مرزا کام بخش بہادر اور مرزا محمد جلال بہادر سے خصوصیت تھی۔ اُن سے اسقدر تعلقات بڑھ گئے تھے کہ شاہزادوں کو بغیر ان کے اور ان کو بغیر اُن کے چین نہ پڑتا تھا۔ تعلیم کے سوا جو وقت ملتا انھیں کی صحبت میں صرف ہوتا۔

بعض شہزادوں سے اسقدر گہرے تعلقات ہو گئے تھے کہ زنانخانے تک میں اُن کی آمد و رفت تھی۔ اور درحقیقت مولانا کے لیئے زباندانی کا پہلا مدرسہ یہی صحبت تھی کیونکہ اس زمانہ کا لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا تھا جس میں زبان اُردو کا نشو و نما ہو سکتا۔ بلکہ اب اس کا قائم مقام مٹیا برج اور مٹیا برج میں بھی خاص محلات شاہی تھے۔

ملازمت اور سلسلۂ تعلیم بدستور

تقریباً ۱۸۶۰ء میں جب کہ مولانا شرر کی عمر پندرہ سال کی تھی اپنے نانا کی خدمت پر مامور ہو کر ملازمین شاہی میں شامل ہو گئے اور اُن کے نانا ترک ملازمت کر کے لکھنؤ چلے آئے۔ اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ یہ مولانا کی پہلی ملازمت ہے مگر وہاں کی ملازمت میں کسی قسم کی پابندیاں نہ تھیں اسلیئے مولانا بدستور طالب العلم بنے رہے اور سلسلۂ تعلیم برابر جاری رہا۔ چونکہ ابتدائی کتابیں ختم ہو چکی تھیں اسلیے مولانا نے مرزا محمد علی صاحب مجتہد العصر کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اور اُن سے ملاحسن۔ قاضی مبارک اور حمداللہ پڑھا۔ اسی زمانہ میں ایک بڑے متبحر عجمی عالم، میرزا ہدایت اللہ شیرازی مٹیا برج میں خاص منشی السلطان بہادر کے مکان پر مقیم تھے۔ اُن کو مولانا کی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت دیکھ کے اُن سے بیحد انس ہو گیا تھا۔ اور خود انھوں نے اپنے شوق سے مولانا کو ملا صدرا کی شرح ہدایت الحکمت پڑھائی۔

خراب صحبت اور بد وضعی

لیکن باوجود اس اعلیٰ تعلیم کے شاہزادوں کی

صحبت میں حد سے زیادہ منہمک ہو جانا اور اُن کے رنگ اُن کی قطع وضع اور اُن کے مذاق کو پوری طرح اختیار کر لینا ایسی باتیں تھیں کہ ہر طرف سے انھیں بد وضعی کے الزام دیے جاتے تھے اور ہر شخص کا یہ خیال قائم ہو گیا کہ مولانا کی اخلاقی حالت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ اب اصلاح کی کوئی امید نہیں۔ یہ حالت دیکھ کر مولانا کے پدر بزرگوار حکیم تفضل حسین صاحب بہت پریشان ہوے چنانچہ مولانا کو یکایک سنہ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ بھیج دیا۔ اور اس طرح بھیجا کہ انھیں اپنے دلی دوستوں اور خاصۂ شہزادوں سے رخصت ہونے کا بھی موقع نہ ملا۔ اور پھر ان کو کلکتہ واپس جانا نصیب نہ ہوا۔ مدتوں انھیں اپنے کلکتہ کے دوستوں سے دوبارہ ملنے کی حسرت رہی۔

واپسی لکھنؤ لکھنؤ آکر مولوی عبدالحی صاحب سے تمام کتب درسیہ پڑھیں بلکہ بعض کتابیں جو مولوی محمد علی صاحب سے دیکھ چکے تھے دوبارہ مطالعہ کیں۔ ازاں بعد مفتی میر عباس صاحب سے دیوان حماسہ اور مقامات حریری کو ایسے ذوق و شوق سے پڑھا کہ مفتی صاحب کو ان سے ایک خاص محبت ہو گئی تھی۔

شادی اثناے تعلیم ہی میں مولانا کی شادی انکے حقیقی ماموں حکیم سعد الدین احمد صاحب کی صاحبزادی کے ساتھ سنہ ۱۸۷۸ء میں ہو گئی مگر ذوق علم میں اس سے کچھ کمی نہ آئی۔ مولانا کو تاریخی واقعات کی جستجو کا فطری شوق تھا۔ ایک واقعہ اس بارہ میں قابل لحاظ ہے لہذا اس کو درج کیا جاتا ہے۔

ملازمت مولوی حامد حسین صاحب مولوی حامد حسین صاحب کا معمول تھا کہ تاریخ و سیر اور حدیث اہل سنت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے

اور ان میں جو عبارتیں اپنے اغراض مناظرہ کے لیے مفید نظر آتیں انہیں نشان بنا دیتے۔ کئی کاتب مقرر تھے جو اُن عبارتوں کو کتاب اور صفحات کے حوالے سے الگ الگ کاغذوں پر نقل کرتے رہتے تھے۔ مولانا شرر اگرچہ سُنّی المذہب تھے اور مولوی حامد حسین صاحب کی اس کوشش کو یقینی طور پر دل سے پسند نہ کرتے ہوں گے مگر شوق علم اُنھیں وہاں لے گیا اور محض نایاب و بے نظیر کتب احادیث کے مطالعہ کے شوق میں مولوی صاحب موصوف کی ملازمت اختیار کی اور تقریباً دو ڈیڑھ سال تک اُن عبارتوں کی جو کاتب لکھتے تھے مقابلہ کر کے تصحیح کرتے رہے۔

دہلی بغرض حصول تعلیم جانا

مولوی نور محمد صاحب ملتانی جو مولانا عبدالحی کے شاگردوں میں تھے، اُن سے علم حدیث میں شرح نخبہ پڑھ کر صحیح ترمذی شروع کی اور چند ہی روز میں حدیث کی تعلیم کا ایسا شوق ہوا کہ گھر میں کسی کو خبر کیے بغیر سنہ ۱۸۷۹ء میں یک بیک دہلی جا پہونچے۔

سرسید سے ملاقات

اس زمانے میں سرسید کا شہرہ ہو رہا تھا۔ اگرچہ مرحوم پر ہر طرف سے گالیاں پڑ رہی تھیں اور شاذ و نادر ہی اُن کا کوئی مدح خواں نظر آتا تھا۔ لیکن مختلف حالات اور کارناموں نے سرسید کو ایک ایسا عجیب غریب شخص ثابت کر دیا تھا کہ مخالف و موافق ہر شخص کے دل میں ان کی صورت دیکھنے کا ضرور شوق تھا۔ چنانچہ مولانا شرر بھی دہلی جاتے وقت خاص ان سے ملنے کے شوق میں علی گڑھ کے اسٹیشن پر اتر پڑے۔ سید صاحب سے جا کر ملے۔ اور دل پر انکی باتوں کا کچھ ایسا اچھا اثر لے گئے کہ اُن کے ساتھ ایک اُنس پیدا ہو گیا۔ دہلی میں چند روز قیام کیا ہوگا

کہ اتفاقاً مسدس حالی نظر سے گزرا جو بیکر طلبہ کی نظر میں تو کھٹکتا تھا مگر مولانا شعر کو لیکے پڑھتے ہی سید صاحب سے بجائے اُن کے گرویدگی پیدا ہو گئی

دہلی میں مولوی سید نذیر حسین صاحب محدث سے حدیث شروع کی اور ڈیڑھ سال میں صحاح ستہ۔ موطا امام مالک اور تفسیر جلالین ختم کرکے لکھنو واپس آئے۔

تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے

قیام دہلی کے زمانے میں عرب کے شہر ابقیر کے دو طالبعلموں کے ذریعے سے مولانا کو محمد بن الوہاب نجدی کا رسالہ التوحید دستیاب ہوا۔ ہوا سقدر پسند آیا کہ فوراً اسکا ترجمہ کر ڈالا۔ اور مولوی تلطف حسین صاحب نے اسکو چھپوا کر شایع بھی کر دیا۔ اس طریقہ سے مولانا نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔

اودھ اخبار میں مضامین لکھنا

دہلی سے واپس آکر مولانا کو فکر معاش ہوئی۔ مولوی عبدالحی صاحب کی سفارش سے آپ منشی نولکشور کے یہاں گئے وہ بڑے مردم شناس آدمی تھے۔ اُنھوں نے مولانا سے چند سوالات کیے اور اُسکے بعد کہا "سینۂ تصحیح آپ کے لیے مناسب نہیں (جس کی سفارش مولوی عبدالحی صاحب نے کی تھی) اُس میں رہ کر آپ کسی قسم کی ترقی نہ کر سکیں گے۔ اگر ممکن ہو تو آپ اودھ اخبار میں مضامین لکھا کیجیے"

اودھ اخبار کی اسسٹنٹ ایڈیٹری

مولانا نے اس سے پیشتر مختلف اخباروں میں مضامین لکھے تھے اور منشی احمد علی کسمنڈوی مرحوم کی صحبت میں اکثر مضمون نگاری کی تھی۔ اُنہیں کی تجویز سے

شرر کا تخلص اختیار کیا تھا اور دو چار غزلیں بھی کہی تھیں۔ گو ان سے تلمذ نہ تھا اور جو کچھ کہتے تھے اُس پر حیدر آباد پہنچکر اپنے پُرانے استاد مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ لیکن اخبارات کی دنیا اور مضمون نگاری کی طرف اُن کو منشی احمد علی کسمنڈوی ہی نے متوجہ کیا تھا غرض جس وقت منشی نولکشور صاحب نے یہ مشورہ دیا ہے وہ مضمون نگاری سے ناآشنا تھے۔ جواب دیا کہ "آپ کوئی سبجکٹ بتائیں میں اس پر مضمون لکھکر پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں اودھ اخبار کی خدمت کے لیئے حاضر ہوں" منشی صاحب نے ایک سیاسی مضمون بتا دیا اور مولانا شرر نے دوسرے ہی دن اودھ اخبار کے دو صفحوں کا ایک مضمون لکھ کے پیش کیا جسے منشی صاحب نے بہت پسند کیا اور سنہ ۱۸۸۰ء میں تیس روپیہ ماہوار پر اودھ اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔

اب مولانا کو جوہر طبع دکھانے کا نیا میدان ملا تھا۔ برابر مضامین لکھنا شروع کیے لیکن اُن کے مضامین زیادہ تر علمی، خیالی اور فلسفیانہ مذاق کے ہوتے تھے۔ یہ مضامین مسلسل دو سال تک نکلتے رہے اور ملک میں ہر طرف اُن کی ایسی دھوم مچ گئی کہ اسی وقت سے مولانا کے لٹریچر کا شہرہ ہو گیا اور بڑے بڑے پُرانے لکھنے والے چونک پڑے۔ اودھ اخبار کے فائل میں آج بھی وہ مضامین موجود ہیں اور بتا رہے ہیں کہ محض اُن مضمونوں کی وجہ سے اس زمانہ کا اودھ اخبار کس قدر نمایاں امتیاز رکھتا ہے۔ روانی طبع کی یہ حالت تھی کہ مولانا صرف چار پانچ روز میں بیٹھ کے اتنے مضمون لکھ دیتے کہ مہینہ بھر تک اودھ اخبار میں شایع ہوتے رہتے۔ اُن مضمونوں کے عنوان اس قسم کے ہوتے تھے کہ وہ چاہے کتنے ہی دنوں بعد چھپتے، پُرانے نہ سمجھے جاتے

ان مضامین میں ایک مضمون "شب" پر مولانا کے قلم سے نکلا تھا۔ اسکو
پڑھکر سر سید احمد خاں نے منشی نولکشور کو اس مضمون کا ایک خط بھیجا کہ "اودھ
اخبار میں "شب روشن" پر جو مضمون چھپا ہے بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ میں اپنی تفسیر میں
اسکے چند خیالات کو لینا چاہتا ہوں۔ لہذا اُن صاحب سے جن کا وہ مضمون ہو مجھے
اخذ کرنے کی اجازت دلوا دیجیے"۔ منشی نولکشور نے مولانا سے دریافت کرکے
سید صاحب کو اُن کی خواہش کے مطابق اجازت دیدی۔

رسالہ محشر کا اجرا

اسی زمانے میں مولوی محمد عبدالباسط صاحب کے
نام سے مولانا نے ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا
جس کا نام محشر تھا۔ اس میں اول سے آخر تک کل مضامین مولانا ہی کے
قلم کے ہوتے تھے۔ محشر رنگین اور شاعرانہ مذاق کا پرچہ تھا جس میں بہت سی
نازک قسم کی خیال آرائیاں ہوتی تھیں۔ ایک زمانہ تک اس میں "زمانہ کا جائزہ"
کے عنوان سے ایک نرالے مضمون کا سلسلہ جاری رہا۔ اُردو میں یہ نیا اور
اچھوتا رنگ تھا۔ سب لوگوں نے عموماً اور انگریزی خوانوں نے خصوصاً ان
مضامین کو بہت پسند کیا۔

رفیق ہند میں راجہ بلی کے نام سے پادری رجب علی صاحب
اکثر مضامین لکھتے تھے راجہ بلی نے ایک بار لکھا کہ جو رنگ محشر کا ہے صرف
عاشقی اور شاعری کی دنیا کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر ایڈیٹر محشر کو دعویٰ ہے
تو ان دو چار سبجکٹوں پر اسی رنگ میں مضامین لکھیں جو ہم بتاتے ہیں
اور انھوں نے چند سبجکٹ بھی شایع کیے جن میں ایک تو "روپ" تھا۔ ایک یہ
کہ "ہندوستان کے لیے استمراری بندوبست مناسب ہے یا میعادی؟"
اور اسی قسم کے اور بھی کئی عنوانات تھے، مولانا نے ان سب عنوانوں پر اپنے

اسی رنگ میں نہایت پُرزور مضامین لکھ کر محشر میں شایع کیے جن کو دیکھکر لوگ عش عش کرنے لگے اور راجہ بلی صاحب نے خاموشی سے داد قبولیت دی۔

حیدرآباد کا قیام اور اودھ اخبار سے قطع تعلق

دو سال بعد منشی نولکشور نے مولانا کو خاص نامہ نگار بنا کر ریاست حیدرآباد دکن میں بھیجا جسکی وجہ سے محشر بند ہو گیا۔ وہاں نواب محسن الملک نے مولانا شرر کو ہاتوں ہاتھ لیا اور بعض اوقات اس بات کا شوق بھی دلایا کہ وہ حیدرآباد کی ملازمت اختیار کرلیں۔ لیکن مولانا نے اس امر کو وضعداری کے خلاف سمجھا۔ اتفاقاً اخبار ہزار داستان کے مالک نے یہ سمجھکر کہ مولانا شرر انکے پرچہ کی اڈیٹری قبول کرلیں گے اپنے سابق اڈیٹر سے قطع تعلق کرلیا۔ اور مولانا پر ہر طرف سے زور ڈلوایا کہ وہ اخبار مذکور کی اڈیٹری قبول کرلیں۔ مولانا اس شرط پر راضی ہوے کہ واپس لکھنؤ جاکر موجودہ ملازمت سے مستعفی ہوں اور پھر وہاں سے حیدرآباد آئیں۔ مالک ہزار داستان نے یہ شرط قبول کرلی اور آمد و رفت کا کرایہ دیا۔ مجبوراً مولانا لکھنؤ واپس آے اور اودھ اخبار سے قطع تعلق کیا مگر مطبع کے حسابات کا تصفیہ نہیں ہونے پایا تھا کہ ہزار داستان بند ہو گیا اور مولانا کو حیدرآباد جانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

ناول نگاری

اودھ اخبار سے قطع تعلق کرنے کے بعد مولانا شرر نے پرائیوٹ طور پر اپنی انگریزی کی قابلیت بڑھانا شروع کیا۔ اور اچھی اور کافی استعداد بہم پہنچائی۔ اسی زمانے میں مولانا نے اپنا پہلا ناول دلچسپ لکھا جسے منشی نثار حسین صاحب مالک پیام یار نے چھپوایا اور اسکو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دوسرا حصہ لکھنے کے ساتھ ہی پہلے حصہ کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی ضرورت ہوئی۔ اسکے بعد مولانا نے

درگیش نندنی کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا۔ یہ بھی خوب مقبول ہوا۔

دلگداز کا اجرا

۱۸۸۶ء کے آخر میں مولوی بشیر الدین صاحب مالک و اڈیٹر البشیر اٹاوہ سے لکھنؤ میں اتفاقیہ ملاقات ہو گئی انھوں نے مولانا کو مشورہ دیا کہ وہ ایک مختصر ادبی رسالہ جاری کریں اور مولوی بشیر الدین نے پانچ روپیہ پانچ رسالوں کی قیمت اسی وقت پیشگی ادا کیے کیونکہ یہ تجویز تھی کہ ایسے رسالہ کی قیمت صرف عہ سالانہ ہو انھیں روپیوں سے مولانا نے دلگداز کا اشتہار شایع کیا اور اشتہار کے شایع ہوتے ہی کثرت سے درخواستیں اور قیمتیں آنا شروع ہو گئیں۔ اور اسی آمدنی سے جنوری ۱۸۸۷ء سے دلگداز شایع ہونا شروع ہو گیا۔ دلگداز میں اس وقت صرف شاعرانہ و عاشقانہ خیالی مضامین ہوتے تھے۔ یا کبھی کبھی تاریخی مضامین نکل جاتے تھے۔ اور سال رواں کے ختم تک اس کے دو ہزار خریدار ہو گئے تھے۔

ملک العزیز ورجنا

۱۸۸۸ء میں ایک جزو ناول کا بھی دلگداز میں اور بڑھا دیا گیا اور قیمت عہ کی بجائے عا کر دی گئی اس سال میں ناول "ملک العزیز ورجنا" مولانا کے قلم سے تصنیف ہو کر مکمل شایع ہوا۔ اور اردو پبلک نے اس کو بیحد پسند کیا اسی سال میں دلکش کا پہلا حصہ لکھا جس میں دلچسپ کی طرح ہندوستان کی موجودہ سوسائٹی سے بحث تھی۔ اور چند روز بعد اس کا دوسرا حصہ لکھا لیکن اس پر بھی وہ نامکمل رہا۔

تاریخی ناولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا

مولانا نے اس ناول کی تکمیل کے بعد ہی تاریخی ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور یہ بھی کوشش کی کہ تاریخ اسلام میں جتنے دلچسپ واقعات ملیں ان کو

ناول کا جامہ پہنا کر اس طرح دلچسپی کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیا جائے کہ لوگوں میں تاریخ کا شوق بڑھے۔ اور اس ذریعے سے انکی واقفیت میں وسعت ہو۔ ملک نے اُن کی اس تجویز سے بہت فائدہ اُٹھایا اور ہر گروہ کو تاریخی ناولوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

ملک العزیز کے بعد ۱۸۹۸ء میں دلگداز کے ساتھ ناول "حسن انجلینا" اور ۱۸۹۹ء میں ناول "منصور موہنا" شائع ہونے لگے علاوہ شہیدِ وفا کے نام سے ایک تاریخی ڈراما شائع ہوا۔

اخبار مہذب

۱۸۹۰ء میں مولانا نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کر دیا جس کا نام مہذب تھا۔ ہر پرچے میں علمائے سلف میں سے کسی کی سوانح عمری بھی لازمی طور پر شائع ہوتی تھی۔

حیدرآباد جانا اور انگلستان کا سفر

اب دلگداز پریس بھی جاری کر دیا گیا تھا۔ رسالہ دلگداز بھی نکل رہا تھا جسکے ساتھ ناول "یوسف نجمہ" شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اخبار مہذب بھی ہفتہ وار شائع ہو رہا تھا۔ اور ان سب کاموں کا بار مولانا کے سر تھا جسے وہ بڑی کامیابی کے ساتھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ یکایک بعض مالی دشواریاں پیش آئیں اور مولانا اپریل ۱۸۹۶ء میں حیدرآباد دکن چلے گئے۔

اپنے پہلے سفر کے خلاف اس مرتبہ مولانا کو ملازمت کا شوق تھا لیکن کہیں موقع نہ ملا۔ ایک دن اتفاقاً مولانا فلک نما کی عمارت دیکھنے کو گئے یہاں بعض احباب کی تقریب پر نواب وقارالامرا بہادر سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں معین المہام مال تھے۔ انھوں نے چھوٹتے ہی سوال کیا کہ میں آپ کو اپنے بیٹے کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے انگلستان بھیجنا چاہتا ہوں۔ آپ جائیں گے؟

مولانا نے جواب دینے کے لیے تین دن کی مہلت مانگی۔ اور کل احباب نے قبول کر لینے ہی کا مشورہ دیا۔ اسلیے تیسرے دن وہاں جاکر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر فرمایا "تو آپ لکھنؤ جا کر اپنے مطبع اور کاروبار کا انتظام کر آئیے" مولانا فوراً لکھنؤ آئے۔ مطبع اور کارخانے کو بند کیا۔ اور انگلستان کے شوق میں پندرہ روز کے اندر ہی حیدرآباد واپس گئے۔

مگر جب وہاں پہنچے تو نواب وقارالامرا بہادر نے غالباً اپنے کسی ایسے مشیر کے مشورہ سے جو نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور شخص بھیجا جائے ٹالنا شروع کیا اور مولانا کی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ اپنے خزانہ پائگاہ سے مقرر کر دی چند روز میں نواب وقارالامرا بہادر مدارالمہام ریاست ہو گئے اور انھیں زیادہ فکر ہوئی کہ کسی کو اپنے فرزند نواب ولی الدین خاں بہادر کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجیں۔ مولانا نے اس زمانۂ بیکاری میں اپنی تاریخ سندھ لکھنی شروع کی۔ اور نواب وقارالامرا بہادر نے صرف مسودہ پڑھ کر اسقدر پسند فرمایا کہ پانچ ہزار روپیہ خزانہ ریاست سے بطور انعام دلوائے۔

یہ سب کچھ تھا مگر انگلستان جانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ آخر ۱۸۹۳ء میں مولانا نے ایک دوست کو مطبع کا منیجر مقرر کیا اور دلگداز کو پھر جاری کر دیا ناول "یوسف و نجمہ" جو ۱۸۹۱ء میں ناتمام رہ گیا تھا۔ اسکو مکمل کرنے کی بجائے اسپین کے عہد خلافت بنی امیہ کا ایک نیا ناول شروع کر دیا جسے لوگ بڑے ذوق و شوق سے پڑھنے لگے۔ اور مولانا نے "خاندان رسالت" کے نام سے ایک مضمون لکھا جس پر اہل تشیع نے سخت برہمی ظاہر کی۔ ابھی یہ نیا ناول بھی پورا نہ ہوا تھا کہ یکایک نواب وقارالامرا بہادر نے مولانا کو حکم دیا کہ اسکے صاحبزادے کے ہمراہ چند پندرہ روز کے لیے ہندوستان میں واپس آ گئے تھے

ایک ہفتہ کے اندر انگلستان روانہ ہو جائیں۔ مجبوراً مولانا کو وسط ۱۸۹۵ء

میں سفر انگلستان کی وجہ سے دلگداز کو پھر بند کرنا پڑا۔

مولانا کے ناولوں کی قدر اگرچہ مولانا انگلستان میں تھے مگر انکے ناولوں کی مانگ ہندوستان میں روز بروز بڑھتی جاتی

تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مطبعوں نے بغیر حصول اجازت مولانا کے ناولوں کو چھاپنا شروع کر دیا اور بہت سے اڈیشن شایع کیے۔ یوسف و نجمہ اور زیاد و حلاوہ کے ناتمام اجزا بھی اُسی ذوق و شوق سے ملک میں خریدے اور پڑھے گئے جس ذوق و شوق سے کہ مکمل ناول خریدے اور پڑھے گئے۔

قیام انگلستان مولانا انگلستان میں تین سال رہے وہاں انھوں نے ایک فرانسیسی پروفیسر سے فرنچ زبان شروع کی اور اس میں اتنا درخور پیدا کر لیا کہ فرانسیسی سے اُردو میں ترجمہ کر سکیں اور فرانسیسی زبان کی سلیس کتابوں کو سمجھ لیں۔

انگلستان سے واپسی اور دلگداز کا اجرا حیدرآباد سے انگلستان سے واپس آکر مولانا نے ۱۸۹۶ء میں "زیاد و حلاوہ" کے تمام ناول کو مکمل کیا اور "فلورا اور فلورنڈا" کے نام سے شایع کیا

اور کچھ عرصہ کے بعد ۱۸۹۸ء میں خاص حیدرآباد سے دلگداز جاری کیا۔ اس سال دلگداز کے ساتھ عہد جاہلیت عرب کا ایک ناول شروع کیا گیا جس میں قبل اسلام عربوں کی سیاسی حالت، معاشرت، ان کا مذاق اور انکے رسوم و رواج بڑی کامیابی کے ساتھ دکھلائے۔ اور دلگداز میں تاریخی تحقیقاتیں شایع کیے۔ سال کے آخری حصہ میں مولانا نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی حضرت سکینہ کی سوانح عمری لکھنی شروع کی۔ چونکہ انکے حالات عام خیال کے

خلاف تھے اسلیے حضرات اہل شیعہ و نیز اہل سنت والجماعت میں بھی برہمی پیدا ہوگئی اور کوتوال شہر نے مولانا سے مل کر کہا کہ "اگرچہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے صحیح ہے مگر بہتر یہ ہوگا کہ دلگداز میں اس سوانح عمری کا سلسلہ روک دیا جائے"۔ چونکہ مولانا کی طبیعت میں ہمیشہ سے آزادی اور ضد رہی ہے اسلیے اس سوانح عمری کے سلسلہ کو برابر جاری رکھا۔

لکھنؤ کی واپسی

چھ ماہ بعد نواب وقار الامرا بہادر سے لکھنؤ میں قیام کرنے کی باضابطہ اجازت حاصل کی اور ۱۸۹۹ء کے آخر میں وطن آئے اور یہاں آکر پہلا کام یہ کیا کہ ۱۸۹۸ء کی جلد میں جو ایک نمبر باقی رہ گیا تھا اُسے چھپوایا اور "سکینہ بنت حسین" کا باقی ماندہ حصہ بھی شایع کردیا اور ناول "ایام عرب" کی پہلی جلد بھی مکمل ہوگئی۔

قیام حیدرآباد کے زمانے میں مولانا نے ناول "فردوس بریں" تیار کیا تھا اور ایک ضخیم تاریخ ارض مقدس لکھنا شروع کی تھی۔ ابھی وہ مکمل نہوئی تھی کہ مولانا کو "فلورا فلورنڈا" خود ہی شایع کرنا پڑا۔ اور فردوس بریں کے پہلے ایڈیشن کے شایع کرنے کا حق منشی نثار حسین صاحب نثار مہتمم پیام یار کے ہاتھ فروخت کرڈالا۔ ان دونوں ناولوں کا ملک پر بہت اچھا اثر پڑا اور غیر معمولی ذوق و شوق سے لیے گئے۔

سنہ ۱۹۰۰ء کے دلگداز میں ناول "ایام عرب" کی دوسری جلد ختم کرکے پھر ناول "مقدس نازنین" کو تصنیف کیا۔ بعد ازاں "تاریخ حروب صلیبیہ" کا ترجمہ اور ایک انگریزی ناول "ڈاکو کی دلہن" کا ترجمہ شایع کرنا شروع کیا۔

مولانا شرر پردہ کے خلاف ہیں چنانچہ ایک ناول "بدرالنسا کی مصیبت"

اور ایک ڈراما "میوۂ تلخ" پردے کی مخالفت میں شائع کرائے۔ اس مسئلہ میں اُن کی دلچسپی اسقدر بڑھی ہوئی تھی کہ لکھنؤ آکر ابتداء سنہ ۱۹۱۰ء سے ایک ماہوار رسالہ بنام "پردۂ عصمت" اپنے دوست سید حسن شاہ کے نام سے جاری کرا دیا جس میں خود ہی لکھتے تھے اور اوّل سے آخر تک خود ہی اسے اڈیٹ کرتے تھے۔ اُسوقت مولانا شرر کا یہ اعتقاد ہوگیا تھا اور آج تک ہے کہ شرع اسلام میں پردہ صرف مہذب اور ساتر لباس کا نام ہے۔ اور اُسکے حدود یہ ہیں کہ چہرہ اور ہاتھ داخل ستر نہیں۔ یہی خانہ نشینی جو مروج ہے اُس پر عورتوں کو مجبور کرنا شرعاً جائز نہیں اور ساری اخلاقی خرابیاں اسی خانہ نشینی سے پیدا ہوتی ہیں۔

حیدرآباد کی طلبی

جون سنہ ۱۹۱۰ء میں نواب وقار الامرا کی طلبی پر مولانا حیدرآباد واپس گئے۔ جسکے ساتھ دلگداز بھی بند ہوگیا اور پردۂ عصمت پر بھی پردہ پڑگیا۔ مولانا کو حیدرآباد پہنچے ہوئے ابھی چند مہینے ہوئے تھے کہ یکایک وہاں ایک انقلاب عظیم برپا ہوگیا۔ نواب وقار الامرا بہادر جو مولانا کے مربی اور قدردان تھے وزارت سے علیحدہ کر دیے گئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کا دور شروع ہوا۔ اور مسٹر واکر حیدرآباد کی قسمت کے مالک ہوئے جنھیں نہ مولانا سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا اور نہ کسی قسم کی مراعات کی وجہ تھی۔ لہذا انھوں نے مولانا کا سلسلۂ ملازمت حیدرآباد ہی منقطع کر دیا اور مولانا اوائل سنہ ۱۹۱۱ء میں پھر لکھنؤ واپس آئے اور جنوری ۱۹۱۲ء سے پھر دلگداز جاری کیا۔

اتحاد کا اجرا

اس مرتبہ مولانا دل میں ایک نیا خیال لیکر آئے تھے وہ یہ کہ ہندو مسلمانوں میں اتفاق پیدا کیا جائے۔

جسکے بغیر کوئی کام نہیں چل سکتا۔ اور ہندوستان کی ترقی غیر ممکن ہے چنانچہ آتے ہی دلگداز سے پہلے "اتحاد" نام ایک پندرہ روزہ رسالہ نکال دیا جسکی خاص کوشش یہ تھی کہ ان دونوں گروہوں میں اتفاق پیدا کرایا جاے۔ مگر مولانا کا خیال ہے کہ زندگی بھر انھوں نے جتنے کام کیے ان سب میں کامیابی ضرور رہی مگر نہ ہوئی تو اس بارے میں اور آخر ڈیڑھ سال اس رسالہ کو جاری رکھکر بند کر دیا۔

تاریخ سندہ کی اشاعت لیکن دلگداز کی اشاعت ۱۹۰۲ء سے شروع ہو کر کئی سال تک برابر قائم رہی اور اُسکے ساتھ "شوقین ملکہ" جس میں دوسری لڑائی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں شایع ہونا شروع ہوا۔ اگست ۱۹۰۷ء میں تاریخ حروب صلیبیہ ختم اور مکمل ہو گئی اور مولانا نے اپنی مصنفہ تاریخ سندہ دلگداز کے ساتھ شایع کی۔

اس تاریخ میں سندہ کی حکومت عرب کے حالات عربی کی مستند کتابوں سے قدیم عرب سیاحوں کے سفرناموں اور پُرانے جغرافیوں سے لیکر جمع کیے ہیں جو اسوقت تک کسی مورخ کی نظر سے نہیں گزرے تھے اور تمام معاملوں میں بڑی تنقید و تحقیق سے کام لیا۔

اسی زمانہ میں مولانا نے رسالہ "العرفان" مولوی محمد سعید الحق کے نام سے جاری کیا، جو اپنی نوعیت کا پہلا اور عجیب و غریب رسالہ تھا۔ اس میں الہیات اور تصوف سے بحث کی جاتی اور دینداری کی تعلیم ایسے دلچسپ اور موجبہ طریقہ سے دیجاتی تھی کہ جس کسی نے اُسے دیکھا پسند کیا اور دنیاے تصوف میں اسے خاص شہرت حاصل ہو گئی لیکن مولانا کے مختلف خانگی افکار اور سفر حیدرآباد کی وجہ سے وہ رسالہ بھی بند ہو گیا۔

انھیں دنوں مولانا نے ایک نیا تاریخی سلسلۂ تصانیف شروع کیا جسکا نام "سلسلۂ مشاہیر اسلام" ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب شیخ الطائفہ حضرت جنید بغدادی کی سوانحعمری ہے۔ اور دوسری حضرت ابوبکر شبلی کی لائف۔ تیسری کتاب یعنی امام ابوالحسن اشعری کی سیرت کا مواد جمع کر چکے تھے کہ سفر حیدرآباد پیش آیا۔

اس سلسلہ کی کتابوں کو صاحب علم مسلمانوں نے بے انتہا پسند کیا اور واقعی انکے مطالعہ سے مولانا کا تاریخی تبحر اور ان کی وسعت نظر کے ساتھ ان کی تحقیق و تنقید کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں مولانا نے ایک ناول "فتح اندلس" تصنیف کیا جو مقبول عام ناول ہے۔ آغا صادق کی شادی کے نام سے ایک چھوٹا سا ناول مطبع دلگداز سے شایع کیا جو نہایت ہی دلچسپ اور با مذاق ہے۔

فروری سنہ ۱۹۰۶ء میں مولانا نے دلگداز میں آٹھ صفحہ اور بڑھا دیے اور اُن صفحات پر مرزا آغا علی خاں رئیس لکھنؤ کے حالات زندگی شایع کرنا شروع کیے اور اسی سال کے شروع سے دلگداز کے ساتھ ناول "یوسف و نجمہ" جو ناتمام تھا مکمل کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ چنانچہ اختتام سال کے ساتھ وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور جنوری سنہ ۱۹۰۷ء سے ایک نیا ناول قیس و لبنیٰ شروع ہوا جو دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء میں پورا ہوا۔

مگر ان سب کتابوں کا تکملہ حیدرآباد میں پہنچکر ہوا کیونکہ جنوری سنہ ۱۹۰۸ء میں مولوی عزیز مرزا صاحب کے علمی مذاق نے مولانا کو پھر حیدرآباد کیطرف کھینچا۔ جہاں اب وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہو کر گئے اور جاتے ہی اپنی خدمت کا چارج لے لیا اور باجازت سرکار نظام دفتر دلگداز کو بھی

حیدرآباد منتقل کرلیا۔ اور سنہ ۱۹۱۰ء کے خاتمے کے ساتھ ناول قیس و لبنیٰ، تاریخ سندھ کی جلد دوم، اور آغائی صاحب کی سوانح عمری یہ سب مکمل ہوگئیں۔

آخر سنہ ۱۹۱۰ء میں حضور نظام کے حکم سے مولانا شرر جنکی ملازمت پنشن تک مستقل بھی نہ ہوئی تھی موقوف کیے گئے اور مولوی عزیز مرزا و مولوی ظفر علی خاں اور مولوی صفی الدین چاروں صاحبوں کو حدود قلمرو نظام سے باہر رہنے کا حکم صادر ہوگیا۔

اسکے بعد پھر مولانا شرر نے اپنے وطن لکھنؤ میں آکر دلگداز جاری کیا لیکن دو سال بھی مشکل سے لکھنؤ رہے ہوں گے کہ سنہ ۱۹۱۲ء کے شروع میں دہلی چلے گئے اور وہاں ہمدرد روزانہ اخبار کی ترتیب اشاعت کا کام مولانا محمد علی صاحب کی زیر نگرانی شروع کرنے والے تھے کہ واپس چلے آئے۔

یہاں آکر پھر وہی ناول نویسی کا مشغلہ شروع کیا چنانچہ حسن کا ڈاکو اور دربار حرام پور، انھیں دنوں میں طبع ہو کر شائع ہوئے اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے گئے۔

سنہ ۱۹۲۶ء تک آپ دلگداز کو بدستور شائع فرماتے رہے اور ناول نویسی میں بیشتر از بیشتر منہمک رہے۔

آخر دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء میں آپ نے اس دار فانی سے ملک جاودانی کو رحلت فرمائی۔

تصنیفات پر عام رائے آپ کی تحریر مغربی خیالات سے مملو ہوتی ہے اکثر ترکیبیں بھی مغربی انشا پردازی کی تقلید کا نمونہ ہوتی ہیں۔ بعض لمبے لمبے جملے کانوں کو ناگوار گزرتے ہیں

اگرچہ بعض فقروں کی بندش بہت چست ہوتی ہے۔ آپ اکثر تاریخی ناول
لکھتے ہیں لیکن اُن میں بہت سی باتیں ایسی بیان کر جاتے ہیں جنکا تعلق تاریخ
سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ عوام الناس اُن کو بھی تاریخ سمجھتے ہیں اور اس طرح تاریخ
کا غلط علم عوام تک پہنچتا ہے۔ شاید یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ قصہ کی
سب باتیں کیونکر تاریخ ہو سکتی ہیں لیکن ہم اس کا یہ جواب دے سکتے ہیں کہ
اُس زمانہ کی طرز معاشرت، طریقۂ ماند و بود، وضع و قطع، رفتار و گفتار، سیاسی
حالت اور دیگر امور سے کامل واقفیت قصہ کی جزئیات کو بھی ایسے پیرایہ میں
دکھا سکتی ہے کہ وہ واقعہ معلوم ہوں اور ان پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے
سر والٹر اسکاٹ جو انگریزی میں نامور تاریخی ناول نگار ہے اپنے ناول
میری ملکہ اسکاٹ لینڈ میں نہ صرف بڑی بڑی باتیں تاریخ سے اخذ
کر کے لکھتا ہے بلکہ ملکہ کے رہنے سہنے کے طریقہ کو، اسکے لباس کو، اسکے طرز
آرایش کو، اسکے مزاج کو، اسکے ناز و انداز کو، اور اسکے خیالات کو، اس طرح
بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ تمام امور فی الواقع اسی
طرح ہوئے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مورخ بھی اسکے ناولوں پر
کوئی بڑی حرف گیری نہیں کر سکتا۔

شرر کی تصنیفات دلچسپی سے مطالعہ کی جاتی ہیں۔ انکے بعض ناول
حقیقت میں کسی زبان کے ناولوں سے کم درجہ پر نہیں رکھے جا سکتے،
مثلاً فردوس بریں کیا بلحاظ پلاٹ اور کیا بلحاظ عبارت آرائی بلاشبہ
اُنکے بہترین ناولوں میں سے ہے ملک العزیز ورجنا کو بھی ایک خاص
درجہ مقبولیت حاصل ہے حسن کا ڈاکو بھی اپنے انداز خاص میں شہرت
پذیر ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ

بعض ناول ایسے لکھے گئے ہیں جو حضرت شرر کے شایان شان ہیں
بدرالنسا کی مصیبت کسی طرح بھی اپنے مصنف کے درجہ کی برابر نہیں ہے
تاریخ سندھ آپ کی نہایت عمدہ تصنیف ہے آپ نے بعد تلاش
و تجسس سے یہ کتاب تحریر فرمائی ہے۔ اول اول جب اہل عرب ہندوستان
میں داخل ہوئے ہیں اور اس وقت کی ہندو سلطنتوں سے اُن کی جو مٹھ بھیڑ
ہوئی ہے اسکا حال شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور نہایت خوب لکھا ہے
آپ کے مضامین انشا پردازی کے نمونے ہیں۔ خیالات بھی عمدہ
ہیں اور اُن کو اچھی زبان میں ادا کیا ہے۔
ذیل میں آپ کی تصنیفات سے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں

(از فردوس بریں)

پہلا باب

پریوں کا غول

اب تو سلسلہ بہری ہے، مگر اس ڈیڑھ سو سال پیشتر سے
سیاحوں اور خاصۃً حاجیوں کے لیے وہ نیچی اور اونچی سڑک نہایت
ہی اندیشہ ناک اور پُر خطر ہے جو بحر خضر (کیسپین سی) کے جنوبی ساحل
سے شروع ہوئی ہے اور شہر آمل میں ہو کے شاہنامے کے قدیم
دیوستان یعنی ملک مازندران اور علاقۂ رودبار سے گزرتی اور کوہسار
طالقان کو شمالاً جنوباً قطع کرتی ہوئی شہر قزوین کو نکل گئی ہے
مدتوں سے اس سڑک کا یہ حال ہے کہ دن دہاڑے بڑے بڑے قافلے

لٹ جاتے ہیں اور بے گناہوں کی لاشوں کو برف اور سردی، مظلومی و قتل و غارت کی یادگار بنا کے سالہا سال تک باقی رکھتی ہے۔

ان دنوں ابتدائے سرما کا زمانہ ہے۔ سال گزشتہ کی برف پوری نہیں گھلنے پائی کہ نئی تہ جمنا شروع ہوگئی۔ مگر ابھی تک جاڑا اتنے درجے کو نہیں پہنچا کہ موسم بہار کے نمونے اور فصل گل کی دلچسپیاں بالکل مٹ گئی ہوں۔ آخری موسم کے دو چار پھول باقی ہیں اور کہیں کہیں ان کے عاشق و قدردان بلبل بدخشانی بھی اپنی ہزار داستانی و نغمہ سنجی کے راگ سناتے نظر آجاتے ہیں۔ یہ کوہستان عرب کے خشک اور بے گیاہ پہاڑوں کی طرح برہنہ اور دھوپ میں جھلسے ہوئے نہیں بلکہ ہر طرف سایہ دار درخت اور گھنی جھاڑیوں نے نیچر پرستوں اور قدرت کے حقیقی قدردانوں کے لیے عمدہ عمدہ عزلت کدے اور تنہائی کی خلوت گاہیں بنا رکھی ہیں اور جس جگہ درختوں کے جھنڈ تھے وہاں آسمان کے نیلے شامیانے کے نیچے قدرت نے گھاس کا سبز اور مخملی فرش بچھا دیا ہے۔ جس پر بیٹھ کے کوئی شراب شیراز کے لطف اٹھانا چاہے تو یہاں نہر رکنا باد کے بدلے نہر دیہ نجان موجود ہے۔ جو شاید ابھی پوری ڈیڑھ صدی بھی نہیں گزری کہ رود سفید سے کاٹ کے پہاڑوں کے اندر ہی اندر مختلف گھاٹیوں میں گھمائی اور آخر شہر حرم آباد کے قریب بحر اخضر میں گرائی گئی ہے۔

ان ہی دلچسپیوں اور قدرت کے انھیں نظر فریب منظروں نے اس کوہسار کے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنت انھیں گھاٹیوں میں ہے اور بعض سمجھتے ہیں

کہ قدیم دیوزادوں کو تو **کیومرث، رستم و نریمان** کے زور بازو نے فنا کر دیا، مگر ان کی یادگاریں بہت سی پریاں آج تک ان تنہائی کے مقامات میں سکونت پذیر ہیں۔ خوش عقیدہ لوگوں میں سے اکثروں نے ان پریوں کو اُڑتے دیکھا ہے اور بعض سیّاحوں کو تو پریوں کے بڑے بڑے ہوش ربا غول جو گھاٹیوں سے ناگہاں نکل پڑتے ہیں، نظر آئے۔ یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ جو کوئی یکہ و تنہا ان پریوں کے غول میں پڑ جاتا ہے، فوراً مر جاتا ہے

مگر پریوں اور قدیم دیوؤں سے زیادہ ظالم ملاحدہ اور باطنیہ لوگ ہیں، جو اس تمام علاقہ میں آباد اور پھیلے ہوئے ہیں اور جو بُرا ہے اصول وعقائد کا مسلمان ان کے ہاتھ میں پڑ جاتا ہے کسی طرح جانبر نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جمادی الاولیٰ، جمادی الثانی اور رجب کے مہینوں میں، ان مظالم کی دھوم مچ جاتی ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ علاقہ ہائے **ترکستان** کر غیز اور **استراخان** کے مسلمان جب حج کو جاتے ہیں تو جہاز دیا بحر خزر سے پار ہو کے اسی علاقہ میں اُترتے اور اسی کوہسار **طالقان** کو طے کرتے ہوئے **ارض عراق** کو جاتے اور پھر وہاں سے خاک پاک حجاز کا ارادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کے مظالم کی ہر جگہ شہرت ہو گئی ہے اور بہت سے لوگوں نے یہ رستہ چھوڑ دیا مگر پھر بھی بعض بے پروا مسلمان اپنی خوش اعتقادی کے جوش میں آ نکلتے ہیں۔ علی الخصوص **آمل** اور اُسکے مضافات کے لیے تو اور کوئی رستہ ہی نہیں۔

یہ سڑک جس کا اوپر ذکر آیا، بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے مگر ہمارے پیش نظر صرف وہی حصہ ہے جہاں یہ سڑک **نہر دیر نجان** کے کنارے کنارے گزری ہے۔ اس مقام سے علاقہ **رودبار** کے

میدان ختم ہو گئے ہیں اور کوہستان کے سخت او پیچیدہ نشیب و فراز
کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہاں سے کچھ آگے بڑھ کے سڑک اور طرف گئی ہے
اور نہر کوہ البرز کے دامنوں میں چکر کھا کے دشوار گزار اور پیچیدہ
گھاٹیوں میں غائب ہو گئی ہے۔

شام میں شاید چند ہی گھڑیاں باقی ہوں گی۔ آفتاب سامنے برف
آلودہ چوٹیوں کے قریب پہنچ گیا ہے، اس کی کمزور کرنوں نے جو تھوڑی
بہت گرمی پیدا کی تھی مٹ گئی اور ہوا کے سرد جھونکے جو بلند برفستان سے
پھسلتے ہوئے آتے ہیں۔ انسان کے کپکپا دینے کے لیے کافی ہیں۔

اس جگہ پر اور ایسی حالت میں شمال کی طرف دو مسافر سر سے
پاؤں تک کپڑوں میں لپٹے اور دو بڑی بڑی گٹھریوں کی صورت
بنائے ہوئے آہستہ آہستہ آ رہے ہیں اور دونوں دو چھوٹے
چھوٹے اور تھکے ماندے گدھوں پر سوار ہیں۔ ان کی شست روی
اور مجموعی حالت سے خیال ہوتا ہے کہ کسی گاؤں کے غریب ملا یا فقیر
ہیں جو اما رست اور سپاہیانہ دونوں وضعوں سے جدا کسی دینی غرض
اور تقدس کی شان سے مذہبی سفر کو نکلے ہیں۔ مگر نہیں وہ قریب آ گئے
اور معلوم ہوا کہ نہ ملا ہیں اور نہ مشایخ بلکہ دو، نو عمر شریف زادے ہیں
اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک مرد ہے اور ایک
عورت۔ اُنکے لباس وضع لباس سے چاہے نہ ظاہر ہو مگر بشرے
بتلائے دیتے ہیں کہ کسی معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور ممکن
نہیں کہ کسی نامی اور شریف گھرانے سے نہ تعلق رکھتے ہوں۔ اس لیے
کہ موٹے موٹے اور لمبے چوڑے کمبلوں کے نیچے جنھیں سر سے پاؤں تک

لپیٹ لیا ہے دونوں شرفائے آمل کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔

مرد جس کی جوانی ہے ایک خوبصورت نوجوان ہے۔ یہ ایک اونی کفتان پر بڑا پوستین کا لبادہ پہنے ہے۔ سر پر لمبی ترکی ٹوپی ہے جو بانس کی تیلیوں سے ایک مخروطی صورت میں بنا کے بکری کی سیاہ کھال سے منڈھ دی گئی ہے۔ ٹوپی پر عمامہ ہے اور اسکے کئی پیچ سر سے نیچے اُتر کے کانوں اور گلے میں بھی لپٹے ہیں۔ پاؤں میں موزے اور ایک اونی پائجامہ ہے۔ کمر میں چمڑے کی پیٹی کسی ہے جس میں خنجر لگا ہے اور تلوار لٹک رہی ہے۔ اس نوجوان کے پاس کمان اور تیروں کا ترکش بھی ہے مگر اس عہد قدیم کے یہ ضروری اسلحہ گدھے کی زین میں بندھے ہیں اور یہی ایک حربہ ہے جس کے ذریعہ سے شکار کر کے یہ دلاور نوجوان اپنے اور اپنی دلربا ہمسفر کے لیے قوت لایموت حاصل کرتا ہے۔ الغرض ایک گدھے پر تو یہ نوجوان سوار ہے اور دوسرے پر ایک اٹھارہ، اُنیس برس کی پری جمال موٹے موٹے کپڑے اور بھدے پوستین، اُسکے زاہد فریب حسن کو بہت کچھ چھپا رہے ہیں مگر ایک باہوش کی شوخ ادائیاں کہیں چھپائے چھپی ہیں جس قدر چہرہ کھلا ہے، حسن کی شعاعیں دے رہا ہے اور دیکھنے والے کی نظر کو پہلا ہی جلوہ یقین دلا دیتا ہے کہ ایسی نازنین حسین پھر نظر نہ آئیگی ہماری آفت روزگار، مہجبین، ایک زرد ریشمی پائجامہ پہنے ہے جو اوپر سے نیچے تک ڈھیلا اور پائنوں کے گٹّوں پر خوشنما چنٹ کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ گلے میں دیبائے سرخ کا ایک کُرتہ ہے اور سر پر نیلی پھولدار اطلس کی شمارہ لیکن یہ سب کپڑے ایک گرم اور

پھولے پھالے پوستین کے اندر چھپے ہوئے ہیں - جو چیز کہ اسکے عورت ہونے کو عام طور پر ظاہر کر رہی ہے، وہ چھوٹی چھوٹی سیکڑوں چوٹیاں ہیں جو ٹھار کے نیچے سے نکل کے ایک شانے سے دوسرے شانے تک ساری پیٹھ پر بکھری چلی گئی ہیں اور رستے کے نشیب و فراز یا گدھے کی تیز روی سے بار بار کھل جاتی ہیں۔

اس دلربا لڑکی کے حسن و جمال کی تصویر دکھانا مشکل ہے مگر غالباً یہ چند باتیں مشتاق دلوں میں اور آرزو مند نگاہوں کے سامنے اسکے زاہد فریب چہرے کا ایک معمولی خاکہ قائم کر سکیں۔ گول آفتابی چہرہ جیسا کہ عموماً پہاڑی قوموں میں ہوتا ہے، سینے اور کھنچے ہوئے سُرخی کی جھلک دینے والے گال۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں۔ لمبی نوکدار پلکیں۔ مگر کسی قدر پھیلے ہوئے نازک نازک اور خمدار ہونٹھ باریک اور ذرا پھیلی ہوئی باچھیں۔ چھوٹے سے سانچے میں ڈھلی ہوئی نوکدار ٹھڈی۔ شرمگیں اور معمولاً جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ شوخ اور بے چین چشم و ابرو۔ اور اس تمام سامان حسن کے علاوہ تمام اعضا و جوارح کا غیر معمولی تناسب ہر شخص کو بے تاب و بیقرار کر دینے کے لیے کافی ہے۔

یہ دو نو عمر مسافر چاروں طرف کے منظروں کو دیکھتے ہیں اور مقامی دشواریوں کی وجہ سے دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور خاموش ہیں۔ دن کے آخر ہو جانے کے خیال سے ان کے نازک چہرے جنھوں نے ابھی تک پختگی نہیں حاصل کی پریشان ہونے لگے ہیں مگر اس پر بھی خموشی کا قفل نہیں کھلتا۔ ناگہاں کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کے نازنین لڑکی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور باریک

دلفریب آواز میں پوچھا "آج کون دن ہے"

نوجوان۔ (چپکے ہی چپکے کچھ حساب لگا کے) جمعرات۔

لڑکی۔ (حسرت آمیز لہجے میں) تو ہمیں گھر چھوڑے آج پورے آٹھ دن ہوے (ذرا تامل کر کے) خدا جانے لوگ کیا کیا باتیں کہتے ہونگے اور کیسی کیسی رائیں قائم کی جاتی ہونگی۔

نوجوان۔ یہی کہتے ہونگے کہ حج کے شوق نے ہمسے وطن چھڑا دیا۔

لڑکی (پھر ایک آہ سرد بھر کے) مجھے الزام بھی دیتے ہونگے کہ نامحرم کے ساتھ چلی آئی۔

نوجوان۔ زمرد! (اس لڑکی کا نام ہے) اب میں نامحرم نہیں ہوں وہ ہی چار روز میں ہم **قزوین** میں پہنچ جائینگے اور وہاں پہنچتے ہی نکاح ہو جائے گا۔

زمرد۔ (پھر ٹھنڈی سانس لے کے) خدا جانے وہاں تک پہنچنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔

نوجوان۔ کیوں۔

زمرد۔ رستے کی دشواریاں مشہور رہی ہیں۔ کوئی خوش نصیب مسافر ہوتا ہوگا جو پریوں کے سایہ سے بچ کے نکلجاتا ہو۔ اور ان سے بھی بچ جائے تو ملاحدہ کیوں چھوڑنے لگے۔ **زمرد** میں اسوقت ایک غیر معمولی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس مقام نے اسے کوئی خاص بات یاد دلادی ہے جسکی وجہ سے وہ چاروں طرف نے منظر کو ہر طرف مڑ کے دیکھ رہی ہے اور بار بار آہ سرد بھرتی ہے۔ نوجوان نے اس بات کا خیال بھی نہیں کیا

ﮯ یہ قرامطہ اور جماعت باطنیہ کا عام لقب تھا۔ شرر۔

اور معمولی لہجے میں کہنے لگا "ملاحدہ کی طرف سے تو مجھے اطمینان ہے۔
اس لیے کہ اُنکے مشہور نقیب آمل۔ ملا اہلبیت اللہ سے
مجھے ایک خط مل گیا ہے، وہ خط ہمیں ایک مجرب تعویذ کا کام دے گا
اور اسکے پیش کرتے ہی ہر قرمطی کے دست ستم سے نجات پائینگے۔"
یہ باتیں کرتے کرتے دونوں نوعمر مسافر اس مقام پر پہنچے جہاں سے
سڑک تو کوہسار کی بلندی پہ چڑھنا شروع ہوئی ہے اور نہر اس سے جدا
ہو کے دشوار گزار گھاٹیوں اور گھنی خاردار جھاڑیوں میں گھسنے کے
لیے داہنی جانب مڑ گئی ہے۔ نوجوان نے اپنے گدھے کو سڑک پہ آگے
بڑھایا ہی تھا کہ زمرد باگ روک کے کھڑی ہو گئی اور کہا نہیں حسین!
(یہ اس نوجوان کا نام ہے)

حسین (حیرت سے زمرد کی طرف دیکھ کے) پھر کدھر۔

زمرد۔ جدھر نہر گئی ہے۔

حسین۔ اُدھر تو رستہ نہیں۔

زمرد۔ تم چلو تو سہی۔

حسین۔ آخر قزوین چلتی ہو یا کہیں اور۔

زمرد۔ نہیں میرا منزلِ مقصود قزوین نہیں۔ مجھے تو دیکھنا ہے کہ یہ نہر
کدھر گئی ہے۔

حسین۔ اس طرف تو پریوں کا نشیمن ہے۔

زمرد۔ ہونے دو۔

حسین۔ سُنتا ہوں کوئی ادھر سے زندہ نہیں آتا۔

زمرد۔ یہی میں بھی چاہتی ہوں۔ حسین نے تعجب اور حیرت سے زمرد کی

صورت دیکھی اور ایک متانت کی آواز سے کہا اور وہ حج کی نیت کیا ہوئی۔

زمرد۔ ہے مگر اپنے بھائی موسیٰ کی قبر پہ جا کے فاتحہ پڑھ لوں تو مکہ معظمہ کا ارادہ کریں۔

حسین۔ تمھارے بھائی کی قبر۔ مگر یہ کسے خبر کہ کہاں ہے؟

زمرد۔ مجھے معلوم ہے، رستہ بھی جانتی ہوں اور اس مقام کو بھی۔

حسین (حیرت سے) تم! تم کیا جانو۔

زمرد۔ خوب جانتی ہوں۔

حسین۔ کیا کبھی آئی تھیں۔

زمرد۔ نہیں، مگر یعقوب جو بھائی موسیٰ کے مرنے کی خبر لایا تھا اُس سے پورا پتہ دریافت کر چکی ہوں۔ پہلی نشانی تو یہی ہے کہ جہاں سے نہر، سڑک سے علیحدہ ہوئی ہے، سڑک چھوڑ کے نہر کے کنارے کنارے جانا چاہیے اور بعد کی نشانیاں آگے چل کے بتاؤں گی۔

حسین۔ یعقوب کو کیا معلوم؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بلند اور پیچ در پیچ پہاڑوں میں کوئی شخص، کہاں اور کیوں کر مارا گیا۔

زمرد۔ تم نہیں جانتے۔ بھائی موسیٰ اور یعقوب دونوں ساتھ تھے۔ اس مقام پہ پہنچ کے، نہر کے کنارے کنارے کچھ دور گئے تھے کہ کوہ البرز سے پریوں کا غول اترا۔ اُن کے ہاتھ سے بھائی تو مارے گئے اور یعقوب غش کھا کے گر پڑا۔ دوسرے دن جب اسے ہوش آیا تو بھائی کی لاش پڑی پائی۔ انھیں دفن کیا۔ پھر قبر بنا کے اور قبر کے پاس ہی ایک چٹان پر ان کا نام کندہ کر کے واپس آیا۔

حسین۔ مجھے تو گپ معلوم ہوتی ہے۔ آخر اس کا سبب کہ پریوں نے یعقوب کو تو زندہ چھوڑ دیا اور تمھارے بھائی مارے گئے۔
زمرد۔ اس کا یہ سبب ہوا کہ بھائی نے ایک پری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور یعقوب بزدل تھا پریزادوں کو دیکھتے ہی غش کھاکے گر پڑا۔
حسین۔ پھر ایسے مقام میں تو ہرگز نہ جانا چاہیے۔
زمرد۔ نہیں! حسین میں تو ضرور جاؤں گی۔
حسین۔ فرض کرو کہ ہم وہاں پہنچے اور ہمارے سامنے پریاں اتریں تو!
زمرد۔ میں تو ان سے نہیں ڈرتی۔ اگر تمھیں خوف ہے نہ چلو۔
حسین۔ تم اکیلی جاؤ اور میں نہ چلوں! میں جو تمھاری محبت میں ہر وقت جان دینے کو تیار رہوں۔
زمرد۔ حسین! سنو۔ میں تمھارے ساتھ نہ آتی۔ یہ مانتی ہوں کہ تم شریف ہو اور اسی زمانہ سے جبکہ ہم دونوں مکتب میں ساتھ پڑھتے تھے مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ ایک شریف لڑکی کو تم فقرہ دے کے گھر سے نکال لائے ہو۔ میں خود اپنے شوق سے آئی ہوں فقط اتنی امید پر کہ بھائی کی قبر پر کھڑے ہو کے دو آنسو بہاؤں گی۔ جب یہ مقصد پورا ہوئے گا تو حج کو چلوں گی۔
حسین۔ زمرد! اپنی جوانی اور اس کم سنی پر ترس کھاؤ اور اس ارادے سے باز آؤ۔
زمرد۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی آرزو کے لیے بے عزتی گوارا کی ہے۔
حسین۔ (مایوسی کی آواز سے) خداوندا! اگر جان ہی جائے تو پہلے میں مارا جاؤں۔ زمرد! تیری مصیبت ان آنکھوں سے نہ دیکھی جائیگی۔

زمرد۔ (مسکرا کے) گھبراؤ نہیں ہم دونوں کی کشش ایک دوسرے کو کھینچ لیگی۔ مارے گئے تو دونوں مارے جائیں گے۔

یہ کہہ کے زمرد نے اپنے گدھے کو نہر دیو بجان کی طرف موڑا دو ہی قدم چلی ہوگی اِحسین نے پھر روک کے کہا زمرد! ذرا صبر کر کے چلنا ہے تو کل چلنا۔ اب شام ہوا چاہتی ہے۔ پہنچتے پہنچتے رات ہو جائیگی

زمرد۔ بس اب چلے ہی چلو۔ کہیں آبادی ملنے کی امید نہیں اور جب جنگل ہی میں ٹھہرنا ہے تو یہاں وہاں دونوں جگہ برابر ہے۔

حسین سے کسی طرح انکار کرتے نہ بنی، چل کھڑا ہوا۔ اور دل میں پس و پیش کرتا ہوا زمرد کے ساتھ کوہ البرز کی تیرہ و تاریک گھاٹی میں گھسا۔ اب دونوں آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں اور اس سنسان مقام کا رعب دلوں پر اسقدر بیٹھ گیا ہے کہ بالکل خاموش ہیں۔ جوں جوں آگے بڑھتے ہیں جنگل گھنا ہوتا جاتا ہے۔ سردی ساعت بہ ساعت تیز ہوتی ہے۔ سناٹے نے نہر کے بہنے کی آواز زیادہ تیز کر دی ہے جس نے اس مقام کے وحشتناک منظر میں ہیبت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اب رستہ دشوار ہے، گدھوں سے اُترنا پڑا۔ دونوں آگے پیچھے اپنے گدھے کے دہانے ہاتھ میں پکڑے، چٹانوں سے بچتے اور جھاڑیوں میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ آخر دیر کے سکوت کے بعد حسین نے مرعوب ہو کے کہا۔ "بیشک دیو، پری ایسے ہی سناٹے کے مقام میں رہتے ہیں، انسان کیا معنی یہاں تو جانوروں کا بھی پتہ نہیں۔"

زمرد۔ ہاں! اور سنتی ہوں کہ اس نہر میں اکثر جگہ پریاں نہاتی اور بال کھولے ہوئے آپس میں کھیلتی اور چھینٹیں اڑاتی بھی نظر آجایا کرتی ہیں۔

حسین (چونک کر) ایں! یہ سنسنانے کی آواز کیسی تھی جیسے کوئی چیز
سن سے کانوں کے پاس سے تیر کے نکل گئی۔

زمرد۔ یہ تو مشہور بات ہے کہ پریوں کے تخت چاہے اڑتے نہ نظر آئیں
مگر ان کے سن سے نکل جانے کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔

حسین۔ یہ بھی ممکن ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی جانور تھا۔

زمرد۔ جانور ہوتا تو دکھائی دیتا۔

حسین۔ اگرچہ ابھی آفتاب نہیں غروب ہوا۔ مگر تم یہاں دیکھ رہی ہو
کہ شام سے بھی زیادہ اندھیرا ہے۔ ایسے دھندلکے میں بعض اوقات تو بڑے
بڑے چمگادڑ بھی اسی طرح سنانے کی آواز سے اڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

زمرد۔ لیکن اصل میں یہ بھی وہی پریزاد ہیں جو مختلف جانوروں کی صورت
میں رات کو نکلتے ہیں۔

حسین۔ ہوگا۔ اتنا کہہ کے اس نے گرد کے سین کو وحشت اور بیزاری کی
نگاہوں سے دیکھا اور نہایت پریشانی کی آواز میں کہا "شام ہوا چاہتی ہے
اور تمھارے بھائی کی قبر کا کہیں پتہ نہیں۔"

زمرد۔ مگر میں تو بھائی کی قبر تک پہنچے بغیر دم نہ لوں گی۔ یہ کہتے ہی ایک
نہایت تاریک گھاٹی نظر آئی جس میں نہر تو گئی ہے مگر دونوں جانب
ایسی چکنی اور کھڑی چٹانیں ہیں کہ انسان کا گزرنا بہت دشوار ہے۔
اس گھاٹی کی صورت دیکھتے ہی زمرد ایک شوق اور بیخودی کی آواز
میں چلا اٹھی۔

"ہاں! دیکھو یہ دوسری علامت ہے۔ اسی میں سے ہو کے
رستہ گیا ہے۔"

حسین۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اُدھر سے ہم جائیں گے کیونکر۔

زمرد۔ جس طرح بنے جاؤنگی ضرور۔

حسین۔ اور یہ گدھے۔

زمرد۔ ان کو یہیں چھوڑ دو واپس آکے لے لینا۔

حسین نے اس مستقل مزاجی اور دُھن پر زمرد کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر گدھے درختوں سے باندھے اور دونوں چٹانوں سے چمٹتے اور ہاتھوں سے پتھروں کے سروں اور رخنوں کو پکڑتے ہوئے آگے روانہ ہوئے۔ کوئی دو گھڑی بمحنت کا سفر کیا ہوگا کہ گھاٹی ختم ہو گئی جس سے نکلتے ہی دونوں نے حیرت سے دیکھا کہ نہر دیریجان اس گھاٹی سے گزر کے یکایک ایک نہایت ہی فرح بخش مرغزار میں بہنے لگی ہے۔ یہ عجب لطف کا مقام تھا۔ قدرت نے خود ہی چمن بندی کر دی تھی۔ شگفتہ اور خوشرنگ پھولوں کے تختے حد دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ نغمہ سنج طیور بھی یہاں کثرت سے نظر آئے، جو ہر طرف شاہدان چمن کے حسن و جمال پر صدقے ہوتے پھرتے تھے۔ شام ہو رہی تھی اور یہ جوش میں ابھرے ہوئے عاشقان شاہد گل اپنے معشوقوں کو آخری الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ سماں دیکھتے ہی زمرد نے خوش ہو کے کہا "اب ہم اپنی منزل مقصود کو پہنچ گئے" اسی وادی میں بھائی موسیٰ مارے گئے اور یہیں کہیں انکی قبر بھی ہوگی" یہ کہہ کے زمرد ایک نازک بدن او چست و چالاک ہرنی کی طرح چاروں طرف دوڑی اور ایک بڑے پتھر کے پاس ٹھہر کے چلائی:

"آہ! یہی میرے بھائی کی قبر ہے"

اس آواز کے سنتے ہی حسین بھی ادھر دوڑ گیا۔ اور دیکھا

کہ ایک چٹان پر موسیٰ نام کھدا ہوا ہے۔ اور اُسکے قریب ہی چند پتھروں کو برابر کر کے ایک قبر کی صورت بنا دی گئی ہے۔ دونوں نے یہاں پر کھڑے ہو کے فاتحہ خوانی کی مگر زمرد کے دل پر حسرت و اندوہ کا اسقدر غلبہ ہوا کہ فاتحہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ گر پڑی اور قبر سے لپٹ کے زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بہت کچھ تسلی دی۔ پھر سے پانی لا کے منہ دھلایا اور رات کے اندھیرے میں اپنی حور وش معشوقہ کو اپنی گود میں لے کے بیٹھا اور بہلانے لگا۔

زمرد (ہچکیاں لے لے کے) حسین! مجھے اپنی زندگی کی امید نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مر رہوں گی۔ ہاتھ پاؤں سنسنا رہے ہیں کلیجے میں میٹھا میٹھا درد ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے مگر مرنے سے پہلے تم سے ایک وصیت ہے۔ مر جاؤں تو میری لاش کو بھی انھیں پتھروں کے نیچے دبا دینا جنکے نیچے بھائی موسیٰ کی ہڈیاں ہیں۔

حسین۔ (نہایت مستقل مزاجی سے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو پی کر) یہ وصیت اگر پوری ہونے والی ہوگی تو کسی اور کے ہاتھ سے یہ وصیت پوری ہوگی۔ میں تمھارے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور جس کے ہاتھ سے یہ وصیت پوری ہوگی، وہ تمھارے ساتھ میری ہڈیوں کو بھی انہی پتھروں کے نیچے دبائے گا۔

زمرد (خوشامد کے لہجے میں) نہیں حسین! ایسا نہ کرنا۔ تمکو ابھی نہیں معلوم کہ مجھے کیا چیز یہاں کھینچ لائی۔ نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ بھائی کی محبت تھی اور نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ یعقوب کے بیان میں کوئی جادو تھا مگر جس روز اُس نے بھائی موسیٰ کی حسرت نصیب داستان سنائی۔ اسی کے

دوسرے ہی دن میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے بھائی اسی وادی میں کھڑے ہیں۔ خواب ہی میں انھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا اور تاکید کر کے کہا کہ میری قبر پہ آکے فاتحہ پڑھ۔ مرحوم بھائی نے کچھ ایسی مؤثر وضع سے بلایا تھا کہ ان کی اسوقت کی صورت اس وقت تک میرے سامنے پھر رہی ہے۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میں یہاں بھائی کی بلائی ہوئی آئی ہوں۔

حسین (وفور گریہ سے بے اختیار ہو کر اور ایک انتہا جوش کے ساتھ) خیر انھیں تو انھوں نے خواب میں فقط بلایا تھا اور مجھے تم خود اپنے ساتھ لائی ہو۔

زمرد۔ ہاں! میں تمکو ساتھ لائی ہوں۔ اور اسی سبب سے کہ اس دنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ میری تمنا اور آرزو یہ ہے کہ تمھارے پہلو میں تمھاری آنکھوں کے سامنے جان دوں۔ اسکے بعد تم گھر جاؤ اور وہاں عزیزوں اور شہر کے دیگر شرفا کے نزدیک جو کچھ بے عزتی ہوئی ہے اسکو دور کرو۔ اور میری خبر مرگ کے ساتھ جا کے بتاؤ کہ میں نے کیوں اور کہاں جان دی۔ اور مرتے دقت تک ایسی پاک دامن تھی (گلے میں باہیں ڈال کے) حسین! میری آرزو ہے کہ تم زندہ رہو اور میرے دامن سے بدنامی کا دھبہ دھو کر۔

حسین (ایک نالۂ جانکاہ کے ساتھ) خدا نہ کرے کہ میں تمھاری خبر مرگ لیجاؤں۔

ناگہاں ایک پہاڑی کی ڈھالو سطح پر کچھ روشنی نظر آئی جس پر پہلے زمرد کی نظر پڑی اور اس نے چونک کے کہا۔ یہ روشنی کیسی

حسین نے بھی اس روشنی کو حیرت سے دیکھا اور کہا خدا جانے کیا بات ہے اور دیکھو! ادھر بڑھتی چلی آتی ہے۔ اس رات کی تاریکی میں یہاں آنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں

دونوں عاشق و معشوق روشنی کو گھبرا گھبرا کے اور ساعت بساعت زیادہ متحیر ہو کے دیکھ رہے تھے کہ وہ بالکل قریب آ گئی بڑی بڑی پندرہ بیس مشعلیں تھیں اور ان کے نیچے حسین و پری جمال عورتوں کا ایک بڑا غول۔ جنکی صورت دیکھتے ہی زمرد اور حسین دونوں نے ایک چیخ ماری۔ وحشت زدگی کی آواز میں دونوں کی زبان سے نکلا "پریاں" اور دونوں غش کھا کے بیہوش ہو گئے۔

یہ فردوس بریں کا پہلا باب ہے اور اس کو پڑھ کر ہر شخص فردوس بریں کے دیکھنے کا شایق ہو جائے گا۔ عبارت میں شاعرانہ انداز نہیں بلکہ مورخانہ ہے اور اس قسم کے ناول کے لئے نہایت موزوں ہے۔ کچھ اس قسم کی عبارت ہے کہ خود بخود دل میں اثر کرتی جاتی ہے اور آگے پڑھنے کا شوق بڑھتا جاتا ہے اور یہی کمال ناول نگاری ہے۔

نمونہ کے طور پر ایک مضمون بھی درج کیا جاتا ہے۔

بزم قدرت

دنیا کی سب محفلیں تغیرات زمانہ سے درہم و برہم ہو جاتی ہیں مگر خدا کی مرتب کی ہوئی محفل۔ جس میں انقلابات عالم سے ہر روز ایک نیا لطف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ہمیشہ آباد رہی اور یونہیں قیامت

تک بھی رہیگی۔ یہ وہ محفل ہے جسکی رونق کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ پُر غم واقعات اور وہ حسرت بھرے سانحے جن سے ہماری محفلیں درہم وبرہم ہو جایا کرتی ہیں۔ اُن سے بزم قدرت کی رونق اور دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہماری صحبت کا کوئی آشنا حرماں نصیبی یا ہم سے بچھڑ کے مبتلائے وحشت غربت ہو جاتا ہے تو برسوں ہماری انجمنیں سونی پڑی رہتی ہیں۔ ہمارے عشرت کدوں کا کوئی زندہ دل نذر اجل ہو جاتا ہے۔ تو سالہا سال کے لیے وہ ماتم کدے ہو جاتے ہیں۔ مگر جب ذرا نظر کو وسیع کرو اور خاص صدمات کا خیال چھوڑ کے عالم کو عام نظر سے دیکھو تو اس کی چہل پہل ویسی ہی رہتی ہے۔ بلکہ نئی نسل کے دو چار پر جوش زندہ دل ایسے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ دنیا کی دلچسپیاں ایک درجہ اور ترقی کر جاتی ہیں ایک شاعر کا قول ہے۔

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز یہ کم نہ ہونگے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہونگے

جس نے کہا ہے بہت خوب کہا ہے۔ بزم قدرت ہمیشہ یونہیں دلچسپیوں سے آباد رہیگی۔ ہاں ہم نہ ہوں گے اور ہماری جگہ زمانہ ایسے اچھے نعم البدل لا کے بٹھا دے گا کہ ہماری باتیں محفل والوں کو پھیکی و بےمزہ معلوم ہونے لگیں گی۔

الغرض یہ محفل کبھی خالی نہیں رہی۔ کوئی نہ کوئی ضرور رہا جو اس بزم کی رونق کو ترقی دیتا رہا۔ اسی مقام سے یہ نازک مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے کہ زمانہ کی عام رفتار ترقی ہے۔ ایک قوم آگے بڑھتی اور دوسری پیچھے ہٹتی ہے۔ تنزل پذیر قوم کے لوگ اپنے مقام پر جب

اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔ زمانہ اور فلک کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ اور ان کو دعویٰ ہوتا ہے کہ زمانہ تنزل پر ہے۔ مگر اصل پوچھیے تو تنزل صرف اُن کی غفلتوں اور راحت طلبیوں کا نتیجہ ہے دنیا اپنی عام رفتار میں ترقی ہی کی طرف جا رہی ہے۔

اے وہ لوگو! جو شکایت زمانہ میں زندگی کی قیمتی گھڑیاں فضول گزران رہے ہو۔ ذرا بزم قدرت کو دیکھو تو کس قدر دلکش اور نظر فریب واقع ہوئی ہے۔ تمہارے دل میں وہ مذاق ہی نہیں پیدا کہ ان چیزوں کی قدر کر سکو یہ وہ چیزیں ہیں کہ انسانی جوش کو بڑھاتی ہیں اور طبیعت میں وہ مفید حوصلے پیدا کرتی ہیں جن سے ہمیشہ نتیجے پیدا ہوئے اور پیدا ہوں گے۔ اندھیری رات میں آسمان نے اپنے شب زندہ دار دوستوں کی محفل آراستہ کی ہے۔ تارے کھلے ہوئے ہیں۔ اور اپنی بے ترتیبی اور بے نظمی پر بھی عجب بہار دکھا رہے ہیں۔ دیکھو ان پیارے خوشنما تاروں کی صورت پر کیسی زندہ دلی اور کیسی تری زندگی پائی جاتی ہے؟ پھر کیا ایک مہتاب کا ایسا حسین اور نورانی مہمان مشرق کی طرف سے نمودار ہوا۔ اور یہ گورے گورے تارے اپنی بے فروغی پر افسوس کر کے غائب ہونے لگے۔ مہتاب آسمان کے نیلگوں اطلسی دامن میں کھیلتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ اگرچہ ہماری طرح دل داغدار لے کے آیا تھا۔ لیکن خوش آیا۔ اور ہمارے غربت کدوں کو روشن کر کے بزم قدرت میں نہایت لطیف اور خوشگوار دلچسپیاں پیدا کر کے خوشی خوشی صحن فلک کی سیر کرتا ہوا مغرب کی طرف گیا۔ اور غائب ہو گیا۔ ابھی آسمان کو اس مہمان کا انتظار تھا

جس سے نظام عالم کا سارا کاروبار چل رہا ہے اور جس کی روشنی ہماری زندگیوں کی جان اور ہماری ترقیوں کا ذریعہ ہے۔ آفتاب بڑی آب وتاب سے ظاہر ہوا۔ رات کا خوبصورت اور رحم حبست چاند اپنے اترے ہوئے چہرے کو چھپا کے غائب ہو گیا۔ اور آسمان کا اسٹیج بزم قدرت کے دلفریب ایکٹروں سے خالی ہو گیا۔

خواب شب کا مزا اٹھانے والوں کی آنکھیں کھل کھل کے افق مشرق کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں آسمان کے دور پر چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں اس کے ساتھ مرغان سحر کے نغمہ کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ اور آنکھیں لگے دیکھا ہے تو ہماری نظر کی نیرنگی بھی شمع حقیقت میں جھلملا رہی ہے۔ یک بیک فوراً طرح ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ گھنٹے بجے۔ چڑیاں چہچہائیں۔ مؤذنوں نے اذانیں دیں۔ اور تمام جانوروں کی مختلف آوازوں نے مل کر ایک ایسا ہمہمہ پیدا کر دیا ہے کہ نیچر کی رفتار میں بھی تیزی پیدا ہو گئی۔ باغ نیچر کے چابک دست کاریگر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نسیم سحر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آئی اور ضابطہ وتیں غنچوں کے پہلو گدگدانے لگی۔ الغرض قدرت نے اپنی پوری بہار کا نمونہ آشکارا کر دیا۔

قدرت کی نیرنگیاں خوب ظاہر کی ہیں اور نثر میں شاعری کی ہے لیکن بیہودہ شاعری نہیں جس میں صرف مبالغہ ہے یہاں حقیقت طرازی بھی موجود ہے۔

(از تاریخ سندھ جلد اوّل)

پانچواں باب

سندھ کی ہندو سلطنت کا آخری دور

چندر راے چچ کے مرنے پر سلائج کا دوسرا بیٹا یعنی اس کا بھائی چندر، سندھ کے تاج وتخت کا وارث ہوا۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب بودھ کی طرف رجحان تھا چنانچہ الور کے تخت پر بیٹھتے ہی اس نے اس مذہب کی اعانت شروع کر دی۔ وہ تارک الدنیا اور مرتاض فقیروں کا نہایت معتقد تھا اور ان کی قدر و منزلت کرتا تھا۔ اسی قدر نہیں اس نے بہت سے برہمنی عقیدے کے ہندوؤ کو جمع کر کے بزور شمشیر مجبور کیا کہ بودھ مذہب کی پیروی کریں۔ متعدد راجگان ہند نے اس کے دربار میں خطوط بھیجے سیوستان کا سردار **مٹا قنوج میں** مٹا قنوج کے دربار میں گیا تو ہندوستان کو نہایت ہی سرسبز و شاداب پایا قنوج کی راج گدی پران دنوں رااسل کا بیٹا سی ہرس رونق افروز تھا سی ہرس معرب سری ہرشا کا ہے۔ مٹا اسکے دربار میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ سلائج کا بیٹا چچ تو مرگیا۔ اب اس کی گدی پر اس کا بھائی بیٹھا ہے جو راجہ نہیں بلکہ ایک عبادت کرنے والا راہب ہے۔ ناسک مذہب بودھ کا پیرو ہے اور سارے دن مذہبی پوجاریوں کے ساتھ

سمندر میں چھپا رہتا ہے۔ جہاں سوا نہیں محنت اور ریاضت کے اس کا
کوئی کام نہیں ہوتا۔ اگر تھوڑی فوج بھی روانہ کی جائے تو اس پر فتح
حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر آپ اس کے ملک کو اس سے چھین کے میرے
قبضے میں دیدیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سالانہ خراج ادا کرتا رہوں گا

قنوج کا حملہ سندھ پر

سی ہرس نے یہ سن کر فوج کشی
کا ارادہ کر دیا۔ مگر مہتا کو صرف اتنی امید
دلائی کہ تم کو مفتوحہ ملک میں سے ایک ضلع دیدیا جائے گا۔ باقی سارے
ملک کو میں خود اپنی قلمرو میں شامل کروں گا۔ یہ جواب دینے کے
بعد سی ہرس نے اپنے بھائی کسائش کے بیٹے ہرپاس
کو سپہ سالار بنا کے سندھ کی مہم پر روانہ کیا۔ راجہ چچ کے نواسے
نے بھی جو رمل اور کشمیر پر حکمران تھا اس مہم میں ہرپاس
کی مدد کی۔ اور دونوں اپنی فوجوں کے ساتھ دریائے پاسی کے
کنارے خیمہ زن ہوئے۔ چندر کے نائب اور والی جو قلعہ دیو میں
تھے غنیم کا اتنا بڑا لشکر دیکھ کے بھاگ کھڑے ہوئے اور حملہ آور اس
قلعہ پر قبضہ کر کے آگے بڑھے۔ اور مقام پندکاہو سے چندر
کے پاس سفارت بھیجی کہ اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً حاضر ہو کے
اظہار اطاعت کرو اور امان مانگو۔ چندر نے باوجودیکہ زہد و تقوے

ان کی سفارت اور ناکام

میں زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ اس ذلت کو
نہ گوارا کیا۔ اور فوج کی اصلاح اور قلعوں کے
مضبوط کرنے میں مشغول ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ ان حملہ آوروں سے اسکی
سلطنت بچ گئی۔ سب ناکام و نامراد۔ واپس گئے

اور اُن کے بعد چندر نے مضبوطی اور قوت سے راج کیا۔ الغرض سات سال تک چندر بغیر کسی اندیشے کے سلطنت کرتا رہا۔ تخت نشینی کے آٹھویں برس اس نے سفر آخرت کیا۔

داہر اور دہرسین چندر کے بعد دعویداران سلطنت میں اختلاف پیدا ہوا۔ الور کے تخت پر تو اس کے بھائی راسے چچ کا چھوٹا بیٹا داہر بیٹھا برہمن آباد میں خود اس کا بیٹا راج تخت نشین ہو گیا۔ مگر اس کی زندگی کا چراغ ایک ہی سال میں گل ہو گیا جس کے بعد برہمن آباد پر چچ کے بڑے بیٹے دہرسین نے قبضہ کر لیا۔ اس سے بظاہر داہر سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ مگر بعد کو ایک شرمناک خانگی جھگڑے نے دونوں کو لڑایا جس کا حال آیندہ بیان کیا جائے گا۔

داہر کا عہد مگر دیگر مورخین کا یہ بیان ہے کہ داہر نے تخت پر بیٹھ کے عدل و انصاف کیا۔ اس کی حکومت سے فوج خوش اور رعایا سرسبز تھی۔ بعد تخت نشینی ایک سال تک اپنے دار السلطنت میں رہ کے ملک کے دورے کو نکلا۔ پہلے مشرق کی جانب ان اضلاع کا انتظام کر کے اور قابل اعتماد والی مقرر کر کے واپس آیا تو برہمن آباد میں پہنچا۔ اور یہاں کا حاکم اپنے بھائی دہرسین (دہرسیا) کو مقرر کیا اور خود حدود مکران کی راہ لی اور چھ مہینے وہاں رہ کے حاکم مکران سے روابط محبت مضبوط کیے اور دہلی واپس آیا

نجومیوں کی پیشین گوئی الور کے قریب پہنچا تو اہل شہر نے بڑی دھوم دھام سے اس کا استقبال کیا۔ ہر طرف خوشی

کے شادیانے بجنے لگے۔ اور اسی موقع پر پنڈتوں اور نجومیوں نے آپکے ادب و تعظیم سے عرض کیا کہ "ہم نے آپ دونوں بھائیوں اور آپ کی بہن باؔئی کا زائچہ کھینچ کے دیکھا تو آپکے اور آپکے بھائی دھرسیا کے طالع میں تو چنداں خوش اقبالی کے آثار نہیں نظر آتے مگر آپ کی بہن باؔئی جی کا اقبال نہایت ہی بلند نظر آتا ہے۔ ان کا زائچہ تو بتا رہا ہے کہ جس کی وہ بی بی بنیں گی وہی سارے سندھ کا راجہ ہو گا۔ اور سارے ملک و دولت پر اسی کا قبضہ ہو گا۔ اور پھر تعجب یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ یہاں سے کہیں باہر جائیں گی بھی نہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان باتوں کی تکمیل کیونکر ہو گی"۔ نجوم کا وہ بڑا معتقد تھا اور ہمیشہ نجومیوں ہی کے کہنے پر چلا کرتا تھا۔ ان کی یہ بات اس کے دل میں کھٹک گئی۔ اور ہر گھڑی اس فکر میں رہنے لگا کہ باؔئی کو یہاں کی سلطنت کیونکر ملے گی اور کسی اور کو مل گئی تو مجھے تخت و تاج سے محروم ہونا پڑے گا۔ آخر پریشانی اور الجھن میں اس نے پھر نجومیوں کو بلوا کے باؔئی کا زائچہ کھنچوایا۔ اور اب بھی وہی نتیجہ حاصل ہوا۔ تب اس نے وزیروں اور صاحب رائے ارکان دولت کو جمع کیا اور اُنکے سامنے اپنی پریشانی اور دل کی الجھن کا حال بیان کیا اور کہا یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں تخت و تاج سے جدا ہونا گوارا کروں۔ بار بار میرے دل میں یہی آتی ہے کہ باؔئی کے ساتھ خود ہی اپنا بیاہ کر لوں۔

بہن سے شادی کرنے کا ارادہ

یہ سن کے سب لوگوں نے حیرت سے راجہ کی صورت دیکھی اور جان پر کھیل کے عرض کیا "حضور! ایسا غضب نہ کریں۔ ورنہ ہمارے ملک کو بدنامی کا داغ لگ جائے گا ہم سب

راجاؤں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جائیں گے اور ملک میں بھی درہمی
و برہمی کے آثار پیدا ہو جائیں گے بلکہ ایسے ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہونگے
کہ ملک کا سنبھالنا مشکل پڑ جائے گا۔ مگر ان باتوں کا داہر پر کچھ اثر نہوا
ظاہر میں تو اس وقت خاموش ہو رہا۔ پھر چند خاص خاص مشیروں اور
معتمدوں کو اس عقد پر راضی کر لیا۔ اور ایک رات کو جبکہ کسی کو خبر
نہ تھی نہایت خاموشی کے ساتھ پنڈتوں کو بلا کے بائی سے بیاہ کر لیا

اُس ارادے کی تکمیل

اور حسب دستور اپنی چادر کا کھونٹ
بائی کی ساری کے آنچل میں باندھ کے
آگ کے گرد پھیرا۔ پھر دولھا دلھن تخت پر آ کے بیٹھے۔ اور اپنی صورت
ایک ساتھ تلوار میں دیکھی۔ مگر باوجود ان کارروائیوں کے دونوں
مقاربت و ہم بستری سے محترز رہے۔ صبح اُٹھتے ہی راجہ نے
بائی کو اس کے گھر بھیج دیا اور دل میں مطمئن ہو گیا کہ اب تو بائی
کا شوہر میں ہی ہوں۔ لوگوں میں اس شادی کی خبر اڑی تو ہر طرف
برہمی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ مگر سب سے بڑی مشکل یہ پیش

بھائیوں کا اختلاف

آئی کہ یہ خبر جیسے ہی برہمن آباد
میں پہنچی تو دہرسین نہایت بگڑا
اور ایک خط بھیج کے داہر کو بہت کچھ لعنت ملامت کی۔ داہر
نے اسے جواب میں اپنا یہ عذر لکھا کہ "نجوم کے فیصلے نے مجھے اس
کام پر مجبور کر دیا ورنہ ہرگز نہ کرتا۔" دہرسین نے پھر لکھا "کیا
تم جانتے ہو کہ ایسے فریبوں سے تقدیر کو پلٹ دو گے؟" خلاصہ یہ کہ اسی
رد و بدل میں لڑائی ٹھن گئی۔

مگر فتح نامہ کا یہ بیان ہے کہ رانی بائی پیشتر دہرسین
ہی کے پاس تھی راول کے راجہ سوبہن نے اس کے عقد کا اسے
پیام دیا اور شرط یہ کی کہ جہیز میں کوئی ایک قلعہ دیا جائے دہرسین
نے اس تجویز کو پسند کیا اور سوبہن کے ایلچیوں کے ساتھ شاہزادی
بائی کو بھی سات سو سواروں اور پانچ سو پیادوں کے جلوس سے
داہر کے پاس بھیجا اور لکھا کہ سوبہن کی درخواست قبول کرنی چاہیے
اور ایک قلعہ دے دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے بائی جب
داہر کے پاس پہنچی تو اس نے یہ حرکت کی کہ سوبہن کے ایلچیوں کو
تو انکاری جواب دیدیا اور بہن سے خود اپنا نکاح کر لیا۔

دہرسین کو اس امر سے اس قدر ملال ہوا تھا کہ فوج لے کے
بھائی سے لڑنے کو چل کھڑا ہوا۔ یہ خبر سن کے ادہر سے داہر بھی
مقابلے کو نکلا۔ اور کچھ دنوں تک اپنے بھائی کے لشکر کا انتظار کرتا رہا
اس کے پہنچنے میں زیادہ دیر ہوئی تو شکار کے لیے جنگل میں چلا گیا
وہ شکار کھیل رہا تھا کہ دہرسین الور میں پہنچا اور شہر کے اندر داخل
ہونے کا ارادہ کیا۔ مگر شہر والوں نے پھاٹک بند کر لیے اور لڑائی کا
ارادہ کیا۔ اتفاقاً بعض نیک نفس اور عاقبت اندیش لوگ اس کے
پاس گئے۔ اسے سمجھا بجھا کے لڑنے سے روکا اور عزت کے ساتھ لیجا کے
الور کی مغربی شہر پناہ کے نیچے اتارا اور سرکارے دوڑائے کہ داہر
کو اطلاع کر کے لے آئیں۔ داہر فوراً واپس آیا۔ راتوں رات دعوت
کی تیاریاں کیں اور صبح ہوتے ہی بھائی کو دعوت کا پیام دیا۔ مگر
دہرسین نے دعوت قبول کرنے سے انکار کیا۔ اسی دن تپ چڑھ

کو داہر کی ماں اور دیگر عمائد شہر دہرسین سے ملنے کو گئے اور کہا داہر نے بہن سے شادی حظِ نفسانی کے لیے نہیں کی بلکہ دل کا شک مٹانے کے لیے۔ اور اسی لیے امید ہے کہ آپ اس کا قصور معاف کر دیں گے۔ معززین شہر کے ساتھ ماں کو بھی داہر کی سفارش کرتے دیکھ کے اس نے بھائی کا قصور معاف کر دیا۔

باہمی ملاقاتیں

دوسرے دن وہ ہاتھی پر سوار ہو کے قلعہ کی دیوار کے نیچے پہنچا اور عین داہر کے محل کے سامنے ادب سے ٹھہر کے آداب شاہی کہلا بھیجا داہر نے فوراً اندر بلوایا مگر دہرسین نے انکار کیا اور کہا میں قسم کھا چکا ہوں کہ آپ کے محل کے اندر نہ آؤں گا۔ لیکن ہاں اگر باہر نکل کے مجھے شرفِ حضوری سے سرفرازی فرما سکیں تو مہربانی ہوگی داہر نے کہا تو میں کل حاضر ہونگا چنانچہ دوسرے دن داہر وزراء و امراء کو ساتھ لے کے جلوس کے ساتھ بھائی سے ملنے کو آیا۔ دہرسین ادھر سے استقبال کو نکلا سامنا ہوتے ہی وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور اپنے صاحب تاج و تخت بھائی کے پاؤں چوم لیے۔ پھر اُسے ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے خیمے میں لایا داہر اس ملاقات کے بعد واپس گیا تو اسکے جاتے ہی دہرسین کو بخار آ گیا

دہرسین کی موت

اور اس شدت سے کہ حدت ساعت بساعت بڑھتی ہی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ سارے بدن میں آبلے پڑ گئے۔ اسی بخار آنے کے چوتھے دن دہرسین مر گیا داہر نے حسب دستور اسکی لاش جلائی اور تمام مراسم مذہبی بجا لایا جسکے بعد داہر بڑے امن امان اور اطمینان دلجمعی سے حکومت کرنے لگا۔

داہر برہمن آباد میں

داہر سین کے مرنے کے بعد داہر اپنے بھائی کے مستقر برہمن آباد گیا۔ برس بھر تک قیام کر کے وہاں کے انتظامات کیے۔ گرد و نواح کے سرداروں کو مطیع و منقاد بنایا۔ دھر سین کے بیٹے سے نہایت شفقت کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی دلدہی اور تسلی و تشفی کی۔ ان امور کو سرانجام دے کے اس نے سیوستان کی راہ لی۔ پھر وہاں سے راوڑ کے قلعہ میں گیا جسے راجہ چچ نے بنوانا شروع کیا تھا اور ناتمام چھوڑ کے مر گیا تھا۔ چند روز میں اس نے یہ قلعہ تکمیل کو پہنچایا اور چونکہ وہ ایک دلچسپ مقام تھا اور اکثر خنکی رہا کرتی تھی۔ لہذا اُسنے معمول مقرر کر لیا کہ گرمیوں کے چار مہینے اسی سرزمین پر بسر کیا کرتا۔ اپنی زندگی آٹھ سال تک اس نے اسی وضع سے بسر کی۔

رامل والوں سے لڑائی

جب ہر جگہ اس کی وقعت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی اور سلطنت کو خوب استحکام ہو گیا تو سرداران رامل کو اس پر حسد آیا اور پیدلوں اور سواروں کا ایک زبردست مجمع کر کے اسکے مقابلے کو چل کھڑے ہوئے اُن کے ساتھ بہت سے جنگی ہاتھی بھی تھے بودھیا کی راہ سے وہ علاقہ راوڑ کے شہر روستا پر حملہ آور ہوئے۔ اور قبل اس کے کہ داہر کی طرف سے کوئی کارروائی مزاحمت کی عمل میں آئے وہ سب روستا پر قبضہ کر کے دارالسلطنت الور کی طرف بڑھے۔

ایک عرب پناہ گزیں کی کارگزاری

اتفاقاً ان دنوں عرب کے ایک معزز بہادر محمد علافی نام

نے عبدالرحمن بن اشعث کو قتل کر کے سرزمین سندھ میں پناہ لی تھی اور اپنے بہت سے عزیزوں اور ہم قوم لوگوں کے ساتھ یہاں امن و امان سے رہا کرتا تھا۔ اس نے اس موقع پر ایک عجیب اور غیر معمولی طریقے سے راجہ داہر کی مدد کی ان حملہ آوروں کا تمام لشکر اروڑ کی طرف بڑھتا چلا آتا تھا کہ محمد علافی نے اپنے پانچ سو عرب رفقا کے ساتھ یکایک ایک رات کو ایسا شبخون مارا اور اس طرح نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتا ہوا ان پر اچانک جا پڑا کہ سب لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اندھیری رات میں کسی سے بھاگتے بھی نہ بن پڑتی تھی۔ اور عربوں نے آناً فاناً میں رامل والوں کے اسی ہزار سپاہی تباہ کر دیے جن میں سے بہت سے مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے اور بے شمار اسلحہ کے ساتھ پچاس ہاتھی بھی عربوں کے ہاتھ لگے۔

یوں ایک از غیبی مدد سے داہر کو دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی تو اس نے ان عربوں کی قدر و منزلت کی۔ اور ان کو زیادہ عزت و حرمت سے اپنے قلمرو میں جگہ دی۔

وزیر کی عزت افزائی اب داہر اطمینان و فارغ البالی سے سلطنت کر رہا تھا اور اپنے وفادار اور مدبر وزیر سے اس درجہ خوش تھا کہ ایک دن اس پر حد سے زیادہ مہربان ہو کے کہا "تمھاری کوئی آرزو ہو تو بتاؤ، میں اسے ضرور پورا کر دوں گا" وزیر نے ادب سے قدمبوس ہو کے عرض کیا "غلام کے کوئی اولاد نہیں کہ اس کا دنیا میں نام چند روز بھی باقی رہ سکے اس لیے اگر کوئی تمنا ہے تو یہ کہ کوئی تدبیر میرے نام کے باقی رہنے کی

اور وہ تمنا اس طریقے سے پوری ہو سکتی ہے کہ حضور سلطنت کے چاندی کے سکے پر ایک طرف میرے نام کے نقش کرنے کا حکم نافذ فرمائیں اور دوسری طرف مہاراج کا نام رہے۔ شاید یہ سکہ میرے نام کو چند روز تک زندہ رکھے" داہر نے اس درخواست کو فوراً منظور کیا۔ اور اس وقت سے سندھ میں ایک طرف داہر کا اور دوسری طرف وزیر کا نام منقوش ہونے لگا۔

ہندو سلطنت کا خاتمہ اس کے بعد داہر کو وطنی دشمنوں سے کسی قسم کا آزار نہیں پہنچا۔ ہر طرف امن وامان تھا کہ بعض وجوہ ایسے پیش آئے کہ خلافت عرب سے مخالفت شروع ہو گئی اور یہ ایک ایسی زبردست قوت کا سامنا تھا کہ چند ہی روز بعد ارض سندھ میں ہندو سلطنت کا خاتمہ ہو گیا"

مولانا نے تاریخ سندھ نہایت اچھی کتاب لکھی ہے۔ جیسے اسی سے مقتبس ہے۔ واقعہ نگاری اور سلاست بیانی کے ساتھ مورخانہ انداز بھی موجود ہے۔

خاتمہ

لیجیے! تیسرے دور کا بھی خاتمہ ہو گیا اور وہ بزرگ صورتیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی تھیں خاک میں پنہاں ہو گئیں ہم جن بزرگوں کے سامنے زانوے ادب تہ کرتے تھے وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔ ہاں! اُن کی یادگاریں اُن کی کتابیں

ہیں جن سے ہم ہمیشہ سبق لیتے رہیں گے اور جو ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی۔ ان بزرگوں نے اردو کے ذرہ کو خاک مذلت سے اٹھا کر عزت کے آسمان پر ستارہ کی طرح چمکا دیا۔ ہمارے ناظرین جلد اول میں دیکھ چکے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بدولت اردو نثر نویسی کا رواج ہوا، بعد ازاں دہلی کالج سوسائٹی نے اپنے ترجموں سے اور انفرادی کوششوں نے ملک کے دیگر حصوں میں اردو کو رواج دیا اس دور ثالث میں کرنل ہالرائڈ اور آزاد نے پنجاب میں اور عموماً شمالی ہند میں علیگڑھ سائنٹفک سوسائٹی اور سرسید نے اور مطبع منشی نولکشور نے لکھنؤ اور کانپور میں بیحد کام کیا۔ دور اول اور دور ثانی میں ہماری زبان صرف افسانوں اور چند اخلاقی و مذہبی کتابوں کی زبان تھی۔ اس دور میں یہ ہر قسم کی بولیاں بولنے لگی۔ علمی مذاکرات میں اسے دخل ہوا، سائنس کی دنیا کو اس نے دیکھ ڈالا، اخبار نویسی کا چربہ اس نے اتارا، تاریخی دنیا میں اسے شہرت ہوئی، ناول نویسی میں اس نے فروغ حاصل کیا علم الاقتصاد اور فلسفہ میں اس نے نام پیدا کیا۔ غرض جس طرح اور زبانیں ہر قسم کے مطالب ادا کر سکتی ہیں یہ بھی انکے اظہار میں تیار اور مستعد نظر آتی ہے لیکن ہماری زبان آئندہ کیسی ہی ترقی کے آسمان پر کیوں نہ نظر آئے وہ ان بزرگوں کے بار احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی جنکی بدولت اس کو یہ رتبہ حاصل ہوا ہے۔

دیکھو! ہمارے چوتھے دور کے مصنفین انہی بزرگوں کی بدولت ہماری زبان میں کیا کیا گلکاریاں اور سحر طرازیاں کرنے لگے ہیں اور "ہمچو ما دیگرے نیست"، کا دعوی کرنے لگے ہیں لیکن ان کو اپنی خاطر نازک سے

یہ خیال کبھی نہ محسوس کرنا چاہیے کہ انھوں نے انھی بزرگوں کی درس گاہ میں تعلیم پائی ہے اور جو کچھ انھوں نے حاصل کیا ہے انھی بزرگوں کی فیض یا صحبت کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنے ان بزرگوں کے پے درپے رخصت ہونے پر جسقدر رنج والم کا اظہار کریں وہ کم ہے اور چونکہ موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں ہے اس لیے چار ونا چار صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

ذیل میں ہم اپنی وہ نظم درج کرتے ہیں جو ہم نے اسی موقع کے لیے لکھی ہے۔

کبھی یہ محفل اردو بھی تھی طرب افزا
نہ پوچھ اے دل غمگیں! وہ کیا زمانہ تھا

کہاں وہ صحبتیں ہوتی تھی روح جن سے شاد
ہر ایک بیخود کیفیت شبانہ تھا

کہاں وہ صورتیں مداح جنکا تھا ہر شخص
کہاں وہ لوگ؟ کہ مشتاق اک زمانہ تھا

گئے کچھ ایسے یہاں سے کہ پھر نہ ہم سے ملے
عدم کی راہ سے یہ قافلہ روانہ تھا

پر انکے فیض سے اردو کی ہو گئی وقعت
وگرنہ اس میں قصص کا فقط خزانہ تھا

مضمون نثر کا اسمیں نہ ذکر تھا نہ خیال
ہر ایک اہل قلم عاشق فسانہ تھا

خزاں رسیدہ چمن میں ترانۂ بلبل
سمند ناز پہ اک اور تازیانہ تھا

ہزار شکر کہ اس دور میں ہوئے پیدا
وہ لوگ جنکے قلم میں کتاب خانہ تھا

انھوں نے خاک کو اردو کی کر دیا گل ریز
سحاب فیض رساں اُن کا آستانہ تھا

شگفتگی مضامین سے بن گیا گلشن
وہ خارزار خزاں کا جو آشیانہ تھا

کہیں تھے لالہ و نرگس کہیں گل و ریحاں
عجیب بلبل ناشاد کا ترانہ تھا

خیال و خواب ہوئیں آج انکی سب باتیں
کہ جنکا معتقد اس وقت اک زمانہ تھا

وہ جستجوئے چراغ علی و سر سید
کہ جن کے لکھنے کا انداز عالمانہ تھا

وہ گلفشانیِ آزاد و حالی و شبلی
کہ اپنے اپنے بیاں میں ہر اک یگانہ تھا

نذیر احمد و سرشار اور شرر کی وہ نثر — کہ جس کا سارے زمانہ میں اک فسانہ تھا

نہ بلگرام کا نجم[1] اب نہ وہ ذکاءاللہ — کہ جن کے پاس تراجم کا اک خزانہ تھا

جدا کیا انھیں ہم سے نہ موت نے ہرگز — یہ چرخ تفرقہ انداز کا بہانہ تھا

انھوں نے باغِ ارم کو بسا دیا جا کر — جہاں ہیں ان کا بس اتنا ہی آب و دانہ تھا

تہ بزم عیش ہوئی آہ! مجلسِ ماتم
کھنڈر بنا وہ مکاں جو نگار خانہ تھا

چوتھا دور

یا

دورِ حاضر

چوتھا دور یا دورِ حاضر سنہ ۱۹۱۴ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ جنگ یورپ کی ابتدا ہوئی۔ اس جنگ نے تمام دنیا کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا اور انسانوں کے دماغ نئی معلومات سے لبریز ہو گئے۔ کوئی حصہ زمین ایسا باقی نہیں رہا جو اُسکے مہلک نتائج سے محفوظ رہا ہو اور کوئی ملک ایسا نہیں نظر آتا جو آزادی اور جمہوریت کے خیال سے خالی رہا ہو۔ تازہ بتازہ نو بہ نو ایجادات اس جنگ نے دنیا کے سامنے پیش کر دیں جو اسوقت تک پردۂ خفا میں تھیں ہر قریہ اور ہر آبادی کے لوگ ان شہروں اور ان مقامات سے جہاں جنگ واقع ہوئی واقف ہو گئے۔ دور دراز ملکوں کے لوگ اس

[1] شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی مراد ہیں۔

جنگ کی بدولت وہاں جمع ہوگئے جہاں ان کو پہنچنے کا کبھی وہم وگمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔ عجائبات دنیا ان کے پیش نظر ہوگئے جنھوں نے اپنے گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم نہ رکھا تھا۔ خیالات میں وسعت ہوگئی سیکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں اور رسالے اس جنگ کے متعلق دنیا کی تمام زبانوں میں شایع ہوئے۔ ہزاروں نظمیں لکھی گئیں اور دنیا کا لٹریچر اس جنگ عظیم کے کارناموں سے پُر ہوگیا۔ ہندوستان بھی اپنی عزلت پسندی اور قدامت پرستی کے باوجود عدم تعاون، سوراج اور خلافت کے معاملات میں کچھی لیے بغیر نہ رہا اور ہمارا اردو لٹریچر بھی ان کارہائے نمایاں میں برابر حصہ لیتا رہا جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب **شاعرانہ خیالات** میں انگریزی شاعری کا مختصر حال لکھتے ہوئے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "لٹریچر اپنے زمانہ کے خیالات کا غیر معلوم آئینہ ہوتا ہے" اگر غور سے دیکھا جاے تو ۱۹۱۴ء سے آج تک کا لٹریچر جنگ یورپ کے اثرات کا جام جہاں نما ہے۔ پس غیر ممالک کے گہرے اور جوشیلے اثرات نے ہم لوگوں میں بھی ایک روح پیدا کردی ہے اور ہمارے دور حاضر کے لٹریچر میں تخیل اور طباعی کی قوتیں اپنا زور دکھا رہی ہیں۔ تحقیق کرنے کا شوق پیدا ہوگیا ہے اور آزاد خیالی کی قوت بڑھ گئی ہے۔ ان دونوں باتوں سے لٹریچر کا وسیع ہونا لازمی ہے۔

لیکن ہمارا لٹریچر موجودہ حالات اور نئے نئے خیالات کے اظہار میں جن بزرگوں کی انشا پردازی کی بدولت قادر نظر آتا ہے ہم کو ان کے احسانات کبھی فراموش نہ کرنے چاہییں۔ وہ بزرگ تیسرے دور کے مصنفین ہیں۔ کیا کیا نایاب کتابیں ان کے قلم سے نکلیں اور کیا کیا جواہر ریزے انھوں نے ہمارے لیے ترکہ میں چھوڑے ہم کسی آیندہ زمانہ میں بھی

اُن سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ جب ہم **یادگار غالب** کے اس باب کا موازنہ جس میں مرزا کی اُردو شاعری پر مفصل ریویو کیا گیا ہے ڈاکٹر عبدالرحمن کے مقدمہ دیوان غالب سے کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص انگوری شراب کا مقابلہ جو مشرقی طریقے سے کشید کی گئی ہے یورپ کی اس شراب سے کیا جا رہا ہے جو مغربی طرز پر بنائی گئی ہے۔ فی الحقیقت مرزا غالب کے کلام کی جو خوبیاں مولانا **حالی** نے اپنے انداز خاص میں بیان کی ہیں وہ مذاق صحیح پر اپنا عجیب و غریب اثر ڈالتی ہیں۔ یہ مولانا ہی کا انداز تحریر تھا جس نے مرزا غالب اور اُنکے کلام کو آج کل کے تعلیم یافتہ طبقے سے روشناس کرا دیا ہے اور خراج تحسین وصول کیا ہے ورنہ مرزا غالب کو یہ قبولیت کبھی نہ حاصل ہوتی جس طرح کہ وہ اپنے زمانہ میں ہمیشہ سخنوران کامل کے شاکی رہے اسی طرح آج بھی بجز چند نفوس قدسیہ ان کا کوئی قدردان نظر نہ آتا۔ خود ڈاکٹر عبدالرحمن نے حسب ذیل الفاظ میں مولانا حالی کے اس کارنامہ کی یوں تعریف کی ہے:-

> "لیکن ایک خصوصیت اُن کے کلام میں ایسی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مضمر ہیں اُن کے بعض اشعار کی ہاوگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں جیسے **کولمبس** نے امریکہ کو دریافت کیا تھا، **مولانا حالی** نے مرزا **غالب** کے کلام میں اس نئی دنیا کا پتہ لگایا ہے اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا **غالب** سے کچھ کم مستحق داد نہیں ہیں"

ڈاکٹر عبدالرحمن کا **مقدمہ دیوان غالب** بھی ہمارے

لٹریچر میں ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ مغربی طرز بیان کو سلیس اُردو میں ادا کیا
گیا ہے جس سے کلام میں زور اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ بے اختیار زبان سے
نکل جاتا ہے کہ ایسے شاعر کے دیوان کے لیے جیسے کہ مرزا غالب تھے اگر
کوئی مقدمہ نگار ہو سکتا تھا تو وہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم ہی تھا۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن ہی کا کام تھا جس نے مرزا غالب کی حیثیت کو دنیائے
سخن میں دیگر ممالک کے نامور شعراء سے برتر و مافوق ثابت کر دکھایا ہے
وہ اُس کے مقدمہ میں ایک اُردو شاعر کی حیثیت سے جلوہ گر نہیں ہوتے
بلکہ ایک شاعر اور ایک فلسفی کی حیثیت سے تمام دنیا کے شاعروں میں ممتاز
درجہ پر نظر آتے ہیں۔ مگر اس بام ترقی پر پہنچنے کے لیے **یادگار غالب**
کا مطالعہ ایک زینہ کا کام دیتا ہے جس کے بغیر یہاں تک پہنچنا مشکل اور
دشوار تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن اور مولانا **حالی** میں ایک وجہ امتیاز یہ بھی
ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مقدمۃ الکتاب اور **کتاب المنافت** کو مرادف
الفاظ خیال کیا ہے اور مولانا نے مرزا غالب کی شاعری کو تنقید کی
عینک سے دیکھا ہے۔ بہر حال جس طرح عمدہ شراب کے لیے انگور ایک ناگزیر
شے ہے اسی طرح ہمارے موجودہ لٹریچر کے لیے تیسرے دور کے مصنفین
کی کتابیں ضروری عناصر ہیں۔ شراب کی کشید کا طریقہ خواہ مشرقی ہو یا مغربی
اگر انگوری کی خالص شراب ہے اپنی خاص کیفیت سے خالی نہیں ہو سکتی
برعکس اسکے طریقہ کشید کیسا ہی عمدہ ہو کسی اور چیز کی شراب سے وہ حظ نہیں
حاصل ہو سکتا جو خالص انگوری شراب سے ہوتا ہے۔ بادہ خوارانِ ادب کے لیے

خمخانۂ دورِ سوئم سے شرابِ مضامین مستعار لینا ضروری ہے اگر اس کیفیت کو جو ایک مست و سرشار ادب میں ہونی چاہیے برقرار رکھنے کی خواہش ہو۔ یا مولانا شبلی کی کتاب **المامون** کے مقابلہ میں **البرامکہ** یا **نظام الملک** طوسی کو پیش کیا جائے تو بے ریب و شک مولوی عبدالرزاق کی تحقیق و تدقیق کی ضرور قدر کیجائیگی تاہم وہ طرزِ تحریر اور وہ پرزور اندازِ بیان

سلہ مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی کے آباؤ اجداد فرخ آباد (صوبۂ آگرہ و اودھ) کے رہنے والے تھے اور فتح پور ہسوہ (متصل الہ آباد) میں آپ کی نانہال ہے۔ آپ کے والد نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کانپور کو اپنا وطن بنالیا۔ آپ کے دادا شیخ نبی بخش شیخ فاروقی تھے اور نانا میر لوعلی بخش سادات رضوی سے تھے یہ دونوں بزرگ ملازمت پیشہ تھے۔ مولوی صاحب کے خاندان کی شہرت آپ کے والد پروفیسر منشی الٰہی بخش صاحب مرحوم کی ذات سے ہوئی جو انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کے نامور منجم اور رمال تھے۔ اہل یورپ سے جو اصطلاحی نجوم کے قائل نہیں ہیں واسطہ رہتا تھا۔ امریکہ والے سالانہ تقویم بنواتے تھے جسکی فیس پانسو روپیہ تھی کل مراسلت انگریزی میں ہوتی تھی۔

مولوی صاحب بمقام انبالہ (پنجاب) بروز جمعہ ۷ا رمضان المبارک ۱۲۹۰ھ (اکتوبر ۱۸۷۳ء) پیدا ہوئے۔ آپ کے اکثر عزیز و اقربا لاہور، سیالکوٹ اور انبالہ میں سکونت پذیر ہیں۔ پانچ سال کی عمر میں (۱۲۹۵ھ) بمقام فتح پور ہسوہ آپ کی مکتب نشینی ہوئی۔ صوفی میر حسن علی صاحب (ایک نامور درویش اور مولوی) نے محض تبرکاً بسم اللہ پڑھائی۔ اسکے بعد صوفی صاحب کے مکتب میں گلستاں اور بوستاں بھی پڑھی۔ قرآن کی تعلیم حافظ چھوٹے صاحب نے دی جو فتح پور کے ایک مشہور حافظ تھے۔ ان سے صرف قرآن پڑھا۔ فتح پور کے تحصیلی اسکول میں منشی

جو مولانا شبلی کی خصوصیات میں سے ہے البر الکلمہ اور نظام الملک

بقیہ صفحہ ماقبل۔ امام علی صاحب فارسی کے ایک نامور ادیب تھے۔ یوسف زلیخا سے **خاقانی** اور **وصّاف** تک جو فارسی کے درجۂ فضیلت کا کورس ہے ختم کیا۔ سکندر نامہ شروع ہوگیا تھا کہ مولوی ظہور الاسلام صاحب (فرزند صوفی میر حسن علی صاحب مرحوم) سے عربی بھی شروع کردی۔ میزان الصرف سے میر قطبی (منطق) تک مولانا سے تعلیم پائی۔ اسکے بعد آپ کے کانپور آکر مولانا احمد حسن صاحب محقق کی درس مدرسہ فیض عام مسجد رنگیان سے بقیہ درس نظامیہ کی تحصیل شروع کردی۔ حدیث کا کچھ حصہ مولانا محمد علی صاحب اول ناظم ندوۃ العلما ساکن کانپور حال مقیم مونگیر سے پڑھا۔

آپ کے نگراں اور کفیل آپ کے ماموں میر عنایت علی صاحب تھے جو ٹھیٹ مشرقی خیال کے تھے اور آپ کے والد سراپا مغربی تھے اسلیے آپ انگریزی تعلیم سے محروم رہے۔ ملازمت سرکاری کی ضرورت سے آپ نے اردو مڈل پاس کیا تو اسی جرم میں آپ کے ماموں صاحب نے کانپور آپ کے والد کے پاس بھیج دیا کئی سال کے بعد یہ قصور معاف ہوا۔ بہر حال انگریزی تعلیم اس خاندان میں بمنزلہ کفر تھی اور یہی سبب ہوا کہ آپ انگریزی تعلیم سے محروم رہے۔ مکتب نشینی سے کامل سترہ سال کے بعد عربی فارسی کی تعلیم ختم ہوئی عربی کی تعلیم ہنوز ختم نہ ہوئی تھی کہ گورنمنٹ انگریزی کی ملازمت (کانپور میں) شروع کردی تھی لیکن مولانا احمد حسن کی درسگاہ گھر سے قریب تھی اسلیے آپ ملازمت کے ساتھ ساتھ چند سال تک تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔

باوجود اسکے کہ آپ کا حافظہ بہت اچھا تھا لیکن عہد طفلی میں جب آپ گلستاں پڑھتے تھے تو یہ دقت پیش آئی کہ آپ نے دیباچے سے گلستاں کو شروع کیا۔ جب اس حکایت پر پہنچے کہ طائفۂ دزدان عرب بر کوہے نشستہ" تو پچھلا ایک حرف بھی یاد نہ رہا یہانتک کہ تین مرتبہ اس حکایت تک اول سے گلستاں پڑھنا پڑی۔ اسکے بعد رستہ صاف ہوگیا۔ غالبًا اس دقت کا سبب یہی تھا کہ عام شاہراہ کو چھوڑ کر آپ کے استاد نے گلستاں کو دیباچہ سے شروع کرایا ورنہ عمومًا معلم باب اول سے پڑھایا کرتے ہیں۔ اور گلستاں کا دیباچہ مشکل ہے حقیقتًا گلستاں ختم کرنے کے بعد دیباچہ پڑھنا چاہیے تاکہ عبارت آسان اور زود فہم معلوم ہونے لگے اور بچہ سمجھنے لگے۔

آپ کو کتابوں کے جمع کرنے کا بچپن سے شوق ہے۔ عیدین وغیرہ میں جسقدر رقم عیدی کی ملتی تھی وہ کل رقم خرید کتب پر صرف ہوتی تھی چنانچہ یہ شوق ابتک قائم ہے اور اسوقت آپ کا کتب خانہ دس ہزار روپیہ سے زیادہ قیمت کا ہے۔ چونکہ آپ کی نگرانی سخت تھی اس لیے آپ کو تفریح اور لہو ولعب سے ہمیشہ نفرت رہی۔ آپ کو تاش، گنجفہ وغیرہ کوئی کھیل نہیں آتا۔ فتح پور میں آپ کے یہاں کاشتکاری بھی ہوتی تھی اسلیے آپ شام کا وقت کھیت پر گزارتے تھے اور یہی آپ کی تفریح کا بہترین مشغلہ تھا۔ آپ کو رمل ونجوم میں بھی اچھی دستگاہ تھی لیکن قرآن وحدیث کی تعلیم کے

میں تلاش کرنا بے سود ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے موجودہ لٹریچر میں

بقیہ صفحہ ماقبل بعد جسقدر پڑھا تھا وہ سب قصداً بھلا دیا۔ آپ صرف مصطلحات یاد ہیں احکام نحوی نہیں کہہ سکتے
آپ کی ملازمت عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔ سب سے پہلی خدمت مدرسۂ اسلامیہ فتح پور کی مدرسی
تھی۔ اس مدرسہ کے بانی مولوی ظہور الاسلام تھے اور یہ مدرسہ اب تک جاری ہے۔ آپ یہاں حساب،
فارسی اور ابتدائی درجہ کی عربی کی تعلیم دیتے تھے۔ بعد ازاں آپکے والد نے یہ کہکر ترک ملازمت کرائی کہ
میں تم کو مسجد کا ملا بنانا نہیں چاہتا ہوں۔ آپ سنہ ۱۸۸۹ء سے سنہ ۱۸۹۶ء تک کلکٹری کانپور میں مختلف
عہدوں پر مامور رہے۔ مشاہرہ میں تیس روپیہ سے زائد اضافہ نہ ہوا۔ اس لیے تنگ آکر سرکاری ملازمت
ترک کر دی۔ اور ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۹۶ء سے میونسپل بورڈ کانپور میں مشاہرہ چالیس روپیہ ماہوار سررشتہ دار
ہو گئے۔ ۵ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء تک آپ ملازم رہے۔ اسکے بعد آپ بھوپال چلے گئے اور دسمبر مذکور میں ہزہائنس
نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ سابق فرمانروائے بھوپال نے مشاہرہ سو روپیہ ماہوار آپ کو تحصیلدار مقرر
کیا۔ عرصہ تک آپ اس عہدہ کی خدمات انجام دیتے رہے لیکن یہ خدمت آپ کے مذاق کے مطابق
نہ تھی لہذا حضور عالیہ نے بنظر قدر دانی سنہ ۱۹۱۰ء میں آپ کو منتظم تاریخ اسلام مقرر کیا اور مشاہرہ بھی
ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کر دیا۔ چنانچہ اب تک اسی عہدہ پر آپ مامور ہیں۔

کانپور میں منشی رحمت اللہ رعد مالک نامی پریس سے آپکے تقریباً عزیزانہ تعلقات تھے اور آپ انکی
دوستی پر فخر کرتے ہیں جب انہوں نے بڑی جنتری میں تاریخی مضامین لکھنا شروع کیے تو انکی اڈیٹری
آپکے سپرد ہوئی چنانچہ تاریخ ایران سے آل عثمان کی تاریخ تک آپ مضامین عرصۂ دراز تک لکھتے رہے
اور سنہ ۱۹۱۲ء سے بھوپال کی تاریخ جو جنتری مذکور میں نکل رہی تھی وہ بھی آپکی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

غالباً سنہ ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس تھا۔ اس جلسہ میں مولانا
شبلی نعمانی مرحوم نے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک عالمانہ لکچر دیا۔ یہ ذریعہ مولانا کی ملاقات کا
ہوا اور اس لکچر نے آپ کو تاریخ عرب کے مطالعہ کا شوق دلایا اور آپ علمی مطالعہ میں مصروف ہوگئے
چند سال گزرے تھے کہ ہردوئی سے حکیم محمد علی نے ناول **جعفر و عباسہ** شایع کیا۔ عباسہ کے نکاح
کا واقعہ پڑھکر آپ کو سخت تشویش ہوا جب مقدمہ ابن خلدون کی طرف رجوع کیا تو یہ واقعہ غلط
ثابت ہوا اور آپکے دل میں آیا کہ اسکی تردید میں ایک مضمون لکھیں۔ چنانچہ اسی شوق نے برامکہ سے
روشناس کرایا۔ اور بجائے اسکے کہ آپ ایک مضمون لکھتے آپ نے آل برمک کی پوری داستان لکھ ڈالی
چنانچہ سنہ ۱۸۹۹ء میں نامی پریس سے پہلی تصنیف **البرامکہ** شایع ہوئی جسکے چار سو چھیالیس صفحات
ہیں۔ پھر اسی سلسلہ میں وزرائے اسلام کی دوسری جلد نظام الملک طوسی سنہ ۱۹۱۱ء میں

البرامکہ یا نظام الملک ایسی کتابیں نہیں ہیں جنکو نظر انداز کیا جاسکے لیکن مولانا شبلی کی تصنیفات کا پایہ اعلیٰ اور برتر ہے۔
یا مولوی محمد حسین آزاد کی تصنیفات سے مولوی ابوالکلام آزاد کی

تقیہ قبل از قیل شایع ہوئی جسکے ۱۷ صفحات ہیں۔ یہ تصنیفات آپ نے بزمانہ تحصیلداری بھوپال میں ختم کی تھیں انکے علاوہ آپ کی حسب ذیل تصنیفات ہیں۔
۱۔ تاریخ مآثر جلالی۔ جسمیں جلال خاں بانی قصبۂ جلال آباد ضلع مظفرنگر کی مکمل سیرت اور تاریخ ہے غالباً ابتک یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔
۲۔ تاریخ اسلام۔ جسکو آپ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کے خاص حکم سے لکھ رہے ہیں ۱۹۲۵ء تک دو حصے ختم ہوچکے تھے۔
۳۔ عہد جاہلیت عرب۔ جو تاریخ اسلام کا مقدمہ ہے اور ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔
۴۔ عہد رسالت۔ یہ حصہ بھی ختم ہوچکا ہے اور تقریباً ۹۰۰ صفحات پر ہے۔
۵۔ خلافت راشدہ۔ یہ تاریخ اسلام کی تیسری جلد ہے حضرت ابوبکر صدیق کے حالات ۵۰۰ صفحات پر ختم ہوچکے ہیں۔ یہ تاریخ تیرہ صدیوں پر تقسیم کی گئی ہے۔ ہندوستان اس سلسلہ کی اخیر جلد ہے سلاطین اسلام کے سوا اور کسی خاندان سے واسطہ نہیں ہے۔ یہ سات جلدوں پر ختم ہوگی مصر، بربر افریقہ، ایشیائے کوچک وغیرہ جملہ سلاطین کے حالات ہونگے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
۶۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی۔ یہ چوتھی صدی ہجری کا فارسی سفرنامہ ہے اور تمام سفرناموں میں (بزبان فارسی) عہد قدیم کا صرف ایک ہی سفرنامہ ہے۔ جو فارسی علم ادب میں نوادرات سے ہے۔ چونکہ یہ غلط بہت تھا اسوجہ سے برسوں کی محنت میں اسکی تصحیح ہوئی ہے اور نوٹوں کے بغیر اس کا شایع کرنا مناسب نہ تھا لہذا اسپر مکمل نوٹ لکھے ہیں اور یہ سفرنامہ چھ یا سات سو صفحات پر ختم ہوا ہے۔
(سفرنامہ حکیم ناصر خسرو علوی بلخی کو مولانا حالی مرحوم نے بھی بعد تصحیح شایع فرمایا تھا اور ایک نسخہ برستی کے سٹیج کا مرزائی نے بھی شایع کیا ہے جو مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ، دہلی سے مل سکتا ہے)
آپ کو اخبارات اور علمی رسائل میں مضامین لکھنا پسند نہیں ہے اسلیئے آپ فرصت کے لمحات مستقل تصنیف میں صرف فرماتے ہیں۔ آپ کو نظام گورنمنٹ سے تاریخ اور فلسفہ کی پروفیسری کے لیے معقول مشاہرہ پر طلب کیا گیا تھا لیکن حضور عالیہ کی قدردانی کی وجہ سے آپ دکن نہ جاسکے۔
آپ کے کوئی فرزند نہیں ہے صرف ایک لڑکی ہے جس سے سلسلۂ نسل چل رہا ہے۔ خدا آپکو ایک فرزند بھی عطا کرے۔ آمین ثم آمین۔

تحریرات کا مقابلہ کیا جائے تو وہ پختگی اور شیرینی جو پروفیسر آزاد کے یہاں ہے اُنکے حریف آزاد کے یہاں کہاں؟ بیشک جوش اور روانی ابوالکلام کے یہاں اس کثرت سے ہیکہ کم از کم دورِ حاضر کا کوئی مصنف اس سے سبقت نہیں لیجا سکتا شاید اسکی یہ وجہ ہو کہ سیاسی مضامین حریت پسند اشخاص کے لیے پہلے ہی سے دلچسپی لیے ہوتے ہیں اور اُن کو جا و بیجا قرآنِ پاک کی آیتوں کے حوالے سے زوردار اور نہایت زوردار بنایا جا سکتا ہے۔

یا تمدنِ عرب کا موازنہ بلحاظ ترجمہ معرکۂ مذہب و سائنس سے کیا جائے تو آخرالذکر کتاب کسی طرح اول الذکر کتاب پر قابلِ ترجیح نہیں ثابت ہو سکتی جو صفائی سلاست اور وضاحت تمدنِ عرب یا تمدنِ ہند میں پائی جاتی ہے اُسکا عشرِ عشیر بھی معرکۂ مذہب و سائنس میں نہیں ہے البتہ مولوی غلام حسنین کا ترجمہ فلسفۂ تعلیم باوجود کثرتِ مصطلحاتِ علمی ضرور لائق داد اور قابلِ تحسین ہے اور تمدنِ ہند یا تمدنِ عرب کے ٹکر کا ہے لیکن بڑی ناانصافی ہوگی اگر ہم اس امر کا اظہار نہ کریں کہ مولوی ظفر علیخاں کو جو دقتیں پیش آئی ہونگی غالباً اس تعداد میں ان دونوں صاحبان کو پیش آئی ہونگی کیونکہ سائنس کی جملہ جدید معلومات کا ذکر معرکۂ مذہب و سائنس میں کیا گیا ہے اور اپنی زبان میں ان علوم کے لیے اور جدید تحقیقات کے آلات کے لیے الفاظ بہم پہنچانا بیحد دشوار تھا اور اُن مطالب کو آسان عبارت میں بیان کر دینا مشکل اور سخت مشکل تھا۔

یا مولوی نذیر احمد کے ناولوں کا ذکر راشد الخیری کے ناولوں کے ساتھ کیا جائے یا اوّل الذکر کی تحریر کا مقابلہ آخرالذکر کی تحریر سے کیا جائے تو جو فرق اصل اور نقل میں ہے وہ بیّن طور پر نظر آجائیگا۔ کہاں مولوی نذیر احمد کی وہ پاکیزہ تحریر جو اُنکی خاص ایجاد تھی اور کہاں راشد الخیری کی نقالی یا مصوری جس طرح مولوی نذیر احمد کے خطوط خواہ اُنکی کتنی ہی تعریف کیوں نہ کیجائے مرزا غالب کے خطوط سے کوئی نسبت

نہیں رکھتے اسی طرح راشد الخیری کی تصنیفات گو وہ قابل تعریف کیوں نہوں
مولوی نذیر احمد کی کتابوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

یا سرشار کے مقابلہ میں حسن نظامی کو پیش کیا جائے تو ایک شہ زور نوجوان
کے مقابلہ میں ایک کمزور لڑکا نظر آئیگا۔ سرشار سے تو کیا شرر سے بھی حسن نظامی کا مقابلہ نہیں
کیا جا سکتا۔ بیشک پریم چند کے قصے دلچسپ ہیں لیکن سرشار اور شرر سے کیا نسبت؟ چہ نسبت
خاک را با عالم پاک + انصاف یہ ہے کہ ہم اپنے تعصبات کی بنا پر خواہ ایک دوسرے پر
ترجیح دیدیں لیکن تیسرے دور کے مصنفین کا مقابلہ اس دور کے کم پایہ مصنفین کسی طور نہیں
کر سکتے۔ اگر خود موجودہ مصنفین سے دریافت کیا جائے تو وہ تیسرے دور کے مصنفین کی
ہمسری سوء ادب خیال کریں۔ البتہ اس دور یعنی دور حاضر کے لکھنے والوں کی تعداد
روز افزوں ہے اور ممکن ہے کہ آیندہ زمانہ میں موجودہ اشخاص ہی میں سے بعض ایسے اصحاب
نکل آئیں جو دور حاضر کے لیے باعث فخر ہوں اور تیسرے دور کے مصنفین سے گوے سبقت لیجائیں

فی الحال موجودہ دور کے مصنفین کے حالات زندگی تیسرے دور کے مصنفین کی طرح
قلمبند کرنا نہ صرف قبل از وقت اور غیر ضروری ہے بلکہ مذاق سلیم کی تضحیک کرنا ہے جسکو ہم کسی طرح
گوارا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ اس سے ہماری کتاب کی ہر دلعزیزی میں فرق آئے لیکن ہم اپنی کتاب کو
رطب و یابس سے پر کرنے کی بجائے صحیح مذاق کی معلومات کا مخزن دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں
بیشک بعض اصحاب ہم سے اختلاف کرینگے اور ہم کو مورد طعن و تشنیع بنائینگے لیکن ہم انکی خدمت میں
باادب عرض کرتے ہیں کہ ہم نے نہایت غور و تامل کے بعد نیک نیتی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے
کہ دور حاضر کے مصنفین کے حالات فی الحال نظر انداز کر دیے جائیں تاکہ (اگر خدا کو منظور ہے)
کسی آیندہ زمانہ میں اس کتاب کے صفحات کو مزین کرنے کے لیے ایک ذخیرہ کا کام دیں۔ جن صاحبان کے
حالات حاشیہ پر حوالہ قلم کیے گئے ہیں وہ ناظرین کو محض آگاہ کرنے کے لیے ہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں
اور چونکہ ان کا ذکر متن میں آگیا ہے، اصول کتاب نویسی کے لحاظ سے بھی انکا مختصر حال لکھدینا ضروری
تھا۔ جن صاحبان کا اسقدر حال بھی درج کتاب نہیں ہوا وہ ہرگز اسکے یہ معنی نہ سمجھیں کہ ہم نے انکو دور
حاضر کے زمرہ مصنفین میں داخل نہیں کیا بلکہ وہ یہ خیال فرمائیں کہ جس شخص کے حالات حسن
اتفاق سے معلوم ہو گئے اسکا مختصر حال داخل کتاب کر دیا گیا۔

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

[illegible]لی دوسری کتابیں

[illegible]ک - یہ کتاب نامور امریکی ادیب واشنگٹن ارونگ کے مضامین کا بامحاورہ ترجمہ ہی۔ مصنف کی زندگی کے حالات بھی درج ہیں اور اسکی طرز تحریر پر بھی تبصرہ کیا گیا ہی۔ نہایت دلکش اور مفید مضامین ہیں اور ان کو اپنی زبان میں نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہی صفحات ۲۹۶ قیمت ۸ر

تاریخ مغربی یورپ - یہ یورپ کے مغربی ممالک کی مفصل اور مشرقی ممالک کی مجمل تاریخ ہی۔ نہایت بصیرت افروز ہی جلد اول اکتوبر ۱۹۲۹ء تک شائع ہو جائے گی۔

سیر المصنفین جلد اوّل - یہ اسی کتاب کی پہلی جلد ہی جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تھی اگر آپ نثر اردو کی مکمل تاریخ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں تو اسے ضرور منگائیے۔ بہت کم نسخے رہ گئے ہیں جلد طلب فرمائیے۔ قیمت عہ

جلد دوم ـــہ

شاعرانہ خیالات - اس کتاب میں انگریزی شاعری کا مختصر حال اور نامور انگریزی شعرا کی مشہور نظموں کا ترجمہ درج ہی۔ نہایت عمدہ اور شاندار ترجمہ ہی۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی اس کتاب کی بیحد تعریف فرما چکے ہیں قیمت۔ ایک روپیہ

ملنے کے پتے
(۱) مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دھلی
(۲) مینجر دار الاشاعت غازی آباد